
سالِ نو مبارک
دل گداز تحریریں، ٥ زندگی کی تصویریں
کراچی
ماہنامہ
سچی کہانیاں
January
2015
WWW.PAKSOCIETY.COM
WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1
PAKSOCIETY

07 نوبل پرائز — منزہ سہام

09 کچھ اپنی باتیں — کاشفی چوہان
اپنے قارئین سے مخاطب
مدیر کی کچھ دل داریاں

10 احوال — مینا تاج
قارئین کے خطوط اور حال
احوال کا دل چسپ سلسلہ

36 گرداب — سلیم اختر
معصوم خواہشات کی بھینٹ
چڑھنے والی دوشیزہ کا قصۂ خاص

40 شش! خاموش — نسیم سحر
گردش حالات کی شکار
عورت کی کہانی خاص

45 تشنگی باقی... — ساحل ابڑو
دلوں کے تار جھنجھنا
دینے والی داستان

52 خالی دامن... — صبا اصغر
مکر و فریب سے
گندھی ایک داستان

58 چور دریچے — محمد بلال عیاض
والدین اور اولاد کے عدم
مطابقت کی ایک کہانی خاص

62 تن کی کالی... — زرغام محمود
ایک بے راہ رو شخص کا قصہ
جو راہِ راست پر چل پڑا

72 کرنی کی سزا — عبدالغفار عابد
گناہ کی شاہراہ پر کھڑی
عورت کا انتقام

77 صبر کا پھل — محمد زبیر ساگر
صبر و تحمل کا انعام پانے
والی دوشیزہ کی کہانی

80 اجتماعی دکھ — رانا محمد شاہد
سقوطِ ڈھاکہ کا غم لیے
ایک حقیقی داستان

84 ادھوری محبت — علی حسین تابش
محبت اور خود غرضی
کے گرد گھومتی کہانی

90 یوں چاہے... — عظمیٰ شکور
ایک ضدی عورت کی نفرت کا
شکار ہونے والے نوجوان کا قصہ

94 گناہوں کی... — ایم اشفاق بٹ
ذلت اور گناہ سے
لپٹی ایک آپ بیتی

101 ہم شکل — ایم اے راحت
سچی کہانیاں میں پہلی بار، برصغیر کے
نامور قلم کار کا نیا سنسنی خیز سلسلہ

119 کوپن ہیگن — محمود شام
انسان دوست صحافی اور بہترین
شاعر ''محمود شام'' کے قلم سے

پرنٹر: حسام محی الدین عباسی' سٹی پریس' 7-OB تالپور روڈ، کراچی / فون: 35893122 - 35893121

130 یہ ملال عشق
ثناء ناز
ایثار محبت اور قربانی کی ایک تصویر

135 لے بسا ئے...
کرن شبیر
ادھورے پن میں مکمل زندگی جینے کے خواہش مند افراد کی ایک داستان

140 کرشمہ قدرت...
فیصل نعیم بھٹی
قدرت کی مہربانی سے لطف اندوز ہوتی ایک کہانی

143 سیوا کا میوہ
ام عادل
بے لوث محبت اور نیکی کا صلہ لیے ایک خاص کہانی

147 نسخہ
غلام عباس
ایک منچلے نوجوان کا قصہ جس کا نسخہ خود اس کے گلے پڑ گیا

151 ناگن
اعجاز احمد نواب
ہزاروں سال کی تپسیا پر پھیلا زندگی کا ایک رنگ

169 قدم قدم پہ ستم
جاوید راہی
جرم کی ایک انوکھی داستان

178 موت العالم...
ایم کاشف
عالم کی موت یعنی علم کی موت

182 حسد کی آگ
عمران مظہر
حسد کی دہکتی آگ میں جھلنے والی عورت کی کہانی

187 شرم کی چادر
بابر نایاب
انسانیت کا درس لیے ایک معلم کا بیان

191 لرزش
شازیہ گل
محبت اور دوستی کی بے اعتنائی لیے ایک کہانی

195 خدا نہ کرے
ڈاکٹر طارق محمود آکاش
ایک شاطر عورت کے مکر و فریب کا شکار نوجوان کی کہانی

203 فیس بک
شائستہ جمال
فیس بک سے نقصان اٹھاتی ایک سچ بیانی

205 کنوارا دل
عثمان غنی
ایک فیشن زدہ نوجوان کا قصہ

208 مسئلہ یہ ہے
ادارہ
آپ کے مسائل کا حل۔ سچی کہانیاں کا لازوال سلسلہ

212 سخن آباد
قارئین
شعراء کے کلام سے آباد ایک سخن فہم سلسلۂ خاص

222 فیض عشق
امجد جاوید
عشق کے متوالوں کے لیے عشق میں ڈوبی ایک خاص الخاص کہانی

زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹری پاکستان 720 روپے افریقہ 65 ڈالر کینیڈا آسٹریلیا 65 ڈالر ایشیا یورپ 55 ڈالر قانونی مشیر



نوبل پرائز

ملالہ کو نوبل پرائز سے نوازہ گیا۔ اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ یہ کوئی قابلِ فخر بات نہیں...... اور اکثریت کا ماننا ہے کہ ملالہ نے پاکستان کا نام دنیا بھر میں بلند کیا۔ کچھ کا یہ بھی کہنا ہے کہ نوبل پرائز ملنے میں ایسی کیا قابلِ فخر بات ہے۔ یہ انعام تو ہر اُس شخص کو مل سکتا ہے جو پاکستان اور اسلام دشمنی کی باتیں کرے جیسا کہ ملالہ کی کتاب سے بھی ظاہر ہے۔ میرا ماننا تو صرف یہ ہے کہ ایٹم بم کے خالق کے نام پر دیا جانے والا نوبل پرائز عزت اور وقار کا باعث ہو یا نہ ہو ہمیں اپنی عزت اور وقار کا خود خیال رکھنا چاہیے۔ اور اس کے لیے ضروری ہے کہ ہم اپنے دین اور اپنے وطن سے مخلص رہیں۔ نہ کسی کو تکلیف دیں نہ خود تکلیف میں مبتلا ہوں۔ اللہ تعالیٰ کے بنائے ہوئے قوانین کی خلاف ورزی نہ کرنے والوں کو جس انعام سے وہ رب العزت نوازتا ہے۔ اس کے سامنے تمام انعامات ہیچ ہیں۔ لہٰذا مسلمان اور پاکستانی ہونے کے ناطے ہمیں صرف اللہ کی رضا کا خیال رکھنا چاہیے کیونکہ جس سے اللہ راضی اس سے دنیا راضی۔

منزہ سہام

کچھ اپنی باتیں

چڑیا دیوانی ہوئی جارہی تھی۔ وہ بے تابانہ لپک رہی تھی، مچل مچل کے گھونسلے پر گر رہی تھی۔ جہاں اُس کے درجن بھر بچے آسمان کی جانب چونچ اُٹھائے چوں چوں کیے جارہے تھے۔ وہ قیامت کا منظر تھا۔ اُن بچوں کی آنکھیں بند تھیں اور وہ اپنی جانب بڑھتے ہوئے بھوکے سانپ کو دیکھنے سے قاصر تھے۔ چڑیا اُڑان کا ایک جھونکا بھرتی اور سانپ کے منہ پر پنجہ مارتی اور آگے کو نکلتی پھر بے تابی سے دیوانہ وار پلٹتی اور سانپ کے منہ سے ٹکرا ہی جاتی مگر سانپ کو کیا فرق پڑتا ہے۔ چہ پدی چہ پدی کا شوربہ اور اُس کی چمکدار آنکھوں میں بھوک پھن پھیلائے ناچ رہی تھی۔ وہ تیزی سے رینگتا ہوا گھونسلے پر پہنچا اور اُس نے چڑیا کے ایک بچے کو سالم نگل لیا۔ اب وہ دوسرا نگلنے جارہا تھا کہ چڑیا کا تو جیسے کلیجہ ہی پھٹ گیا۔ وہ ممتا کی ماری جن کے لیے دانہ دانہ چُگ کر لاتی تھی انہیں ناگ کے منہ میں جاتا کیسے دیکھ سکتی تھی۔ پھڑ پھڑا کر گری اور تڑپ تڑپ کر ٹھنڈی ہوگئی۔ میں نے ٹی وی بند کر دیا اور مکدر طبیعت لیے سو گیا۔ دوسرے دن ٹی وی آن کیا تو منظر وہی تھا کردار بدل گئے تھے۔ چڑیوں جیسی مائیں بے تابانہ اِدھر سے اُدھر ڈولتی پھر رہی تھیں۔ کچھ کالے ناگ اپنے زہریلے پھن پھیلائے اُن کے بچوں کو نگلنے کے درپے تھے۔ گولیوں کی آوازیں سانپ کی پھنکار سے زیادہ دہشت ناک ہوئی جاتی تھیں۔ ایک ماں کو کیمرہ بار بار دکھا رہا تھا۔ اُس کے چہرے پر اندیشے، اُمید، مایوسی، خوف، دہشت، غصے اور غم کی کیفیات یکساں ہویدا تھیں۔ وہ آرمی اسکول کی دیواروں کے ساتھ ساتھ دوڑتی پھر رہی تھی کہ شاید اُس کا لختِ جگر دیوار کی کسی درز سے برآمد ہو اور اُس کی چھاتی سے لگ جائے۔ مجھے معلوم نہیں اُس کی ماں کو بچہ ملا یا بچے کا لاشہ......!

لیکن مجھے یہ ضرور معلوم ہے کہ یہ دہشت و بربریت سے عبارت یہ اندوہناک واقعہ کسی انسانی معاشرے میں وقوع پذیر نہیں ہوسکتا۔ ایسا تو جنگلوں میں ہوتا ہے۔ جن جنگلوں میں سانپ، بچھو، بھیڑیئے، لکڑ بھگو، چیتے، شیر، بجو، گدھ جیسے درندے رہتے ہیں۔ مگر ہم تو انسان ہیں۔ اشرف المخلوقات انسان! ہم اپنے بچوں کو نہیں مارتے، ہم اُنہیں چیر پھاڑ کر نہیں کھاتے۔ تو پھر یہ کون تھے جو اسکول میں نہتے بچوں پر اسلحے کا زور آزمانے آئے تھے۔ جنھوں نے گھیر گھیر کر معصوم کلیوں کو گولیوں کی باڑ میں بھون دیا تھا۔

کیا یہ رحمت اللعالمین ﷺ کے ماننے والے تھے؟

کیا یہ شافع محشر ﷺ کے کلمہ گو تھے؟

کیا یہ امام المسلمین کے مسلماں تھے؟

کیا یہ خلفائے راشدین کی رعیت تھے؟

کیا یہ پنجتن پاک کا نام چومنے والے تھے؟

نہیں نہیں...... ہرگز نہیں...... یہ اُن مقدس ہستیوں کو کجا کسی انسان کو بھی ماننے والے نہیں تھے۔ یہ تو اُس ناگ دیوتا کے ماننے والے تھے جو چڑیا کے بچوں کو نگل جاتا ہے۔



ظالمو ! کچھ تو فرق رہنے دو
قتل گاہوں میں ، درس گاہوں میں

احوال

قارئین کے درمیان رابطہ، آپ کے خطوط اور اُن کے جواب

شروع اللہ کے بابرکت نام سے، جو بڑا مہربان اور رحم والا ہے۔
قارئین کرام اور احوالی ساتھیوں کو بینا تاج کا سلام۔ میری جانب سے آپ تمام لوگوں ''سالِ نو'' کی بہت مبارک باد قبول ہو۔
دعا ہے یہ سال ہمارے وطن عزیز اور اس میں بسنے والوں کے لیے خیر اور امن کا پیغام لائے (آمین)
قارئین نئے سال کا آغاز میں اپنے آقا حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم سے کرنا چاہوں گی جو ہمارے لیے ایک نادر تحفہ ہے۔
ایک بار صحابہ نے عرض کی، یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مال دار لوگ بلند درجات اور ہمیشہ رہنے والی جنت کی نعمتوں کو حاصل کر لے گئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہ کیسے؟ صحابہ نے عرض کی۔ جس طرح ہم نماز پڑھتے ہیں، وہ بھی پڑھتے ہیں، جس طرح ہم جہاد کرتے ہیں وہ بھی کرتے ہیں اور اس کے ساتھ وہ اپنا زائد مال بھی (اللہ کے راستے میں) خرچ کرتے ہیں اور ہمارے پاس مال نہیں ہے، آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ''پھر کیا میں تمہیں ایک ایسا عمل نہ بتادوں جس سے تم اپنے آگے کے لوگوں کے ساتھ ہو جاؤ اور اپنے پیچھے آنے والوں سے آگے نکل جاؤ اور کوئی شخص اتنا ثواب نہ حاصل کر سکے، جتنا تم نے کیا ہو، سوا اس صورت کے جبکہ وہ بھی عمل کرے جو تم کرو گے (اور وہ عمل یہ ہے) کہ ہر نماز کے بعد دس مرتبہ 'سبحان اللہ' پڑھا کرو۔ دس مرتبہ 'الحمد للہ' پڑھا اور دس مرتبہ 'اللہ اکبر' پڑھا کرو۔
(صحیح بخاری شریف۔ جلد سوم)

اللہ ہم سب کو ان نادر باتوں پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے (آمین)
آیئے اب اپنی رنگا رنگ بزم سجائیں کہ ساتھی بہت دیر سے بے چین ہو رہے ہیں۔
✉ محمد سلیم اختر راولپنڈی سے احوال کو رونق بخش رہے ہیں۔ میں شرمندہ ہوں منزہ بہن آپ نے ہم سب کو ہی شرمندہ کر دیا ہے کاش کسی کو اس شرمندگی کا احساس ہو جائے اور آئندہ کوٹ رادھا کشن جیسا سانحہ جنم نہ لے۔ کچھ اپنی باتیں کاشی چوہان مزہ آ گیا آپ کے ہاتھ چومنے کو جی چاہتا ہے مٹی نے واقعی حیران کر دیا۔ آپ کی باتیں اپنی ڈائری کی زینت بناؤں گا آپ نے قلم توڑ کر تو لکھا ہوگا یہ سب کچھ زہر عشق کا انتظار رہے گا۔ تمام احوالی دوستوں کو آداب اور ان سب کا شکریہ جنہوں نے مجھے ایوارڈ ملنے پر مبارک باد دی۔ فرداً فرداً سب کا ذکر کروں تو خط لمبا ہو جائے گا۔ کہانیوں میں علی رضا عمرانی کی آئیڈیل سر فہرست رہی اسماء اعوان کی بنگلہ نمبر D-36 اور عذرا فردوس کی آسیبی چکر پر اسرار نمبر کی شان میں اضافہ کر

رہی ہیں۔ان دونوں کو بہت بہت مبارکباد ایک غلطی رضوان تیوم بہت ہی اچھی اور منفرد تحریر لے کر آئے۔سدرہ انور کی حوا کی بیٹیاں، وہ مہرباں، ممتاز احمد مانو یا نا مانو، اور مور شاہد حسین ماں جایا، معاویہ عنبر دلو، عاشق جن، چھلاوا گراونڈ، وہ کون تھے، کالا جادو، طلسمی محبت، جادو، خوف، نرالی چاہت، وہ رات، اور برکات رحمانی، مختصر مگر پراثر تحریریں تھیں سب لکھنے والوں کو مبارک باد دیں۔ ہمشکل، ناگن، اور فیئش عشق، ان تینوں کا تو جواب نہیں یہ اپنے قارئین کو گرفت میں لیے ہوئے ہیں۔میرے ایک ہم عمر رائٹر، عبدالعزیز آجی ہیں، جو کئی ماہ سے احوال اور سچی کہانیاں کے پلیٹ فارم سے غائب ہیں بھائی آپ کہاں ہیں؟ پلیز لوٹ آئیں خالی، آپ کے بغیر سچی کہانیاں ادھورا لگتا ہے۔جلدی سے احوال کے ساتھ ساتھ کوئی اچھی سی تحریر بھی روانہ کریں میں آپ کی آمد اور تحریروں کا منتظر رہوں گا۔دعاؤں کے ساتھ۔

☆ محترم سلیم اختر صاحب خوش رہیں اور اپنے مفید مشوروں اور کہانیوں سے ہمارے پرچے کی رونق میں اضافہ کرتے رہیں۔

✉ محمد علی! ہانگ کانگ سے پہلی بار شامل احوال ہیں السلام وعلیکم جناب عالی! امید ہے کہ آپ خیریت سے ہوں گے۔ جناب عالی! ہانگ کانگ کی پیداوار ہیں اور ہمیں زیادہ لکھنا نہیں آتا۔یہ بھی کچھ دوستوں سے اردو لکھنی اور پڑھنی سیکھی ہے۔کوئی غلطی ہو تو معافی چاہتے ہیں۔ جناب ہم تو پاکستانی ہیں اپنی زبان یعنی اردو بول سکتے ہیں۔لیکن کسی نے ہم پر توجہ نہیں دی تھی کہ پڑھ اور لکھ بھی سکتے۔ جناب عالی! فرسٹ ٹائم خط لکھ رہا ہوں اور ایک غزل بھیج رہا ہوں امید کرتا ہوں کہ مایوس نہیں کریں گے۔یہاں ہانگ کانگ میں رسالے ملتے ہیں لیکن اتنی لیٹ کہ مہینہ ختم ہو رہا ہوتب۔ جناب دنیا میں کوئی نہیں سوائے رب کے اور ایک چھوٹے بھائی کے اور یہی سوچتا ہوں اس کو پڑھا لکھا کر ہانگ کانگ پولیس میں لگا دوں۔اپنی بھی یہی جاب ہے لیکن اب دل بھرنے لگا ہے ویسے بھی اللہ کا دیا ہوا سب کچھ ہے۔ جناب مجھے زیادہ لکھنا نہیں آتا تو بس یہیں خط ختم کر رہا ہوں۔

☆ خوش آمدید۔ محمد علی! بے شک اللہ کے سوا کوئی حامی اور مددگار نہیں۔پر دنیا اس دنیا کی بھی کچھ حقیقتیں ہیں اور ایک حقیقت یہ بھی ہے کہ آپ کا ہم سے رابطہ بنا رہے۔آپ کی غزل سخن آباد میں رونق افروز ہو رہی ہے۔اپنا بہت خیال رکھیے گا اس امید کے ساتھ کہ اللہ اور ہم آپ کے ساتھ ہیں۔

✉ پیر نوید شاہ ٹنڈو جام سے شامل احوال ہیں۔محترم مدیر ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' آداب عرض ہے امید

معزز لکھاریوں!

کچھ عرصہ قبل سے ''سچی کہانیاں'' کے متعدد لکھاری، اپنی کہانی دوسرے رسائل میں شائع کرانے کے بعد بھی ہمیں شائع شدہ کہانیاں ارسال کر دیتے ہیں۔ اُن سے گزارش ہے کہ آئندہ اس قسم کی حرکات سے اجتناب برتیں۔ ورنہ ادارہ انہیں کبھی بھی ''سچی کہانیاں'' کا حصہ بننے نہیں دے گا۔اور اس فعل کی سخت مذمت کی جائے گی۔

شکریہ

مینا تاج

ہے کے خیریت سے ہوں گے۔ (آمین) شمارہ نومبر 2014ء ہماری سالگرہ 28 نومبر کی پیشگی مبارکباد کی صورت میں 7 نومبر کو ٹنڈو جام پہنچا۔ دیر آید درست آید کی گردان کرتے ہوئے رزو تبدیل ہوتی ہوئی ملکی صورت حال کی سی تیز رفتاری سے مطالعہ کیا تا کہ شمارہ دسمبر کی آمد سے قبل تبصرہ تحریر کیا جا سکے۔ ''احوال'' اس مرتبہ احوال نہ تھا۔ بڑی حیرت ہوئی مبصرین کی تصاویر غائب، بے دردی سے 36 عدد خطوط کا قیمہ پیش کیا گیا۔ اگر یہ ستم ایوارڈ یافتگان کے باعث عارضی ہے تو گوارہ البتہ مستقل کریں گے تو سب مل کر دھرنا دیں گے۔ سوچ لیں! اس بار کئی مبصرین بھی غائب تھے۔ بشریٰ سعید، مریم شاہ، ملک عاشق حسین، تحسین جو نیجو کہاں ہو بھئی؟ چلیے آؤ بھائی عمران فائق، مور شاہد حسین، ممتاز احمد، فیصل ندیم، عادل حسین، منشی محمد عزیز اور اسامہ ندیم کے خطوط نے بہر حال کچھ ذائقہ ذہن بحال کیا۔ راقم کے اکھٹے خطوط شامل کیے گئے۔ شکریہ۔ کہانیوں میں اس بار پہلی سچ بیانی ''خواہشوں کے سراب'' سب پر سبقت لے گئی۔ محمد سلیم اختر کا اسلوب کن متاثر کن ہے۔ ''بابل کی پری'' بھی شاندار رہی۔ ''رستے زخم'' کی کیا بات ہے۔ ''یہی دنیا ہے'' مکافات عمل پر مبنی سبق آموز تحریر رہی رفعت محمود ''اک گناہ اور'' عابد علی سحر کی یہ کہانی بھی دل میں اتر گئی۔ ''محمد خان'' محمد اسد علی بھٹی کی ڈاکو محمد خان کی زندگی پر مبنی حقیقی داستان بہت معلوماتی ثابت ہوئی۔ مرد مجاہد، اعتراف، صلہ، ہمت کرے انسان تو، بے اثبات ہے زندگی، چشم آزار، اور منزل عشق کے راہی بھی علمی تسکین کا موثر ذریعہ ثابت ہوئیں جبکہ بہاریں روٹھ نہ جائیں، کیوں اعتبار نہ کیا، زندگی ٹھہر جا ذرا، بے وفا کون اور جفا کیسی قابل گزارہ کہہ سکتے ہیں۔ ''سخن آباد میں مور شاہد حسین، ایم حسن نظامی، نجیل متیلو اور پرنس تابش کے کلام متاثر کن رہے۔ شاہد رفیق کا انتخاب تیری آنکھوں کے دریا کا اترنا بھی ضروری تھا، تو ویسے ہی باکمال ہے۔ ''بمشکل'' کی قسط دوئم بھی بہترین رہی تمام ایوارڈ یافتگان کو میری جانب سے مبارکباد قبول ہو۔ براہ کرم مکمل تبصرہ شائع کیا جائے یہ بھی ایک تخلیقی عمل ہے سدا مسکراتے رہیں آمین۔

☆ پیر نوید شاہ! خط لکھنے کا شکریہ احوال تصاویر کے بنا شائع کرنا پرچے میں کچھ تبدیلی ضروری تھی۔ پلیز دھرنے کی بات نہ کریں، پرچے کو اس لفظ سے تو دور ہی رکھیں۔ رہی بات خطوط مکمل شائع کرنے کی تو آپ ان احوالیوں کا بھی تو خیال کریں جو احوال میں شرکت کے متمنی ہیں۔ ان کو بھی تو جگہ چاہیے نا پرچے کی پسندیدگی کا بہت شکریہ۔

✉ ریحانہ! شامل احوال ہیں، کاشی بھائی! السلام وعلیکم بہت ہی دکھ اور افسوس کے ساتھ لکھ رہی ہوں۔ 10 اکتوبر کو میرے پیارے بھائی اور مجھ سے بے حد زیادہ محبت کرنے والے میرے والد اس فانی دنیا سے کوچ کر گئے ہیں۔ میں ابھی تک صدمے سے باہر نہیں آ سکی ہوں والدہ تو پہلے ہی چلی گئی تھیں۔ میری تو جیسے دنیا ہی اندھیر ہو گئی ہے۔ وہ میرے لکھنے لکھانے سے بہت خوش ہوتے تھے۔ میرے لکھے ہوئے کی اصلاح کرتے تھے، اچھا لکھنے پر انعام بھی دیتے تھے۔ غلط لکھنے پر ڈانٹ بھی پڑتی تھی۔ اب تو کوئی ناخوش ہونے والا ہے نا کوئی ناراض ہونے والا ہے نہ کوئی اصلاح کرنے والا ہے۔ اب تو لے دے کے بس آپ ہی کا سہارا ہے ایک کہانی لکھ رہی تھی۔ مگر ابا کے انتقال کے بعد سے نا قلم اٹھانے کا دل چاہ رہا ہے۔ نا ہمت ہو رہی ہے۔ آپ کو اطلاع دینی ضروری تھی اس وجہ سے یہ خط لکھا ہے اتوار کو ابا کا چالیسواں ہے۔ اس کے بعد خود کو ذہنی طور پر دیکھوں گی۔ کہ کیا حالت ہے میرے لیے دعا کیجیے گا۔ اکتوبر کا شمارہ مجھے نہیں ملا میں نے بک اسٹال سے لے لیا میری کہانی ''قسمت کی دستک'' کو سب نے پسند کیا۔ آپ سب کا بے حد شکریہ اب انشاء اللہ اگلی دفعہ تبصرہ بھی لکھوں گی۔ بس میری ذہنی یکسوئی کی دعا کریں۔ میں اتنی جلدی

اپنے والد کو نہیں بھول سکتی۔ تمام اسٹاف کو سلام اللہ حافظ۔

☆ ریحانہ! حوصلہ رکھیں، اللہ آپ کے والدین کی مغفرت فرمائے یہ دنیا فانی ہے ہم سب کو ادث کر جانا ہے۔ ہم سب آپ کے غم میں شریک ہیں اللہ آپ کو صبر عطا فرمائے۔ ''آمین''!

✉ شمائلہ شہزاد! کوئٹہ سے شامل احوال ہیں، السلام و علیکم مینا تاج صاحبہ، نیا نیا یہ عہدہ بہت بہت مبارک ہو۔ کاشی چوہان صاحب بھی اچھے تھے، لیکن اتفاق سے ان کے ہوتے ہوئے کبھی کچھ لکھ نہ سکی، مگر آپ کے رسالے کی مستقل قاری ضرور ہوں۔ ایک ذرا سی گذارش ہے کہ ''اسلامی واقعات'' کو شامل اشاعت کرنے کی بھی کوشش کریں۔ کوئی سلسلہ ایسا بنائیں کہ ہر شمارے میں کوئی ایک واقعہ کہانی کی صورت میں شامل ہو۔ باقی رسالہ دیر سے ملنے کی وجہ سے سب کہانیوں پر تبصرہ ممکن نہیں ہاں ''ہمشکل'' زبردست ہے۔ خدا حافظ

☆ سدا خوش رہو شمائلہ! مبارک باد کا شکریہ انشاء اللہ تمہاری رائے پر بھی عمل شروع کیا جائے گا۔ غزل کے لیے ابھی تھوڑی محنت کرلو تو زیادہ اچھا ہے۔

✉ رمیز افغان! عیسیٰ خیل سے رونق افروز ہورہے ہیں۔ امید کرتا ہوں کہ تمام اسٹاف خیریت سے ہوں گے میری پہلی حاضری ہے۔ ''سچی کہانیاں'' ڈائجسٹ گھر لے کر آئے تو سب گھر والوں نے پڑھ کر کافی تعریفیں کی۔ جب میں نے پڑھا تو میں سچی کہانیاں ڈائجسٹ کا دیوانہ ہوگیا۔ تب سے میں ہر مہینے سچی کہانیاں ڈائجسٹ کا بڑی شدت سے انتظار کرتا ہوں اور جب ملتا ہے تو ہفتے کے اندر ہی پڑھ لیتا ہوں۔ دل میں ایک چھوٹی سی خواہش تھی کہ میں بھی خط لکھوں۔ اب نومبر کے شمارے پر مختصر سا تبصرہ کر لیتے ہیں۔ ڈائجسٹ کھولا تو منزہ سہام آپی کا ایک خوبصورت موضوع ''بچپن'' پڑھ کر بہت کچھ سیکھنے کو ملا۔ کاشی بھائی کی ''کچھ اپنی باتیں'' پڑھ کر یقین ہوگیا کہ محبت زندگی کا لازمی جز ہے اور کہانیاں تو ایک سے بڑھ کر ایک ہیں۔ سچ کہوں تو مجھے تمام کہانیاں بہت پسند آئیں۔ ہر رائٹر نے بھرپور محنت سے کام کیا۔ سخن آباد کا تو مزہ ہی کچھ اور ہے۔ تمام دوستوں کی غزلیں اور نظمیں بہت اچھی لگیں۔ اگلے ماہ انشاء اللہ بھرپور تبصرے کے ساتھ پھر خط بھیجوں گا۔ اللہ تعالیٰ ''سچی کہانیاں'' ڈائجسٹ کو دن دوگنی رات چوگنی ترقی عطا فرمائے آمین۔

☆ ''خوش آمدید'' رمیز! سدا خوش رہیے۔ احوال میں آپ کی آمد یقیناً خوش آئند ثابت ہوگی۔ آپ کے اگلے خط کا انتظار رہے گا۔

✉ سید مبارک شمسی! حاصل پور سے شامل محفل ہیں۔ محترمہ مینا تاج صاحبہ، السلام وعلیکم میری طرف سے محترم کاشی چوہان صاحب، محترم دانیال شمسی صاحب، آل ٹیم اور قارئین کو محبتوں بھرا سلام۔ میری دعا ہے کہ خالق اکبر ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' کی ٹیم اور اس سے جڑے ہر فرد کو خوش وخرم اور سلامت رکھے۔ (آمین) میں مشکور رہوں ان سب دوستوں کا جنھوں نے مجھ ناچیز کی اسٹوری کو پسند کرتے ہوئے مجھے فون کالز، میسجز اور ای میل اور فیکس کے ذریعے مبارک باد دی اور محترم کاشی چوہان صاحب کا مشکور ہوں جنہوں نے میری اسٹوری کو ''سچی کہانیاں'' کے صفحات کی زینت بنایا اور سچی کہانیاں سلسلہ احوال کی انچارج بننے پر محترمہ ''مینا تاج صاحبہ'' کو دل کی اتھاہ گہرائیوں سے مبارک باد پیش کرتا ہوں اور خوش آمدید کہتا ہوں۔ چار محرم الحرام کو حاصل پور جانا ہوا وہاں نیوز ایجنسی سے سچی کہانیاں خریدا۔ ٹائٹل پر خوبرو ماڈل کی تصویر بہت اچھی لگی، ورق گردانی کرتے کرتے اداریے والے صفحات تک جا پہنچا۔ جس پر مدیر اعلیٰ منزہ سہام نے ''بچپن'' کے حوالے سے بہت ہی خوبصورت انداز میں لکھا۔ کچھ اپنی باتیں سچی کہانیاں کے صفحہ

نمبر 9 پر کاشی چوہان کے قلم سے لکھی ہوئی تھیں۔ احوال میں صفدر علی حیدری، مجید احمد جائی، عمران فائق اٹک، ایم ارشد وفا، گوجرانوالہ، ایم اشفاق بٹ لالہ موسیٰ، منشی محمد عزیز لندن، سید انصیٰ نقوی گلبرگ لاہور، شاہ اشرف ایبٹ آباد، کنول عمران خان کراچی، عظمیٰ شکور سرگودھا، اور اسامہ ندیم کراچی کے خطوط بہت ہی اچھے اور خوبصورت تھے۔ بلا تاخیر میں محترم محمد سلیم اختر صاحب کو لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ ملنے پر اور تمام ایوارڈ یافتگان لکھاریوں کو ایوارڈ ملنے پر دل کی انتہاء سے مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ میری دعا ہے کہ اللہ تبارک تعالیٰ آپ سب پر علم کے مزید دروازے کھول دے محمد سلیم اختر کی ''خواہشوں کے سراب''، نجیل متیلو، شعبان کھوسہ، بابر نایاب، نسیم سکینہ صدف، رفعت محمود، ام منائل، عابد علی سحر، ممتاز احمد، ''رستے زخم''، ایم ارشد وفا، مومنہ بتول، سنبل، گل مینا خان کی تحریریں بہت اچھی لگیں اللہ کرے زور قلم اور زیادہ..... تحسین آباد شری نظمیں بہت پیاری تھیں۔ مبشر حسین آپ کیوں غائب ہیں؟ راحت امیر نیازی آپ سچی کہانیاں جوائن کریں۔ اعظم سہیل ہارون ایڈوکیٹ، ریاض سبائی لودھراں، ڈاکٹر فواد حسن، رخسانہ کوثر، حفیظ تبسم، طارق جاوید، اعجاز دانش، ڈاکٹر ناصر کو میری طرف سے سلام۔ اگلی ملاقات تک اجازت چاہوں گا اس دعا کے ساتھ کہ اللہ تبارک تعالیٰ ہم سب کو اپنے حفظ وامان میں رکھے۔

☆ خوش رہیے مبارک علی! مبارکباد کا شکریہ آپ کی اگلی تحریر کا انتظار ہے۔

✉ بشیر احمد بھٹی بہاول پور سے شامل احوال ہیں، جناب بہن مدیرہ مینا تاج صاحبہ السلام وعلیکم! نومبر کا سچی کہانیاں سامنے ہے۔ جس میں کاشی بھیا نے اعلان کر دیا ہے کہ دسمبر کے شمارے سے خطوط احوال کی کرسی پر مینا تاج صاحبہ براجمان ہوں گی۔ لہذا اب ظاہری بات ہے احوال خطوط آپ کے نام آئیں گے۔ سچی کہانیاں ہر ماہ نکھر رہا ہے۔ چشم بددور۔ یہ سب آپ کی محنتوں کا نتیجہ ہے۔ ''پُراسرار نمبر 3'' کا شدت سے انتظار ہے ہر شمارے میں مختصر کہانیاں بھی ہوتی ہیں یہ بڑی اچھی بات ہے۔ کہ قارئین کی پزیرائی تو کوئی آپ کے ادارے سے سیکھے۔ واہ کیا بات ہے؟ قارئین کی دلجوئی ہی کامیابی کا راز ہے۔ عوام کو کہانیاں اپنے نام سے شائع کروانے کا شغف ہوتا ہے۔ ہر انسان کی زندگی کے گزرے ہوئے واقعات بھی ہوتے ہیں۔ ، معاشرے میں بکھری ہوئی کہانیوں کا مزہ کچھ اور ہوتا ہے۔ اس سے ذائقہ تبدیل ہوتا رہتا ہے۔ شکریہ

☆ بشیر احمد بھٹی! خوش رہیے خط لکھنے کا اور پرچے کی پسندیدگی کا بے حد شکریہ۔

✉ حسن نظامی! پاک پتن سے شامل احوال ہیں، قابل قدر کاشی چوہان صاحب اور منزہ سہام صاحبہ سلام عقیدت جی..... کیسے کیسے مزاج ہیں.....؟ امید ہے کہ ''سچی کہانیاں'' کا پورا اسٹاف، قارئین، رائیٹر، اور شاعر حضرات سب ہی بخیریت ہوں گے۔ ''سچی کہانیاں'' جانے کب سے زیر مطالعہ ہے۔ اچھا اور معیاری، منفرد پرچہ ہے آپ لوگوں نے اپنی محنت اور انتھک کوششوں کے بل بوتے پر اسے آکاش میں پہنچا دیا ہے۔ رضوانہ کوثر، فرزانہ سہام مرزا، ایم اشفاق بٹ، نفیسہ سنبل، صفدر علی حیدری، محمد سلیم اختر، نسیم سکینہ صدف، رفعت محمود، شازیہ جاوید شازی، ایم اے راحت، کاشی چوہان، ایم اشفاق بٹ، رفعت سراج، سہام مرزا صاحب، مور شاہد حسین، اور فریدہ جاوید فری کے علاوہ کئی دوسرے دوست احباب اسے سجانے سنوارنے اور اپنی شاعری کے علاوہ دلنشوں کے لاتعداد موتی بکھیرنے میں دن رات کوشاں ہیں۔ ''احوال'' ''نہ جانے کب سے مجھے اپنی طرف کھینچتا ہوا محسوس ہوتا رہا ہے۔ یہ ایسا سلسلہ ہے جس سے ایک دوسرے میں محبت، خلوص، اور انسیت کے پاکیزہ اور لازوال رشتوں کی جانکاری ہوتی ہے اور ایک دوسرے کے دکھ سکھ کا بروقت پتا چلتا رہتا ہے۔ میری شاعری پسند کرنے اور اس کو قیمتی صفحات پہ سجانے کا بے حد شکریہ اور

ان بہن بھائیوں کا بھی شکریہ جنہوں نے میرے حقیر سے لفظوں کو پسند کیا ہے شکریہ۔
☆حسن نظامی! خوش رہیے۔ پرچے کی پسندیدگی کا شکریہ۔ آئندہ بھی اپنی رائے سے ہمیں باخبر رکھیے گا۔

✉ صغیر احمد! جہلم سے شامل احوال ہیں ڈیئر چوہان السلام وعلیکم خیریت موجود ہے عافیت مطلوب ہے۔ ماہ اکتوبر کے شمارے سے استفادہ حاصل نہیں ہوسکا۔ 4 اکتوبر کو راولپنڈی کے مختلف بک اسٹالوں سے پتہ کیا مگر نادستیاب تھا پھر 12 اکتوبر کو اپنے قریبی شہر لیہ سے پتا کیا مگر نومبر تک مجبوراً صبر کا دامن تھامنا پڑا۔ اور چپ سادھ لی اپنی غزل کی اشاعت پر خوشی ہوئی۔ تمام کہاری بہن بھائیوں نے قلمکاری میں بہت دیانت داری اور محنت دکھائی ہے۔ دیگر کہانیاں بھی کسی طرح کم نہیں تھیں ''خواہشوں کے سراب'' ''بابل کی پری'' ''مرد مجاہد'' ''کیوں اعتبار نہ کیا'' ''صلہ'' زبردست تحریر ہے۔ ''ہمت کرے انسان تو'' بہترین کاوش ہے۔ ''محمد خان'' ہماری دھرتی کا ایک ایسا کردار ہے، جو مدتوں یاد رکھا جائے گا۔ تمام رائٹر بشمول سلسلہ وار تحاریر کے خالق اپنے قلم اور قاری سے بھرپور انصاف کرتے نظر آرہے ہیں۔ خدا تعالیٰ میرے وطن کو ''سچی کہانیاں'' اس کے منتظمین وقارئین کو اپنی حفظ وامان کے سائے تلے رکھے آمین ثم آمین۔
☆صغیر احمد پرچے کی پسندیدگی کا شکریہ آئندہ بھی اپنی قیمتی مشورے سے نوازتے رہیے گا۔

✉ پیاری گڈی آپا! لاہور سے شامل احوال ہیں۔ ایڈیٹر محترمہ مینا تاج صاحبہ گڈی آپا! کا سلام قبول ہو امید ہے کہ آپ کا اور آپ کا پورا اسٹاف بخیریت ہوگا۔ ہم بھی اپنے خالق کی مہربانی سے بخیریت تمام ہیں۔ خوش آمدید۔ اکتوبر اور نومبر کا اعزازیہ ملا پاکر ازحد خوشی ہوئی..... تمام گلے جاتے رہے۔ سب سے زیادہ خوشی کہانی ''ہاف سیٹ'' پر ایوارڈ ملنے کی ہوئی اس پر سونے پہ سہاگہ کا کام نومبر میں رائٹر سرٹیفکیٹ بذریعہ ڈاک ملنے کی اطلاع نے کیا۔ اس خط میں ایڈیٹر کاشی چوہان کی تعریف نہ کرنا زیادتی ہوگی۔ بے شک وہ بہت ہی محنتی اور اچھے انسان ہیں اللہ ان کی عزت میں اور اضافہ کرے آمین۔ امید کرتی ہوں میری کہانیاں باری باری اپنی جگہ اور مقام پاتی رہیں گی۔ عنقریب ایک اور اچھی سی کہانی آپ کی نذر کروں گی جو انشاء اللہ آپ کو پسند آئے گی۔ امید ہے آپ بھی کاشی چوہان کی طرح خوب عزت کمارہی ہیں اور کمائیں گی۔ اور قارئین میں خلوص بانٹتی رہیں گی جس کی ہمارے معاشرے کو سخت ضرورت ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمارے ملک پر رحم فرمائے اور ترقی کے راستے پر گامزن کرے۔ آمین ثم آمین۔ دعاؤں اور نیک تمناؤں کے ساتھ ختم کرتی ہوں اللہ ہمارے ''سچی کہانیاں'' کو ترقی کے راستے پر گامزن رکھے۔ آمین آپ کی خیر اندیش گڈی آپا شاعرہ، مصنفہ، افسانہ نگار، ناول نگار ورائٹر ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' کراچی۔
☆اتنی ساری صلاحیتوں کی مالک گڈی آپا کو ہمارا سلام عرض ہے پرچے کی پسندیدگی اور دعاؤں کا بے حد شکریہ۔ بس اپنی تمام خوبیوں کے ساتھ ہم سے ہمیشہ رابطے بنائے رکھیے گا۔

✉ نفیسہ مغل! لکھتی ہیں عزیز بیٹے کاشی چوہان اللہ پاک آپ کو اور تمام اسٹاف کو صحت وزندگی کے ساتھ خوش رکھے ''آمین'' بیٹا آپ جس محنت اور لگن سے اپنی صلاحیتیں بروئے کار لارہے ہیں اس کے لیے میں آپ کو سلام پیش کرتی ہوں۔ اتنی کم عمری میں بڑی ذمہ داریاں نبھارہے ہو۔ اس میں منزہ بیٹی کی بہترین کاوش شامل ہے اللہ پاک منزہ بیٹی کو زندگی وصحت عطا فرمائیں اور زندگی کی تمام خوشیاں عطا فرمائے۔ آمین! کاشی بیٹا میری چار کہانیاں شاہ صاحب کے پاس تھیں ان کا کیا بنا؟ سنا ہے وہ تو چلے گئے، میں اپنے چھوٹے بیٹے ثاقب کے ساتھ حج پر گئی تھی۔ بیٹا ڈائجسٹ ''سچی کہانیاں'' تواتر سے مل رہا ہے

مگر میں ابھی پڑھ نہیں سکی صرف سرسری نظر ڈالی ہے۔ کیوں کہ میں کافی بیمار تھی۔ رائیٹرا یوارڈ کا سن کر خوشی ہوئی یہ ایک اچھا فیصلہ ہے۔ اس سے لکھاریوں کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے۔ یہ کہانی بھیج رہی ہوں عنوان ہے ''بیٹھے بیٹھے میری حاضری ہوگئی'' باخدا خواب میں بھی نہیں سوچا نہ تھا کہ ایک بے کس بیوہ حج بھی کر سکتی ہے۔ مگر میرا رب جسے چن لے صد شکر ہے اس ذات باری تعالیٰ کا جس نے یہ سعادت نصیب فرمائی۔ میرے بھانجے کا گیارہ سال قبل امریکہ میں قتل ہوگیا تھا اس کی برسی ہے 28 جنوری کو میری طرف سے تمام اسٹاف کو دعائیں وسلام منزہ بیٹی کو دعا۔

☆ نفیسہ آنٹی! خوش رہیے۔ اور اپنی خوبصورت دعاؤں سے ہمیں فیض یاب کرتی رہیں۔ اللہ آپ کے بھانجے کے درجات بلند فرمائے۔ ''آمین''۔

✉ یاسمین اقبال! لاہور سے احوال میں حاضر ہیں۔ محترم ایڈیٹر صاحب السلام وعلیکم، بہت سی دعائیں آپ سب کے لیے ''دوشیزہ'' اور ''سچی کہانیاں'' سے وابستگی تو برسوں پرانی ہے۔ ''دوشیزہ'' کے بعد ''سچی کہانیاں'' میں میرا یہ پہلا خط ہے۔ اکتوبر کے شمارے میں آپ نے میری نظم ''اک تیری کمی ہے'' لگائی ہے۔ جس کے لیے میں آپ کی بہت شکر گزار ہوں۔ مزید دو نظمیں لے کر حاضر خدمت ہوں کیوں کہ یہ حوصلہ آپ ہی کا بخشا ہوا ہے۔ ہمیشہ کی طرح یہ شمارہ بھی زبردست رہا تمام کہانیاں بہت ہی اچھی تھیں۔ شاعری تو ہماری فیورٹ ہے۔ ''سخن آباد'' میں شاہد رفیق علی کا مشہور زمانہ گیت تیری آنکھوں کے دریا کا اترنا بھی ضروری تھا لکھ دیا مگر شاید شاعر کا نام لکھنا غالباً یاد نہیں رہا۔ بہر حال ایم اشفاق بٹ، عنبرین نعیم، شاہد محمود مغل لکنی، شائستہ جمال، پرنس تابش اور عاشق حسین ساجد کی شاعری زبردست رہی۔ مومنہ بتول کی منزل عشق کے راہی زبردست تحریر تھی۔ میری جانب سے تمام اسٹاف کو بہت سلام ڈھیروں دعاؤں کے ساتھ اللہ نگہبان۔

☆ یاسمین اقبال! خوش آمدید۔ سدا خوش رہو۔ نئے سال کا تحفہ تمہاری شاعری سخن آباد میں لگا کر دے رہی ہوں۔

✉ مجید احمد جائی! ملتان سے احوال میں حاضر ہیں۔ مزاج بخیر سنایئے کیسے ہیں آپ سب؟ اللہ تعالیٰ سے بدست دعا گو کہ رب سوہنا اپنے کرم سے نوازے، ایمان کی سلامتی، صحت کی دولت ہمیشہ رہے۔ دیگر احوال یہ ہے کہ سرد ہوائیں، کالی سیاہ راتیں، عاشقوں کو تڑپانے چلی آئیں ہیں۔ اس سال میں ''سچی کہانیاں'' نے مجھے بہت کچھ دیا۔ عظیم محبت کرنے والے دوست پیارے سوہنے قارئین۔ عظیم تر ''سچی کہانیاں'' کی ٹیم جس نے ہر لمحہ، ہر پل محبتیں دیں۔ 2014ء میں سچی کہانیاں میں میری چھ کہانیاں شائع ہوئیں، آپ کی محبت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ میرے لیے یہی ایوارڈ ہے۔ قارئین، لکھاریوں کی مبارک باد کے نذرانے، مسکراتے لبوں سے پھول نچھاور ہوتے رہے ہیں۔ 2014ء جاتے جاتے بھی ایوارڈ دے گیا۔ ماہ دسمبر 2014 میں میری کہانی ''رحمانی برکات'' شائع ہوئی۔ میرے پاس الفاظ نہیں ہیں کہ میں ''سچی کہانیاں'' کا شکریہ ادا کر سکوں۔ ایک سال میں چھ کہانیاں شائع کر کے مجھے ایسے ایوارڈ سے نواز دیا جو تا زندگی یاد رہے گا۔ دوستوں میں عبدالعزیز جی آ، صفدر علی حیدری، مبارک شمسی، محمد عزیز مئے، صفدر اعوان اور ان جیسے ہزاروں کے نام لکھوں تو صفحات کم پڑ جائیں گے سب کا شکر گزار ہوں مقصود احمد بلوچ، اللہ دتہ مخلص، محمد سلیم اختر کا شکریہ جنھوں نے ہر پل ہر لمحہ میری رہنمائی کی، مجھے لکھنے کا حوصلہ دیا۔ سدرہ انور علی جھنگ جن کے تبصرے نس نس میں سما جاتے ہیں۔ شکریہ یہی دوست، قارئین، لکھاری میرے لیے سرمایہ

حیات ہیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ تو ہر چیز میں تبدیلیاں آتی رہتی ہیں۔ میں بھی ''سچی کہانیاں'' میں کچھ تبدیلیاں دیکھنا چاہتا ہوں 1) سچی کہانیاں میں جہاں بہت سارے سلسلے شامل ہیں وہاں حمد باری تعالیٰ، نعت رسول مقبول ﷺ نہ ہونا سمجھ سے بالاتر ہے۔ امید ہے میری کو سچی کہانیاں میں اسانی صفحہ حمد باری تعالیٰ، نعت رسول مقبول ﷺ کا آغاز کیا جائے گا۔ 2014ء میں سچی کہانیاں سے ایوارڈ حاصل کرنے والوں کو دل کی اتھاہ گہرائیوں سے مبارک باد دیتا ہوں۔ ڈھیروں دعاؤں اور نیک خواہشات کے ساتھ اللہ نگہبان۔

☆ مجید احمد جائی! سدا خوش و آباد رہیے بھیا۔ آپ کا خوبصورت خط نذر قارئین ہے۔ شکریہ کی ضرورت اس لیے نہیں ہے کہ ''سچی کہانیاں'' آپ لوگوں کا اپنا پرچہ ہے اپنوں کو اس میں جگہ دینے کا فرض ہم پورا کرتے ہیں

✉ شاہد رفیق! کبیر والا سے شامل احوال ہیں۔ السلام علیکم! مینا تاج صاحبہ اینڈ کاشی بھائی ماہ دسمبر کا شمارہ میرے ہاتھ میں ہے۔ ماشااللہ بہت اچھا ٹائٹل تھا کہانیوں میں میرے پیارے دوست مجید احمد جائی برکات رحمانی کی کیا بات تھی۔ جتنی تعریف کروں کم ہے ہمارے سینئر رائٹر سلیم اختر صاحب ''سانپوں کا باغ''، ''حوا کی بیٹیاں'' کیا بات ہے۔ سدرہ انور، آپ کی اسٹوری پڑھتے ہی مجھے ایک دلی سکون سا ہوا ''نرالی محبت'' فوزیہ نور بہت اچھی لگی۔ باقی بھی ایک سے بڑھ کر ایک تھی سخن آباد بھائی مقصود، احمد بلوچ کی غزل پڑھ کر دیوانہ ہو گیا اس کے بعد خط میں مجید احمد جائی، اشفاق بٹ، مقصود بلوچ، چشتیاں کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے میری غزل پڑھی اور جب آپ نے مجھ پر تنقید کی بہت خوشی ہوئی میں خوشی سے پھولے نہیں سما رہا۔ علی بھائی جب راحت خان کو کوئی اعتراض نہیں کوئی گلا۔ نہیں تو آپ کیوں ٹینشن لے رہے ہو، خوش رہا کرو رنگ کالا ہو جاتا ہے۔ آخر میں سچی کہانیاں کی ایڈیٹر کو بہت سلام اور ہر وقت دعا گو۔ سچی کہانیاں کا کارواں چلتا رہے۔

☆ شاہد رفیق! خوش رہیے پرچے کی پسندیدگی کا بے حد شکریہ بس آپ اپنی آراء سے ہمیں نوازتے رہیے گا۔

✉ ارم خان ڈیرہ غازی خان سے احوال کی ساتھی بن رہی ہیں۔ السلام علیکم ڈیئر آپی مینا تاج اور سلام احوال کی محفل کو۔ امید ہے کہ سب خیریت سے ہوں گے۔ آپی جی بہت شکریہ آپ نے میری غزل کو سخن آباد میں جگہ دی۔ اور خط احوال کی محفل میں شامل کیا۔ اس بار کا پراسرار نمبر زبردست رہا۔ سب سے پہلے سلسلے وار کہانیاں پڑھیں۔ اس کے بعد سانپوں والا باغ، آسیبی چکر، ایک غلطی، وہ مہرباں، اور اتنا پڑھنے کے بعد سخن آباد کی طرف دوڑ لگائی۔ ارے اس بار تو سب نے اتنی پیاری شاعری کی کہ بار بار پڑھ ڈالا میں نے اس بار ایک غزل بھی ایسی نہیں تھی جو پسند نہ آئی ہو۔ آپی جی ایک کہانی اور ایک غزل بھیج رہی ہوں۔ پلیز میری کہانی کو جگہ ضرور دیجئے گا پلیز آپی جی اس بار مجھے کہانیوں میں جگہ ضرور چاہیے۔ جو کہانی میں بھیج رہی ہوں بالکل سچی ہے اب اجازت اس دعا کے ساتھ کہ یہ سال سب کی خوشیوں کا سال ہو۔ اے اللہ ہمیں ہر غلط راستے سے بچا۔ ہماری غلطیوں کو معاف فرما اور آنے والا ہر وقت بہتر بنا دے۔ اس سال کو ہماری خوشیوں کا سال بنا دے۔ آمین۔

☆ ڈیئر ارم! آپی بھی کہہ رہی ہو اور شکریہ بھی ادا کر رہی ہو بات کچھ جچی نہیں یہ ہم سب کا پرچہ ہے اسے ہم نے مل کر سجانا ہوتا ہے سمجھ آئی بات؟

سہیل خان کورنگی سے شامل احوال ہیں جناب کاشی بھائی السلام علیکم! صدا خوش رہو بعد دعا کے آپ اور آپ کی ٹیم خیریت سے ہوگی۔ کاشی بھائی میں تین چار مہینوں سے بیمار تھا میری طبیعت اس قابل نہیں تھی کہ میں خط کے ذریعے آپ سے مخاطب ہوتا مگر سچی کہانیاں پابندی سے آتا رہا۔ کیوں کہ مجھ سے زیادہ میری بیگم سچی کہانیاں کی دیوانی ہے جیسے ہی دسمبر 2014 کا ڈائجسٹ پر اسرار نمبر میرے ہاتھ میں آیا تو اسے دیکھ کر اور پڑھ کہ قلم خود با خود لکھنے کو اٹھ گیا اور خاص طور پر آپ کی لکھی ہوئی (کچھ اپنی باتیں) میں مٹی کی جس طرح آپ نے تعریف کی ہے اور حقیقت بیان کی ہے تو یقین مانیئے سمجھنے کو مل گیا۔ میں سچی کہانیاں کی پوری ٹیم اور سرپرست کے لیے دل کی گہرائیوں سے دعا گو ہوں کہ اللہ آپ سب لوگوں کو صحت اور تندرستی عطا فرمائیں اور جاتا ہوا سال آپ لوگوں کے لیے اور آپ کے اس ڈائجسٹ کو دن دگنی رات چگنی ترقی عطا فرمائے اور آنے والا سال 2015 آپ کی زندگیوں میں خوشیاں بکھیر دے۔ آپ سب لوگ یونہی ہنستے مسکراتے رہیں (آمین) (ثمہ آمین) اور آپ کے صدقے میں اللہ مجھے بھی خوش رکھے اور مجھے صحت اور تندرستی عطا فرمائیں۔

☆ خوش رہیے سہیل خان! پرچے سے وابستگی کا بے حد شکریہ۔

منشی محمد عزیز میے وہاڑی سے شامل احوال بخش رہے ہیں۔ محترمہ مینا تاج صاحبہ! السلام وعلیکم اگر چہ یہ ہمارا پہلا قلمی رابطہ ہے لیکن پھر بھی مجھے آپ بالکل اجنبی نہیں لگ رہی ہیں۔ بلکہ سچی کہانیاں کی نسبت سے ہمارا اخلوص اور محبت کا رشتہ پرانا ہے۔ میرا نام اگر آپ کے لیے اجنبی ہو تو بتادوں کہ میں بڑے پرانے ساتھیوں میں سے ہوں اور میرا مکمل تعارف جنوری 1999 کے سچی کہانیاں میں شائع ہوا تھا۔ بارہ عدد کہانیاں پہلے اور تین اسی سال 2014 میں شائع ہو چکی ہیں اور یہ سب سچی کہانیاں والوں کی مہربانی ہے ورنہ میں کیا اور میری بساط کیا؟ میرے ٹوٹے ہوئے الفاظ کا بھرم آپ لوگ رکھتے ہیں اور مجھے آپ لوگوں کی ان بے پایاں محبتوں اور عنایتوں کا احساس ہے۔ آپ لوگوں نے میری کہانی ''تریا چلتر'' کو ایوارڈ کے لیے منتخب کیا بہت مشکور ہوں۔ اللہ آپ سب لوگوں کو ہمیشہ شاد و آباد، حفظ وامان میں رکھے (آمین)

29 نومبر کو کسی کام سے ڈاک خانے گیا تھا تو سچی کہانیاں بھی آچکا تھا بہت ہی اچھا سرورق تھا۔ محترمہ منزہ سہام مرزا صاحبہ کا اداریہ میں زندہ جلادینے والی سچی خاندان سے متعلق تھا۔ چونکہ آپ کے ساتھ پہلا رابطہ ہے اس لیے میں نے ''خالی ہاتھ'' آنا گوارہ نہیں کیا بلکہ ایک کہانی اور میرے دوست کرن کی دو غزلیں حاضر خدمت ہیں۔ جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے۔ سخن اباد میں ثانیہ ثانی، مون شاہ، شہزاد علی اور جمالی صاحب کی شاعری پسند آئی۔ کہانیوں میں مجید احمد جائی آیت الکرسی کی فضیلت بیان کر رہے تھے۔ میرا یہ معمول ہے کہ میں صبح فجر کے بعد چار مرتبہ آیت الکرسی پڑھ کر اپنی تمام چیزوں کو اللہ تعالیٰ کے حفظ وامان میں دے دیتا ہوں۔۔ جہانگیر کی وہ رات بھی ڈراؤنی تھی۔ فوزیہ نور، عظمیٰ شکور اور فرخندہ بتول کی کہانیاں انسان اور جنات کے عشق سے متعلق تھیں۔ احسان عمرزئی کی جادو اور غلام رسول گل کی کالا جادو کچھ ادھوری سی لگی ہیں سید محمود حسین کی چھلاوا گراؤنڈ پڑھ کر مجھے اپنے نانا جان کی سنائی ہوئی آپ بیتی یاد آ گئی۔ میرے نانا جان مرحوم نے بھی ایک بار جنگل سے ''بکری کا بچہ'' اٹھایا تھا جو کہ خود تو ان کی بغل میں رہا، مگر اس کی ٹانگیں لمبی ہو کر زمین سے گھسٹتی چلی گئیں۔ میرے نانا مرحوم ایک چرواہا تھے ان کی ڈھیر ساری بکریاں تھیں ان دنوں آبادی کم اور جنگلات زیادہ ہوا کرتے تھے اور نانا مرحوم کے ساتھ تو کئی دفعہ چھلاوا کی مڈبھیڑ ہوتی رہتی تھی۔ انور علی کی ''حوا کی بیٹیاں'' پڑھ کر بے اختیار استغفر اللہ پڑھنے لگا۔ مہر پرویز

احمد، مور شاہد حسین، ممتاز احمد کی تحریر زبردست تھی۔ احوال کا پہلا خط ہمارے سینئر اور مستند لکھاری جناب سلیم اختر کا تھا ان کے خط میں اپنا نام دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ شکریہ سلیم اختر صاحب کہ آپ نے میرا نام بھی یاد رکھا۔ بلوچستان کے دوستوں کا جذبہ اور محنت قابل تعریف ہے۔ جو کہ خودغرضی کے اس دور میں بھی محبتوں کو عام کرنے کا مشن لے کر اپنے دوستوں کو اپنے ساتھ شامل کررہے ہیں اور پرل پبلیکیشز کے علاوہ شاد پندرانی، صاحب جمالی، ساحل ابڑو، آپ لوگ مبارک باد کے مستحق ہیں۔ سو قبول کیجیے مبارک باد اور محبتیں پھیلانے کا یہ مشن جاری رکھیے گا۔ اللہ آپ کا حامی و ناصر ہو۔ بہت شکریہ ممتاز احمد! ادھر سرگودھا میں ہمارے دوست رہتے ہیں اگر آپ کا تفصیلی ایڈریس ہوتا تو شاید آپ سے ملاقات بھی ہو جاتی۔ جھنگ جانے کا بھی موڈ تو بن بھی رہا ہے۔ جن دوستوں نے ایوارڈ کے لیے مبارک باد پیش کی، ان سب کا بے حد شکریہ۔ مینا تاج جی خط کافی لمبا ہو گیا ہے۔ اللہ حافظ میں جارہا ہوں لیکن یہ شعر میری طرف سے کسی کو سنا دیجیے گا۔

اشعار کے پردے میں ہم جن سے مخاطب ہیں
وہ جان گئے ہوں گے کیوں نام لیا جائے

☆منشی محمد عزیز! آباد رہیے۔ آپ کا نام ہرگز میرے لیے نیا نہیں ہے۔ کہانی لکھنا آپ کا فرض ہے تو اسے شائع کرنے کا فرض ہم نے نبھانا ہے۔ بس آئندہ بھی ہم سے ناتہ اسی اپنائیت سے قائم رکھیے۔

✉ محمد اسماعیل بروہی نواب شاہ سے لکھتے ہیں۔ میڈم مینا تاج صاحبہ ہم آپ کو دل سے خوش آمدید کہتے ہیں۔ دسمبر کا پراسرار نمبر ہاتھوں میں ہے ماڈل کے گلے میں بڑے بڑے منکوں والی مالا اور اس کی پر اسرار آنکھیں واہ جی واہ۔ منزہ کا اداریہ ''میں شرمندہ ہوں پڑھا'' پر کیا لکھوں کاشی کی باتیں پسند آئیں۔ ایک شکایت ہے۔ میڈم مینا تاج کاشی بھائی اور منزہ آپی سے کہ میری کہانی ابھی تک شامل نہیں ہوئی آخر کیوں؟ پلیز ہمیں بھی نمبر دیجیے کیوں کہ سچی کہانیاں بڑے اور نئے رائٹر کا پرچہ ہے۔ مجھے انتظار کی سولی سے بچایئے۔ احوال میں اس بار بلوچستان سے آنے والے خطوط کی بھر مار تھی ان کے خط پڑھ کے اچھا لگا مور شاہد بھائی آپ کیسے ہو؟ سدرہ بہن کو بھائی کا سلام۔ مقصود احمد آپ کے خط میں اپنا نام پا کر دلی خوشی ہوئی۔ شکریہ...... مسز نوید ہاشمی کیسی ہو؟ عائشہ نور، حمیرہ جمیل اور عائشہ سلیم کو ویلکم کہتے ہیں۔ ایس ایم ایس میں ایک نام دیکھا نذیر علی نواب شاہ سے...... نذیر صاحب ایس ایم ایس کیوں خط کے ذریعے شامل ہو جاؤ میں بھی نواب شاہ کا ہوں۔ اب آتے ہیں کہانیوں کی طرف انکل سلیم اختر کی کہانی تو نمبرون ہے۔ رضوان قیوم کی اک غلطی بھی اچھی تھی ممتاز احمد اور مور شاہد نے بھی اسرار سے بھری کہانی پڑھنے کو دیں۔ سدرہ انور، کنول عمران خان، عظمیٰ شکور، غلام رسول گل نے بھی بہترین کہانیاں لکھیں، ایم اے راحت کی ہم شکل کی تو کیا بات ہے ناگن بھی بہترین جارہی ہے۔ فیض عشق بھی پسند آیا۔ سب رائٹر کو ایوارڈ مبارک ہو اور اب اجازت۔

☆اسماعیل بروہی! خط لکھنے کا شکریہ۔ انشاء اللہ جلد آپ کی کہانی نذر قارئین ہوگی۔

✉ مس غزالہ کرن! فیصل آباد سے شامل احوال ہیں ڈیئر مینا تاج ایڈیٹر سچی کہانیاں السلام علیکم! میں سچی کہانیاں کی پرانی قاری ہوں۔ مگر پہلی بار احوال میں شامل ہو رہی ہوں۔ کچھ باتوں نے مجھے خط لکھنے پر مجبور کیا ہے۔ اگر یہ واقعی سچی کہانیوں پر مشتمل ڈائجسٹ ہے تو پھر مجھے امید ہے کہ میرا خط ضرور شائع ہوگا۔ کانٹ چھانٹ کے بغیر، بات یہ ہے کہ احوال ایک بہت خوبصورت سلسلہ ہے مگر پچھلے چند مہینوں سے

سانحۂ ارتحال

ہماری دیرینہ دوست اور لکھاری ''رضوانہ پرنس'' کی والدہ شدید علالت کے بعد لندن میں اپنے خالق حقیقی سے جاملی ہیں۔ دکھ کی اس گھڑی میں ادارہ پرل پبلی کیشنز ان کے دکھ میں برابر کا شریک ہے۔ اللہ رب العزت مرحومہ کی مغفرت فرمائے اور ان کے درجات بلند فرمائے (آمین)

اسے کسی ریاست یا سلطنت کا دربار بنا دیا گیا ہے۔ نام نہاد القابات اور خطابات میں چاپلوسی اور خوش آمد کا آمیزہ شامل کر کے کسی کو ''ملکہ'' کسی کو ''شہنشاہ'' اور کسی کو شہزادہ عالم کے القابات نوازے جارہے ہیں تو کیا باقی احوالی ان کے درباری، خادم، خادمائیں ہیں؟ کچھ تو خدا کا خوف کریں۔ اگر القاب ہی دینے ہیں تو پھر میں بھی سدرہ انور علی کو ملکہ چاپلوس کا خطاب دیتی ہوں کیوں کہ ڈھٹائی کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ کچھ ماہ پہلے ریحانہ نعیم نے اس پر تھوڑا احتجاج کیا تھا۔ تو موصوفہ سدرہ نے بجائے اپنی اصلاح کے بے شرمی اور ہٹ دھرمی سے زیادہ زور و شور سے خطابات دینے کا سلسلہ شروع کر دیا۔ اور کہتی ہے ''مجھے کسی کی کوئی پرواہ نہیں۔'' چاہیے تو یہ احوال میں کہانیوں پر زیادہ سے زیادہ تبصرہ کیا جائے۔ ان کی خوبی خامیوں کو اجاگر کیا جائے۔ تاکہ لکھاری خوب سے خوب تر اور بہتر لکھیں۔ ایک اور موصوف ملک صفدر اپنے خطوط میں کبھی ''کڑاہی گوشت'' کبھی ''بریانی'' اور کبھی ''مرغ مسلم'' کا تذکرہ کرتے ہیں۔ لگتا ہے کہ موصوف کے پاس نئے نئے پیسے آئے ہیں۔ جو آئے دن گھٹیا پن اور چھچھورا پن کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ یاد رکھیے یہ ایک قلم قبیلے کی ادبی دنیا ہے نا کہ کوئی دربار یا ہوٹل ہے۔ اکتوبر میں شائع ہونے والی ملک صفدر کی کہانی ''دیر لگی آنے میں'' کسی اور ڈائجسٹ کی اسٹوری چرا کر اور ایک اور ٹی وی ڈرامے کی نقل کر کے بھی لکھی تھی جو کہ نہایت شرم ناک بات ہے۔ تو پلیز سچی کہانیاں کا معیار خراب نہ کریں میری باتیں بری لگیں تو معذرت مگر یہ کڑوی گولیاں ضرور نگل لیں جلدی آرام آجائے گا (شکریہ)

☆ غزالہ جی! خوش رہیے خط لکھنے کا شکریہ بالکل ''سچی کہانیاں'' آپ سب کا اپنا پرچہ ہے، آپ کی تجاویز قابل قدر ہیں۔ آپ کا خط بغیر کانٹ چھانٹ کے شامل احوال ہے۔

✉ فریدہ جاوید فری لاہور سے شامل احوال ہیں محترم کاشی چوہان اینڈ پیاری منزہ جی، السلام وعلیکم! سچی کہانیاں اپنی آب و تاب سے 28 تاریخ کو ملا اس کی کہانیاں پڑھ کر تو سرور آجاتا ہے۔ سب ہی بہت اچھا لکھتے رہے ہیں۔ ہمیں افسانے زیادہ تر متاثر نہیں کرتے پڑھ کر احساس ہوتا ہے۔ یہ سب جھوٹ ہے مگر کئی سبق آموز بھی ہوتے ہیں۔ مگر کہانیاں زیادہ پسند ہیں۔ اسی لیے تو سچی کہانیاں کا اپنا ہی منفرد انداز ہے۔ اس میں مقصود احمد اور ایم اشفاق بٹ کو خوش آمدید وہ بہت ہی اچھا لکھ رہے ہیں اور جناب سلیم اختر صاحب کی کہانیاں متاثر کرتی ہیں۔ ''میں شرمندہ ہوں'' منزہ جی نے بہت اچھا لکھا۔ سب سے پہلے ہم اپنے بھائی راحت صاحب کا ''ہمشکل'' پڑھتے ہیں۔ ان کے ناول کی تو کیا بات ہے۔ وہ مہرباں، حوا کی بیٹیاں، ایک غلطی، سودائی میرا، ماں جایا، نرالی چاہت سلیم اختر صاحب کی سانپوں والا باغ سب بہترین تحریریں تھیں۔ کاشی بھائی ہمیں کھاریاں سے کاروان ادب سلو کی جو بھی عبدالحلیم شرر ایوارڈ ملا جو کہ منیر طور

صاحب کی تقریب میں پہلا ایوارڈ تھا۔ اس طرح یہ ہمارا ساتواں ایوارڈ تھا۔ اللہ حافظ۔

☆ فریدہ جاوید خوش رہیے آپ کا خط شامل احوال ہے۔ کہانیوں پر تبصرے آئندہ بھی جاری رکھیے گا شکریہ۔

✉ عبدالوحید مزاج میانوالی سے شامل احوال ہیں۔ السلام وعلیکم منزہ سہام صاحبہ ماہنامہ سچی کہانیاں، دوشیزہ کراچی میرا نام عبدالوحید ہے۔ مختلف اخبارات اور رسائل کے لیے لکھ رہا ہوں مجھے لکھنے کا بہت شوق ہے اور وہ بھی تحقیقی مضامین کے بارے میں لکھو تو اطمینان سا ہوتا ہے۔ منزہ سہام صاحبہ چاہے کچھ بھی ہو جس رسالے کے لیے بھی لکھوں میں آپ کے بچوں کے رسالہ ''ماہنامہ بچوں کا رسالہ'' کراچی کو میں کبھی بھی فراموش نہیں کر سکتا۔ جس نے میری ہمت افزائی کی، مجھے شوق دیا، اور میرے جنون میں اضافہ کیا تو خوشی سے میرے آنسو نکل آئے تھے۔ وہ منظر آج بھی مجھے کل کی طرح یاد ہے۔ مگر اس دوران 27 برس کا عرصہ بیت گیا ہے اس وقت میری عمر 14 برس تھی اور آج 37 برس ہے۔

☆ عبدالوحید آپ کا خط شامل احوال ہے۔ کہانی اگر قابل اشاعت ہوگی تو اسے ضرور جگہ دی جائے گی۔

✉ ساحل ابڑو بلوچستان سے شامل احوال ہیں، قابل احترام مینا تاج صاحبہ ہمیشہ مسکراتی رہیں اور ادبی گیت گنگناتی رہو۔ السلام علیکم! عرض ہے کہ ماہ دسمبر شمارہ سچی کہانیاں میرے ہاتھوں میں ہے۔ ورق گردانی شروع کی تو احوال میں باجی آپ کو پا کر بہت خوشی ہوئی کہ آپ رائٹر کی حیثیت سے سفر کرتی ہوئی یہاں تک پہنچی تو باجی مجھ ناچیز کی طرف سے آپ کو مبارکباد ہو۔ اور امید ہے آپ کی ادبی محبت سے سچی کہانیاں کو چار چاند لگ جائیگا۔ جس کا ثبوت سے دسمبر کا شمارہ جو ہمارے لیے بہترین شمارہ ثابت ہوا۔ میں ان تمام دوستوں کا بھی شکریہ ادا کروں گا جنہوں نے سچی کہانیاں کے تعارفی پروگرام کو رونق بخشی اور خوب کوریج دی۔ جس میں خاص کر گلزار وفا علی دوست بلگٹی، عمارہ جمیل، آپ سب کا ادبی تعاون میرے لیے حکم کا درجہ رکھتا ہے۔ باجی آپ کی خدمت میں ایک کہانی (تشنہ لب) ارسال کی تھی جو آپ کے پاس موجود ہے۔ اور ایک چھوٹی سی کہانی (رائیگاں ہے زندگی) ارسال خدمت ہے۔ آپ اسے پڑھ کر فیصلہ کریں اگر سچی کہانی کے معیار پر اتریں تو قریبی اشاعت میں ضرور جگہ دینا۔ ورنہ آپ کو پورا حق ہے اسے ردی ٹوکری میں پھینک دینا۔ وقت کی کمی کی وجہ سے تمام کہانیوں پر تبصرہ نہ کر سکا معذرت خواہ ہوں۔

☆ ساحل ابڑو خوش رہیے۔ آپ کی کہانی ماہ جنوری کی زینت بن رہی ہے، اور آئندہ بھی انشاء اللہ سلسلہ بنا رہے گا اگر آپ پھر بھی ناراض ہوں تو ''کیا عرض کر سکتے ہیں۔''

✉ کنول عمران خان، کراچی سے شامل احوال ہیں۔ پیاری بہن مینا جی! السلام وعلیکم کیسی ہیں آپ اور تمام اسٹاف کیسا جا رہا ہے آپ کا نیا سفر، اللہ تعالیٰ آپ کو ہر قدم پر کامیابی عطا فرمائے۔ (آمین) اور تمام قارئین کو سلام عرض ہے کیسے ہیں جی سب۔ مینا جی سب سے پہلے میں آپ کا شکریہ ادا کرنا چاہوں گی اور کاشی بھائی کا جو میری کہانی پراسرار نمبر کے لیے بھیجی تھی وہ پراسرار نمبر 3 میں شائع کر دی۔ بہت نوازش ویسے سچی بات بتاؤں مجھے تو یقین ہی نہیں تھا کہ اس بار بھی میری کہانی آئے گی۔ مگر آپ نے میرا دل خوش کر دیا شکریہ جی۔ سلیم انکل آپ نے میرے تبصرے کو سراہا شکریہ آپ جیسے بڑے رائٹر کا ہمارے تبصرے کو سراہنا بہت بڑی بات ہے۔ آپ کی کہانیاں تو ٹاپ کلاس ہوتی ہیں پلیز ہماری کہانیوں پر بھی تبصرہ کر کے ہمیں بھی رہنمائی دیا کریں۔ سدرہ جی میں بھی ٹھیک ہوں آپ اپنی سناؤ۔ چلیں اب کہانیوں کی طرف آتے

سانحۂ ارتحال

''ٹین ایجز'' میگزین کی روح رواں ''مسز احمد'' کے صاحبزادے کے انتقال پر ہم اُن کے دکھ میں شریک ہیں۔ اللہ رب العزت اُن کے صاحبزادے کی مغفرت فرمائے اور اُن کے درجات بلند فرمائے (آمین) اور اُن کے سوگواران کو صبر جمیل عطا فرمائے (آمین)

ہیں۔ سب سے پہلے تو سرورق بالکل بھی خوفناک نہ تھا۔ اس بار ''سانپوں والا باغ'' بلا شبہ زبردست تھی۔ ''بنگلہ نمبر 36.D'' اچھی تحریر تھی۔ ''آسیبی چکر'' ''مرشد'' اچھی تھیں۔ ''ایک غلطی'' بہت اچھی لگی ہیں۔ ''بہن بھائی'' ''آئیڈیل'' ''وہ مہربان سلسلہ وار کہانیوں میں تو سب سے پہلے ٹاپ پر ''ناگن'' ہے۔ زبردست شاہد بھائی کی مانو یا نہ مانو اچھی لگی۔ ''حوا کی بیٹیاں'' سدرہ کی تحریر اچھی لگی۔ ''چھلاوہ گراونڈ'' ''وہ کون تھے'' ''وہ رات'' بہت پسند آئی۔ جبکہ ''جادو'' ''طلسمی محبت'' ''کالا جادو'' اتنی اثر انگیز نہ لگیں۔ سلسلہ وار کہانیوں میں ''ناگن'' اور ''ہمشکل'' ہی میں پہلے پڑھتی ہوں۔ واہ، کیا بات ہے شمارہ زبردست ہے اللہ اسے اور ترقی دے۔ (آمین) اب اجازت دیں۔ پھر ملاقات ہوگی۔ اللہ حافظ۔

☆ کنول عمران! خوش رہو۔ تمہارا منصل خط شامل احوال ہے۔ آئندہ بھی اپنی آراء سے ہمیں آگاہ کرتی رہنا۔

✉ تحسین جونیجو خیر پور ناتھن شاہ سے احوال میں حاضر ہیں۔ سویٹ ڈیئر مینا تاج جی اور تمام قارئین کی خدمت میں سلام محبت۔ اللہ پاک آپ سب کی جھولی میں خوشیوں کی چادر میں لپٹی چاہت ومحبت سے لبریز رنگ برنگے، پھول نچھاور کرے (آمین) اس دعا کے ساتھ ہی نیا آنے والا سال بھی مبارک ہو۔ رواں سال کے اختتام پر اداریہ ''میں شرمندہ ہوں'' بھی سوگوار کر گیا۔ آخرات کے اذیت ناک امتحان کے بعد پھر نئی نویلی روپہلی صبح کی کرن نمودار ہوگی جو ہر چیز روشن کر دے گی۔ اللہ پاک رحم وکرم فرمائے ہم سب پر (آمین ثم آمین)۔ ''کچھ اپنی باتیں'' میں کاشی بھیا نے ایک اہم پوائنٹ کو قلم بند کیا ماشاء اللہ احوال میں رونق لگی ہوئی ہے۔ جو انشاء اللہ عزوجل قائم رہے گی۔ سلیم اختر انکل اور سدرہ انور علی کو ایوارڈ حاصل کرنے کی مبارک باد۔ محمد یوسف لغاری بھائی شکریہ اور بزم احوال میں خوش آمدید۔ مور شاہد حسین بھائی اب کی بار حاضری نہیں لگوائی خیریت؟ پیاری سدرہ انور علی علیکم السلام۔ شائستہ جمال جی ہم حاضر ہیں آپ سناؤ کیا کر رہی ہیں آج کل؟ بہترین کہانیوں میں آئیڈیل علی رضا عمرانی ''مانو یا نہ مانو'' مور شاہد صاحب ''حوا کی بیٹیاں'' سدرہ انور ''کالا جادو'' غلام رسول گل رہی۔ باقی کہانیاں پڑھنے کا وقت مل نہیں سکا۔ بس ہمیشہ سے ہی بھاگ دوڑ میں احوال تک پہنچ پائی ہوں۔ باجی سب اچھا ہی اچھا ہے اور رہے گا۔ خوش رہیے خوشیاں بانٹیں، خوشیوں کے سنگ۔

☆ تحسین جونیجو! بہت خوش رہیے اور اپنی آمد سے احوال کو رونق بخشتی رہیے۔ کہانیوں پر تبصرے کا شکریہ!

✉ کاشف عبید بٹ موڑی بنگرام سے شامل احوال ہیں قابل احترام کاشی چوہان، دانیال شمسی اور مینا

تاج صاحبہ السلام وعلیکم! امید ہے اسٹاف خیریت سے ہوگا اور قارئین بھی امن میں ہوں گے۔ دسمبر یعنی سال کا آخری شمارہ 1 تاریخ کو ہی بیڈ کے سائیڈ پر چمکتا دمکتا ہوا پایا۔ پرچہ دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی میں بیان نہیں کرسکتا۔ اداریہ منزہ جی نے خوب لکھا واقعی اس طرح ہم شریف لوگ بھی شرمندہ ہیں۔ اب انتظار ہے ہمیں کاشی چوہان کی کہانی ''زہر عشق'' کا کہ کب صفحہ قرطاس پہ آئے گی لیکن اس کے ساتھ ساتھ ''سفرنامہ محمود شام'' کا بھی انتظار ہے۔ خطوط میں سب قارئین نے خوب لکھا۔ کسی نے شکایت تو کسی نے محبت بکھیری خطوط کے بعد سخن آباد محفل میں پہنچا۔ اس میں بھی سب ہی شاعروں نے اپنے فن کا لوہا منوایا۔ ''مسئلہ یہ ہے'' میں بہت پریشان لوگوں نے خطوط لکھے، خدا کرے سب کے مسئلے حل ہو جائیں۔ (آمین) ایم اے راحت کی ''ہمشکل'' خوب جارہی ہے۔ ایم اے راحت میرا پسندیدہ مصنف ہے اس بار صرف اتنا ہی پڑھ پایا ہوں کیوں کہ وقت نہیں تھا۔ فیض عشق کو جلدی سے ختم کریں مجھے پسند نہیں ہے زیادہ۔ امید ہے پراسرار نمبر 3 زیادہ اچھا ہوگا جیسے ہی خط پوسٹ ہوگا تو پڑھنے بیٹھ جاؤں گا۔ ایک ناول تو میں نے بھی شروع کیا ہے پتا نہیں مکمل ہوگا بھی یا نہیں جب میں لکھوں گا تو آپ کو خبر ہوجائے گی۔ گزارش ہے کہ فروری 2015 کا شمارہ ''عشق نمبر'' کرلیں میرے خیال سے سب کو یہ تجویز پسند آئے گی۔ آخر میں سب قارئین اسٹاف اور تمام پاکستان کو نیا سال بہت مبارک ہو اب تک کے لیے اتنا ہی اگر زندگی رہی تو اگلے ماہ حاضری دوں گا......!

☆ کاشف عبید! خوش رہیے۔ آپ کا خط شامل احوال ہے بس ہمیشہ اسی اپنائیت سے ہم سے ناتہ قائم رکھیے۔

✉ سدرہ علی انور جھنگ سے احوال میں حاضری دے رہی ہیں۔ عزیز از جان سسٹر بینا تاج، ڈیئر ایڈیٹرز، رائٹر اینڈ آل اسٹاف السلام وعلیکم! دعا گو ہوں کہ رب ذوالجلال سب کو سلامت رکھے آمین۔ 2014 کا آخری شمارہ ملا انتہائی دلکش ٹائٹل کے ساتھ، پراسرار نمبر 3 منزہ آنٹی کا اداریہ ''میں شرمندہ ہوں'' کرب اور آزار لیے تھا۔ احوال میں سب نے ہی بہت شاندار لکھا۔ زرینہ جونیجو آپی جان احوال میں آنے کا شکریہ میں ٹھیک ہوں۔ ممتاز احمد بھیا الحمدللہ! آپ کیسے ہیں؟ شائستہ جمال یاد رکھنے کا شکریہ فیصل ندیم جی شکریہ شاہد رفیق خط پسند کرنے کا شکریہ منشی محمد عزیز بھیا، مور شاہد حسین بھیا، فریدہ فری یوسفزئی، شفقت حسین، غلام رسول، کنول عمران، صفدر علی حیدری، عبدالغفار عابد بھیا، نصرت سرفراز آپ سب احوال سے غیر حاضر تھے، خیریت؟ فرح انیس، تسلیم کوثر، عائشہ سلیم، ایلون مسیح کو احوال میں خوش آمدید سب کو پتا ہے کہ پراسرار نمبر میرا کتنا فیورٹ ہے ہمیشہ اسی کا انتظار رہتا ہے۔ انکل محمد سلیم اختر کی سانپوں والا باغ، عنوان کی طرح کہانی بھی بہت شاندار تھی۔ اسماء اعوان کی بنگلہ نمبر D-36 بہت خوفناک کہانی تھی۔ عذرا فردوس کی آسیبی چکر۔ رضوان قیوم کی، ایک غلطی، ممتاز بھیا کی، وہ مہرباں، مور شاہد کی، مانو یا نہ مانو، مہر پرویز کی سودائی میرا، نوری اور شی جاوید راہی کی، فرخندہ بتول کی عاشق جن، سید محمود حسن کی چھلاوہ گراؤنڈ، رئیسہ خالد کی وہ کون تھے۔ عظمیٰ شکور کی طلسمی محبت، غلام رسول کی کالا جادو، حیرت بھری پر اسرار رونگٹے کھڑے کردینے والی ایک سے بڑھ کر ایک لاجواب تحریریں تھیں۔ ویلڈن اللہ کرے زور قلم اور زیادہ، کنول عمران خان، مجید احمد بھیا کی تحریر اچھی لگی۔ کاشی چوہان بھیا کو سلام ان کی سلسلے وار تحریر ''زہر عشق'' کا شدت سے انتظار ہے۔ سخن آباد میں زرینہ آپی کی شاعری، شائستہ جمال کی شاعری کمال شاعری کی آپ نے ویلڈن۔ ان کے علاوہ ثانیہ ثانی، ارم خان، ریحان آفاق، شہزاد علی، زیب ملک اور باقی سب

جنوری 2015ء

کوپن برائے احوال

میں سچی کہانیاں کی کہانیوں پر مختصر تبصرہ اپنی تصویر کے ساتھ ارسال کر رہا/ کر رہی ہوں۔ اس خط کو احوال میں شامل کرلیں۔

نام: ----------

مکمل پتا: ----------

جنوری 2015ء

کوپن برائے اشاعت کہانی

میں سچی کہانیاں میں اپنی کہانی اپنی تصویر کے ساتھ اشاعت کے لیے بھیج رہا/ بھیج رہی ہوں۔ اسے کسی شمارے میں شاملِ اشاعت کرلیں۔

عنوان کہانی: ---------- تعداد صفحات: ----------

نام: ----------

مکمل پتا: ----------

فون/ سیل نمبر: ----------

جنوری 2015ء

کوپن برائے پسندیدہ کہانی

میں سچی کہانیاں میں شائع ہونے والی کہانی پر پسندیدگی کا اظہار کرتا/ کرتی ہوں۔ میری رائے میں

اوّل، عنوان: ---------- مصنف: ----------

دوم، عنوان: ---------- مصنف: ----------

سوم، عنوان: ---------- مصنف: ----------

نام: ---------- شہر: ----------

نے عمدہ شاعری لکھی۔ بینا تاج آپی سزک کہانی کا سلسلہ دوبارہ شروع کر دیں۔ انہی الفاظ کے ساتھ اجازت چاہوں گی جہاں رہیں خوش رہیں، آباد رہیں۔ مگر سچی کہانیاں کے ساتھ رہیں۔ اپنا بہت خیال رکھیے گا۔ اللہ نگہبان۔

☆ سدرہ جی اللہ سلامت رکھے۔ نئے سال کا تحفہ تمہاری شاعری سخن آباد کی زینت بنا رہی ہوں۔ مشورے کا شکریہ۔

✉ عبدالغفور چیچہ وطنی سے احوال کی محفل سجا رہے ہیں۔ محترمہ منزہ سہام، کاشی بھیا اور سچی کہانیاں کی پوری ٹیم، نئی ایڈیٹر سسٹر بینا تاج کو عبدالغفور عابد کی طرف سے محبتوں بھرا آداب! رب العزت سے دعا اور امید ہے کہ آپ سب خیریت سے ہوں گے۔ میرے عزیز ساتھیو! میں آپ لوگوں کی محفل میں حاضر ہونے کی ہر ممکن کوشش کرتا ہوں مگر کوشش کے باوجود کبھی کبھار غیر حاضری ہو جاتی ہے۔ میری اس غیر حاضری کو آپ میری سستی مان لیں۔ آپ کچھ بھی کہہ لیں آپ حق بجانب ہیں۔ میں اپنی غلطی کھلے دل سے تسلیم کرتا ہوں۔ مگر میری اس غیر حاضری میں میرے اپنوں کا بھی عمل دخل ہے۔ میں نے اس غیر حاضری کا گلہ سسٹر بینا تاج سے کیا تو سسٹر نے کھلے دل سے اس غلطی کو تسلیم کیا۔ سسٹر بینا تاج ہم تو تیز آندھیوں میں بھی وفا کے دیپ جلائے رکھتے ہیں ہمارا تو شیوا ہے خوشیاں تقسیم کرنا یہ سوچے بغیر کے اوروں کا رویہ ہمارے ساتھ کیسا ہے؟ آپ تو پھر بہن ہیں۔ مجھے آپ کے وہ لفظ کبھی نہیں بھول سکتے جب میں نے آپ کو یہ کہا تھا کہ ''سسٹر اگر آپ سچی کہانیاں کے بجائے دوشیزہ کے قارئین اور لکھاریوں کو جواب دیتی۔'' آپ نے میرے اس سوال کا جواب خوبصورت انداز میں دیا آپ نے کہا ''اگر میں دوشیزہ سے منسلک ہوتی تو آج میں اپنے بھائی غفار عابد سے کیسے بات کر سکتی تھی؟'' میں یہاں اپنے بھائیوں کے درمیان رہ کر بہت خوش ہوں بہت خوب سسٹر میں دعا گو ہوں کہ آپ کا یہ نیا سفر کامیابیوں سے بھرپور ہو۔ اپنے تبصرے کا آغاز حسب معمول باجی منزہ کے اداریے ''میں شرمندہ ہوں'' سے کرتا ہوں۔ کوٹ رادھا کشن میں جلائے گئے جوڑے ہم میں سے ہی تھے۔ کاشی بھیا کی کچھ اپنی باتیں پڑھ کر بہت افسوس ہوا بے جان مٹی کو اشرف المخلوقات سے شکایتیں ہیں۔ ہم اپنی اصلی منزل کو بھول چکے ہیں ہمارا سفر بے کار ہے۔ بہت غور طلب بات ہے باقی پراسرار کی ہر کہانی اپنی مثال آپ تھی۔ ایوارڈ حاصل کرنے والے تمام لکھاریوں کو میری طرف سے مبارک باد قبول ہو۔ باجی تسلیم کوثر آپ کو اس محفل میں دیکھ کر دلی خوشی محسوس ہوئی۔ آپ کی نوازش جو آپ اپنے چھوٹے بھائی کی خیریت معلوم کرتی رہتی ہو۔ فریدہ جاوید فری، عظمیٰ شکور، سدرہ، مسز نوید ہاشمی، تحسین جو نیجو، مقصود بلوچ، علی حسنین تابش، ممتاز احمد، ظفر اللہ رند اور سچی کہانیاں کے سب ہی قارئین اور لکھاریوں کو سلام۔ عزیز دوستو! جنوری کے شمارے میں میری تحریر ''گناہوں کی دلدل'' شائع ہو رہی ہے۔ آپ سب سے مثبت تنقید کی امید رکھتا ہوں مہر پرویز بھائی آپ کا گلہ حق بجانب ہے۔ آئندہ آپ کو کوئی شکایت نہیں ہوگی۔ آپ نے سچی کہانیاں کے لیے لکھنا ہے وہ دن دور نہیں جب آپ کا شمار اچھے رائٹرز میں ہونے لگے گا۔ آپ بہت اچھا لکھتے ہیں ہمیں آپ کی ضرورت ہے۔ باجی ام جلال بخاری اور چھوٹی نور العین آپ نے اس محفل میں شمولیت کا پکا وعدہ کیا تھا پھر مسلسل غیر حاضری کیوں؟

☆ عبدالغفار عابد! سدا خوش اور آباد رہیے۔ ساری باتیں گلے شکوے ختم کر کے ہمارے پرچے کی رونق بڑھاتے رہیے۔

✉ مسز نوید ہاشمی کراچی سے احوال میں رونق افروز ہو رہی ہیں۔ میرے پیارے دوستوں، اسٹاف کے

ممبران السلام وعلیکم! سب سے پہلے میں شکریہ ادا کرنا چاہتی ہوں اپنے اللہ تعالیٰ کا پھر سچی کہانیاں کے تمام ارکان خاص کر میڈم رخسانہ سہام مرزا کا اللہ انہیں صحت عطا فرمائیں۔ پھر میڈم منزہ سہام منزہ اور کاشی چوہان کا جنہوں نے ایوارڈ دینے کا وعدہ کیا اور سچ کر دکھایا محمد سلیم اختر نے چار اور ایم اشفاق بٹ، نصرت سرفراز، ملک صفدر عباس، عادل حسین، مور شاہد حسین، محمد عزیز سے، سنبل، مجید احمد جائی، الماس فاطمہ ارمان، صفدر علی حیدری، شعبان کھوسہ جنہوں نے تین کہانیاں لکھیں۔ ایس امتیاز احمد، بشیر احمد بھٹی، گڈی آپا، محمد علی اسد بھٹی، محمد سلیم آزاد، شاہد محمود مغل، غلام مصطفیٰ، عبدالغفار چوہدری، بشیر سعید احمد، ندا ہاشمی، کاشی چوہان، شکیلہ انجم طارق، بشیر احمد بھٹی، حنا بشری، مسز نوید ہاشمی، جیجل منتیلو نے دو کہانیاں لکھیں اور رضوانہ کوثر، نگہت غفار، آصف ضیاء احمد، فرزانہ سجاب مرزا، جویریہ سلیم، دستگیر شہزار، احمد سجاد بابر، صدف آصف، حمیرا آصف، خلیل احمد انجم رئیسہ خالد، ریاض حسین شاہد، ام منابل، نفیسہ مغل، زرینہ جونیجو، عبدالغفار عابد، سدرہ انور علی، سلمی کنور، امجد جاوید، عابد علی سحر، شاہانہ خان نے ایک کہانی لکھی۔ ساتھیو! یہ میری فہرست ہے جو میں نے دن رات محنت کر کے بنائی ہے اگر کسی کا نام رہ گیا ہو تو معافی چاہتی ہوں۔ یہاں آپ میری سچی کہانیاں ڈائجسٹ سے محبت جنون دیکھیے۔ میں تمام اسپیشل ایوارڈ اور رائٹر ایوارڈ میں نام دینے پر مبارک باد پیش کرتی ہوں۔ منزہ صاحبہ اور کاشی چوہان صاحب آپ کی حوصلہ افزائی محبت توجہ اور دیکھ بھال سے وہ ایک درخت کا روپ دھار لیتے ہیں اور اپنا نام روشن کرتے ہیں یہ لکھنے کا حوصلہ کاشی بھائی نے دیا۔ احوال اور دوشیزہ کی محفل سے لکھنا شروع کیا اور محبت توجہ سے لکھنے کا سلیقہ آ گیا اعتماد آ گیا کاشی چوہان احوال کے جواب نہیں دیں گے اب مینا تاج صاحبہ دیں گی۔ آپ کا تعلق آپ کی تبصرہ کہانی سے قائم رہے گا۔ زہر عشق آپ کے ناول کا بے چینی سے انتظار ہے۔ ڈاکٹر صغیر احمد کے لیے دعا گو ہوں اللہ انہیں صحت عطا فرمائے عمران فائق آئی سی ایس کی کامیابی پر دلی مبارک باد فیصل ندیم بھٹی وعلیکم السلام امید کرتی ہوں میرا بھائی خیریت سے ہوگا۔ احوال نومبر کا پسندیدہ خط منشی عزیز لندن اور اسامہ ندیم کا تھا۔ نومبر کی پہلی سچ بیانی محمد سلیم اختر، شعبان کھوسہ، نسیم صدف، رفعت محمود کی تحریر بھی اچھی تھی۔ شاہانہ خان کی تحریر نے مجھے سوچنے پر مجبور کر دیا رانا محمد شاہد کی کہانی چھا گئی۔ دسمبر میں منزہ سہام کا اداریہ "میں شرمندہ ہوں" ہمیں واقعی شرمندہ کر دیتا ہے۔ دسمبر کے احوال میں سلیم اختر کا خط پسند آیا شاد پندرانی میرے بھائی آپ نے غلط کہا بلوچستان سے محبت آپ پورے احوال میں دیکھ سکتے ہیں بھائی کیا میں غلط کہہ رہی ہوں؟ ساحل ابڑو، فریدہ جاوید فری، عمارہ جمیل سب کو محبت بھرا اسلام۔ فریدہ جاوید اللہ آپ کو صحت عطا فرمائیں۔ میں نے سچی کہانیاں کے دفتر فون کیا تھا اپنی کہانی کے لیے کہ کب تک چھپے گی (Telephone Operatar) نے میرا نمبر ملا کر دیا تھا۔ ایک میٹھی سی آواز سن کر میں حیران رہ گئی پھر پتا چلا کہ وہ میٹھی رسیلی آواز مینا تاج کی ہے۔ آواز کے ساتھ ساتھ مینا تاج یقیناً پیارے دل کی مالک بھی ہوں گی۔ جی میری دو کہانیاں (اکلوتی) اور (گوری نہیں کالی) پلیز کوئی جنوری 2015 میں شائع کر دیں۔ اب اجازت دیں۔

☆ پیاری مسز نوید ہاشمی! سدا خوش رہیے اور آباد رہیے آپ کا پیار بھرا خط شامل احوال ہے آپ کی تحریر جلد آپ کے پرچے "سچی کہانیاں" کی زینت بنے گی۔

✉ امام بخش ابڑو بلوچستان سے شامل احوال ہیں۔ محترمہ مینا تاج صاحبہ سدا خوش رہیے۔ السلام علیکم دسمبر کا تازہ شمارہ سچی کہانیاں پر اسرار نمبر میرے ہاتھوں میں ہے۔ ٹائٹل خوبصورت ہے ویل ڈن مینا تاج مبارک ہو آپ کو جو آپ سچی کہانیاں کے احوال میں نمودار ہوئی ہیں۔ دسمبر کا شمارہ باقی شماروں سے بہترین

لگا ہے جو آپ کی محنت کا ثمر ہے۔ احوال میں قدم رکھا تو خطوط سے پتہ چلا کہ ہمارے شہر ڈیرہ اللہ یار میں سچی کہانیاں کا تاریخی پروگرام کیا گیا تھا۔ مبارک باد ہو جو آپ نے ادبی سرگیاں دکھائی ہے تو میرا ابھی آپ سے ادبی تعاون رہے گا۔ عمران مظہر بھائی آپ کو سلام پیش کرتا ہوں کیوں کہ تنقید ہی رائٹر کی تخلیق کا آئینہ ہے شاد پندرانی ہمیشہ خوشیاں پاؤ محمد سلیم اختر کی کہانی سانپوں والا باغ، زبردست خوفناک اور سچی کہانیاں کی معیار پر اتری۔ تمام کہانیاں بھی اچھی اور معیاری تھیں۔ باقی باتیں اگلے شمارے میں۔

☆ امام بخش ابڑو! سدا خوش رہیے آپ کا انکساری اور خلوص سے بھرا خط شامل احوال ہے۔ تبصرے کا شکریہ!

✉ شازیہ گل! مانسرہ سے لکھتی ہیں۔ مائی ڈیئر سویٹ مینا جی، کاشی بھیا منزہ جی اینڈ دیگر اسٹاف رائٹر اور ریڈرز میری طرف سے چاہتوں اور خلوص سے بھرا سلام قبول کیجئے۔ میری دعا ہے کہ سچی کہانیاں ایسے ہی اپنی پوری آب تاب سے چمکتا دمکتا رہے، سچی کہانیاں ہر لحاظ سے ایک بہترین رسالہ ہے۔ احوال میں شامل تمام لوگوں کے تبصرے اور خطوط رسالے کو چار چاند لگا دیتے ہیں۔ کاشی بھائی ہر بار کی طرح کچھ اپنی باتیں بہت خوب لکھتے ہیں دل کو چھو جاتی ہیں۔ اس بار بھی سچی کہانیاں بہت خوبصورت ہے میں تبصرہ نہیں کر پاؤں گی کیوں کہ ابھی تک مکمل پڑھ نہیں پائی مکمل پڑھے بناء تبصرے کا مزہ نہیں آتا۔ اگلی بار انشاء اللہ تبصرے کے ساتھ اس محفل میں حاضر ہوں گی۔ سدرہ جی۔ آپ کے تبصرے اور خط بہت شاندار ہوتا ہے اور باقی تمام جو بھی احوال میں شامل لوگ ہیں سب بہت شاندار لکھتے ہیں۔ سب سے پہلے احوال ہی پڑھتی ہوں سب کا منفرد انداز بیاں بہت اچھا لگتا ہے۔ سب سے کچھ نہ کچھ سیکھنے کو ملتا ہے اپنی ایک غزل بھیج رہی ہوں شمارے میں جگہ دے کر حوصلہ افزائی کریں گے اچھا اب اجازت چاہوں گی۔ اس دعا کے ساتھ کہ جہاں رہیں خوش رہیں اور خوشیاں پائیں خدا حافظ

☆ شازیہ جی! بہت خوش رہیں نئے سال کا تحفہ آپ کو سخن آباد میں جگہ دے کر ادا کر رہی ہوں۔

✉ محمد علی اسد بھٹی ہڈالی سے شامل احوال ہیں برادر محترم کاشی چوہان صاحب السلام وعلیکم! امید ہے کہ آپ بخیریت ہوں گے۔ ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' کی طرف سے بندہ ناچیز کو ''سچی کہانیاں'' رائٹر ایوارڈ 2014 کی نامزدگی اور حوصلہ افزائی پر ماہنامہ سچی کہانیاں کے تمام اسٹاف اور ادارے کا تہہ دل سے ممنون احسان ہوں۔ برادر سچی کہانیاں زندگی کی چلتی پھرتی حقیقی کہانیوں سے معاشرے کی صحیح عکاسی کر رہا ہے اور اس طرح کی ہزاروں کہانیاں ہمارے معاشرے میں ہر طرف بکھری پڑی ہیں۔ ماہنامہ سچی کہانیاں اصلاح معاشرہ میں بھرپور اپنا کردار احسن طریقے سے ادا کر رہا ہے جس کے لیے آپ سچی کہانیاں کا تمام اسٹاف ادارہ اور مثبت سوچ والے قارئین لکھاری قابل تحسین ہیں۔ اس کے علاوہ موجودہ ملکی حالات کی مناسبت سے اپنی ایک تحریر 'مادر وطن تم سے مخاطب ہے' کے عنوان سے بھیج رہا ہوں یہ تحریر انتخاب کے صفحہ پر شائع ہو سکتی ہے؟ ڈھیروں دعاؤں کے ساتھ۔

☆ محمد علی اسد بھٹی! آپ کا خط شامل احوال ہے خوش رہیے۔

✉ ممتاز احمد سرگودھا! سے احوال میں شریک ہو رہے ہیں۔ السلام وعلیکم سب سے پہلے سچی کہانیاں کی پوری ٹیم اور رائٹر قارئین کرام کو نیا سال 2015 مبارک باد ہو۔ اللہ پاک کی بارگاہ میں دعا ہے کہ آنے والا سال سب کے لیے ڈھیروں خوشیوں اور سلامتی کا پیغام لائے۔ (آمین) اداریہ میں بہن منزہ سہام نے انسان نما درندوں کی درندگی سے جلنے والی لاشوں پر انسانیت کو جھنجوڑنے کے لیے ایک بہت تلخ حقیقت کو

عیاں کیا ہے۔احوال حسب معمول احوالیوں کے خوبصورت سندیسوں سے چاند ستاروں کی طرح چمک دمک رہا تھا احوال میں بینا تاج کے ساتھ پہلی ملاقات خوب رہی۔ اللہ رب العزت اور حضور نبی ﷺ کے ذکر اور دعا کے ساتھ گفتگو کا آغاز کیا جو کہ بہت اچھا لگا۔ تمام احوالیوں نے بہت بہترین لکھا مگر محترم سلیم اختر صاحب لیہ کے محمد یوسف، لالہ موسیٰ کے ایم اشفاق بٹ، بھائی ظفر اللہ رند اور شائستہ جمال کے خطوط بہت شاندار تھے۔ آپ کا خط بھی بہت شاندار تھا ایم اشفاق بٹ، تیر رضوی شائستہ جمال عمران مظہر، فیصل ندیم بھٹی آپ کا بہت شکریہ ''رستے زخم'' کہانی پسند کرنے کا۔ علم دوست محترم سلیم اختر، ظفر اللہ رند، زیب ملک ،عمران مظہر، آپ کی مبارک باد کا بے حد شکریہ آپ سب کے لیے دل سے بہت ساری دعائیں۔ فرح انیس اور عائشہ گابا کو احوال میں خوش آمدید۔ دسمبر کا پراسرار نمبر بہت شاندار رہا۔ کنول عمران خان کی کہانی ''جیسی کرنی ویسی بھرنی'' بہترین نمبرون تھی۔ اور محمد سلیم اختر کی ''سانپوں والا باغ'' عمدہ کہانی تھی عذرا فردوس کی ''آسیبی چکر'' بہت شاندار کہانی تھی۔ ''بنگلہ نمبر D-36 '' رضوان قیوم کی ''ایک غلطی'' علی رضا عمرانی کی ''آئیڈیل'' مور شاہد حسین کی ''مانو یا نہ مانو'' مہر پرویز کی ''سودائی میرا'' جاوید راہی کی ''نوری اور شی'' فرخندہ بتول کی کہانی ''عاشق جن'' اور فوزیہ نور کی ''نرالی چاہت'' پراسراریت میں ڈوبی حیرت انگیز بہت زبردست کہانیاں تھیں۔ انشاء اللہ اگلے ماہ پھر حاضری ہوگی اگر روح کا جسم سے ناتہ جڑا رہا تو......اللہ نگہبان۔

☆ محترم ممتاز احمد! خوش رہیے آپ کا خوبصورت خط شامل احوال ہے آپ سے امید ہے کہ آئندہ بھی آپ سے ہمارا ناتہ خلوص اور محبت سے جڑا رہے گا۔

✉ بشیر احمد عمرانی ڈیرہ اللہ یار سے احوال کی خوبصورتی بڑھا رہے ہیں۔ مینا تاج صاحبہ سدا خوش رہو آباد رہو السلام وعلیکم کے بعد عرض ہے کہ بندہ ناچیز یہاں پر بالکل خیریت سے ہوں گی۔ دیگر احوال یہ ہے کہ باجی آپ کی بزم ادب میں یہ میرا پہلا خط ہے ویسے تو سچی کہانیاں کو شمیم نوید (مرحوم) پرویز بلگرامی کے دور سے پڑھتا آرہا ہوں اور آج جو تبصرہ کرنے لگا ہوں تو اس کی وجہ میرے ادبی دوست امام بخش ابڑو جنہوں نے مجھے دعوت دی۔ سردیوں کی اماوس راتیں اور دسمبر کا تازہ شمارہ پراسرار نمبر خوفناک ٹائٹل اور جنوں بھوتوں سے بھرا یہ مجمع نے یہ ثابت کر دیا کہ واقعی اس بار زبردست خوفناک دل دہلانے والی کہانیاں شائع کی گئی ہیں جسے پڑھنے کے بعد یہ محسوس ہوتا کہ یہاں سے چڑیل کھانے کو آتی ہے۔ وہاں سے بھوت آرہا ہے۔ اب تو دن کو بھی ڈر ہونے لگا ہے۔ جس کہانی نے مجھے زیادہ متاثر کیا وہ ہے محمد سلیم اختر کی (سانپوں والا باغ) جو خوف کے مارے ڈر نہیں بلکہ سبق آموز بھی دیا۔ کیوں کہ اس کی ہر کہانی کے اندر ایسا کردار چھپا ہوتا ہے جو معاشرے کی عکاسی کرتا ہے۔ مجید احمد اجائی کی بھی کہانی بہترین تھی مگر یہ کہانی دو ماہ پہلے افق میں (خونی بیوی) کے عنوان سے شائع ہو چکی تھی۔ مجید احمد میں آپ کو دوش نہیں دیتا بلکہ کچھ اسطرح کچھ اور بھی رائٹر ہیں جو اپنی کہانی کو بار بار شائع کروا کے اپنی عزت کماتے ہیں۔ اس طرح تمام پڑھنے والوں کی دلچسپی ختم ہو جائے گی۔ باجی تمام کہانیاں تو میں نے ابھی تک پڑھی نہیں میں مبارک باد دیتا ہوں کہ انہوں نے ادب کے حوالے سے زبردست کام کیا، ساحل ابڑو اپنی کہانی سے کب نوازتے ہیں ضرور بتانا۔ والسلام

☆ شبیر احمد عمرانی سدا خوش رہیے احوال میں شمولیت کا بے حد شکریہ یہ ہماری خوش نصیبی ہے کہ عرصہ دراز سے آپ سچی کہانیاں کے ریڈر ہیں بس آپ اب احوال میں اپنی جگہ بنائے رکھیے گا۔

✉ ایم اشفاق بٹ، لالہ موسیٰ سے احوال میں شرکت کر رہے ہیں۔ پیاری سی میڈم مینا تاج صاحبہ سدا

خوش رہیے اور مسکراہٹیں بکھیرتی رہیں دسمبر 2014 کا آخری پرچہ آپ کی زیر سرپرستی 28 نومبر کو مل گیا شکر ہے۔ میڈم مینا تاج صاحبہ دسمبر کا پراسرار نمبر نہیں تھا۔ سرورق پر اتنی ڈراونی تصویر نہیں تھی کہ جسے دیکھ کے دل دہل جاتا کاشی بھائی نے تو دو دفعہ ہمیں پراسرار نمبر دیا اور جس کو دیکھ کر پورا پورا مہینہ ڈر لگا رہتا تھا۔ کہانیوں پر نظر ڈالی کہ کس کس کی آئی ہیں۔ منزہ سہام کہہ رہی تھیں کہ ''میں شرمندہ ہوں'' آپی جی آپ ہی نہیں یہاں سارا پاکستان ہے۔ کاشی چوہان بھائی کا سلسلہ وار ناول، زہر عشق کا شدت سے انتظار رہے گا۔ کاشی سے ملاقات کر کے سچی کہانیاں کی نئی ایڈیٹر میڈم مینا تاج صاحبہ نظر آئیں جو کہ احوال کی محفل سجائے نظر آئیں۔ اگر آپ کی ہم سے بحیثیت ایڈیٹر پہلی ملاقات ہے اور آپ یہ کہتیں کہ آپ کا اور ہمارا ساتھ اپنائیت اور خلوص سے جڑا رہے گا تو ہمارا ابھی یہ دعویٰ ہے کہ پنجاب والے آپ کو اتنا اپنا پن دیں گے کہ آپ کراچی والوں کو بھول جائیں گی۔ مینا تاج صاحبہ آپ نے جس طرح اپنے احوال کا آغاز کیا وہ قابل تعریف ہے۔ آقا دو جہاں کا جتنی بار نام آئے ﷺ پڑھیں بھی اور لکھیں بھی۔ احوال کی محفل بہت زبردست ہوتی ہے۔ سب ہی اکھٹے ہو کر ایک دوسرے کا حال چال پوچھتے ہیں ایک دوسرے سے اپنے دکھ درد شیئر کرتے ہیں۔ احوال کی محفل میں میرے قابل قدر محمد سلیم اختر، ثانیہ بھٹی، سدرہ انور علی، زرینہ جونیجو، فریدہ فری مسٹر نوید ہاشمی، مقصود احمد بلوچ علی حسنین تابش، عائشہ نور، ان سب کا بہت شکریہ جنہوں نے اپنے احوال میں مجھ ناچیز کو یاد کیا۔ چند باتیں احوالی دوستوں کو کہنا چاہتا ہوں میرے قابل احترام محمد سلیم اختر آپ سچی کہانیاں کی جان ہیں۔ جب بھی آپ کو اسٹوری آتی ہے سب سے پہلے میں آپ کی اسٹوری پڑھتا ہوں۔ سدرہ انور علی آپ تو ہر مہینے سچی کہانیاں پر چھائی نظر آتی ہیں۔ آپ کا احوال بہت شاندار ہوتا ہے۔ فریدہ جاوید فری آپ کا شاعری والا مجموعہ محبت یاد رکھوں گی بہت زبردست ہے۔ عائشہ نور آپ تو بڑی چھپی رستم نکلیں میرے شہر کے نزدیک ہی آپ رہتی ہیں شکر ہے ہمارے ضلع گجرات کا بھی کوئی اور رائیٹر سچی کہانیاں میں نظر آیا۔ میں تو اکیلا لکھ لکھ کر تھک گیا تھا۔ اب اپنی حاضری لگواتی رہنا سچی کہانیاں کی محفل میں آجاؤ ہم تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔ احوال کی محفل کے بعد توت سیاہ سے گلہ صاف کر کے ڈان بریڈ سے ناشتہ کیا۔ اور محمد سلیم اختر ہمیں سانپوں والا باغ میں لے گئے اور گلو کی کہانی پڑھی۔ رضوان قیوم کی کہانی ایک غلطی بہت ہی سسپنس اور بھرتناک تھی۔ علی رضا عمرانی کی کہانی آئیڈیل بھی بڑے کمال کی تھی۔ باقی رائیٹروں نے بھی بہت اچھا لکھا۔ جن میں اسماء اعوان، عذرا فردوس، عصمت پروین، ممتاز احمد، مور شاہد حسین، مہر پرویز احمد، سدرہ انور علی، کنول عمران خان، فرخندہ بتول، رئیسہ خالد، فوزیہ نور، جہانگیر ان سب کو بہت بہت مبارک باد۔ مینا تاج جی اس دفعہ کہانیوں کے ساتھ پہلی سچ بیانی، دوسری سچ بیانی بھی نہیں لکھا ہوا تھا۔ سخن آباد کی محفل اس دفعہ ثانیہ ثانی، مون شاہد، ارم شہزاد، شہزاد علی، شائستہ جمال، احمد سرفراز احمد، مقصود احمد بلوچ ان سب نے خوب مفل سجائی تھی۔ آخر میں سچی کہانیاں کے سب ہی دوستوں اسٹاف کو میرا خلوص بھرا اسلام۔ اگر کوئی بات بری لگی ہو تو پنجاب والے ہاتھ جوڑ کے معافی مانگتے ہیں۔

☆ایم اشفاق بٹ! آباد رہیے آپ کا پرخلوص جذبہ دعائیں غلطیوں پر اشارہ سرآنکھوں پر۔ ٹائٹل کے خوفناک ہونے سے زیادہ ضروری کہانی کا خوفناک ہونا معنی رکھتا ہے آئندہ بھی اپنی قیمتی رائے مشوروں سے ہمیں نوازتے رہیے گا۔

✉ ظفر اللہ رند کوئٹہ سے لکھتے ہیں، السلام علیکم منزہ آنٹی پیارے کاشی بھائی، دانیال شمسی صاحب اور پیاری باجی مینا تاج اور تمام نئے پرانے لکھاریوں کو سلام قبول ہو۔ میں کافی دنوں سے بخار میں مبتلا ہوں

اپنے دوست مہربان کے ذریعے رسالہ منگوایا۔ منزہ سہام آنٹی نے شرمندہ کر دیا۔ سچ میں کہ ہم بھی اس ملک کے باشندے جو ٹھیرے بس کر کچھ نہیں سکتے سوائے دعاؤں کے اللہ پاک ہمارے پاک وطن کو امن کا گہوارہ بنا دیں۔ (آمین) چوہان صاحب آپ کا زہر عشق کا انتظار رہے گا۔ آ گئے احوال میں تو باجی مینا تاج نے خوش آمدید کہا مختلف دوستوں کے خطوط کو پڑھتے ہوئے آگے بڑھے ایک جگہ پہ رکنا پڑا جی ہاں شاد بندرانی کوئٹہ، صاحب جمالی، ساحل ابڑو، عمارہ جمیل، مہر جان، محمد عمر، علی دوست اور پیارا دوست، عمران مظہر یہ تو سب اپنے علاقے کے ڈی ایم جمالی اور ستہ ایم کوئٹہ ڈیرہ اللہ یار کے مگر مین ان دوستوں سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ ''میں کہاں ہوں؟'' مجھے اپنے ہی شہر میں اجنبی کی طرح ٹھرایا گیا کیا مین ان علاقوں میں نہیں رہتا ہوں؟ میں گلا کروں تو کس سے کروں؟ میں آپ سب سے اور خاص کر ساحل ابڑو بھائی سے کہ اس غریب کو اطلاع دیتے بھی دل باغ باغ ہو جاتا ہے سو وقت گزر گیا اس لیے دل میں بس دکھ کے سوا اور کچھ نہیں۔ کہانیوں میں سانپوں والا باغ محمد سلیم اختر'' بنگلہ 36-D جیسی کرنی ویسی بھرنی باقی کہانیاں نہیں پڑھ سکا سخن آباد میں ثانیہ بھٹی، زرینہ جونیجو، فریدہ جاوید فری اور باقی تمام شاعری بھی بہت اچھی تھی۔ آپ سب اسٹاف اور رائٹر کو 2015 بہت بہت مبارک ہو شکریہ۔ کسی کی دل آزاری کی ہو تو پلیز معاف اب اجازت تب تک کے لیے برائے مہربانی دعاؤں میں یاد رکھیے گا۔

☆ ظفر اللہ رند خوش رہیے۔ جناب ناراض مت ہوں۔ آپ سچی کہانیاں کا ایک اہم حصہ ہیں۔۔

✉ عائشہ محمد سلیم گابا کراچی سے شامل احوال ہیں السلام علیکم مینا باجی میرا یہ پہلا خط شائع کر کے میری حوصلہ افزائی کرنے کا شکریہ یہ دسمبر کا شمارہ جو کہ پراسرار نمبر تھا مگر پچھلے پراسرار نمبروں سے تھوڑا ہٹ کے تھا۔ اس میں سب سے پہلی تبدیلی تو یہ تھی کہ سرورق دوشیزہ خوفناک اور خون خوار شکل لے کر موجود نہ تھی۔ مگر نہ تو ایسی ایسی دوشیزائیں جلوہ گر ہوتیں تھیں کہ دیکھ کر ہی دل ڈوب جائے۔ پھر بندہ آگے پڑھے کیا؟ اب آتے ہیں کہانیوں کیطرف تو باجی اس دفعہ کہانیاں بھی الگ اور بہترین تھیں۔ ایک آدھ پرانے موضوع پر نیا پیراہن پہنائے ہوئے لگی باقی تو تمام نئے موضوعیات پر تھیں۔ اس دفعہ جو کہانیاں اول نمبر لے گئیں ان مین ''آئیڈیل'' (علی رضا عمرانی)، ''جیسی کرنی ویسی بھرنی''...... (کنول عمران خان) کی تھی۔ سچ یہ دو کہانیاں اپنے اندر پراسراریت رکھتے ہوئے بھی ایک اچھا سبق دے گئیں۔ اس کے بعد سانپوں والا باغ ایک غلطی، حوا کی بیٹیاں بہترین کہانیوں میں شامل ہیں۔ غرض یہ ہے کہ پورا شمارہ اپنے آپ ایک بہترین شمارہ تھا اس کے علاوہ ایک تجویز پیش کہ اگر اس دفعہ یعنی 2015 کا مئی کا شمارہ ماں نمبر ہو تو کیا ہی اچھا ہو۔ اب چلتی ہوں اس دعا کے ساتھ کہ ہمارا رسالہ خوب ترقی کرے اور اللہ اس سے جڑے تمام لوگوں کو خیر و عافیت کے ساتھ رکھے۔ (آمین) خدا حافظ۔

☆ سویٹ عائشہ سلیم! سدا خوش رہو اور اپنے مفید مشوروں سے آئندہ بھی نوازتی رہو۔

✉ مور شاہد بلوچستان سے شامل احوال ہیں ایڈیٹر سچی کہانیاں مینا تاج صاحبہ آداب غرض ہے امید ہے کہ آپ اور آپ کا اسٹاف بخیریت سے ہوں گے دسمبر کا شمارہ ''پراسرار نمبر'' بہت پسند آیا۔ غلام رسول گل، امجد علی، محمد اسماعیل بروہی احوال سے غیر حاضر کیوں ہیں جناب۔ ماشاء اللہ تحسین جونیجو، زرینہ جونیجو کولائیں انکل عبدالعزیز جی آپ کو یکم جنوری کی سالگرہ مبارک ہو نوازش کہ ایک بار پھر پراسرار سے پر کہانیاں تھیں انشاء اللہ باقی باتیں اگلے احوال میں خدا حافظ۔

☆ مور شاہد بھائی سدا خوش رہیے اور ہمارے احوال کا حصہ بنے رہیے۔ قارئین کی آراء سے وتبصرے

ہمارے لیے معتبر ہیں۔

✉ عائشہ صدیقہ کشمیر شامل احوال ہیں۔السلام وعلیکم محترم ناصر رضا صاحب امید ہے کہ آپ اور دوسرے سب بہن بھائی بفضل خدا خیریت سے ہوں گے۔گزارش ہے کہ میں اپنا ایک افسانہ اور"پاری بدل گئی" ارسال کر رہی ہوں مجھے یقین ہے آپ کو ضرور پسند آئے گا۔اور جلد ہی ماہنامہ سچی کہانیاں ڈائجسٹ میں جگہ پائے گا۔حج بیت اللہ سے آنے کے بعد لکھنا لکھانا برائے نام رہ گیا ہے اب اس سلسلہ کو دوبارہ شروع کیا۔محترمہ بہن رخسانہ سہام صاحبہ اور سب کو سلام۔خدا حافظ۔

☆ عائشہ صدیقہ لگتا ہے کافی عرصے سے آپ نے سچی کہانیاں نہیں پڑھا جب ہی آپ نے میرے محترم استاد" ناصر رضا صاحب کو مخاطب کیا آپ کی کہانی جلد سچی کہانیاں کی زینت بنے گی۔

✉ فیصل ندیم بھٹی سرگودھا سے احوال میں حاضری دیتے ہیں۔السلام وعلیکم محترمہ منزہ سہام صاحبہ، ایڈیٹر مینا تاج صاحبہ ماہ دسمبر کا پراسرار نمبر میرے سامنے ہے۔حسب معمول سب سے پہلے میں شرمندہ ہوں پڑھ کر واقعی احساس ہوا کہ درحقیقت اس معاشرے کا فرد ہونے پر شرمندہ ہیں۔" کچھ اپنی باتیں، کاشی چوہان کی خاک اور مٹی کی حقیقت سے آگاہی کی علامت ہے۔احوال میں سب سے پہلے ایڈیٹر مینا تاج کا سلام پڑھ کر قبول کیا اس کے بعد نبی پاکؐ کی حدیث پاک میں جو محبت کے بارے درج ہے مینا تاج صاحبہ آپ کی عظمت کو سلام پیش کرتا ہوں کہ آپ نے محبت کا پیغام اللہ اور اس کے رسول حضرت محمد ﷺ کے فرمان کے حوالے سے پیش کیا ہے۔میری دعا ہے کہ اللہ آپ کو اپنے فرائض احسن طریقے سے سرانجام دینے کی توفیق عطا فرمائے اور ان نادر باتوں پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔اس کے بعد نئے سال کی آمد پر مبارک باد اور ایڈیٹر کا قلمدان سنبھالنے پر دل کی اتھاہ گہرائیوں سے خوش آمدید۔سلیم اختر پہلے خط میں شامل احوال ہیں۔سلیم اختر صاحب آپ کا خط بہت اچھے الفاظ سے مذین ہوتا ہے اور آپ تو ایک عظیم قلمکار ہیں۔مجھ ناچیز کے خط کے الفاظ کو سراہنے پر تہہ دل سے مشکور ہوں اور ایوارڈ کی مبارک باد۔مسز نوید ہاشمی کو سلام میری کہانی خودغرض کو پسند کرنے کا شکریہ، مورشاہد بھائی کہاں غائب ہیں اسامہ ندیم بھی احوال میں آپ آجایئے ناسدرہ انور علی آپ کیسی ہیں؟ زرینہ جونیجو، تحسین جونیجو کو سلام۔سلیم اختر کی کہانی، سانپوں والا باغ اسماء اعوان کی بنگلہ نمبر 36-D، آسیبی چکر کہانی پسند آئی، ماں جایا، ایم اے راحت کا ہمشکل بہت اچھا جارہا ہے۔علی رضا عمرانی کی کہانی آئیڈیل اچھی رہی۔ممتاز بھیا کی کہانی، وہ مہرباں، زبردست کہانی ہے۔پڑھ کر ایسے محسوس ہوا کہ میں حقیقت میں یہ منظر دیکھ رہا ہوں مانو یا نا مانو، مورشاہد کی کہانی آخر ماننا ہی پڑی۔حوا کی بیٹیاں، عاشق جن، وہ کون تھے، اچھی کہانیاں تھیں عظمی شکور کی کہانی، طلسمی محبت، مختصر مگر جامع کہانی ہے۔سخن آباد میں تمام شاعروں کے کلام اچھے لگے۔اپنی ایک آزاد نظم بھیج رہا ہوں۔اگر اس قابل ہو تو سخن آباد میں شامل کر لیجیے۔تمام قارئین اور اسٹاف کو سلام۔زندگی رہی تو اگلے ماہ یہاں ملاقات ہوگی۔

☆ فیصل ندیم بھٹی!سدا خوش رہیے اور اپنی خوبصورت آراء کے ساتھ احوال کا حصہ بنے رہیے۔

✉ فرح انیس کراچی سے احوال میں رونق بخش رہی ہیں۔محترمہ مینا تاج السلام وعلیکم!دسمبر کا شمارہ 30 تاریخ کو ملا بہت اچھا لگا اپنا نام احوال میں دیکھ کر اسکے علاوہ میم مینا تاج آپ سے کال پر بات کر کے بہت ہی اچھا لگا۔سب سے پہلی کہانی جو میں نے پڑھی وہ اسماء اعوان کی"بنگلہ نمبر 36-D، عذرا فردوس کی آسیبی چکر، معاویہ عنبر ڈو کی ماں جایا، رضا عمرانی کی آئیڈیل بھی اچھی تھی۔اور"ہم شکل" کا تو کیا کہنا ہے

۔اپنی دو تحریریں بھیج رہی ہوں اور دو نظمیں بھی جواب ضرور دیجئے گا۔ کہیں کوئی غلطی ہوئی تو معافی کی طلبگار ہوں زندگی نے وفا کی تو پھر ملاقات ہوگی اللہ تعالیٰ اس رسالے کو اور ترقی عطا فرمائے۔ (آمین) (اللہ نگہبان)

☆ فرح انیس خوش رہو جلد ہی تمہاری کہانی ''سچی کہانیاں'' کی زینت بنے گی اور احوال میں اپنی انٹری دیتے رہنا۔

✉ عظمیٰ شکور سرگودھا سے احوال میں دستک دے رہی ہیں۔ مینا جی آداب! اب احوال کی طرف سدرہ جان کیسی ہو؟ کہانی کیا خوب لکھی واہ باقی سب خطوط بھی اے ون رہے خاص کر مسز نوید ہاشمی کا خط بھر پور محبت اور خلوص تر لگا مقصود احمد میاں چنوں سے احوال میں شامل تھے اب آتے ہیں کہانیوں کی طرف، محمد سلیم اختر کی تحریر سانپوں والا باغ، وہ مہرباں، ممتاز احمد کی تحریر خوب رہی، مانو یا نہ مانو، سودائی میرا احوا کی بیٹیاں خوبصورت تحریر تھیں۔ ہم فوراً سخن آباد چلے گئے ثانیہ ثانی، شائستہ جمال زبردست غزل تھی مگر زرینہ جونیجو کی نظم کی بات ہی الگ تھی۔ اوکے بائے بائے۔

☆ سویٹ عظمیٰ! سدا خوش رہو اور خوشیاں بکھیرتی رہو کاشی ہمارے ساتھ ہی ہیں۔ آپ ان سے جب چاہیں رابطہ کرسکتی ہیں پرچے کی پسندیدگی کا شکریہ۔

✉ اشفاق شاہین کراچی سے شامل احوال ہیں مینا جی آداب عرض ہے۔ سلیم اختر سب سے پہلے برا جمان تھے بہت خوب لکھا گڈ۔ سدرہ انور آپ واقعی احوال کی رونق ہیں۔ ادی تحسین زرینہ، جس دن آپ کا ساتھ نہ ہو وہ دن بُرا گزرتا ہے خوش رہیے اور اسی طرح قلم کے جوہر دکھاتی رہیے۔ فریدہ فری اتنی کامیابیوں پر تہہ دل سے مبارک باد۔ مقصود بلوچ آپ کا قلم خوب رواں ہے دوست۔ مسز نوید ہاشمی بہت سی دعائیں۔ مجید احمد جائی، مور شاہد ارشد وفا، ممتاز احمد نشی عزیز، عبدالغفار، کنول عمران،، سلیم اختر، اسماء اعوان نے بہت خوب لکھا۔ سخن آباد میں شائستہ جمال، زرینہ جونیجو، فریدہ فری، اور مقصود بلوچ کا کلام قابل تعریف ہے۔

آج تک اس کی محبت کا نشہ طاری ہے
پھول باقی نہیں خوشبو کا سفر جاری ہے

☆ اشفاق شاہین! پرچے کی پسندیدگی کا شکریہ اور دختر کی پیدائش پر بہت بہت مبارکباد قبول کریں۔

✉ منعم اصغر ڈیرہ غازی خان سے احوال کا حصہ بن رہے ہیں۔ میرے سارے دوست اور کزن کہتے ہیں پڑھنے سے میں پڑھائی پر توجہ نہیں دے پاؤں گا۔ لیکن یقین کریں میں جب بھی پڑھائی سے بور ہو چکا ہوتا ہوں تو رسالہ پڑھتے ہی ایک دم فریش ہو جاتا ہوں۔ سچی کہانیاں کا مسلسل خاموش قاری ہوں آج لکھا ہے تو ایک تحریر بھی ارسال کر رہا ہوں، اگر پسند آئے تو شائع ضرور کیجئے گا۔ اور میرا خط بھی شائع ضرور کیجئے گا۔ آخر میں رسالے کے لیے ڈھیروں۔ خدا حافظ۔

☆ منعم اصغر ''خوش آمدید'' سدا خوش رہو اور احوال کا حصہ بن رہے ہو اور آئندہ بھی اس سے جڑے رہنا آپ کی کہانی پڑھی نہیں ہے پڑھنے کے بعد جواب سے نوازیں گے۔

✉ کٹھرین کراچی سے احوال کی رونق بڑھا رہی ہیں۔ سسٹر مینا تاج خوش رہیں اور ہمیں یونہی احوال میں جگہ دیتی رہیں۔ سسٹر کرسمس کی مصروفیات سر پر ہیں پر اس سے بھی زیادہ ضروری کام ابھی باقی ہے ہاہاہا جی ہاں ''سچی کہانیاں'' پراسرار نمبر کو پڑھنا۔ سسٹر مزا آ گیا یقیناً پراسرار نمبر گزشتہ شمارے سے بازی لے گیا پر یہ کیا احوال میں بڑے زور شور سے صدائیں بلند ہو رہی ہیں کہ ''بلوچستان'' میں ادبی پروگرام مرتب ہوا۔ سچی کہانیاں اور دوشیزہ کے حوالے سے ستائشی جملے موصول ہو رہے ہیں مگر یہ کیا صرف لفظوں کی

برسات کیا ہی اچھا ہوتا کہ اس تقریب کی ایک آدھ جھلک دیکھ کر ہم بھی محظوظ ہو جاتے یعنی ایک چھوٹی سی تصویر سچی کہانیاں کی زینت بن جاتی تو اپنی ایک ٹوٹی پھوٹی تحریر روانہ کر رہی ہوں۔ اگر سخن آباد میں جگہ مل جائے تو بڑی مہربانی ہوگی اُف باتیں باتیں تو ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتی ہیں۔ اس لیے اجازت میری طرف سے آپ تمام لوگوں کو "ہیپی نیو ایئر" اب کی بار پرچے میں "سچی کہانیاں" کی کامیابی کی دعائیں شامل کروں گی۔

☆ سسٹر کترین "ہیپی کرسمس" اینڈ "ہیپی نیو ایئر" سدا خوشیاں بکھیرتی رہو۔ پرچے کی پسندیدگی کا شکریہ، آمین۔

✉ ثمینہ ناز کراچی سے شامل احوال ہیں لکھتی ہیں مینا تاج جی! آپ کو سچی کہانیاں کی ایڈیٹر بننے پر مبارکباد۔ منزہ سہام کا اداریہ "میں شرمندہ ہوں" پڑھ کر آنکھیں نمناک ہوگئیں۔ بھائی سلیم اختر کو "لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ" ملنے پر بہت بہت مبارک باد برصغیر کے نامور قلم کار ایم اے راحت کا نیا سلسلہ "ہمشکل" بہت زبردست اسٹوری ہے۔ فریدہ فری آپ کا مجموعہ کلام "محبت یاد رکھوں گی" کی اشاعت پر ڈھیروں مبارک۔ ممتاز احمد بھائی آپ کے یاد کرنے کا بہت بہت شکریہ

☆ ثمینہ ناز، سدا خوش رہو۔ پرچے کی پسندیدگی کا شکریہ۔

✉ چمن اعوان آزاد کشمیر سے احوال کے چمن میں تشریف لائی ہیں۔ میں بھی ایک لکھاری ہوں اخبار میں کالم تو لکھتی ہوں لیکن کسی ڈائجسٹ میں پہلی بار لکھ رہی ہوں۔ امید ہے کہ آپ کو میری کہانیاں پسند آئیں گی یہ جو کہانیاں بھیج رہی ہوں بالکل سچی کہانیاں ہیں اگر میری کہانیاں شائع کر کے حوصلہ افزائی کریں تو بہت اچھا لگے گا اور مزید بھی کہانیاں بھیجنے کی کوشش کروں گی (میں جس جگہ رہتی ہوں وہاں یہ کتاب ملتی نہیں اگر آپ مجھے کتاب میرے پتے پر بھیج دیں تو آپ کی بہت مہربانی ہوگی)

☆ چمن اعوان! خوش آمدید سدا خوش رہیے آپ کا خط شامل احوال ہے کہانی پر نظر ثانی کے بعد جواب دیا جائے گا۔ پرچہ گھر کے پتے پر پہنچانے کے لیے سرکولیشن انچارج محمد اقبال زمان سے رابطہ کریں۔

✉ زیب ملک گھوٹکی سے شامل احوال ہیں لکھتی ہیں سچی کہانیاں اور آپ سب کے لیے محبت ہے خیر ایک طویل انتظار کے بعد سچی کہانیاں دسمبر کا شمارہ چھ 6 تاریخ کو ملا۔ منزہ سہام کی "میں شرمندہ ہوں" واقعی بڑی شرم والی بات ہے۔ "احوال نامہ" میں اپنے بھیجے گئے دونوں ہی خطوط دیکھ کر تو بڑی خوشی ہوئی۔ محترمہ شائستہ جمال صاحبہ موسٹ ویلکم کہانیوں میں ساری ہی کہانیاں بہترین تھیں۔ آئیڈیل، ہمشکل، ماں جایا، وہ مہرباں، حوا کی بیٹیاں، نوری اور شی، جیسی کرنی ویسی بھرنی، عاشق جن، نرالی چاہت، وہ رات، خوف، فیض عشق، ناگن، کالا جادو، اور دیگر ساری ہی کہانیاں پڑھتے ہوئے بہت ڈر محسوس ہو رہا تھا۔ "سخن آباد" میں آپ نے میری نظم "خود غرض" شامل کی اس کے لیے آپ کا بیحد مشکور ہوں۔ انشاء اللہ اب اجازت چاہتا ہوں۔ فی امان اللہ۔

☆ زیب ملک! سدا خوش رہو۔ خط لکھنے کا وعدہ تم کرو اسے شائع کرنے کا وعدہ ہم کرتے ہیں۔

رانا محمد شاہد بورے والا سے شامل احوال ہیں۔ منزہ سہام کا اداریہ بے حس اور درندہ صفت معاشرے کا نوحہ بیان کر رہا تھا۔ "کچھ اپنی باتیں" میں کاشی چوہان بڑے دلچسپ انداز میں مٹی کی کہانی سنا رہے تھے۔ احوال میں سدرہ انور علی اور دوسرے ان احوالیوں کا بھی شکریہ جنہیں کہانی پسند آئی۔ معروف صحافی "محمود شام" کی زندگی کے حوالے سے "سفرنامہ سود و شام" کا انتظار رہے گا۔ میری ایک کہانی بہ عنوان "ایمانداری کا ٹکٹ" پیش خدمت ہے۔ جب کہ اس کے علاوہ بھی چند کہانیاں آپ کے پاس موجود ہیں۔ امید ہے جلد مثبت جواب ملے گا دعاؤں میں یاد رکھیے گا۔

رانا محمد شاہد! آپ کا خط شامل احوال ہے۔ پراسرار کا سرورق قارئین کے اصرار پر تبدیل کیا گیا تھا۔

✉ ارم ناز کراچی سے احوال میں شریک ہیں پیاری بہن مینا تاج، السلام علیکم! پہلے تو ایڈیٹر بننے پر مبارکباد خدا آپ کو خوب ترقی عطا فرمائے۔ (آمین) دسمبر کا شمارہ پڑھ کر بہت مزا آیا ہر کہانی ایک سے بڑھ کر ایک تھی یہ واقعی پراسرار نمبر تھا۔ کاشی بھیا کا زہر عشق کا انتظار رہے گا۔ ویسے اس زہر کا ذائقہ ہم نے چکھا ہے یقین کرو بہت کڑوا ہے نہ نگل سکتے ہیں۔ نہ اگل سکتے ہیں کہانی بھیج رہی ہوں قابل اشاعت ہو تو شائع کر دیجئے گا۔ دوبارہ حاضر ہوں گی۔ خدا حافظ۔

☆ ارم ناز سدا خوش رہو۔ ''زہر عشق'' جلد ہی آپ کی نظروں کے سامنے ہوگا۔

✉ عائشہ نور عاشا گجرات سے شامل احوال ہیں۔ السلام علیکم مینا تاج جی کیا حال ہے؟ مینا تاج جی مجھے پوچھنا تھا کہ ''سچی کہانیاں'' ادارے کی طرف سے ''دوشیزہ'' پرچے کے علاوہ کوئی اور بھی ہے؟ اگر ہے تو پلیز مجھے اس کا نام بھی بتا دیں۔ ایک اور بات میں نے ایک کہانی ''ظالم بھی مظلوم بھی عورت'' کے نام سے بھیجی تھی۔ اب اجازت چاہتی ہوں اللہ تعالیٰ اس ادارے کو بہت ساری کامیابی عطا فرمائے (آمین)۔

☆ عائشہ نور عاشا! خوش رہو ادارے کی طرف سے ''دوشیزہ'' اور ''سچی کہانیاں'' کے علاوہ کوئی دوسرا پرچہ نہیں ہے کہانی پڑھنے کے بعد جواب دیں گے۔

✉ محمد عمر گولہ! بلوچستان سے احوال میں شریک ہو رہے ہیں۔ محترم کاشی چوہان صاحب السلام علیکم کے بعد گزارش ہے کہ میں نے دسمبر 2014 کی ڈائجسٹ سچی کہانیاں میں خط پڑھا دل بہت خوش ہوا جس کہانیاں دسمبر 2014 کے لکھاریوں کی کہانیاں پسند آئی ہیں۔ سچی کہانیاں بہترین ڈائجسٹ جو معمولی لکھاریوں پر بھی مہربان ہے۔

☆ محمد عمر! اللہ آپ کو خوش رکھے۔ پرچہ کی پسندیدگی کا شکریہ۔

نوازش، کرم، شکریہ، مہربانی تمام احوالیوں کا جو احوال کا حصہ بنے، آئندہ ماہ انشاء اللہ پھر ملاقات ہوگی اُس وقت تک کے لیے اجازت، آپ کی سلامتی وخوشیوں کی طالب

مینا تاج

توجہ طلب

قارئین خط و کتابت کے لیے ہمارا نیا پتا نوٹ فرمالیں۔

آئندہ خطوط اسی پتے پر ارسال کریں۔ (شکریہ)

88-C II خیابانِ جامی فیز 7۔ ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی' کراچی

رابطہ 35893122 - 35893121

موبائل: 0300-2313256 / 0333-2269932

ای میل: pearlpublications@hotmail.com

گرداب

سلیم اختر

معصوم خواہشات کی بھینٹ چڑھنے والی دوشیزہ کا قصہ خاص/ راولپنڈی سے

''شہنی! تم شہر چلی جاؤ گی تو میں کیا کروں گا؟''
کالو نے اچانک میرا راستہ روکتے ہوئے کہا
کالو کی اس جرات پر غصہ سے میرا دماغ کھولنے لگا۔ ''کبھی شکل دیکھی ہے تم نے اپنی آئینے میں؟''
''وہ تو میں روزانہ ہی دیکھتا ہوں سچ میں جب بکریاں کھول کر چرانے جاتا ہوں تو پہلے شیشے میں دیکھ کر بالوں میں کنگھی کرتا ہوں'' اس نے میری طرف حسرت بھری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔
تم اپنی اوقات میں رہو تو بہتر ہے۔ کوے کی شکل والوں کو شاہین بننے کے خواب نہیں دیکھنا چاہیے۔'' یہ کہہ کر میں غصے سے بل کھاتی ہوئی آگے بڑھی۔ کالو مجھے اس وقت تک دیکھتا رہا جب تک میں اسکی نظروں سے اوجھل نہیں ہوگئی۔

☆......☆......☆

میرے چچا ایک سرکاری ادارے میں آفیسر تھے۔ وہ شہر میں رہتے تھے۔ ابا جان زمینداری کرتے تھے۔ اس لیے ہم نے گاؤں میں ہی رہنا تھا نازی میری چچازاد تھی ہم دونوں ہم عمر تھیں ایک ہی کلاس میں پڑھتی تھیں اور ہماری دوستی بھی گہری تھی میں قصبہ کے ہائی اسکول میں تھی اور وہ شہر کے ہائیر سیکنڈری اسکول میں ہماری ملاقات عید کے موقعے پر یا گرمیوں کی چھٹیوں میں ہی ہوتی تھی نازی زیادہ خوب صورت تو نہ تھی مگر بدصورت بھی نہ تھی۔ گندمی رنگ کے ساتھ تیکھے نقوش اور بڑی بڑی آنکھوں کے ساتھ وہ ایسا خوب صورت بالوں کا جوڑا بناتی کہ اس کے حسن کو چار چاند لگ جاتے تھے وہ جب بھی گاؤں آتی تو میں اس کا قیمتی ماڈرن لباس اور چہرے کا میک اپ دیکھ کر حیران رہ جاتی میک اپ میں تو شہزادی لگتی تھی۔

☆......☆......☆

اس کے برعکس میں شکل وصورت میں اس سے بہتر تھی مگر میرا سادہ لباس اور میک اپ سے بے نیاز چہرہ کسی کو بھی اپنی طرف متوجہ نہیں کرتا تھا۔ نازی کو حسین روپ میں دیکھ کر میرے من میں بھی اس خواہش نے سر ابھار دیا کہ میں نازی کی طرح کب بنوں گی میرے من میں بھی خوبصورت بننے کا جنوں سوار ہوگیا۔ میں نے جب اس کا ذکر نازی سے کیا تو وہ کہنے لگی۔
''شہنی! گاؤں میں رہ کر تم ایسی نہیں بن سکتی تم میرے ساتھ شہر چلو میں تمہیں بھی اپنے جیسا بنادوں گی۔''
''مگر یہ تو ناممکن ہے ناں میں نے بے بسی ظاہر کر

دی۔
شہنی تم میٹرک کا امتحان پاس کرلو اور آگے مزید پڑھنے کی خواہش کا اظہار کرو پھر میں تمہیں اپنے ساتھ لے جاؤں گی۔ ہم دونوں ایک ہی کالج میں داخلہ لیں گے اور پھر میں تمہیں اپنے جیسا بنا کر ہی رہوں گی۔

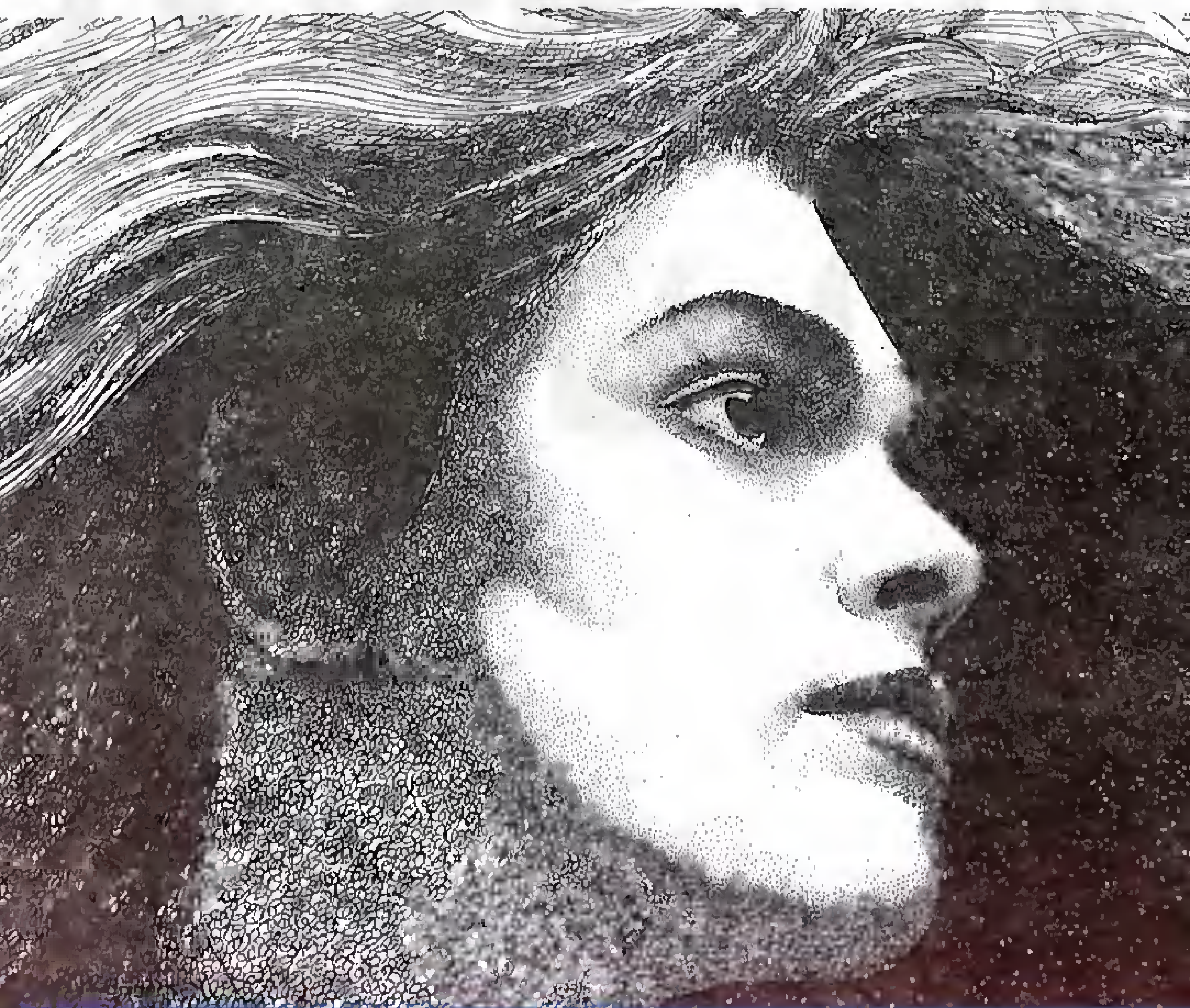
نازی کی بات دل کو لگی میں نے میٹرک کا امتحان اچھے نمبروں میں پاس کرلیا اور جب ابا جان سے شہر جا کر پڑھنے کی خواہش کا اظہار کیا تو وہ فوراً مان گئے انہوں نے چچا سے بات کی تو انہوں نے مجھے شہر بلالیا یوں میں نے اور نازی نے ایک ہی کالج میں داخلہ لیا۔

☆......☆......☆

کالو میری ایک خالہ کا بیٹا تھا اس کا رنگ اتنا کالا ہے کہ ہر کوئی اسے کالو کہتا ہے کوئی کالا کوا۔ پانچ جماعتیں اس نے گاؤں کے اسکول سے پاس کی تھیں۔ اس کی صورت دیکھ کر ہر کوئی اس کا مذاق اڑاتا تھا۔ جیسے اسے جینے کا حق ہی نہ ہو۔ میں بھی ان لوگوں میں شامل تھی جو کالو کو ایک ناکارہ فالتو چیز سمجھتے تھے نہ ہی وہ زیادہ پڑھ سکا اور نہ ہی اُسے کوئی نوکری ملی تو اس نے بھیڑ بکریوں کا ریوڑ بنالیا وہ اپنی دنیا میں مگن ہوگیا وہ میرا ہم عمر بھی تھا میں اکثر ان کے گھر جاتی رہتی تھی کیوں کہ اس کی ایک بہن میری کلاس فیلو تھی میں نے کئی بار یہ محسوس کیا کہ کالو کی نگاہیں میرا پیچھا کرتی ہیں مگر میں نے اس کو وہم جان کر بھلا دیا میں کبھی کبھی اس کے ساتھ مذاق کرتی کہ کالو کی دلہن کوہ قاف سے آئے گی۔

جواب میں وہ یہ کہتا ہاں وہ کوہ قاف سے ہی آئے گی۔

میرے شہر جانے کی خبر برادری والوں کو معلوم ہو



گئی تھی اس لیے میں روانگی سے قبل خالہ سے ملنے آ گئی تو کالو نے مجھے وہ بات روک کر کہہ دی جس کا تصور بھی میرے لیے محال تھا کالو نے میرا موڈ بہت خراب کر دیا بہر حال میں شہر آ گئی مگر میں کالو کے الفاظ نہ بھلا سکی میں نے جب نازی کو یہ بات بتائی تو وہ خوب ہنسی اور بولی" حور اور لنگور میں بہت فرق ہوتا ہے۔"

☆......☆......☆

وہ کالج میں میرا پہلا دن تھا اور اسکول اور کالج میں مجھے پہلے دن ہی فرق معلوم ہو گیا کالج کے منتخب لباس ہونے کے باوجود لڑکیاں ایسے فیشن کر کے آتی تھیں کہ میں منہ کھول کر ان کو دیکھتی رہ گئی۔ کسی کے بال دو رنگوں میں رنگے تھے کسی کے تین رنگوں میں اور کسی کے سامنے کی لٹیں مختلف رنگ کی تھیں کسی نے پورے کے پورے بالوں کو اپنی مرضی سے رنگا ہوا تھا لباس کا انداز بھی ایک سے بڑھ کر ایک تھا شلوار قمیض تو کالج کے لباس ہی کی تھی لیکن فیشن کے مطابق تنگ اور چھوٹی قمیض اور ان پر دوپٹہ تو محض تکلف تھا۔ میں بھی آخر کیا کرتی مجھ پر بھی ماحول کا اثر ہو گیا مجھے اپنی ڈھیلی ڈھالی قمیض تھیلا سا لگنے لگی اور شلوار تو پٹھانیوں کے انداز کی لگنے لگی۔

دو دن بعد جب میں کالج گئی تو میری قمیض تنگ ہو چکی تھی اور شلوار کا گھیرا بھی فیشن کے مطابق تھا۔ اب معاملہ بالوں کا تھا جن کے لیے پارلر جانا تھا اور یہ کام نازی کے بغیر ناممکن تھا۔ وہ اکثر مجھے بیوٹی پارلر کے چمک دمک کے قصے سناتی اور ساتھ ساتھ یہ راز بھی کھولتی کہ یہ فلم اور ٹی وی ڈراموں کی ہیروئنیں اتنی خوبصورت اور حسین تھوڑی ہوتی ہیں یہ سارے کمالات بیوٹی پارلروں کے ہیں اگر تم ان کو کبھی اصل روپ میں دیکھ لو تو کبھی پہچان نہ سکو۔

☆......☆......☆

سچ شہی! ایک دفعہ تم میرے ساتھ تو چلو میں تمہیں دکھاتی ہوں تم کیا چیز ہو؟...... قسم سے تمہاری تو شخصیت ہی بدل جائے گی اور مردوں کی تو لائن لگ جائے گی۔

میرا دل بہت چاہتا تھا کہ میں ان حسن خانوں کی سیر کروں لیکن میں اپنے ماں باپ سے ڈرتی تھی ان کی عزت مجھے بہت عزیز تھی انہوں نے جس اعتماد کے ساتھ مجھے شہر بھیجا تھا میں ان کا وہ مان برقرار رکھنا چاہتی تھی نازی کو میری ایسی باتوں سے اختلاف تھا ایک روز وہ کہنے لگی۔

"والدین بے جا پابندیاں عائد نہ کریں تو اولاد چور راستے نہ ڈھونڈے۔"

"کیا مطلب ہے تمہارا؟" میں نے چونک کر پوچھا

"مطلب سادہ ہے۔ مجھے آج رات ایک شادی میں شرکت کرنی ہے یہ فارغ وقت ہے ابھی کوئی پیریڈ بھی نہیں ہے لہٰذا ابھی بیوٹی پارلر جایا جا سکتا ہے۔ کیا خیال ہے؟"

☆......☆......☆

میں نے اس کے ساتھ جانے پہ رضامندی ظاہر کر دی اس شرط پر کہ آج نازی سنگھار کروائے گی اور میں صرف دیکھوں گی "کاجل بیوٹی پارلر" کی ایک شاخ ہمارے کالج کے پاس تھی پندرہ منٹ بعد میں اور نازی بیوٹی پارلر کے دروازے پر کھڑی تھیں۔ حسن خانے کا فرش لشکارے مار رہا تھا الماریوں میں سلیقے سے چنی گئی مختلف قسم کی کریموں، پاوڈروں، اور سرخی کے ڈبوں کے درمیان بالوں کو آراستہ کرنے کے مختلف آلات بھی موجود تھے بڑے بڑے شیشوں نے کمرے کو شاندار قسم کے آئینے میں تبدیل کر دیا تھا۔ پارلر کی ایک ملازمہ نے سبز رنگ کا لبادہ دیا اور ایک مجھے میں نے اسے اٹھا کر دیکھا تو وہ بغیر آستین کے قمیض نما شمیز تھی جس کے بڑے بڑے گلے میں ہلکا سا لاسٹک تھا میں نے اسے ناپسندیدگی سے دیکھ کر ایک طرف رکھ دیا اور کہا۔

"میں نے کچھ نہیں کروانا۔"

"اچھا میڈم آپ نے کیا کیا کروانا ہے؟" ملازمہ نے انتہائی ادب و تمیز سے پوچھا نازی نے تفصیل سے اپنے مقاصد بیان کیے چند منٹ بعد وہ کپڑے تبدیل کر کے آئینے کے سامنے بڑی بہت سی آرام دہ کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھ چکی تھی سبز لبادے کا گلہ اس کے شانوں سے کافی نیچے لٹکا ہوا تھا مجھے جھرجھری سی آ گئی۔

''کیا میں اس کا طرح کا یہ مختصر لباس پہن کر یوں آرام سے بیٹھ سکتی ہوں میں نے اپنے آپ سے پوچھا اس کا جواب کیا آتا میں تو سامنے والے مناظر میں گم ہو چکی تھی میں چہرے کو چمکانے بالوں کو رنگنے اور بھوؤں کی کمانیاں کسنے کے عمل کو حیرت سے دیکھتی رہی تھی تقریباً ڈھائی گھنٹے بعد جب نازی کپڑے بدل کر آئی تو ہرگز ویسی نہ تھی جیسی یہاں آنے سے قبل تھی میں نے رشک بھری نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

سیاہ بالوں کے درمیاں سنہری بالوں کی لٹیں دمکتے گالوں کے اوپر لہرا رہی تھیں نازی بڑے انداز سے انہیں وقفے وقفے سے کانوں کے پیچھے کرتی......

اس نے کلائی پر بندھی گھڑی پر نظر ڈالی اور بولی ''چلو شہنی بالکل وقت پر فارغ ہوئے ہیں کالج کی چھٹی کا وقت ہو گیا ہے'' آؤ چلیں'' تو میں اس کے ساتھ چل پڑی......

وہ نازی کی کسی سہیلی کے خاندان میں شادی تھی وہ مجھے بھی ساتھ لے گئی۔ میں نے دیکھا ہر کوئی نازی کے خوبصورتی کی تعریف کر رہا ہے وہ سب عورتوں اور لڑکیوں میں نمایاں نظر آرہی تھی کئی لڑکیں اور مردوں کی نگاہیں اس کے حسن کا تعاقب کر رہی تھیں۔ میں جو سادہ لباس اور بغیر کسی میک اپ کے تھی کسی کی نگاہ کا مرکز نہ بن سکی تھی اس رات میں نے بھی فیصلہ کر لیا کہ میں بیوٹی پارلر ضرور جاؤں گی۔

☆......☆......☆

ان دنوں میں سیکنڈ ایئر میں تھی کہ شادی کا ایک فنکشن آ گیا اس موقع پر میں بھی نازی کے ہمراہ بیوٹی پارلر گئی اور ہم دونوں کو ہی انہوں نے سنوار دیا میں نے تیار ہونے کے بعد جب اپنے آپ کو آئینے میں دیکھا تو دیکھتی رہ گئی کہ جیسے کوئی پری کوہ قاف سے اتر آئی ہو۔ اس رات میں ہی اس محفل کی ملکہ حسن ٹھہری میرا رنگ روپ قیامت ڈھا رہا تھا سب کی نگاہیں میرے حسن پر مرکوز تھیں خود نازی بھی میری خوبصورتی کی تعریف کر رہی تھی۔

☆......☆......☆

اگلے ہی دن میرے لیے خوشیوں انبار لے کر طلوع ہوا۔ رات والی تقریب میں مجھے ایک صنعت کار کے بیٹے نے پسند کر لیا اگلے دن ہی سارے معاملات طے پا گئے۔ گاؤں سے میرے امی ابو کو بلا لیا گیا تھا وہ بھی خوشی سے پھولے نہ سمار ہے تھے لڑکے والوں نے منگنی کی رسم میں ہی مجھے زیور سے لاد دیا تھا راشد بھی لاکھوں میں ایک تھا میں اپنی قسمت پر نازاں تھی۔ خوشیاں میرے انگ انگ سے پھوٹ رہی تھیں۔ ایف اے کے امتحانوں کے بعد شادی ہو جانی تھی میں نے جیسے تیسے کر کے امتحان دیا اور انتظار کرنے لگی کہ کب وہ دن مقرر کرنے آتے ہیں۔

مگر اس کی تو نوبت ہی نہ آئی ان لوگوں نے انکار کر دیا راشد نے کسی کیفے میں مجھ پر بنائی گئی فلم دیکھ لی تھی جو بیوٹی پارلر والوں کے آئینے خانوں میں خفیہ کیمروں میں خفیہ تصویر کشی کر کے بنائی گئی تھی اور پھر کمپیوٹر کے ذریعے میرے چہرے کو نہ جانے کہاں کہاں اور کیسی کیسی فلموں میں استعمال کیا گیا تھا۔ انہوں نے میری زندگی برباد کر دی تھی نہ جانے کہاں کہاں کے نیٹ کیفوں میں وہ فلم چلائی جا رہی تھی میں بہت روئی تڑپی آنسو بہائے بے گناہی کی قسمیں کھائیں مگر جو تذلیل ہونی تھی وہ تو ہو ہی گئی، ہو رہی تھی اور نہ جانے کب تک ہونی تھی...... پارلر والوں نے میرا جینا حرام کر ڈالا۔

میں نہ صرف اپنی بلکہ ہر ایک کی نظروں میں گر گئی۔ کوئی خواہش کوئی امنگ نہ رہی میں اپنا گھٹیا چہرہ اور وجود لے کر گاؤں لوٹ آئی۔ ہر طرف بربادیوں نے ڈیرے ڈال لیے آہیں میرا مقدر بن گئیں۔ آنسو میرے ساتھی بن گئے میری رسوائی کے چرچے گلی گلی میں پھیل گئے میں زندگی سے مایوس ہو گئی...... تھی...... کہ روشنی کی ایک کرن نمودار ہوئی اور میری اندھیروں کو روشن کر گئی۔

کالو...... ہاں وہی کالو جسے میں لنگور کہتی تھی......

میں آج اسی کی بیوی ہوں جس نے مجھے تمام تر غلاضتوں کے بعد بھی قبول کر لیا تھا میں اس کی عظمت اور بڑائی کی معترف ہوں...... اس کی عظمت کے نشان میرے سینے میں نقش رہیں گے۔

☆☆......☆☆

شش! خاموش

نسیم سحر

گردش حالات کی شکار، عورت کی کہانی خاص / کراچی سے

کبھی کبھی میں سوچتی ہوں کہ میں کون ہوں؟ کوئی کھلونا ہوں جسے کھیل کر پھینک دیا جاتا ہے۔ کوئی تفریح کی چیز جسے مزے لے کر استعمال کیا جاتا ہے آخر کون ہوں میں؟ کیا انسان ہوں؟ یا مشین ہوں رات دن کام کرتی ہوں مجھے آخر کون بتائے گا ؟اماں ابا کے ایک درجن بچوں میں درمیان میں تھی۔ سو درمیان ہی میں ہی رہی۔ کبھی آسمان اور زمین کے درمیان کبھی محبت اور نفرت کے درمیان اگر پہلی اولاد ہوتی تو بڑے ہونے کا غرور ہوتا کچھ قدر ہوتی۔ آخر کی ہوتی تو چھوٹے ہونے کا مان یا لاڈ حصے میں آتا۔ مگر میں تو سدا بیچ میں رہی معلق خوشی اور غم کے بیچ میرا وجود ہچکولے کھاتا رہا کبھی نئی چیز میرے حصے میں نہیں آئی بڑی بہنوں کی اترن یا پھر چھوٹیوں کے لیے لائے ہوئے کپڑے جو سائز کے بڑا ہونے کی صورت میں مجھے مل جاتے۔ کھلونوں کا بھی یہی حال تھا اور محبتوں کے تو کیا ہی کہنے وہ استہزائیہ سی ہنسی ہنی۔

میں ایک ٹک خاموشی سے اسے دیکھتا رہا تھا۔

ابا کا کام سے آنے کے بعد سارا وقت اماں کے ساتھ ہی گزرتا ان کی کارکردگی کے نتیجے صحن میں پھرتے ان کو بھی تعداد معلوم کرنے کی ضرورت نہ پڑی اور نہ دلچسپی بہن بھائیوں میں جو زور آور ہوتا وہ کھیل میں بھی جیت جاتا۔ کھانے کے معاملے میں بھی خوش قسمت ثابت ہوتا پتیلی سے نکلنے والا تازہ سالن اور بوٹیاں اس کے حصے میں آجاتیں اس میں بھائی یا بہن کی تخصیص نہ تھی زور آور ہونا شرط تھا۔ بہنیں بھی اس معاملے میں بھائیوں سے کسی طرح کم نہ تھیں شاید تعداد میں زیادہ تھیں یا ناانصافی سہتے سہتے خود بڑھ کر حاصل کرنے والوں میں شامل ہوگئیں۔ لیکن میں خاموش رہتی لڑائی جھگڑے کا حصہ نہ بنتی اسی لیے میرے حصے میں زیادہ تر شور شرابا ہی آتا۔

اس آنکھ مچولی میں بچپن گزرنے لگا گھر میں کھانے کا سلسلہ ہی ختم نہ ہوتا تھا پڑھائی کی طرف کون توجہ دیتا تھا۔ جیسے جیسے بڑے ہونے لگے اماں نے پہلا آنے والا رشتہ قبول کیا اور بیٹیاں بیاہتی چلی گئیں چار بیٹیاں بیاہ کر جیسے ہی میرا نمبر آیا اچانک ہی اماں ابا کا یہ انکشاف ہوا بیٹیاں بھی رحمت ہوتی ہیں اگر وہ کمانے لگ جائیں لہٰذا میری شادی کا خیال ترک کر کے مجھے نوکری پر لگا دیا گیا۔

☆......☆......☆

وہ سانس لینے کو رکی میں نے خاموشی سے پانی کا گلاس اس کے آگے بڑھا دیا اس نے وہ گلاس اٹھایا اور سارا خالی کر دیا شاید اسکی پیاس بجھ گئی تھی۔ اس نے پھر کہنا شروع کر دیا ''میری تنخواہ سے اماں نے دوسری بہنوں کے جہیز بنانا شروع کر دیے اور میں سدا کی خاموش کبھی نہ بولی۔ حالانکہ مجھ سے بڑا بھائی بھی نوکری کرتا تھا مگر وہ آدھی تنخواہ اپنے اوپر لگا دیتا اور اماں اسے کچھ نہ کہتیں مجھ سے چھوٹی بھی ایک ایک کر کے رخصت ہونے لگیں۔ بہنوں کے لیے آنے والے رشتوں کے وقت میں گھر میں ہی نہ ہوتی تھی اور نہ ہی مجھے کہا جاتا اماں تو میرے ذریعے سے اپنا بوجھ ہلکا کر رہی تھیں۔ اب میرے علاوہ صرف ایک چھوٹی بہن تھی اس سے پیشتر کہ وہ بھی رخصت ہو جاتی بڑے بھائی نے شور مچا دیا میرے لیے نہیں اپنے لیے۔

☆......☆......☆

وہ پھر بیچارگی سی ہنسی ہنسی۔ ''اس نے کسی کو پسند کر لیا تھا اور اب وہ چاہ رہا تھا کہ اس کی شادی ہو جائے۔ مگر اماں'' اس کو بیاہ دوں پھر تیرا نمبر ہے '' یہ کہہ کر اس کو ٹالتی رہیں لیکن میری باری آنے تک بھائی کو ہی عقل آ گئی اور وہ چیخ پڑا'' سن اماں اب تو نے میری شادی کرنا ہے نہیں تو میں خود ہی بھگا کر لے آؤں گا بھائی کی دھمکی نے کام دکھایا اور اماں نے اس کی شادی بھی کر دی کہتے ہیں بچہ جب تک روئے نہیں ماں دودھ نہیں دیتی۔ اور مجھے تو نہ رونا آتا تھا نہ بولنا اس لیے میرے حصے کی چیزیں دوسروں کو ملتی رہیں بھابی کا آنے کا اماں کو کوئی فائدہ نہ ہوا سارا دن کمرے میں ٹی وی دیکھتی رہتی۔ اماں کی دانٹ پھٹکار پہ تھوڑا سا کام کر لیتی۔ مگر مجھے یہ فائدہ ہوا۔ کہ اسے میرا وجود کھٹکنے لگا حالانکہ میں بے زبان تو سارا دن گھر پہ ہی نہیں ہوتی تھی مگر پھر بھی اسے میرے وجود سے چڑ تھی اس نے میرے لیے رشتے ڈھونڈنے شروع کر دیے۔ اماں کی بھی بولتی بند تھی بہو کے آگے۔ اس لیے جو رشتہ اس نے پسند کیا میرے لیے وہاں اماں نے بھی ہاں کر دی بغیر چھان بین کے دو چار چیزوں کے ساتھ بیاہ دیا جبکہ میری تنخواہ سے دوسری بہنیں بھر بھر جہیز لے گئیں لیکن خیر میں خوش تھی اس جہنم سے نجات ملی مگر......

ایک اور دریا کا سامنا تھا منیر مجھ کو
میں ایک دریا کے پار اترا تو میں نے دیکھا

میرے سسرال اور شوہر لالچی لوگ تھے۔ ان کو میری ایک ہی بات اچھی لگتی تھی کہ میں نوکری کرتی تھی اس لیے میرے جاتے ہی انہوں نے مجھے پھر نوکری کرنے پہ مجبور کر دیا میرے لیے صرف چہرے بدلتے تھے ماحول نہیں یہاں بھی میری خاموشی کے لیے زہر قاتل ثابت ہو رہی تھی۔ مگر میں اپنے گھر کی خاطر خاموش تھی میری تنخواہ سے میری چھوٹی دو نندوں کا جہیز تیار ہونے لگا آٹھ سال میں دونوں نندیں رخصت ہو گئیں۔ میں دو بچوں کی ماں بن گئی اب شاید میری ضرورت نہ رہی تھی یا بہانا رتھا۔ میرے میاں کو اور کوئی پیسے والی مل گئی تھی۔ اور وہ مجھ سے شادی کے دس سال بعد پھر ماں کے گھر چھوڑ گیا اس نے ایک گہرا سانس لیا۔

☆......☆......☆

آج میرا دوسرا اسیشن تھا خاموش گہری آنکھوں والی عورت آج پھر میرے سامنے بیٹھی تھی۔ کچھ لوگوں کی آزمائش زندگی بھر ختم نہیں ہوتی۔ اُس نے بولنا شروع کیا وہی روز و شب پھر شروع ہو گئے اماں ابا کا انتقال ہو چکا تھا۔ اب گھر مکمل طور پر بڑی بھاوج کے ہاتھ میں تھا۔ اسے میرا وجود تو پہلے ہی برداشت نہ تھا اب کیا ہوتا اس نے میرے لیے پھر کوشش کرنا شروع کر دیں۔ اور بالا آخر ایک پیسے والا شخص ڈھونڈنے میں کامیاب ہو گئی جو پہلے سے شادی شدہ اور تین بچوں کا باپ تھا۔ مگر پیسے والا تھا اس لیے اس بات کو نظر انداز کر دیا گیا اس نے مجھے ایک گھر میں رکھا۔

مجھے وہاں نوکری نہیں کرنا پڑی وہ معقول خرچہ دیتے تھے میں اپنے بچوں کے ساتھ سکون سے رہنے

لگی۔ وہ تقریباً روزانہ ہی آتے مگر رات نہیں رکتے تھے میرے بچے اسکول جانے لگے تھے۔ مجھے لگتا کہ شاید اللہ نے میرے دکھوں کا مداوا کر دیا وہ میرے بچوں سے بھی اچھا رویہ رکھتے تھے۔ بس یہ کہ انھوں نے مجھے مزید اولاد پیدا کرنے نہ دی مجھے ضرور بھی نہ تھی۔

میں اپنے بچوں کے ساتھ خوش تھی چند سال اچھے گزرے پھر ان کا آنا کم ہو گیا۔ ہفتے میں دو چکر پھر ایک چکر پھر مزید دورانیہ بڑھنے لگا میں نے کوئی باز پرس نہ کی میں عمر کے اس طبقے میں آ کر بہت تھک چکی تھی اور سکون چاہتی تھی اسی لیے میں نے کوئی احتجاج نہ کیا۔ خاموش رہی میرے پاس اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا۔ بات بے بات استہزائیہ سی ہنسی اس کے ہونٹوں پہ رہتی تھی وہ کچھ منٹ خاموش رہی۔

☆......☆......☆

میں پورے انہماک سے سن رہا تھا ''وہ کچھ دنوں سے دوبارہ التفات برتنے لگے۔ آتے ہوئے کافی کھانے پینے کا سامان بھی لاتے ہم سب مل کر کھاتے باتیں کرتے مجھے ان کا ساتھ اچھا لگتا تھا میری زندگی میں دوبارہ سے خوشیاں آنے لگیں۔ میرے بچے ان سے کھل مل گئے تھے جب ہم ساتھ ہوتے اسی میں مکمل فیملی لگتی تھی میں چند دن یہیں رہوں گا۔

ایک دن انہوں نے مجھے چائے پیتے ہوئے بتایا میں حیران ہوئی کیوں کہ پہلی بار تھا کہ وہ رہنے کی بات کر رہے تھے۔ میرے لیے اس سے زیادہ خوشی کی بات اور کیا ہو سکتی تھی۔ وہ اپنے میکے جا رہی ہے دوسرے شہر انہوں نے وضاحت کی ''یہ بھی تو آپ کا گھر ہے'' میں نے آہستہ سے کہا وہ ذرا لیے دیے رہنے والے آدمی تھے اس لیے میں نے کبھی ان کی پہلی فیملی کے بارے میں نہیں پوچھا اور نہ انہوں نے بتایا۔ میرے لیے یہی بہت تھا کہ وہ ہمارا بہت اچھی طرح خیال کرتے تھے۔

انھیں آئے ہوئے تین دن ہو گئے تھے ہم سب بہت خوش تھے گھر، گھر لگ رہا تھا۔ ایک دن وہ ہمیں گھمانے لے گئے میرے بچے بھی بہت خوش تھے۔ ان کو بھی کسی نے اہمیت نہیں دی'' وہ پھر خاموش ہو گئی اس بار خاموشی کا دورانیہ زیادہ ہونے لگا تو میں کھنکار ''ہونہہ'' اس رات بھی ہم بہت خوش تھے۔ باہر کھانا کھا کے آئے تھے اس نے دوبارہ بولنا شروع کیا اس کی آنکھوں میں نمی آ گئی تھی۔

☆......☆......☆

میں ایک ماہر نفسیات تھا میرا کام جیل میں قیدیوں کی اصلاح کرنا تھا وہ قیدی جو عادی مجرم نہ ہوتے تھے ان کی کاؤنسلنگ کر کے ان کے جرم کی وجہ معلوم کرتا تھا کہ کیسے کسی نفسیاتی یا ذہنی دباؤ میں آ کے وہ جرم کر بیٹھے ان کی اصلاح کی کاؤنسلنگ اس لیے بھی ضروری تھی کہ وہ عادی مجرم نہ بننے پائیں اور جیل سے باہر نکل کر اچھے شہری بنیں۔ پہلی مرتبہ جرم کرنے والے ذرا سی کاؤنسلنگ سے بھٹکنے سے بچ جاتے ہیں اور جیل سے نکلنے کے بعد اچھی زندگی کی طرف راغب ہو جاتے تھے کیوں کہ جرم، سزا، قید یہ سب تو بہر حال کسی بھی شخص کو نا منظور رہی ہیں۔

☆......☆......☆

یہ خاتون اقرار جرم تو کر چکی تھیں مگر وجہ بتانے سے گریزاں تھیں۔ کسی وکیل کو بھی نہیں ہائر کیا بس خاموشی سے سزا کی منتظر تھی۔ اس کے بچے ماموں کے گھر تھے کوئی اس سے ملنے نہیں آتا تھا میری دو تین ملاقاتوں کے بعد وہ کچھ بتانے پر راضی ہوئی تھی وہ پینتالیس سال کی معقول صورت عورت تھی۔ میں بھی ا سکا جرم تو جان چکا تھا مگر وجہ سے لاعلم تھا اپنے گھر میں بھی اس نے کسی کو نہ بتایا تھا ذاتوں رات اس نے اپنے دونوں بچوں کو بھائی کے گھر چھوڑا اور خود تھانے میں پیش ہو گئی۔ خود اقرار جرم، آلہ قتل اور لاش برآمدگی کے بعد تھانے والوں نے پرچہ کاٹا اور جیل میں ڈال دیا اس کی طرف سے کوئی وکیل نہیں تھا عدالت کے کہنے کے باوجود اس نے کسی بھی وکیل کو ہائر نہیں کیا۔

میں کبھی کبھی اپنے کسی کیس اسٹڈی کے سلسلے میں جیل جاتا تھا اور وہاں موجود قیدیوں سے بات کرتا۔ تمام ہی قیدی جو پہلی دفعہ وہاں آئے ہوں لپک لپک کے مدد کے خواہش مند ہوتے تھے سوائے اس خاتون کے اسی بات نے مجھے اس کی طرف راغب کیا کہ میں پوری کوشش کرتا ہوں کہ کسی بھی بے گناہ کو (میں اسی طرح کے لوگوں کو بے گناہ ہی کہتا تھا) سزا نہ ہو یا کم سے کم ہو کچھ نہیں تو میں اسے دوبارہ برائی کی طرف بڑھنے سے روک سکوں۔ بہر حال مجھے خوشی تھی کہ وہ بات کرنے پہ راضی ہوگئی تھی۔

☆......☆......☆

مجھے افسوس ہوا وہ اندر ہی آنسو پی رہی تھی تھوڑی دیر میں اس نے خود پہ قابو پایا اور اٹھ کے جانے لگی۔ ''بات ابھی ادھوری ہے'' میں نے اسے یاد دلایا اگر تم خاموش رہنا چاہتی ہو تو صرف یہ یاد رکھنا کہ اب کہ بار یہ خاموشی تمہارے بچوں کے حق میں بہتر نہ ہوگی۔ اور تم ہرگز یہ نہیں چاہو گی کہ تمہاری بیٹی بھی خاموشی کا یہ زہر پیتی رہے۔ کیوں کہ وہ جس گھر میں ہے وہی گھر تمہاری بربادی کا پہلا مقام تھا وہ پلٹ آئی اور دوبارہ کرسی پر بیٹھ گئی اور سلسلہ کلام وہیں سے جوڑا گھر آکے بچے اپنے کمروں میں چلے گئے اور ہم بھی سونے کے لیے لیٹ گئے۔

رات کے کسی پہر اچانک میری آنکھ کھلی کچھ عجیب سا محسوس ہونے لگا برابر میں نظر ڈالی تو وہ بیڈ پر نہیں تھے میں سمجھا باتھ روم میں ہوں گے جب کافی دیر ہوگئی اور وہ باتھ روم سے بھی نہیں نکلے تو میں اٹھ کے کمرے سے باہر آگئی۔ ادھر اُدھر دیکھا گیلری میں دیکھا کہیں بھی نہیں تھے چھوٹا سا فلیٹ تھا اس میں بندہ کہاں غائب ہوسکتا ہے خیال آیا کے شاید باہر چلے گئے ہوں میں واپس اپنے کمرے کی طرف بڑھی تو مجھے بیٹی کے کمرے سے کچھ آوازیں آتی محسوس ہوئی میں بھاگ کر دروازے پر پہنچی دروازہ بند تھا۔ میں نے کان لگائے اور اندر سے جو سنا اور محسوس کیا اس کو ایک ماں کیا سمجھ سکتی ہے۔

☆......☆......☆

میں نے کچن سے چھری اٹھائی اور دوسری چابی سے لاک کھول کر اندر داخل ہوگئی۔ میری بیٹی کے بکھرے بال اور روتی ہوئی آنکھیں سب کہہ گئیں وہ مجھے دیکھ کر گھبرا گیا۔ ابھی وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوا تھا میری بیٹی ڈری سہمی کونے میں کھڑی تھی مجھے دیکھا تو میرے گلے لگ گئی۔ میرے ہاتھ میں چھری دیکھ کر وہ گھبرا گئے۔ ''وہ میں...... میں..... در...... دیکھو دیکھو تم دور رہو مجھ سے'' اس کی زبان لڑکھڑا رہی تھی میری آنکھوں میں وحشت اور دل دکھ سے بھر آیا یہ تو میں نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ یہ دکھ بھی میرے حصے میں آئے گا۔

میری خاموشی سے وہ ذرا شیر ہوگئے فوراً پینترا بدلا۔ ''کیا کرلوگی تم ہیں؟ بولو یہیں ختم کردو اس بات کو ورنہ میں تمہیں طلاق دے دوں گا رُلتی پھروگی۔'' اب مجھے ان کے دوبارہ التفات کی وجہ سمجھ آگئی تھی ان کی نظریں میری معصوم بیٹی پر تھیں مجھے ایکدم ہی ان سے کراہیت محسوس ہوئی۔ اچانک میں نے لات چلا دی جوان کے پیٹ پہ لگی وہ گر گئے بوکھلاہٹ میں مجھ سے یہ توقع نہ تھی وہ جیسے ہی گرے میں ان کے سینے پر چڑھ کر بیٹھ گئی وہ ایکدم گھگھیانے لگے ''دیکھو پلیز مجھے مت مارو میں چلا جاؤں گا انھوں نے میرے آگے ہاتھ جوڑے آنکھوں میں موت کو سامنے دیکھ کر خوف اتر آیا پلیز ایسا نہیں کرو مجھے معاف کردو۔''

''ششش! خاموش'' میں نے ہونٹوں پہ انگلی رکھی میرا ہاتھ حرکت میں آیا اور وہ چھری میں نے اس کے سینے میں اتار دی سدا خاموش رہنے والی عورت نے آج کسی کو خاموش کروادیا تھا وہ بھی ہمیشہ کے لیے۔

☆......☆......☆

میں نے اس کے لیے وکیل کا بندوبست کیا۔ میں نے اس کا کیس بہت اچھی طرح ہینڈل کیا اور اسے کم سے کم سزا دلوائی۔ اور اس کے کہنے پہ ہم نے اسکے بچوں کو ایک اچھے ویلفیئر ادارے میں رکھا۔ کیوں کہ ماموں کے گھر رہ کر شاید اس کی بیٹی بھی زبان کبھی نہ کھول پاتی۔

☆☆......☆☆



تشنگی باقی رہے گی

ساحل ابڑو

دلوں کے تار جھنجھنا دینے والی داستان/ بلوچستان سے

میں اپنی اہلیہ کے ہمراہ اس کی کلاس فیلو کے ہاں تعزیت کے لیے گیا تھا۔ اور پھر ایک کرٹسی وزٹ کے لیے قبرستان تک آ گئے تھے۔ اس بے چاری کی ایک بہن اور تین بیٹیاں گھر میں آگ لگنے سے مر گئی تھیں۔ بہنوئی نے جھلسنے کے بعد چھلانگ لگا دی مگر اس کی زندگی بھی روٹھ گئی تھی۔ ایک ہی گھر سے پانچ جنازے اٹھے پانچ قبریں آباد ہو گئیں۔

قبروں کو دیکھتے۔ مکینوں کے نام پڑھتے ہوئے ایک قبر نام نے ہم دونوں کے قدم جکڑ لیے وہ قبر ہماری ایک دور کی عزیز کی کرن گل کی تھی۔...... ہم نے اس کی قبر پہ کھڑے ہو کر دعا مانگی تو ہمیں وہ خوب صورت جاذب لڑکی نظر آ گئی۔ نہایت ہی غریب گھرانے سے تعلق رکھنے والی اس لڑکی نے اپنے خاندان کی خاطر بہت دکھ اٹھائے تھے۔ اس کے بڑے خواب تھے اس نے گھر کے حالات بدلنے کا عہد کیا تھا غربت کو مٹانے کی خاطر اس نے خود کو مٹا دیا تھا۔

☆......☆......☆

اس کا باپ ایک فیکٹری میں مزدور تھا۔ اس کے پانچ بچے تھے کرن گل بہنوں میں سب سے چھوٹی تھی۔ اس سے چھوٹا ان کا ایک بھائی تھا۔ ایک کمرے کا ایک مکان تھا۔ ایک چھوٹا سا باتھ روم اور ایک کچن تھا۔ جس میں وہ سب لوگ رہتے تھے مکان ان کا اپنا تھا۔ پھر بھی باپ کی معمولی سی تنخواہ سے گزارہ مشکل سے ہوتا تھا۔ کبھی ایک وقت کی روٹی نصیب ہوتی تھی کبھی فاقا...... کبھی گھر کا چولہا نہیں جلتا تھا تو کبھی کسی بیمار کے لیے دوا نہیں ہوتی تھی۔ کبھی نمک مرچ سے روٹی کھائی جاتی تھی۔ اور کبھی دو دو دن فاقے...... گھر میں گیس تو تھی ہی نہیں کبھی لکڑیاں جلائی جاتی تو کبھی ہمسائے کے گھر سے روٹیاں پکا کر لائی جاتیں مفلسی اور بے چارگی تھی۔

☆......☆......☆

اس کی بڑی بہن کی شادی ہو گئی تھی۔ اس کے باپ نے اس کی رخصتی کے لیے فیکٹری سے قرض لیا تھا اور جواب اتارنا مشکل ہو رہا تھا۔ قرض ادا کرنے کی فکر اور غریبی کی لمبی لکیر نے اس کے باپ کی بھی زندگی چھین لی۔ اس کے باپ کو دل کا دورہ پڑا تھا مگر اس کو دوا تک نصیب نہیں ہوئی تھی، وہ سب یتیمی کے غم سے دو چار ہوئے۔ کرن گل اور اس کا بھائی ابھی اسکول میں ہی تھے۔ جب باپ کی ٹھنڈی چھاؤں ان کے سروں سے چھن گئی تھی۔ یتیمی بھی کسی عذاب سے کم



نہیں ہوتی یتیمی اور غربت کے بدترین دن اس خاندان کو گزارنے پڑ گئے۔ غربت سے زیادہ اس دنیا میں کوئی مصیبت نہیں اس کے باپ کی وفات کو دو ماہ ہی گزرے تھے کہ فیکٹری مالکان نے اس رقم کی واپسی کا تقاضا کر دیا جو اس کے باپ نے بطور قرض لی تھی۔ مگر اس کی ماں میں اتنی سکت نہ تھی کہ وہ قرض لوٹا سکے۔ اس نے فیکٹری مالکان کی بہت منتیں کی ہاتھ جوڑے کہ وہ قرض معاف کر دیں، مگر ان لوگوں نے قرض معاف نہ کیا۔ اور ان کا قرض کی واپسی کا تقاضا بڑھتا گیا۔

کرن گل کی ماں نے رشتہ داروں سے بھی مدد کی اپیل کی مگر کسی نے قرض کی رقم نہ دی...... یونہی ایک سال کا عرصہ بیت گیا...... ان دنوں وہ اپنا مکان فروخت کر کے قرض کی رقم ادا کرنے کا پروگرام بنا رہے تھے کہ میری تبدیلی کراچی والے دفتر میں ہو گئی اور میں بچوں کو ساتھ لے کر کراچی آ گیا۔ کراچی کا ماحول ایسا راس آیا کہ میں کراچی کا ہی ہو کر رہ گیا۔ والدین کو بھی یہیں کراچی لے آیا تھا۔ پانچ سال بعد ہمارا ایک رشتہ دار کسی کام کے سلسلے میں کراچی آیا تو وہ ہمارے ہاں چلا آیا۔ اس سے اپنے شہر محلہ اور برادری کی باتیں ہو رہی تو باتوں باتوں میں کرن گل اور اس کے خاندان کا ذکر آ گیا اس نے بتایا انہوں نے اپنا مکان فروخت کر کے قرض چکایا تھا اور پھر کرائے میں رہ رہے تھے۔ لیکن اس کے بعد تو نہ جانے ان کے حالات بدلے ہیں کہ ان کی تقدیر ہی بدل گئی۔

کرن گل کہیں ملازمت کرتی ہے اس نے اپنے بہن بھائیوں کی شادیاں کر دی ہیں وہ کہیں ملازمت کرتے ہیں۔ اس کے پاس اب کوٹھی بھی ہے شاندار گاڑی بھی ہے۔ اب تو ان کے ٹھاٹھ باٹھ اور ہی نرالے ہیں یہ سب کچھ حیران کر دینے والا تھا۔ مگر ہم نے ان میں زیادہ دلچسپی نہ لی اور نہ ہی کرید کی کہ یہ سب کیسے ہوا یوں بات آئی گئی ہو گئی۔

☆......☆......☆

ایک سال بعد ایک عزیز کی شادی کے سلسلے میں ہمارا آبائی شہر آنا پڑا میں نے پندرہ دن کی چھٹی لی ہوئی تھی ہم دونوں میاں بیوی شادی میں شرکت کے لیے آئے تھے۔ مہندی کی رسم میں کرن گل بھی آئی تھی۔ وہ عموماً برادری کی تقریب میں شرکت نہیں کرتی تھی۔ اس کا بھائی اور بھابھی ہی رشتہ داری نبھار ہے تھے۔ ان دنوں اس کا بھائی اور بھابھی سکولوں میں چھٹیاں ہونے کی وجہ سے بچوں کو ساتھ لے کر کہیں تفریح کے لیے گئے ہوئے تھے۔ اس لیے کرن گل کو یہ فریضہ ادا کرنا پڑا تھا اسکی ملاقات میری بیوی سے بھی ہوئی تھی اس کا رنگ روپ ہی بدل گیا تھا۔ میری بیگم اس سے تو بے تکلفی سے ملی مگر کرن گل خاموش تھی۔ وہ کسی بھی عورت سے کھل کے بات نہیں کر رہی تھی۔ اس کا نہایت ہی قیمتی لباس گلے میں سونے کا قیمتی سیٹ اور شاندار گاڑی دیکھ کر کچھ عورتیں تو اس پر شک کر رہی تھیں۔ مگر کچھ عورتیں اس پر اور اسکے کردار پر طنز کر رہی تھیں جتنے منہ اتنی باتیں ہر کوئی اسے تنقید کا نشانہ بنے پر تلی بیٹھی تھیں کرن گل چپ چاپ سی تھی جیسے کوئی دکھ اندر ہی اندر اس کو کھا رہا ہے ...... ان عورتوں میں سے ایک نے کرن سے پوچھا تمہاری شادی ہوگئی ہے؟۔

اس سوال پر کرن گل کا چہرہ دھواں دھواں ہوگیا اس کی خوبصورت آنکھوں میں نمی سی تیرنے لگی کرن گل نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ جب ایک منہ پھٹ عورت نے اس سے کردار پر تنقید کرتے ہوئے کہا کہ ایسے ناز ونخرے تو کوٹھے والیوں کے ہوتے ہیں تو کرن گل برداشت نہ کر سکی۔ اس نے کسی کی بات کا جواب نہ دیا اور تقریب ادھوری چھوڑ کر چلی گئی۔

پھر کیا تھا اس کا پنڈورا بکس کھل گیا کوئی حقیقت نہ جانتی تھی مگر اب ہر ایک نے کھل کر اس کے خلاف باتیں کرنے لگے ہر کوئی اسے برا بھلا کہہ رہی تھی۔ سارے تیروں کے رخ کرن گل کی طرف تھے۔ مگر یہ کوئی نہیں جانتا تھا کہ اندر سے وہ کتنی دکھی ہے اس کے لبوں پر زخمی مسکراہٹ تھی کیوں کہ اس نے موت پر زندگی کا نقاب اوڑھ رکھا تھا۔

☆......☆......☆

بحریہ ٹاؤن کے سفاری ولا میں آ کر کرن گل نے گاڑی پارک کی ...... اپنا ہینڈ بیگ اور فون پکڑ کر باہر نکلی اور اونچی اونچی ہیل کی ٹک ٹک کے ساتھ اندر چلی گئی بڑے سے خالی لاؤنج سے ہوتی ہوئی وہ اپنے بیڈ روم میں آ گئی اس نے پرس اور موبائل صوفے پر پھینکا اور اپنے بستر پر اوندھے منہ گر کر سسکنے لگی۔ وہ اسی وجہ سے کسی محفل میں نہیں جاتی تھی، کہ وہ لوگوں کے سوالوں کا جواب نہیں دے سکتی تھی۔ آج بھی یہی ہوا تھا مختلف عورتوں کی طنز بھری گفتگو نے اس کے دل و دماغ میں ایک ہلچل سی مچادی تھی وہ دیر تک سسکتی اور بلکتی رہی ......۔

”بی بی جی چائے“ ملازمہ کی آ گوز نے اسے چونکا دیا۔

ہاں ...... یہیں رکھ دو ...... اس نے بھیگی آواز میں کہا۔

”بی بی جی! لگتا ہے آج آپ کو ماں کی یاد آ رہی ہے۔“ ملازمہ نے زمین پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

وہ کب یاد نہیں آتی اس نے سوالیاں نظروں سے ملازمہ کی طرف دیکھا۔

”ہاں بی بی جی! ماں تو چیز ہی ایسی ہوتی ہے مرنے کے بعد اس کی دعائیں ساتھ رہتی ہیں۔“ اور پھر آپ ان سے وہ آپ سے بہت پیار کرتی تھیں وہ اپنا پسینہ صاف کرتے ہوئے بولی۔

”ہاں اب تو کوئی پوچھنے والا بھی نہیں رہا کہ آج اتنی دکھی کیوں ہو؟“ کرن گل نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔

”بڑی بی بی جی کو آپ کی شادی کی بہت فکر لگی رہتی تھی۔ مگر وہ یہ حسرت دل میں لیے چلی گئی؟“ نوکرانی نے گہری سانس لے کر کہا۔ تو کرن گل نے اس کی طرف دیکھا اور دیکھتی رہ گئی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے جیسے کچھ سائے سے لہرا گئے تھے۔

”بی بی جی چائے۔ ٹھنڈی ہو رہی ہے۔“

''ہاں'' وہ چونکی پھر چائے کا کپ اٹھالیا۔ اور ٹھنڈی چائے کو دو تین گھونٹوں میں ہی ختم کرلیا۔

ملازمہ نے کپ اٹھایا۔ تو اس نے ملازمہ سے کہا۔ میں کھانا کھا کر آئی ہوں تم اب چھٹی کرو صبح ناشتہ پہ بات ہوگی۔

☆......☆......☆

ملازمہ کپ اٹھا کر چلی گئی...... تو کرن گل اٹھ کر لاؤنج میں آ گئی اور اس سے ملحق ماں کے کمرے میں چلی آئی...... وہاں ایک ٹیبل پر ان کی ایک تصویر پڑی ہوئی تھی۔ اس نے تصویر کو ہاتھ میں اٹھایا اور اسے چوم کر کہنے لگی۔

''امی'' آپ ٹھیک ہی کہا کرتی تھیں کہ ایک دن آئے گا میں اکیلی رہ جاؤں گی اور زمانے والے مجھے جینے نہیں دیں گے۔ امی آج وہ دن آ گیا ہے کہ آج میں اکیلی ہوں۔ بالکل اکیلی۔ اب تو گھر آنے کو بھی جی نہیں چاہتا میں گھر آؤں بھی تو کس کے لیے وہ خالی خالی نظروں سے ادھر اُدھر دیکھنے لگی۔ آنسوں اس کی آنکھوں سے خشک ہو کر اب اسکے دل کی ویرانی پر برسنے لگے تھے۔ اسے ماضی کا ایک ایک لمحہ یاد آ رہا تھا۔ جیسے ابھی کل کی بات ہو وہ دفتر سے چھٹی کر کے جلدی جلدی گھر پہنچی تھی۔ تاکہ میں آپ کو کھانا کھلاؤں...... دوا دوں پھر ڈھیروں باتیں کروں وقت کتنی تیزی سے بدل جاتا ہے۔ وہ تصویر اٹھائے لاؤنج میں آ گئی اور کسی بدروح کی طرح ادھر اُدھر ٹہلنے لگی۔ لاؤنج میں اپنی فیملی کی تصویر کو بھی دیکھنے لگی۔ جس میں وہ سب تھے ماں باپ بہن اور چاروں بہنیں اس وقت ہم غریب تھے مگر ایک ساتھ تھے۔

وہ چھوٹا سا گھر اسے یاد آیا جہاں وہ سب مل کر رہتے تھے اس کا باپ غربت کے ہاتھوں مر گیا تھا۔ اس گھر میں ہم نے زندگی کے بدترین دن گزارے تھے۔ وہ بھی آج یاد آتے ہیں تو روح کانپ جاتی ہے۔ غربت نے ابا کو تو نگل لیا تھا۔ اس وقت میں اس قابل نہ تھی کہ ابا کا علاج کروا پاتی۔ مگر ماں جی۔ میں نے آپ کے لیے جتنا بھی کیا اس سے بھی کچھ حاصل نہ ہوا وہ دکھی دل کے ساتھ اپنے تمام تر

بات کرنی مجھے مشکل کبھی ایسی تو نہ تھی
جیسی اب ہے تری محفل کبھی ایسی تو نہ تھی
لے گیا چھین کے کون آج ترا صبر و قرار
بے قراری تجھے اے دل کبھی ایسی تو نہ تھی
تیری آنکھوں نے خدا جانے ، کیا کیا جادو
کہ طبیعت میری مائل کبھی ایسی تو نہ تھی
شاعر: بہادر شاہ ظفر

پچھتاوؤں اور بھاری وجود کو اکھٹا کر کے وہاں سے نکل آئی شاید وہ گذشتہ تمام یادوں سے پیچھا چھڑوانا چاہتی تھی۔ رشتہ داروں کی زہر بھری باتیں اس کے دماغ کو چھلنی کر رہی تھیں۔ شاید وہ تھک چکی تھی۔ وہ چلتے ہوئے اوپر کی منزل پر آ گئی جہاں اس کے کمرے کے ساتھ تین کمرے اور بھی تھے بالکل خالی تھے۔

☆......☆......☆

''ٹک ٹک ٹک''

پورے گھر میں اس کی سینڈل کی آواز گونج رہی تھی وہ بیڈ پر گر کر چھت کو گھورنے لگی خیالوں کی ایک یلغار اس کے دماغ پر حملہ آور ہو رہی تھی اور وہ انہیں جھٹکنا چاہتی تھی۔ اس نے اپنا فون اٹھایا اور بہنوں بھائیوں کو کال کرنے لگی مگر ہر کوئی اسے مصروف ہی ملا کسی کے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ وہ اس سے بات ہی کر لے یا اس کی تنہائی دور کرنے کے لیے اس کے پاس آ جائے ...... وہ الجھ کر رہ گئی مہندی والی تقریب میں عورتوں کی باتیں ہتھوڑے بن کر اس کے کانوں میں گونجنے لگیں، ایسے میں اس کے کانوں میں اپنی ماں کی آواز گونجی۔

''اپنا گھر اپنا ہوتا ہے بیٹی۔''

اماں آپ کیسی باتیں کرتی ہیں یہ سب بھی تو میرے بچے ہیں۔ تین بہنیں اور ایک بھائی اور انکے

بچے انکے ہوتے ہوئے میں کیوں اکیلی رہ سکتی ہوں میری شادی ہوگئی تو آپ پھر کیا کریں گی کہاں رہیں گی کس کے ساتھ رہیں گی؟

تم ہمیشہ مجھے ٹال جاتی ہو مگر جب میں نہ رہی تو پھر تمہیں پتا چلے گا اس کی ماں آنکھوں میں نمی لا کر کہتی۔

اماں آپ صحیح کہتی ہیں مگر میں کیا کروں۔ میرے پاؤں میں ایسی ان دیکھی زنجیریں ہیں۔ جو پہلے ہی کسی کے نکاح میں ہے۔ نکاح...... وہ زہر بھری ہنسی ہنسی اور پھر قہقہہ لگا کر بولی...... شوہر، گھر، بچے یہ سب تو میرے پاس ہے۔ ایک ایسا شوہر جن سے میرا نکاح تو ہوا ہے...... مگر مگر جو کبھی میرا شوہر نہ کہلوائے گا اور نہ کبھی میں اس کی بیوی...... اس کے تو پہلے ہی بیوی بچے ہیں۔

یہ میری زندگی کا ایسا سچ ہے جو میرے سوا کوئی نہیں جانتا کوئی جان بھی لے تو کیا کرے گا عزت ایک بار چلی جائے تو واپس نہیں آتی وہ لیٹے لیٹے چھت کو گھورنے لگی جارہی تھی...... کاش وہ دن کبھی بھی نہ آیا ہوتا یا آنے سے پہلے مجھے موت آ گئی ہوتی۔ کاش اس نے قرضہ لیا ہوتا اس کے باپ نے قرض نہ لیا ہوتا۔

☆......☆......☆

مس کرن گل آج آپ نے سارا کام مکمل کر کے جانا ہے وہ اس کی میز پر فائل پٹخ کر بولا۔

''سر آج تو بہت دیر ہوگئی ہے میں کل۔''

''کل کل کل...... آخر تمہاری کل کب آئے گی مجھے یہ فائلیں آج ہی مکمل چاہئے رات کے بارہ بج جائے تمہیں جو اتنا زیادہ لون دیا گیا ہے وہ مفت میں تو نہیں دیا گیا۔'' وہ غصے سے باہر نکل گیا سب ملازم چھٹی کر کے جا چکے تھے مگر وہ ابھی تک اپنے کام میں لگی ہوئی تھی اسے یہاں کام کرتے ہوئے زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا۔ تب اس نے گھر کا خرچہ چلانے کے لیے سروس کرنے کا سوچا تھا اس کمپنی میں اسے مشکل سے جاب ملی تھی۔ اتنی سی عمر میں وہ اتنی بڑی دنیا میں کمانے کے لیے نکلی تھی تاکہ گھر کے سارے افراد کا پیٹ بھرا جا سکے۔ وہ اتنی نادان اور ناسمجھ تھی کہ اسے دنیا میں لڑکیوں کے ساتھ ہونے والی زیادتیوں کی خبر ہی نہ تھی۔ وہ تو گھر سے رزق حلال کمانے نکلی تھی اسے کیا معلوم تھا اس دنیا میں انسانوں کے روپ میں کتنے شیطان ہیں اس نے ماں کے لیے قرض لیا جسے اس کے باس نے خوشدلی سے دیا تھا پھر دونوں بہنوں کی رخصتی کے لیے بھی اس نے ادھار لیا تھا آہستہ آہستہ قرض کی رقم بڑھتی جارہی تھی، وہ اوور ٹائم لگا کر بھی اس کو لوٹا نہ پارہی تھی، یہ اس کی سمجھ میں نا آرہا تھا۔

''سر میں جلد ہی سارا قرض اتار ڈالوں گی'' وہ شرمندہ سی ہو کہ بولی۔

''کب اتارو گی؟'' وہ نظریں جھکائے کھڑی تھی اس کے معصوم اور دلکش چہرے پر پسینے آرہے تھے۔ سفید گالوں کی لالی اور بھی گہری ہو رہی تھی وہ دھڑکتے دل کے ساتھ یہ سب کچھ سن رہی تھی مگر کچھ کہہ نہیں پارہی تھی اس کا باس ٹھیک ہی تو کہہ رہا تھا۔ مگر وہ کیا کرتی اپنی غربت کے ہاتھوں مجبور تھی۔

''اگر یہ قرض اتر بھی سکتا ہے مزید لون بھی مل سکتا ہے تمہاری کوئی اور ضرورت ہو تو وہ بھی پوری ہو سکتی ہے۔''

وہ اپنی کرسی سے اٹھ کر اس کے قریب آ کر بولا میں جانتا ہوں کہ تم بہت ہی مفلس اور مجبور ہو مگر اس کے ساتھ ساتھ بے حد حسین بھی ہو دنیا میں سب کچھ مل سکتا ہے بس جیب میں پیسہ ہونا چاہئے پیسہ ہو تو سب کچھ اپنا ہوتا ہے۔

وہ اس کے مقابل کھڑا تھا وہ ڈری سہمی وہاں ہی جمی ہوئی تھی۔ تم بہت خوبصورت ہو بہت ہی معصوم اور جوان بھی تمہیں تو کسی رئیس کے گھر میں پیدا ہونا چاہیے تھا۔ محل کی رانی ہونا چاہیے تھا۔ مگر تمہاری قسمت میں غربت کی چکی لکھی ہے۔

اس نے اس کے گال کو نرمی سے چھوا تو وہ پیچھے ہٹی جیسے اسے کرنٹ لگ گیا ہو وہ گھبراہٹ اور دحشت زدہ نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔

تم چاہو تو میں تمہیں محل کی رانی بنا سکتا ہوں۔

تمہیں راتوں میں زمین سے اٹھا کر آسمان پر بیٹھا سکتا ہوں۔ تم، ہارے ہونٹوں پہ مسکراہٹ سجا سکتا ہوں۔ تمہاری غربت بھری زندگی میں امیری کے پھول کھلا سکتا ہوں۔ وہ اس کے قریب آ کر بولا۔

''بس تم اپنا آپ میرے نام کر دو۔'' وہ ہوس بھری نگاہوں س یا سے دیکھتا ہوا بولا......

وہ حیرت بھری نگاہوں اور بے یقینی کے انداز میں دیکھ رہی تھی۔ کہ وہ آج تک جسے نیک اور پارسا فرشتہ سمجھتی تھی وہ تو ایک شیطان نکلا اور آج اپنی اصلی شکل میں اس کے سامنے آیا تھا درمیانی عمر اور واجبی سی شکل مگر نہایت ہی امیر دکبیر کئی کارخانوں کا مالک تھا۔ وہ جسے کرن گل نے کبھی آنکھ بھر کے نہیں دیکھا تھا آج اس کے سامنے کھڑا اس کی بولی لگا رہا تھا۔ وہ جو گھر سے صرف عزت کمانے نکلی تھی آج وہ اس کی نیلامی کر رہا تھا۔ وہ بھول گیا تھا کہ گھر میں اس کی بیوی اور جوان بچے بھی ہیں۔

''بس تم مجھے خوش کر دو'' میں تمہیں خوش کر دوں گا اس نے ہاتھ بڑھایا تو کرن گل نے جھٹک دیا۔ ''آپ سب کچھ خرید سکتے ہیں مگر میری عزت نہیں میں بکاؤ مال نہیں ہو۔'' اس نے غصے سے کہا اور باہر نکل آئی۔

☆......☆......☆

بس وہ دن تھا اور آج کا دن اس کا باس دفتر میں بات بے بات اس کی بے عزتی کر دیتا اور اسے اسٹاف کے سامنے ڈانٹ دیتا، اور اسے قرض کے طعنے بھی دیتا۔ اس نے اسے بری طرح اپنے جال میں جکڑ لیا تھا۔ اور اسے دھمکی دی کہ اگر اس نے آفس چھوڑا تو وہ اس کے خلاف پرچہ کٹوا دے گا کتنا بے بس اور مجبور ہوتا ہے ایک غریب جس کے پاس نہ کوئی اختیار ہوتا ہے اور نہ ہی کہیں جانا اس کے بس میں ہوا ہے وہ جو پہلے ہی اپنے گھر سے دکھوں اور پریشانیوں میں الجھی ہوئی تھی، یہاں جاب کرنے پر مجبور تھی، اور آج وہ ایک بار پھر باس کے غصے کا نشانہ بن رہی تھی۔

''جی سر!'' وہ گھبرا کر بولی۔

فائلز لے کر میرے آفس میں آ جاؤ۔

''جی سر۔''

جس بات کا ڈر تھا۔ وہی ہوئی۔ وہ فائلز لے کر اندر گئی تو وہ بولا۔

''کیا سوچا ہے تم نے؟''

''میں بتا چکی ہوں سر'' اس نے نظریں جھکاتے ہوئے کہا ...... وہ غصے سے اٹھا فائل لے کر پرے پھینکی۔ اور بولا ''تم اپنی قیمت بڑھوانا چاہتی ہو بولا کیا قیمت ہے تمہاری'' وہ اسے دونوں بازوؤں سے پکڑ کر بولا۔

''چھوڑ دیں مجھے'' میں کوئی بکاؤ مال نہی ہوں کہ آپ مجھے پیسے سے خرید لیں گے ...... یہ تمہاری بھول ہے۔ وہ اس کی گرفت سے آزاد ہونے کے لیے سٹپٹا کر بولی۔

تم جیسی کئی خرید چکا ہوں تمہیں تو بنا مول کے حاصل کر سکتا ہوں۔ تم تو میری مقروض ہو اس نے اسے صوفے کی طرف دھکیلا اور دروازہ لاک کر دیا ...... کاش میں مر گئی ہوتی آہ شاید مرنا میرے بس میں ہوتا ...... اس کی ساکت آنکھیں چھت پر گڑی تھیں، اس کے آنسو جو جانے کب سے خشک ہو چکے تھے آج سے برسات بن گئی تھیں ......

''ماں جی'' کاش آپ جان پائیں کے آپ کی بیٹی تو اس دن ہی لٹ گئی تھی ...... اس نے بے دام ہی میرا سودا کر ڈالا تھا وہ صحیح تو کہتا تھا اس دنیا میں ہر شے بکاؤ ہے اس کے ہاتھوں میں نے اپنا آپ بیچ کر یہ مقام حاصل کیا ہے یہ سب ......

پھر کیا تھا دیکھتے ہی دیکھتے اس کی بہنوں اور بھائیوں کی بھی شادی ہو گئی اور وہ ایک بڑے سی کوٹھی میں رہنے لگی ...... گاڑی بھی مل گئی اس نے اُس معقول معاوضہ دے دیا تھا۔

☆......☆......☆

''میں نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ یہ میرا مسلہ نہیں ہے۔'' وہ سرد لہجے میں بولا ویسے بھی تم ہی نے کہا تھا ورنہ میرے لیے کاغذ کا ٹکڑا کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔

''ہاں آپ کے لیے تو وہ کاغذ کا ایک ٹکڑا ہی ہے

اور دیکھا جائے تو میرے بھی کس کام کا نہیں ہے۔ میں آپ کا نام ہی اپنے نام کے ساتھ نہیں جوڑ سکتی اور نہ ہی ماں بن سکتی ہوں۔''

''اچھا بس یہ کوئی بات نہیں جو آج پھر تمہیں یاد آ گئی ہے یہ سب تو بہت پہلے طے ہو چکا تھا اور اب تمہیں یہ سب باتیں کس لیے یاد آ رہی ہیں کیا پھر کچھ اور ہی چاہیے؟ گھر، بنگلہ، گاڑی، نوکر، عزت، اب کیا باقی رہ گیا ہے۔ جس کے لیے تم مچل رہی ہو۔''

وہ ایک بار پھر سے آج پہلے والا باس بنا ہوا تھا۔ اتنے سالوں سے کسی بھی چیز میں کوئی فرق نہیں پڑا تھا اس کلا رویہ ان کا رشتہ۔ وہ اس کا نام نہاد شوہر تھا۔ اور وہ اس کی خریدی ہوئی باندی وہ صحیح تو کہہ رہا تھا۔ کہ سب کچھ تو تھا اس کے پاس اس نے اسے سب کچھ ہی تو دیا تھا اسے ہر طرح عیش و آرام۔ اچھی نوکری، اتنا بڑا گھر، ہاں آج اس کے پاس سب کچھ ہی تو ہے وہ بیڈ سے اٹھ کر واش روم میں آ گئی اس نے شاور لیا اور واپس کمرے میں آ گئی اسکے سر میں درد ہونے لگا تھا اور رواں رواں بھی ٹیسیس مار رہا تھا۔ وہ اپنے کمرے سے باہر آئی اور سامنے والے کمروں کے دروازوں کو دیکھنے لگی...... اور سوچنے لگی...... کبھی مکین بہت تھے اور مکان نہیں تھا آج اتنا بڑا مکان ہے تو کوئی مکین نہیں ہے ہر طرف سناٹا تھا مہیب سناٹا تھا کہ وہ کسی کھنڈر میں کھڑی ہے وہ سیڑھیاں اتر کر باورچی خانے کی طرف جانے لگی۔ لگتا تھا وہ سیڑھیاں نہیں کسی دلدل میں اتر رہی ہے ایسی دلدل جہاں سے باہر نکلنا ممکن نہ تھا اس وحشت بھرے گھر میں سکون نہ تھا ہر طرف بے سکونی تھی پھر اس کے اندر سکون نہ تھا تنہائی کا ایک گھنا جنگل تھا لوگوں کی دل کو تڑپانے والی باتیں تھیں جو اس کو نگلنے کے لیے تیار کھڑی تھیں۔

اس کے اندر کی ویرانی اسے نگلنے لگی۔ وہ کچن میں آ کر ڈائننگ ٹیبل کے گرد ایک کرسی پر بیٹھ گئی تو اس کا سر درد سے پھٹنے لگا شاید کا اٹیک ہوا تھا اسے۔ اس نے مشکل سے فریج کھولا اس میں سے ایک کولڈ ڈرنک نکالا اور آہستہ آہستہ اس کے گھونٹ بھرنے لگی،

......اس کا درد بڑھتا جا رہا تھا کوئی نہیں تھا، جو اسے اسپتال لے کر جائے کوئی نہیں تھا جو اسے میڈیکل اسٹور سے دوا ہی لا دے اس نے خود ہی دوا لائی تھی مگر اس کی ہمت نہ ہو رہی تھی تبھی اس کے اندر سے ایک آواز بلند ہوئی اور پورے گھر میں گونجنے لگی۔

☆......☆......☆

کرن گل آج تیرے پاس دنیا کی ہر شے ہے ......مگر سکون نہیں ہے کھانا ہے مگر بھوک نہیں ہے۔ پیسہ ہے مگر نہ دینا کی نظر میں عزت اور نہ ہی۔ اپنی نظر میں، اتنا بڑا گھر ہے مگر مکین نہیں ہے، شوہر ہے مگر وفا نہیں ہے، وقت ہے پر کسی کا ساتھ نہیں اتنا کچھ ہالک کر کے بھی تو خالی ہاتھ ہے۔ ہاتھوں میں لکیریں ہیں مگر قسمت کی کوئی لکیر نہیں...... یہ سب کچھ لا حاصل ہے اتنا کچھ گنوا کر بھی میرے ہاتھ آج کیوں خالی ہیں کیوں کوئی ایسی کمی ہے جو ان سب چیزوں پر بھاری ہے ......سب ہی اپنے اپنے گھروں میں شوہروں اور اپنے بچوں کے ساتھ خوش باش ہیں مگر میرے پاس کیا ہے۔

ایسا شوہر جو اپنی ہوس پوری کرنے کی غرض سے مجھے استعمال کرتا ہے۔ جس کے لیے میں فقط ایک دل بہلانے کا کھلونا ہوں جس سے جب اس کا جی چاہے کھیل لیتا ہے۔ پھر مجھے تنہائی کے جنگل میں جلنے کے لیے ننگے پاؤں اکیلا چھوڑ دیتا ہے۔ میری گود میری جھولی میری ممتا کسی بچے کے لیے ہمیشہ ترستی رہے گی۔ مجھے کبھی گھر کا سکھ نہیں ملے گا اتنا سیر ہو کر بھی میں تشنا ہوں یہ تشنگی کیوں ہے میری جستجو میری خواہش میرا انتظار لا حاصل کیوں ہیں۔

درد کی ٹیسیں اس کے دماغ کو ماؤف کر رہی تھیں۔ اور درد سے چلانے لگی تھی کوئی اس کی آواز سننے والا نہیں تھا۔ کوئی اس کو دوا لا کر دینے والا نہیں تھا۔ کوئی ڈاکٹر کوئی اسپتال اس کے نصیب میں نہیں تھا وہ خالی ہاتھ رہی تھی وہ تشنہ لب ہی رہی...... وہ اوندھے منہ فرش پر گری...... تو پھر اٹھ نہ سکی۔ وہ اندھیروں میں ڈوب کر زندگی سے ناطہ توڑ گئی تھی۔

☆☆......☆☆

خالی دامن خالی ہاتھ

حنا اصغر

مکروفریب سے گندھی ایک داستان/ ملتان سے



آج تقریباً دو ماہ ہو گئے تھے اس شخص کو دیکھتے ہوئے۔ آج چھٹی کا دن تھا وہ سڑک کے اس پار بیٹھے اس اداس وملول شخص کو دیکھ رہی تھی جو تصویریں بنانے میں مشغول تھا ایسے جیسے اس نے جوگ لے لیا ہو، ایک عالم سے ناراض ہو اس کا اضطراب اس کے چہرے سے ہویدا تھا، وہ ٹکٹکی باندھے اس کو دیکھ رہی تھی وہ انتہائی سرخ وسفید دراز قد وجیہہ انسان تھا۔ پہلے پہل محض وہ اس کی شکل وصورت اور شخصیت سے متاثر ہوئی تھی اس کی آنکھیں عجیب سی تھیں جن میں یاسیت تھی اضطراب تھا اور حزن وملال تھا پتہ نہیں کیا کچھ نہیں تھا۔

☆......☆......☆

جب وہ صبح سویرے اپنے اسٹور پر جانے کے لیے نکلتی تو وہ نظر آتا تھا اور جب وہ واپس آتی تو چار بجے تک وہ وہیں بیٹھا اپنے کام میں منہمک نظر آتا تھا۔ اس کے بعد وہ اپنا سارا سامان سمیٹ کر چلا جاتا تھا۔ وہ واشنگٹن کے شہر ایلگونیہ میں رہتی تھی ایلگونہ ڈیز میں ان دنوں شدید سردی ہوتی تھی اس شدید سردی میں بھی بیٹھا پینٹنگ کر رہا ہوتا تھا۔ اس کا بس نہیں چلتا تھا کہ وہ اس کو کوئی جیکٹ دے آئے لیکن وہ کس طرح ایک اجنبی نک چڑھے انسان سے بے عزتی کرواسکتی تھی۔ کیوں کہ کئی لوگ اپنی بے عزتی اس کے ہاتھوں کرواچکے تھے۔

ایک بار وہ خود پر قابو نہ رکھ سکی اور اس نے اس کے پیچھے چلنا شروع کر دیا تھا وہ ایلگونہ کے انتہائی ڈاؤن ایریا میں ایک سستے سے فلیٹ میں رہتا تھا۔ وہاں اس کی پینٹنگ بکتی تھیں۔ ہر کوئی اس کو زید پینٹر کے نام سے جانتا تھا اس کا تعلق ترکی سے تھا اور اس کو یہاں آئے ہوئے ایک سال ہو گیا تھا اس نے یہ ساری معلومات اپنی محنت و لگن سے حاصل کی تھیں۔

وہ دل ہی دل میں اس سے محبت کرنے لگی تھی۔ اس کا معمول بن گیا تھا وہ ہر صبح دس سے پندرہ منٹ ٹکٹکی باندھ کر اس کو دیکھا کرتی تھی اور پھر واپسی پر آتے ہوئے دانستہ سامنے بنچ پر بظاہر ستانے بیٹھ جایا کرتی تھی۔ کبھی ہونٹوں سے بوتل منہ سے لگا لیتی تو کبھی انبار پر نظریں دوڑاتی جبکہ کن اکھیوں سے اس کو دیکھتی رہتی تھی۔

☆......☆......☆

ایک دن اس کے دل میں کیا سمائی وہ اپنے اسٹور سے تین چار برگر اور کولڈ ڈرنک لے کر آئی اور اس کے سامنے رکھ دی اس نے تحیر سے پہلے اس کو پھر برگر کی طرف دیکھا اور سپاٹ آواز میں بولا......

''میں فقیر نہیں ہوں......''

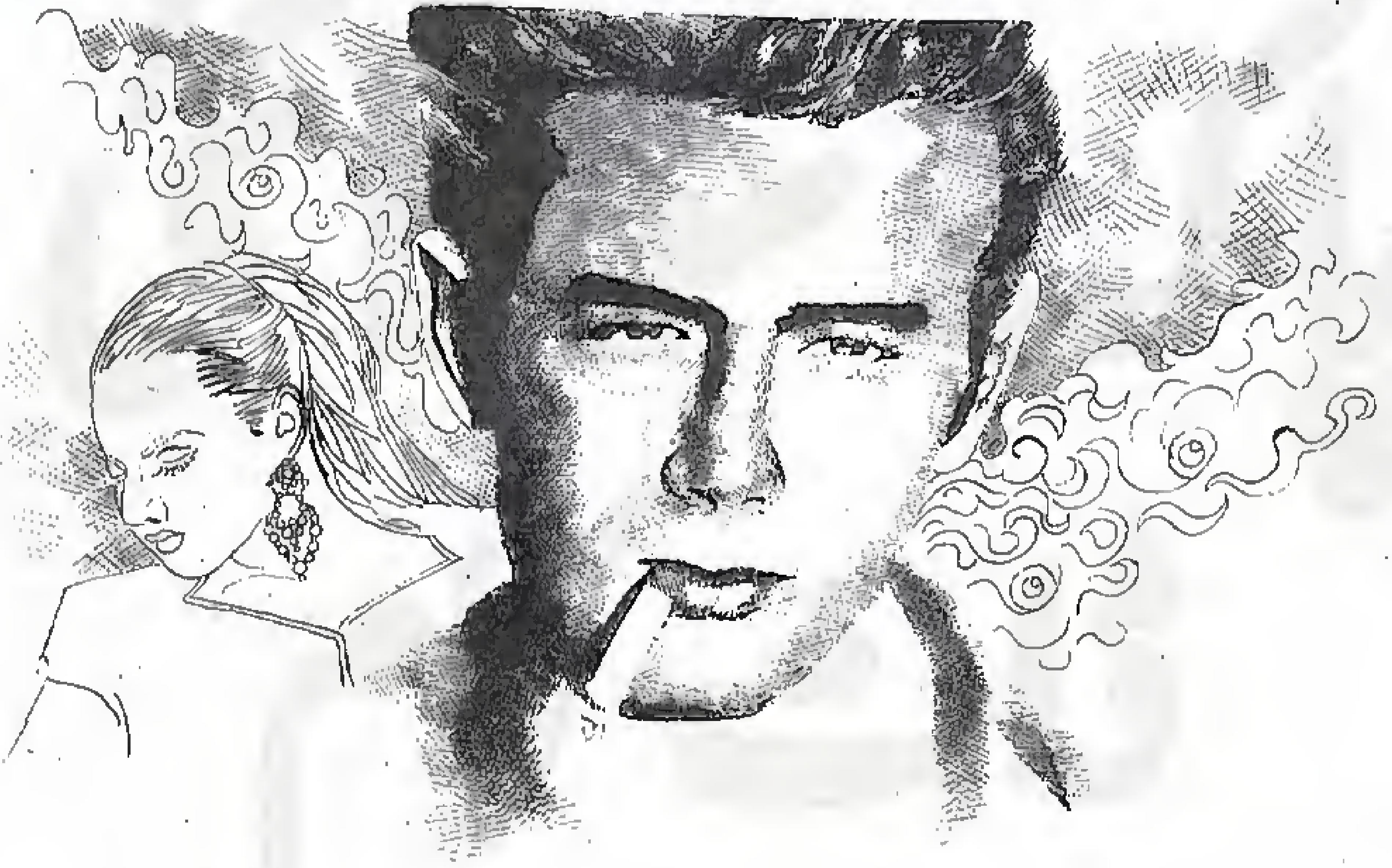
"میں جانتی ہوں......" اس نے تحمل سے جواب دیا
پھر یہ دینے کا مقصد......؟ اس نے غصے سے چیزیں ایک طرف کیں "میرا دل چاہ رہا تھا" ...... اس نے منمنا کر کہا جب کہ وہ دوبارہ سے اپنے کام میں منہمک ہو گیا شرمندگی کے شدید احساس نے اس کی پیشانی عرق آلود کر دی کچھ دیر وہیں ٹھہرا رہنے کے بعد وہ چیزیں اٹھا کر اپنے فلیٹ کی جانب بڑھنے لگی۔

ان چیزوں کو دینے کے لیے کسی اور کا انتخاب کرد ...... اس نے سرعت سے اپنا سامان سمیٹا اور اس کے پہلو سے نکلتا چلا گیا جبکہ وہ دھندلائی ہوئی نظروں سے اس کو جاتا ہوا دیکھتی رہ گئی۔

کھائے پیئے آرام کیے اس کے فلیٹ کی جانب بڑھنے لگی تھی تیس منٹ کا فاصلہ اس نے جوش سے پیدل ہی طے کر لیا تھا۔ اس کے پاؤں شل ہو گئے تھے اس نے بیل بجائی "کون ہے؟" ...... اس کی سخت جھنجلائی آواز نے اس کے قدم ڈگمگا دیئے لیکن وہ بظاہر مضبوط کھڑی رہی اس نے دروازہ کھول دیا پھر اس کو دیکھ کر حیران ہو گیا اور تیزی سے بے نیازی کا لبادہ اوڑھتے ہوئے بولا۔

☆......☆......☆

جی فرمایئے" ...... وہ ...... وہ ...... میں آپ سے ملنے آئی تھی" اس سے کچھ بولا ہی نہیں جا رہا تھا۔
دیکھو محترمہ آپ جو بھی ہیں میں آپ سے نہیں ملنا



☆......☆......☆

اگلے دن وہ نہیں آیا تھا وہ صبح سویرے تیار ہو کر آئی لیکن اس کو سامنے نہ پا کر اس کی ساری امیدوں پر پانی پھر گیا۔ اس کا جی نہیں چاہ رہا تھا کہ وہ کام پر جائے لیکن وہاں جانا اس کی مجبوری تھی وہ مرے مرے قدموں سے اسٹور پر چلی گئی۔ واپس آئی تو وہ وہاں نہیں تھا اس کا دل بجھ سا گیا اس کا دل چاہ رہا تھا کہ اس کے فلیٹ میں چلی جائے اور جانے اس کے دل میں کیا سمائی کہ وہ بغیر

چاہتا اور نہ ہی مجھے ایسا کوئی شوق ہے ...... اس نے دو ٹوک لہجہ میں اپنی بات مکمل کی اور دروازہ بند کر دیا۔ اور وہ شکست خوردگی کے شدید احساس سے لبریز دھیمے قدموں سے واپس آ گئی کتنے لڑکے تھے کہ جو اس کے ساتھ کے خواہاں تھے لیکن کبھی اس نے کسی کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھا تھا اور جس کے لیے اس کا دل بار بار ہمکتا تھا وہ اس پر ایک نظر کے بعد دوسری نظر ڈالنا پسند ہی نہیں کرتا تھا۔ تھکن اضطراب تشنگی واپسی کے سفر میں اس کے ساتھ

کیا کچھ نہیں تھا۔

☆......☆......☆

وہ اگلے دن پھر نہیں آیا موسم شدید خراب تھا ایسا لگتا تھا جیسے بارش ابھی ہونا شروع ہو جائے گی۔ وہ ایک بار پھر اس سے ملنے آئی تھی اب کی بار اس کے فلیٹ پر تالا لگا ہوا تھا۔اس نے ساتھ والے فلیٹ کے دروازے پر کھڑے شخص سے پوچھا اس نے لاعلمی کا اظہار کیا جبکہ بہت تیز بارش شروع ہو چکی تھی۔ وہ عجیب کشمکش میں مبتلا ہو گئی تھی وہ واپس نہیں جا سکتی تھی۔ وہ سامنے سے آتا ہوا دکھائی دیا اس کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی وہ اس کے فلیٹ سے ذرا ہٹ کر کھڑی ہو گئی اسنے سرسری سی نگاہ اس پر ڈالی فلیٹ کھولا اور اندر چلا گیا تھا۔

☆......☆......☆

ہتک کے شدید احساس نے اس کی پیشانی عرق آلود کر دی تھی وہ بارش میں آگے بڑھنے لگی۔ سردیوں کی بارش تھی اس کا پورا جسم کانپ رہا تھا لیکن اس پر ایک جنون سا طاری ہو گیا تھا اس کو چلے جانا چاہیے۔اس نے بے ساختہ پیچھے مڑ کر دیکھا ایک لڑکا دوڑتا ہوا آ رہا تھا اس کے ایک ہاتھ میں چھتری اور دوسرے میں چادر تھی وہ جانتی تھی کہ یہ دونوں چیزیں کس نے بھیجی ہیں ایک بار اس نے سر اٹھایا کہ منع کر دے لیکن دل نے اس کو ایک طرف دھکیلا......اس نے مسکرا کر دونوں چیزیں لے لیں۔

وہ اپنے فلیٹ کی جانب ایسے بڑھ رہی تھی جیسے ہفت اقلیم کی دولت مل گئی ہو اس کے ہونٹ نیلے پڑ گئے تھے اس نے آتے ہی کپڑے بدل لیے اس کا پورا جسم اب بھی کانپ رہا تھا۔ کپڑے تبدیل کرنے کے بعد وہ بے سدھ ہو کر سو گئی دو دن بخار میں گزار دیے۔

دو دن بعد وہ اپنے اسٹور پر گئی صبح وہ نظر نہیں آیا تھا جب وہ واپس آئی تو وہ اسی جگہ پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کا دل خوشی سے جھومنے لگا کیوں کہ اس سے منہ موڑنا اب اس کے اختیار میں نہیں تھا......اس نے فلیٹ سے شال اور چھتری اٹھائی اور اس کے قریب جا کر رکھ دی اس نے ان چیزوں کو اور پھر اس کو دیکھا اس نے دونوں چیزیں سائیڈ پر رکھ دیں وہ بے مسکرا دی۔

☆......☆......☆

''تم یہ کس کی تصویریں بناتے رہتے ہو''......؟
وہ اس سے ذرا فاصلے پر بیٹھ گئی۔

''کیوں تمہیں اس سے مطلب، جاؤ جا کر اپنا کام کرو......

''میں اپنا کام ہی کر رہی ہوں''......اس نے اپنے پر زور دے کر کہا''

''تمہارا تعلق ترکی سے ہے ناں اور تمہارا نام زید بن حارث ہے میرا نام عائشہ ہے'' جانتا ہوں۔اس نے ایک نظر اٹھا کر اس کو دیکھا اور اس کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔

''تمہیں کیسے پتہ چلا''......اس نے حیرت سے اس کی جانب دیکھا۔

''جیسے تمہیں پتہ چل گیا تھا اب تم جاؤ اور سنو کھڑکی کے قریب مت کھڑی رہا کرو موسم خراب ہے۔ تمہیں پھر سے بخار ہو جائے گا''......وہ کہہ کر وہ دوبارہ اپنے کام میں منہمک ہو گیا اور وہ خوشی سے پاگل ہونے کے قریب تھی اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ ناچنا شروع کر دے۔

☆......☆......☆

اگلے دو دن وہ نہیں آیا اور اس سے انتظار نہیں ہو رہا تھا وہ اس کے فلیٹ میں اس سے ملنے آ گئی وہ اس کو دیکھ کر حیران نہیں ہوا تھا۔ وہ اس کو اندر لے کر آیا تھا اس کا فلیٹ بہت سستے علاقے میں تھا لیکن اس نے اپنا فلیٹ انتہائی خوبصورتی سے ڈیکوریٹ کیا ہوا تھا۔ وہ آج اس کو دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔اس کی مسکراہٹ بھلی لگ رہی تھی۔ باہر موسم بہت طوفانی ہو رہا تھا جبکہ وہ کچن میں اس کے لیے کافی بنا رہا تھا اس کو کافی دینے کے بعد اس کو یاد آیا کہ وہ اپنا سامان اسی جگہ پر بھول آیا ہے جہاں وہ بیٹھ کر پینٹنگ کیا کرتا تھا......وہ اس سے بول رہا تھا اسکو مسکراتی نظروں سے دیکھ رہا تھا اس کے لیے اس سے بڑی بات اور کیا ہو سکتی تھی۔

☆......☆......☆

اس نے بغیر کسی ہچکچاہٹ کے اپنے اسٹور اور گھر کی مشترکہ چابیاں اس کو تھما دیں۔ کافی پیتے وہ اس کو اپنی مسکراتی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ میں جاؤں......وہ اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔ جبکہ اس کی پلکیں لرزنے لگی تھیں دل کی دھڑکن شور مچا رہی تھی۔ وہ

ایلکونہ میں اکیلی نہیں تھی کچھ فاصلے پر اس کے بھائی کا فلیٹ تھا بھائی کی بیوی سے اس کی بالکل نہیں بنتی تھی۔ ہر وقت کے لڑائی جھگڑوں سے تنگ آ کر اس نے علیحدہ فلیٹ خرید لیا تھا اور اب زید کو دیکھ کر وہ اپنا آپ اس کے حوالے کرنے کو تیار ہو گئی تھی۔

☆......☆......☆

وہ چلا گیا تھا جبکہ وہ رات کا کھانا تیار کرنے لگی تھی۔ باہر طوفانی بارش ہو رہی تھی پتہ نہیں وہ واپس کیسے آئے گا دل میں طرح طرح کے سوالات سر اٹھا رہے تھے۔ وہ اس کے خیریت سے واپس آنے کی دعائیں مانگ رہی تھی۔ لیکن اس کا کوئی اتا پتہ نہیں تھا۔ رات تیزی سے گزرتی جا رہی تھی اس کی تشویش پریشانی کا روپ دھارتی جا رہی تھی۔ صبح ہو گئی تھی وہ نہیں آیا تھا ذرائع مواصلات کا نظام درہم برہم ہو گیا تھا۔ ایلکونہ میں جب بھی سرد ہوائیں چلتی تھیں تو دیکھتے ہی دیکھتے وہ بارش اور طوفان کا روپ دھار لیا کرتی تھی۔ صبح سے شام ہو گئی وہ اس کے فلیٹ میں قید ہو گئی تھی۔ اس کا موبائل بج رہا تھا شاید وہ اپنا موبائل بھول گیا تھا۔ اس نے موبائل شتابی سے کان سے لگایا ہیلو......ہیلو......آواز نہیں آ رہی......زید میں......عائشہ......''ہاں عائشہ پریشان نہ ہونا یہاں موسم خراب ہے میں کوشش کر رہا ہوں کہ رات تک آ جاؤں جب تک تم یہیں رہنا۔ یہاں ڈکیتیاں بہت ہوتی ہیں فلیٹ نہ چھوڑ کر جانا......''

☆......☆......☆

ٹھیک ہے اس نے سر اثبات میں ہلایا......تم آج بہت یاد آ رہی ہو موسم رنگین ہے اور......وہ پتہ نہیں کیا کیا کہہ رہا تھا اس کا دل پسلیوں کے درمیان شور مچا رہا تھا آخر اس نے اس مغرور انسان کو جیت ہی لیا تھا۔ وہ بڑی بے تابی سے اس کے آنے کی خواہش کر رہی تھی اور سنو میں نکاح خواں کو لے کر آؤں گا وہ کہہ رہا تھا جبکہ وہ شرما رہی تھی۔

او کے بائے......وہ موبائل آف کر چکا تھا اور وہ کھڑکی کے قریب کھڑی انتظار کر رہی تھی......اس کے قریب سے دو آدمی گزرے۔ انہوں نے کھڑکی میں نظر آتے اس کے عکس کو دیکھا اور معنی خیز انداز میں ایک دوسرے کو دیکھ کر ہنسنے لگے......

''وہی ہے......؟'' ایک نے دوسرے سے پوچھا،
''نہیں اور ہے''......

پینٹر قسمت کا دھنی ہے ......دونوں نے ایک دوسرے کے ہاتھ پر ہاتھ مارا اور آگے بڑھ گئے جبکہ وہ ان کی یہ باتیں اس کے سر کے اوپر سے گزر گئی تھیں رات کے کسی پہر فلیٹ کھلا تھا وہ بہت چونکنا ہو کر سوتی تھی آہٹ پر ایکدم سے جاگ گئی زید کو دیکھ کر ایکدم سے اٹھی اور اس سے لپٹ کر رونے لگی......کہاں چلے گئے تھے تم؟ میں پریشان ہوگئی تھی؟۔ کام سے گیا تھا اس نے اس کو خود سے قریب کرتے ہوئے کہا......ہوگیا کام......

ہاں ہوگیا لیکن ایک کام نہیں ہوا......اس نے اس کا چہرہ ہاتھوں میں تھامتے ہوئے کہا......

کونسا کام......

نکاح خواں کا انتظام نہیں ہوسکا کل آئے گا وہ......

کہو تو گھر چھوڑ آؤں ......اس نے اس کی پیشانی چومتے ہوئے پوچھا اس کے خاموش رہنے پر اس نے اپنا چہرہ اس کے رُخسار کے قریب کیا اور کان میں سرگوشی کی......

''کیا آج رات ہم'' وہ شرما کر اندر بھاگنا چاہتی تھی لیکن وہ اس کو بازو پکڑ چکا ہوا تھا......

کیا مجھے چھوڑ کر جانا آسان ہے۔ وہ اس کے بالوں میں سر چھپا کر پوچھنے لگا بالکل نہیں ......وہ اس سے لپٹتے ہوئے بولی وہ اس کو لے کر اپنے کمرے میں آ گیا اور دونوں ایک دوسرے میں مگن گناہ وثواب سے مبرا ہو چکے تھے۔

☆......☆......☆

عائشہ کی آنکھ صبح دس بجے کھلی پہلے پہل تو اسے سمجھ نہ آیا کہ وہ کہاں ہے لیکن پھر اپنے قریب سوتے ہوئے زید کو دیکھ کر اسکو ساری بات سمجھ آ گئی وہ بے اختیار مسکرا دی......آخر اس مغرور انسان کو میں نے جیت لیا......اس نے انگلی سے اس کی آنکھوں کو چھوا لیکن اسی پل وہ جاگ گیا اور اس نے اس کو کھینچ کر اپنے قریب کر لیا۔

''موسم ٹھیک ہوگیا ہے۔''

جانتا ہوں......وہ نیند سے بوجھل لہجہ میں بولا۔

مجھے واپس جانا ہے......؟ عائشہ نے شرارت سے کہا۔

ہرگز نہیں، اب تم میرے پاس رہو گی......اس نے اس کے بالوں کو جھنجھوڑا بس میری جان میرے پاس رہے گی......اس نے محبت سے چور لہجہ میں کہا اور وہ اس کے جذبوں کے آگے سر جھکا گئی......

تین دن کے بعد وہ تیار ہو رہا تھا کہیں جا رہے ہو؟......وہ اس کے پیچھے آ کر ٹھہر گئی۔

کام سے جا رہا ہوں واپس آ کر تمہارے بھائی سے ملنے چلیں گے وہ اس کو دیکھ کر مسکرایا۔

اور ہاں اگر مجھے دیر ہو جائے آنے میں تو یہیں میرا انتظار کرنا اپنے گھر نہ چلی جانا میں نہیں چاہتا کہ اب تم ایک پل بھی مجھے یا میرے فلیٹ کو چھوڑو۔

''اور میرا اسٹور'' چلا لینا کیا تمہارا اسٹور مجھ سے زیادہ اہم ہے......؟

اس کے سوال پر اس نے نفی میں سر ہلایا......جبکہ وہ باہر چلا گیا کچھ دیر بعد واپس آیا ''میں بیگ تو بھول گیا''۔

''کس کا بیگ ......اس نے تحیّر سے ایک بڑے بیگ کو دیکھا۔ دوست کا بیگ ہے اس کو واپس کرنا ہے بلکہ میں اس کو کہتا ہوں خود لے جائے تم اندر چلو میرے ساتھ ......وہ اس کا ہاتھ پکڑنے ہی والا تھا کہ دو جوان اندر آ گئے۔

☆......☆......☆

یہ ہے تمہاری بھابھی ......زید نے انتہائی بدشکل ادھیڑ عمر کے آدمیوں سے تعارف کرایا جبکہ وہ دونوں اس کو دیکھ کر ہنسنے لگے تھے سامان لے جاؤ وہ کہہ کر اس کو لیکر اندر آ گیا......

''کیسے عجیب گندے دوست ہیں تمہارے شکل سے آوارہ لگ رہے تھے''

''عائشہ کہے بنا نہ رہ سکی'' اور میری شکل کیسی ہے......؟ وہ اس کے قریب ہوا وہ سر جھکا کر رہ گئی۔ ''تم تو جا رہے تھے؟''

تمہیں چھوڑ کر جا سکتا ہوں وہ اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا کہو تو چلا جاؤں وہ نقلی ناراضگی سے آگے بڑھا۔

''مت جاؤ''......

رات کے کسی پہر اس کو بھوک لگی تھی اس نے زید کو اٹھایا اوہ اتنی دیر ہوگئی وہ بڑبڑا کر اٹھا اس نے ٹائم دیکھا

بارہ بج رہے تھے۔
تم بھوکی ہوگی میں کھانا لاتا ہوں......
لیکن کھانا ہے...... میں نے بنایا تھا...... وہ بولی۔
میں گرم کر کے لاتا ہوں تم آرام کرو...... اس نے شرارت سے کہا۔ کچھ دیر بعد دونوں نے ساتھ کھانا کھایا اس کے بعد وہ اس کے لیے کافی بنا کر لایا۔ یہ کیا تم نہیں پیو گے''اس نے تحیر سے اس کو دیکھا جبکہ وہ تیار ہو رہا تھا نہیں تم پیو میں نے کام سے جانا تھا نہیں جا سکا سوچتا ہوں اب کر کے آجاؤں۔
''تو کیا رات کے اس پہر میں تم مجھے اکیلا چھوڑ کر جاؤ گے؟''نہیں تمہارا خیال اور لوگ رکھیں گے۔
''کون لوگ''اس کو نیند آ رہی تھی شاید وہ تھک چکی تھی۔ کافی ختم کرتے ہی وہ سونا چاہتی تھی زید اس کو بھنبھوڑ کر جا چکا تھا۔ جبکہ وہ آرام کی غرض سے سوگئی رات کے پہر اس کو ایسا لگا کہ جیسے کوئی اس کو پیٹ رہا ہو، بھنبھوڑ رہا ہو لیکن اس کی آنکھیں کھل کر نہیں دے رہی تھیں۔

☆......☆......☆

اس کی آنکھ اگلے دن شام کو جھگڑے کی آواز سے کھلی...... اب میری باری ہے......
کمینے میری باری ہے میں نے زیادہ رقم دی تھی۔
تیرے سے زیادہ تو میں نے دی تھی...... ایک ادھیڑ عمر آدمی بولا...... تو بعد میں آ...... وہ کہہ کر اندر آگیا اور دروازہ بند کر دیا۔
''تت تم...... کون ہو......؟''
''جو سب تیرے لگتے ہیں میں بھی وہی ہوں۔''
...... وہ مکروہ ہنسی میں ہنسا۔ زید...... زید کہاں ہے؟...... کون زید...... اسکا دل ڈھے گیا ساری بات اس کو سمجھ میں آنے لگی۔
وہ جو یہاں رہتا تھا...... اس نے مرے دل کے ساتھ کہا۔

☆......☆......☆

اچھا وہ پینٹر ہے زید نہیں ہے۔ کمینے کو بہت سی زبانیں آتی ہیں تجھے بیچ گیا ہے کل رات سے چلا گیا ہوگا کہیں اور پچھلی بار اتنی موٹی لڑکی لایا تھا کہ نہ پوچھو''تو بہت حسین ہے جبھی تیرا دام زیادہ لگا گیا ہے اور تو نے اس کو اپنا فلیٹ اور اسٹور بھی دے دیا، کہہ رہا تھا۔ بڑی دل والی عورت عاشق ہوئی ہے اس پر...... اس ادھیڑ عمر مکروہ چہرہ آدمی کے الفاظ نے اس کے ذہن کو تاریک کر دیا وہ وہیں گر کر بے ہوش ہوگئی اب ہوش میں آنا بھی کون چاہتا تھا اس کے دل پر نقب لگا کر وہ کسی اور کو اجاڑنے چلا گیا تھا۔

☆......☆......☆

کبھی ہم خوبصورت تھے

کبھی ہم خوبصورت تھے
کتابوں میں بسی خوشبو کی مانند
سانس ساکن تھی
بہت سے ان کہے لفظوں سے تصویریں بناتے تھے
پرندوں کے پروں پر نظم لکھ کر
دور کی جھیلوں میں بسنے والے لوگوں کو سناتے تھے
جو ہم سے دور تھے لیکن
ہمارے پاس رہتے تھے
نئے دن کی مسافت
جب کرن کے ساتھ آنگن میں اُترتی تھی
تو ہم کہتے تھے
امی...... تتلیوں کے پر بہت ہی خوبصورت ہیں
ہمیں ماتھے پر بوسہ دو
کہ ہم کو تتلیوں کے
جگنوؤں کے
دیس جانا ہے
ہمیں رنگوں کے جگنو
روشنی کی تتلیاں
آواز دیتی ہیں
نئے دن کی مسافت رنگ میں ڈوبی ہوا کے ساتھ
کھڑکی سے بلاتی ہے
ہمیں ماتھے پہ بوسہ دو

شاعر: احمد شمیم

چور دریچے

محمد بلال فیاض

والدین اور اولاد کے عدم مطابقت کی ایک کہانی خاص/ ملتان سے



آنسو تھے کہ رکنے کا نام نہیں لے رہے تھے۔ ساری رات کرسی پر بیٹھے روتے ہوئے گزری تھی...... جسم اکڑ چکا تھا آنکھیں بے حد سرخ ہو چکی تھیں پپوٹے سوجھ گئے تھے ...... دل سے بیٹے کی سلامتی کی دعائیں نکل رہی تھیں۔

''امی پلیز! کچھ دیر آرام کرلیں۔'' افشاں نے کندھے پر ہاتھ رکھ کر نرم لہجے میں کہا تھا۔

''بیٹا جیل میں ہو تو کس ماں کو نیند آئے گی...... ؟'' امی غم زدہ لہجے میں بولیں۔

''اللہ خیر کرے گا...... آپ پریشان مت ہوں ابو اور چاچو یقیناً کوئی خوشی کی خبر لائیں گے۔'' افشاں نے تسلی دی۔

''بیٹا بینک لوٹنے کی واردات میں پکڑا گیا ہے۔ آج تک ان کی سات پشتوں میں سے کسی نے ایسا گھٹیا کام نہیں کیا تھا...... خاندان بھر میں ناک کٹ گئی ہے، بہت رسوائی ہوئی تھی بیٹا تو رہا ہو کر واپس آ ہی جاتا مگر عزت واپس آ سکتی تھی...... ؟

یقیناً نہیں۔'' انہوں نے بے حد دکھ سے سوچا سرخ سوجھی ہوئی بوڑھی آنکھوں سے ایک بار پھر آنسو بہنے لگے۔

''سارا قصور ہمارا ہے۔'' انہوں نے دکھ سے سوچا۔ ''کوئی بھی بچہ پیدائشی چور ڈاکو نہیں ہوتا، تربیت کا اثر ہوتا ہے۔'' دل نے کہا تھا۔

''بالکل۔'' دماغ نے تصدیق کر دی۔ وہ اس وقت بے حد اذیت سے گزر رہی تھیں۔ انہیں یاد آیا کہ ایک بار انہوں نے نسیم آمنہ کے ناول میں پڑھا تھا ''بداعتمادی چور دروازوں کو جنم دیتی ہے جب جبر فرار کا رستہ ڈھونڈ نکالتا ہے...... کمزور نفس تسکین چاہتا ہے، پھر جائز راستہ نہ ملے تو ناجائز کی تمیز کھو بیٹھتا ہے۔'' یہ مصنف بھی اکثر کس قدر حقیقت سے انسان کو روشناس کرواتے ہیں...... انہیں لگا جیسے یہ بات مصنفہ نے انہیں ہی لکھی تھی۔

صبح کی اذان فضا میں گونجنے لگی...... آنسوؤں میں شدت آ گئی...... جو ہو چکا اس کا ازالہ تو شاید ممکن نہ ہو، کیوں کہ ''گزرا وقت کبھی لوٹ کے نہیں آتا...... مگر آنے والے وقت کو بہتر بنانے کے لیے کوشش اور دعا تو کی جا سکتی ہے نا۔'' یہ ہی بات سوچ کر وہ نماز کے لیے اٹھ کھڑی ہوئیں۔

☆......☆......☆

میں اس وقت جیل کی سلاخوں کے پیچھے بیٹھا

ہوں۔ پولیس کی مار کھانے کے بعد میرا جوڑ جوڑ دکھ رہا ہے...... میں ایک صحت مند کڑیل نوجوان ہوں مگر اس کے باوجود درد کی شدت سے نڈھال اپنے آنسو نہیں روک پا رہا ہوں...... پولیس کی مار سے تو آپ لوگ واقف ہی ہوں گے کھائی نہیں سنی تو ہوگی۔

میں نے کبھی بھی اتنا سنجیدہ نہیں سوچا تھا کہ مجھ پر یہ وقت بھی آئے گا کیوں کہ ہر غلط کام سے پہلے میں یہی کہتا تھا:

''جو ہوگا دیکھا جائے گا۔'' اور اب میرے ساتھ جو ہو رہا ہے بے حد اذیت ناک تھا......

میں تو یہاں بیٹھا اپنے زخموں پر رو رہا ہوں، مگر میرے پیچھے میرے والدین میرے بہن بھائی ندامت سے سر جھکائے ہوں گے۔ صبح کے اخبارات میں جب میری خبر چھپے گی تو میرے ماں باپ کی معاشرے میں کیا عزت رہ جائے گی؟

مگر میں سمجھتا ہوں اس حال کو پہنچنے میں میرے والدین کا قصور بھی ہے......

ٹھہریے! میں آپ کو اپنی 25 سالہ زندگی کا مختصر احوال سناتا ہوں آپ خود فیصلہ کر لیجیئے گا کہ میں قصور میرا ہے یا میرے والدین کا۔

☆......☆......☆

ابو آفس سے آنے کے بعد لان میں بیٹھے شام کی چائے سے لطف اندوز ہو رہے تھے، امی بھی ان کا ساتھ دے رہی تھیں...... ایک طرف مالی گلاب کے پودوں کی کانٹ چھانٹ کر رہا تھا۔ ''امی......! یہ سوال سمجھ نہیں آ رہا۔'' میں ہوم ورک والی کاپی اٹھائے امی کے پاس چلا آیا...... کاپی پر نظر ڈالنے سے پہلے امی میرے ہاتھ میں موجود قیمتی پین کو دیکھ کر چونک گئیں۔

''یہ کب خریدا تم نے۔'' امی نے پین پکڑتے ہوئے تحیر سے دریافت کیا۔''

''خریدا نہیں امی!'' میں نے فخر سے بتایا۔ ''خریدا نہیں تو کہاں سے آیا......؟'' امی کے بجائے ابو نے سخت لہجے میں دریافت کیا۔

''یہ میں نے چپکے سے فہد کے بیگ سے نکال لیا۔'' میں نے اپنا کارنامہ سینہ تان کر امی اور ابو کے گوش گزار کیا۔ حیرت سے امی کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا ابو تو غصے سے بھڑک اٹھے۔ ''شرم نہیں آتی تمہیں......؟'' امی نے غصے سے ایک ہاتھ جڑ دیا۔



''بہت بدتمیز اور بے شرم ہو گئے ہو۔'' ابو اپنی کرسی سے اٹھے اور ایک زوردار تھپڑ میرے گال پر رسید کیا میرے گال پر ابو کی انگلیوں کے نشان قہر کی طرح ثابت ہوئے میری آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو آ گئے۔

ابو امی نے مجھ سے یہ نہیں پوچھا کہ تم نے فہد کے بیگ سے پین چوری کیوں کیا...... بلکہ مار دھاڑ شروع کر دی...... میں نے اونچی آواز میں رونا شروع کر دیا ......میرے اونچی آواز میں رونے پر ابو کا پارہ ہائی ہو جاتا تھا اور اس وقت تو وہ پہلے ہی غصے میں تھے۔ انہوں نے اپنا جوتا اتار لیا اور دو چار میری کمر پر لگائے ، مالی اپنا کام چھوڑ کر میرا تماشہ دیکھنے لگا ، کچن سے ملازمہ نکل آئی اور برآمدے میں کھڑا ہو کر مجھے پیٹتے ہوئے دیکھنے لگی......۔

☆......☆......☆

ابو کو تو رحم نہ آیا، امی کو کچھ ترس آیا تو انہوں نے ابو سے میری جان بخش کروائی ......تمام ملازم بھی میری دھلائی سے کچھ دیر لطف اندوز ہوتے رہے ......ابو نے بھی ان کا لحاظ نہ کیا میری انا کو بہت ٹھیس پہنچی تھی......میری نفسیات متاثر ہوئی تھی......آپ سوچ رہے ہوں گے کے پانچویں کلاس کے بچے کا انا سے کیا لینا دینا ، مگر یہ حقیقت ہے کہ بچّہ بھی ایک شخصیت ہوتی ہے، انا ہوتی ہے ، احساسات اور جزبات ہوتے ہیں اور میں تو بہت ہی حساس واقع ہوا تھا مگر اس واقعے نے میری حساسیت چھین لی تھی......میں اس رات بہت رویا اور صبح تک روتا رہا صبح اسکول گیا تو آنکھیں سوجھی ہوئی تھیں۔

''کاش ابو مجھ سے یہی پوچھ لیتے کہ آخر میں نے چوری کیوں کی۔'' مگر مجھے لگا کہ ابو اور ''پولیس'' میں کوئی فرق نہیں ۔اصل بات یہ تھی کہ فہد سے میری لڑائی ہوئی اس نے میری دو کاپیاں پھاڑ دیں اور اس سے بدلہ لینے کے لیے میں نے اسکے بیگ سے اس کا قیمتی پین چرا لیا۔ بلاشبہ یہ ایک غلط حرکت تھی، مگر ابو مجھے پیار سے بھی ت سمجھا سکتے تھے مگر پیار اور محبت کا لفظ میرے والدین کی ڈکشنری میں شاید نہیں تھا۔

☆......☆......☆

میں نے ہر وہ کام شروع کر دیا جس سے ابو اور امی کو چڑ ہوتی تھی......بے شک مجھے مار پڑے یا بے عزتی ہو میں نے پروا چھوڑ دی تھی اور امی کے مطابق میں انتہائی بدتمیز اور ڈھیٹ ہو گیا تھا۔ابو نے میری پاکٹ منی بند کر دی تھی کیوں کہ ان کا خیال تھا کہ میں فضول خرچی کرتا ہوں......۔

وہ گرمیوں کی ایک دوپہر تھی۔ابو کمرے میں سو رہے تھے میں نے آہستہ سے دروازہ کھول کر کمرے میں داخل ہوا عموماً ابو قمیض اتار کر سویا کرتے تھے ...... جب مجھے یقین ہو گیا کہ ابو گہری نیند میں ہیں تو میں نے چپکے سے ان کی قمیض سے پچاس روپے کا نوٹ نکال لیا......کم پیسے اس لیے نکالے تھے کہ ابو کو شک نہ ہو......

اور پھر اس کے بعد تو جیسے میرا معمول بن گیا۔ کبھی امی کے پرس سے بیس تیس روپے نکال لیتا اور کبھی ابو کی جیب سے ......''کیوں کہ جب جائز طریقے سے نہ ملے تو ناجائز کام کرنے ہی پڑتے ہیں۔'' یہ میرا خیال تھا۔

☆......☆......☆

اسکول کے سخت اور گھٹن زدہ ماحول سے نجات ملی تو میں نے شکر ادا کیا......کالج لائف بہت زبردست تھی، نہ پڑھائی کی فکر نہ ہوم ورک کا عذاب۔آزادی ہی آزادی، اور اس آزادی میں مجھ سے زیادہ فائدہ شاید ہی کسی نے اٹھایا ہو سونے پر سہاگہ مجھے عدیل اور شہباز جیسے دوست مل گئے......ان کی عادات وفضائل بھی مجھ سے ملتے جلتے تھے......فن اور انجوائے منٹ کے نام پر چھوٹے موٹے جرائم اور چوریاں کرنا ان کی ہابی تھی......

میں، عدیل اور شہباز ہم تینوں کا گروپ پورے کالج میں مشہور ہو گیا......خوب گزرتی تھی جب مل بیٹھتے تھے تین دیوانے۔وقت گزرتا گیا......F-A میں ،میں بری طرح ناکام ہوا تھا عدیل اور شہباز کے ساتھ بھی یہی ہوا......۔

اور F-A کے رزلٹ پر ابو نے میرا کیا حشر کیا

آپ سمجھ تو گئے ہوں گے......ابو چاہتے تھے میں کسی نہ کسی طرح کم از کم B.A ہی کرلوں اور اسکی بنا پر ابو نے میرا کالج تبدیل کروایا یہ ایک پرائیویٹ کالج تھا۔ ماحول بھی اسکول جیسا تھا یہاں مجھے عدیل اور شہباز جیسے دوست نہ مل سکے۔ یہی وجہ تھی کہ میں نے عدیل اور شہباز سے تعلق نہ توڑا ہم اکثر چھوٹی موٹی وارداتیں کیا کرتے تھے، کبھی کسی کی جیب کاٹ لی ،موبائل چھین لیا، گن پوائنٹ پر بائیک ہتھیالی، اور پھر تینوں آپس میں برابر میں تقسیم کرلیا کرتے تھے۔ بینک لوٹنے کا پلان ہم تینوں نے ہی بنایا تھا مگر آئیڈیا عدیل کا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ جیب کاٹنے، موبائل چھیننے سے اب گزارا نہیں ہوتا کوئی بڑا ہاتھ مارتے ہیں تا کہ چند دن سکون سے بیٹھ کر کھاسکیں۔ بینک لوٹنے کا ہمارا پہلا تجربہ تھا جو کہ بری طرح ناکام ہوگیا عدیل اور شہباز تو بھاگنے میں کامیاب ہوگئے اور میں اکیلا ہی پولیس کے ہتھے چڑھ گیا ......اور ان دونوں کے حصے کی ''چھترول'' بھی میرے میرے ہی حصے میں آئی۔

ہر جرم، ہر برائی ہم تینوں نے مل جل کر کی تھی مگر آج جیل کی سلاخوں کے پیچھے میں اکیلا ہی تھا پولیس ان دونوں کو پکڑنے میں ناکام رہی تھی۔



ابھی کچھ دیر پہلے ابو اور چاچو مجھ سے ملنے آئے تھے آج ابو نے مجھے ڈانٹا نہیں ذلیل نہیں کیا وہ خاموش تھے، آنکھوں میں آنسو اور چہرے پر بے بسی تھی......ویسی ہی بے بسی جیسی اس وقت میرے چہرے پر تھی جب ابو نے پہلی بار مجھے بہت ظالمانہ طریقے سے پیٹا تھا۔

چاچو وکیل تھے انہوں نے بہت تسلی دی تھی۔

''تم فکر نہ کرنا بالکل پریشان نہ ہونا کل تک تم اس جیل سے باہر ہوگے انشاء اللہ۔ انہوں نے سلاخ کے اندر ہاتھ ہاتھ کر میرا کندھا تھپتھپایا۔ میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

ابو بت بنے سر جھکائے کھڑے تھے۔ میں منتظر تھا وہ کچھ بولیں گے......مگر ان کی خاموشی نہ ٹوٹی۔ وہ چلے گئے...... جھکے ہوئے سر اور تھکے تھکے قدموں کے ساتھ مگر جاتے سمے ابو کی آنکھوں سے بہنے والے آنسو مجھ سے چھپ نہ سکے۔



برسوں کے بعد

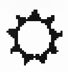
خفا رہا ہوں بہت دیر گو کہ میں تجھ سے
نہ خیریت کبھی پوچھی نہ عافیت بھیجی
نہ تیری دید کی حسرت نہ تیرے ذکر کا شوق
نہ آرزوئے ملاقات ہی نے کروٹ لی



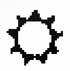
مگر یہ سچ ہے کہ تُو پھر بھی یاد آتی رہی
مری رگوں میں رہیں دوڑتی تری سانسیں
مری قبا میں رہی تیرے جسم کی خوشبو
مرے وجود پہ چھائی رہیں تیری باتیں



اب اتنے برسوں کے بعد آج تُو ملی ہے تو میں
یہ سوچتا ہوں کہ اس میں تری خطا کیا تھی
مرا نصیب یہی تھا کہ تجھ کو کھو بیٹھوں
مرا نصیب تھی یہ بے بسی یہ رُسوائی



خدا کے واسطے رنجیدہ د ملول نہ ہو
خدا کے واسطے یہ اشک پونچھ لے اپنے
یہ تیری گود کا معصوم چاند سا بچہ
نہ سہم جائے کہیں اشک دیکھ کر تیرے



خود اپنے واسطے میں طالبِ اجل ہوکر
ترے سہاگ کو دیتا ہوں زندگی کی دعا!

مراسلہ: محمد ادریس ممتاز۔ سعودی عرب

تن کی کالی من کی اجلی

زرغام محمود

ایک بے راہ رو شخص کا قصہ، جو راہِ راست پر چل پڑا/ کراچی سے

پرانی کہاوت ہے بند ہو مٹھی تو لاکھ کی...... اسی لیے جب میں پیدا ہوا تو میرے بائیں ہاتھ کی مٹھی سختی سے بند تھی دائی کو مٹھی کھولنے میں کافی وقت ہوئی جب مٹھی کھلی تو دائی حیران رہ گئی۔ میری مٹھی میں ایک خون کا قطرہ تھا جسے میں نے اپنی مٹھی میں چھپا رکھا تھا۔ یہ دیکھ کر منہ پھٹ دائی بولی...... ''یہ لڑکا بہت غصے والا ہوگا جانے کتنوں کے خون سے اپنا ہاتھ رنگے گا۔''

☆......☆......☆

نہیں اس کا مطلب ہے دنیا میرے بیٹے کی مٹھی میں ہوگی۔ اماں نے پورے یقین سے پیش گوئی کی میرے بائیں ہاتھ کی مٹھی بند ہی رہتی تھی جیسے جیسے میں بڑا ہوتا چلا گیا میری یہ عادت بھی پختہ ہوتی چلی گئی مٹھی بند رکھنا میری عادت تھی۔ میں بائیں ہاتھ کی مٹھی صرف ضرورت کے وقت ہی کھولتا تھا اور پھر جلدی سے بند کر لیتا تھا جیسے کوئی چیز چھپا رہا ہوں۔ دیکھنے والوں کو یہی شبہ ہوتا تھا کہ میں نے مٹھی کے پیچھے کچھ چھپایا ہوا ہے ابتدا میں میرے ماں باپ کو بھی یہی دھوکا ہوتا تھا۔ اور اسکول میں اساتذہ بھی دھوکا کھا جاتے تھے۔ خاص طور پر امتحانوں میں بڑی پریشانی ہوتی تھی۔ اکثر اساتذہ میری مٹھی بند دیکھتے تو فوراً میرے پاس آتے اور کہتے ...... یہ مٹھی میں کیا چھپایا ہے۔

☆......☆......☆

کچھ نہیں، جھوٹ بولتے ہو مٹھی کھول کے دکھاؤ...... اور میں اپنی ننھی سی مٹھی کھول دیتا جو ہمیشہ کی طرح خالی ہوتی تھی۔ گھر میں کوئی چیز غائب ہوتی تو مجھے ڈانٹ پڑتی اور حکم ملتا مٹھی کھول کر دکھاؤ...... اور میں معصومانہ انداز میں مٹھی کھول دیتا اور سامنے والا شرمندہ ہو جاتا کیوں کہ مٹھی ہمیشہ کی طرح خالی ہوتی رفتہ رفتہ میرا معصوم ذہن سمجھنے لگا کہ میری مٹھی عمرو عیار کی زنبیل ہے جہاں تمام چیزیں چھپائی جا سکتی ہیں۔ تھوڑا بڑا ہوا تو میں نے آزمائش کے طور پر ابو کی جیب سے دس روپے کا نوٹ نکالا اور اسے تہہ کر کے مٹھی میں چھپا لیا ابو نے کرتا پہنتے ہوئے پیسوں کی کمی محسوس کی پھر میری بند مٹھی کی طرف دیکھا مگر یہ سوچ کر خاموش ہو گئے یہ تو بچے کی عادت ہے بار بار مٹھی کھلوانے سے شرمندگی ہوتی ہے۔ اس طرح میں پہلی بار چوری کے پیسے گھر سے باہر لے جانے میں کامیاب رہا۔ دوسری بار ماں نے میری چوری پکڑ لی مگر میرے باپ کو اس کے بارے میں نہیں بتایا کیوں کہ ان کی نظر میں میرا



باپ ظالم تھا بچے کو اس کی عمر سے بڑی سزا دیتا تھا۔ یہ بات اس دن میری سمجھ میں آ گئی، کہ جب تک ماں زندہ ہے باپ کا قانون میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ پھر میں نے ساری زندگی قانون سے یہی آنکھ مچولی کھیلی۔ میں دنیا کو دیکھنے کے لیے آنکھیں کھلی رکھتا تھا مگر دنیا کو سمجھنے کے لیے مٹھی بند رکھتا تھا۔

☆......☆......☆

میری زندگی سبک رفتاری سے گزر رہی تھی میری زندگی کی جھیل میں پہلی طغیانی تب آئی جب ایک صبح ابا کام پر گئے، حکمران کی واپسی لاش کی صورت میں ہوئی وہ کسی ظالم کی اندھی گولی کا نشانہ بن گئے۔ اس وقت مجھے احساس ہوا کہ جب تک ابا زندہ تھے میں انہیں ایک ظالم حکمران سمجھتا تھا وہ جب گھر میں ہوتے تھے تو میں سہا سہا رہتا تھا۔ ان کے گھر آنے سے پہلے میں کھیل کود کر گھر آ جاتا تھا اور شریف بچہ بن جاتا تھا۔ مگر جب ابا چلے گئے تو احساس ہوا وہ ایک گھنا سایہ تھے۔ ایک ایسا چھاتا تھے جو ہر دکھ پریشانی اور مصیبت کی بارش سے ہمیں محفوظ رکھتا تھا جب وہ چھاتا ہمارے سروں سے اٹھ گیا تو پتا چلا زندگی دکھوں کی ایسی پوٹلی ہے جس میں روز ہاتھ ڈال کر ایک نیا دکھ نکالنا پڑتا ہے۔ ابا کے مرنے کے ایک ماہ بعد ایک رات اماں سوئی تو سوتی ہی رہ گئی نجانے رات کے کس پہر ابا آئے اور اماں کا ہاتھ پکڑ کر انہیں دوسرے جہاں لے گئے...... مگر وہ مجھ کیوں بھول گئے مجھے کس کے سہارے چھوڑ گئے۔ زمانے کی ٹھوکروں میں رلنے کے لیے میں کیوں زندہ رہ گیا۔ میری زندگی جو ہنسی خوشی گزر رہی تھی گو ہم مالدار نہیں تھے مگر ابا جو کماتے اماں سلیقے سے خرچ کرتی مہینہ گزر جاتا۔ مگر اماں ابا کے بعد جو میرے ساتھ ہوا وہ میری زندگی کا تلخ ترین دور تھا اماں کے انتقال کے بعد چچا مجھے اپنے گھر لے آئے بیٹا بنا کر نہیں مفت کا نوکر بنا کر میں پورا دن کام کرتا جھاڑو پونچھا سے لے کر برتن کپڑے دھونے تک پھر کہیں جا کر دو وقت کی باسی روٹی ملتی۔ پھر ایک دن میرے ہاتھ سے چچی جان کے جہیز کے ڈنر سیٹ کی ایک پلیٹ ٹوٹ گئی اس دن چچی نے مجھے اتنا مارا کہ میں ادھ موا ہو گیا اور پھر مجھے پیچھے گھر کے پیچھے

ہی گندی گلی میں کھڑا کر دیا گندی گلی میں بدبو نا قابل برداشت تھی میں چیختا رہا مگر چچی نے میری ایک نہ سنی پھر میں نے گھر سے بھاگنے کا فیصلہ کرلیا اور گندی گلی میں پڑے کچرے کو پھلانگتا ہوا ایک انجانی منزل کی طرف چل دیا گندی گلی میں کچرا پھینکا جاتا شاید میں بھی کچرا تھا اسی لیے گندی گلی میں پھینکا گیا۔ اور کچرا کبھی اچھے ہاتھوں میں نہیں جاتا لہٰذا میں کیسے اچھے ہاتھوں میں جا سکتا تھا میں بھی غلط ہاتھوں میں چلا گیا آخر میں معاشرے کا کچرا تھا۔

☆......☆......☆

ماں باپ نے میرا نام نعمت اللہ رکھا تھا شائد میں ان کے لیے نعمت تھا یا مجھے اللہ کی نعمتیں حاصل ہوں ماں باپ بے چارے اپنے طور پر بچوں کا نام ایسا رکھتے ہیں جیسا وہ انہیں بنانا چاہتے ہیں ماں باپ بچوں کی تقدیر خود لکھنا چاہتے ہیں۔ مگر بند مٹھی کے پیچھے کیا ہے یہ کسی کو نہیں پتا بس اس پالن ہار کو پتا ہے۔ جس نے ہم سب کی تقدیر لکھی ہے مجھے اللہ کی کچھ نعمتیں حاصل ہوئیں اور کچھ چھین لیں لیکن اللہ کی اتنی نعمتیں حاصل ہونے کے باوجود مجھے اطمینان حاصل نہیں تھا بچپن میں جب گھر سے بھاگا تھا تو میں سوچتا تھا کہ دل کا اطمینان کب حاصل ہوتا ہے؟ اور دل کہتا تھا جب آدمی کو پیٹ بھر کر روٹی ملتی ہے تو اطمینان حاصل ہوتا ہے بچپن میں روٹی میری سب سے بڑی خواہش ہوتی تھی۔ اور آج میرے پاس روٹیاں ہی روٹیاں ہیں میں پیٹ بھر کر کھاتا ہوں اور جی بھر کر پیتا ہوں...... اگر ناشتہ کراچی میں کرتا ہوں تو رات کا کھانا دبئی میں کھاتا ہوں اور اگلی صبح کا ناشتہ پیرس میں کرتا ہوں مگر اطمینان پھر بھی حاصل نہیں ہوا شاید دولت سے اطمینان حاصل ہوتا ہے۔ میرے پاس کتنی دولت ہے اس کا مجھے خود شمار نہیں انکم ٹیکس والوں کو دکھانے والی لاکھوں کی جائیداد ملک میں اور چھپانے والی کروڑوں کی جائیداد بیرون ملک میں ہیں۔ دنیا کے ہر بڑے شہر میں میری ایک کوٹھی موجود ہے۔ اس کوٹھی میں تین چار مہنگی گاڑیاں کھڑی ہیں میں دنیا کے مہنگے ترین کلبوں کا ممبر ہوں میرا اپنا ہوائی جہاز ہے جو ہر وقت سفر کے لیے تیار رہتا ہے اتنی دولت کے باوجود مجھے اطمینان حاصل نہیں ہے۔ ایک بے چینی سی ہر وقت رہتی ہے شاید محبت سے دل کا اطمینان حاصل ہوتا ہے۔ میری بیوی دنیا کی حسین ترین عورت ہے اور مجھ سے پیار بھی کرتی ہے۔ فارینہ سے ملاقات کا قصہ بھی بڑا دلچسپ ہے وہ ایک بیوٹی کنسرٹ میں مقابلے کے لیے آئی تھی اور میں وہاں جج تھا جب فارینہ ریمپ پر آئی تو میں اسے دیکھتے ہی دل ہار گیا۔ اور کنسرٹ کے اختتام پر میں نے اسے شادی کی پیش کش کر دی اور تھوڑی پس وپیش کے بعد فارینہ نے اس پیش کش کو قبول کرلیا ہماری شادی کو دو سال ہو گئے ہیں مگر ابھی تک میں اللہ کی نعمت یعنی اولاد سے محروم ہوں...... ہماری شادی انتہائی دھوم دھام سے ہوئی اور شادی کے تمام انتظامات میری سیکریٹری لیلیٰ نے کیے۔ جب میں نے فارینہ کے سامنے لیلیٰ کو فون کر کے شادی کے انتظامات کرنے کے لیے کہا تو فارینہ نے پوچھا ''لیلیٰ کون ہے......؟''

میری پرسنل سیکریٹری...... لیلیٰ کے ذکر پر میری آنکھوں کے سامنے لیلیٰ کا چہرہ آ گیا اور میں اسے سوچنے لگا۔ فارینہ چند لمحوں تک مجھے دیکھتی رہی پھر بولی...... ''کیا لیلیٰ بہت خوبصورت ہے۔؟''

آں...... میں چونک گیا...... تم کچھ کہہ رہی تھی۔

میں پوچھ رہی ہوں کہ کیا لیلیٰ بہت خوبصورت ہے جس کے خیالوں میں تم کھو گئے......

تم اسے صرف ایک نظر دیکھ پاؤ گی...... میں نے مسکرا کر جواب دیا۔

کیوں دوسری بار کیوں نہیں دیکھوں گی۔

وہ دوسری بار دیکھنے کے قابل ہی نہیں اللہ نے نا جانے کس موڈ میں اسے بنایا ہے عموماً لوگ اسے لوگ ایک بار ہی دیکھ کر نظر پھیر لیتے ہیں وہ اماوس کی رات سے بھی زیادہ کالی ہے اور شکل وصورت بھی واجبی سی ہے۔

تو تم نے اتنی بدصورت سیکریٹری کیوں رکھی ہوئی ہے۔

میرا محل ایک چاند ہے اور وہ اس میں ایک دھبے

کی طرح ہے وجہ نہ ہو تو چاند کی خوبصورتی ماند پڑ جاتی ہے ویسے وہ بے حد سمجھ دار اور معاملہ فہم ہے پرسنل سیکریٹری کی تمام خوبیاں اس میں موجود ہیں ۔میں نے جواب دیا تو فارینہ گردن ہلانے لگی۔

چھوڑو ہم بھی کیا موضوع لیے بیٹھے ہیں۔آؤ اپنی باتیں کریں میں نے موضوع بدلتے ہوئے کہا،اب باتیں شادی کے بعد ہوں گی تم انتظامات کرو...... یہ کہہ کر فارینہ کمرے سے جانے لگی میں نے اپنا ہاتھ بڑھا کر اس کا ہاتھ پکڑا اور اپنی جانب کھینچا اس نے مزاحمت نہیں کی اور سیدھے میرے سینے سے آ لگی میں نے اپنے ہونٹ اس کے گلابی ہونٹوں پر رکھ دیئے حسن کی تپش سے میں پگھل گیا اس سے پہلے کہ میں مزید پیش قدمی کرتا فارینہ نے اپنے آپ کو میری گرفت سے آزاد کرایا اور ہنستی ہوئی کمرے سے باہر چلی گئی۔

☆......☆......☆

خوب صورت ہو یا بدصورت گوری ہو یا کالی۔ اگر وہ ہاتھ نہ آئے اور آنچل کی ہوا بھی نہ لگنے دے تو آگ بھڑک اٹھتی ہے ایک دن نشے میں، میں نے لیلیٰ کا ہاتھ پکڑا تھا تو وہ دنگ رہ گئی وہ پرسنل سیکریٹری کی حیثیت سے میرے مزاج کو خوب سمجھتی تھی اس نے نہایت اطمینان سے اپنا ہاتھ چھڑوایا اور بولی۔۔اس کا کیا مطلب ہے......؟

تم نادان نہیں ہو مطلب خوب سمجھتی ہو۔

ہاں میں اتنی نادان نہیں ہوں کہ آپ کو نادانی سے روک نہ سکوں۔

میں تمہیں دو لاکھ روپے تنخواہ دیتا ہوں۔

میری صورت دو لاکھ تو کیا دو کوڑی کی بھی نہیں ہے یہ رقم آپ میری صلاحیتوں کی عوض مجھے دیتے ہیں۔

چلو یہی سہی،آج پارٹ ٹائم میں دس لاکھ روپے کما لو۔

میرے پاس حسن نہیں ہے مگر عزت تو ہے پلیز میری توہین نہیں کریں۔

عزت اسے کہتے ہیں جو دنیا والوں کے سامنے بنی رہے گھر کے اندر کوئی نہیں جھانکتا۔

نو سر......!عزت وہ ہوتی ہے جو گھر کے اندر بھی ہوس کی آنچ سے محفوظ رہے انسان جب آئینے میں اپنی صورت دیکھے تو خود سے نظر ملا سکے۔آپ دنیا کی حسین ترین لڑکی خرید سکتے ہیں مگر مجھے نہیں۔

میں تمہیں جبراً بھی حاصل کر سکتا ہوں......میرے اندر کا مجرم جاگنے لگا۔

سر......آپ مجبور نہ کریں ورنہ میں یہ ملازمت چھوڑ دوں گی اور اگر آپ نے زبردستی کی تو میں اپنی جان پر کھیل جاؤں گی......

میں یہ نہیں جانتا تھا کہ وہ اپنی جان پر کھیل سکتی ہے یا نہیں لیکن میں یہ نقصان برداشت نہیں کر سکتا تھا کہ وہ ملازمت چھوڑ کر چلی جائے وہ میرے کاروبار کی تمام باریکیاں جانتی تھی۔تمام پارٹیوں اور سرکاری اداروں سے نہایت کامیابی سے ڈیل کرتی تھی اس نے کئی مرتبہ پیچیدہ کاروباری مسائل نہایت آسانی سے ہینڈل کیے اور مجھے لاکھوں کا نہیں کروڑوں کا فائدہ پہنچایا آخر منشیات کا ایک کامیاب اسمگلر ہوں۔ پاکستان سے خام مال باہر بھیج کر وہاں سے اس خام مال سے تیار ہونے والی ہیروئن ملک میں درآمد کرتا ہوں اور پھر اپنے کارندوں کے ذریعے ہیروئین کو ملک بھر میں پھیلا دیتا تھا ان تمام امور کی نگرانی لیلیٰ کرتی تھی لہٰذا میں اسے ناراض کرنے کا رسک نہیں لے سکتا تھا اس لیے میں نے سوری کہا اور اپنے کمرے سے جانے دیا۔

☆......☆......☆

دوسری صبح جب میں بیدار ہوا تو میں نے سوچا کل رات مجھے کیا ہو گیا تھا۔"میں کیوں اس کالی چڑیل کو اپنے خوبصورت بیڈروم میں لانا چاہتا تھا جہاں ایک سے ایک حسین لڑکی آ چکی تھی کیا میرا دماغ خراب ہو گیا تھا یا میں نے زیادہ پی لی تھی۔شاید میں لیلیٰ کی خدمات سے خوش ہو کر اسے انعام دینا چاہتا تھا اسے اپنی بانہوں میں جکڑ کر اس کی عزت بڑھانا چاہتا تھا جسے کوئی دیکھنا پسند نہیں کرتا تھا میں اسے پیار کرتا تو یہ اس کی خوش نصیبی ہوتی وہ ساری عمر میرے پیار کو یاد کر

کے گزار سکتی تھی واہ کیا زمانہ آ گیا ہے کسی کو عزت دو تو وہ اپنی بے عزتی سمجھتا ہے...... دراصل وہ اپنی اوقات بھول گئی تھی میں نے ہاتھ پکڑا تو نخرے کرنے لگی اپنے آپ کو میرے برابر سمجھنے لگی شاید خود کو حور پری سمجھ رہی تھی...... بس یہ میری پہلی اور آخری غلطی ہے میں باس ہوں باس کی ہی طرح رہوں گا میں کسی دوسری سیکر یٹری کا بندوبست کرتا ہوں جو لیلیٰ کے ساتھ رہ کر کام سیکھ لے پھر میں اس لیلیٰ کو اس کی اوقات یاد دلاؤں گا۔'' میں مسلسل لیلیٰ کے خلاف سوچ رہا تھا۔ میں تیار ہو کر اپنے گھر سے منسلک آفس پہنچا تو لیلیٰ اپنی کرسی پر بیٹھی کسی فائل کا مطالعہ کر رہی تھی اس نے سیاہ جسم پر ہلکے زرد رنگ کا لباس پہنا ہوا تھا ایسا لگتا تھا جیسے رات میں سورج نکل آیا ہو اس کا جسم بڑا متناسب تھا۔ میں مسلسل لیلیٰ کے خلاف ہی سوچ رہا تھا مگر مجھے یہ تسلیم کرنے کو عار نہیں تھا کہ لیلیٰ کا جسم بڑا متناسب تھا شاید اسی لیے میں اس کی جانب بڑھ گیا تھا اس کے علاوہ وہ اپنا کام انتہائی محنت اور ایمانداری سے کرتی ہے پولیس کے بڑے بڑے آفیسروں اور قانون نافذ کرنے والے اداروں سمیت دوسرے ممالک کے اسمگلروں سے وہی معاملات طے کرتی ہے اور نہایت کامیابی سے میرے کاروبار کو دن دوگنی رات چوگنی ترقی دے رہی ہے۔

لیلیٰ کی بے رخی ہی شاید فارینہ سے میری شادی کا سبب بنی میں لیلیٰ کو جتانا چاہتا تھا کہ میں چاہوں تو دنیا کی خوبصورت ترین لڑکی کو حاصل کر سکتا ہوں۔

شادی کی اس تقریب میں جب پہلی بار فارینہ نے لیلیٰ کو دیکھا تو وہ بے ساختہ بول اٹھی آپ نے صحیح کہا تھا لیلیٰ کو کوئی دوبارہ دیکھنا پسند نہیں کرے گا۔ اوہ گاڈ...... ایسا کالا چہرہ لے کر یہ زندہ کیسے ہے میں اگر ایسی ہوتی تو خودکشی کر لیتی۔

☆......☆......☆

تقریب میں بہت سے لوگ لیلیٰ کو دیکھ کر مسکرا رہے تھے یہ دیکھ کر فارینہ نے لیلیٰ سے کہا تمہیں پتا ہے لوگ کیوں ہنس رہے ہیں۔ میں بچپن میں ایسی باتوں کو مائنڈ کرتی تھی کیوں کہ نادان تھی مگر اب میں نے اس قدرتی سچائی کو تسلیم کر لیا ہے...... لیلیٰ نے نہایت شوخ لہجے میں جواب دیا۔

تم اپنی خوش مزاجی رہنے دو اور اس حقیقت کو تسلیم کرو کہ تمہیں دیکھنے سے ذوقِ حسن کو تکلیف پہنچتی ہے میں نے کئی بار کوشش کی ہے تمہاری طرف نہ دیکھوں مگر تم بار بار میرے سامنے آ جاتی ہو کیا تمہاری یہاں موجودگی ضروری ہے۔ میں یہاں ڈیوٹی پر ہوں...... بڑے بڑے سرکاری آفیسر آئے ہوئے ہیں ان سے کاروباری ڈیلنگ کرنا میری ڈیوٹی ہے۔

''میں تمہارے باس کی بیوی ہوں اور اس حیثیت سے تمہیں کہتی ہوں کہ تم گھر جاؤ اور صبح اپنا استعفاء بھیج دینا۔''

مجھے افسوس ہے مجھے دیکھنے سے آپ کو تکلیف ہو رہی ہے مگر آپ کو یہ تکلیف برداشت کرنا پڑے گی کیوں کہ اگر میں آپ کی خواہش کے مطابق استعفا دے بھی دوں تو آپ کے شوہر نامدار مجھے نوکری نہیں چھوڑنے دیں گے۔ لیلیٰ کے انداز میں ایک بیگانگی تھی جس نے فارینہ کے پتنگے اڑا دیے فارینہ فوراً میرے پاس آئی اور سرگوشی کے انداز میں بولی۔ تمہاری پرسنل سیکر یٹری کو دیکھ کر لوگ ہنس رہے ہیں مجھے بہت شرمندگی ہو رہی ہے آخر اسے اس تقریب میں بلانے کی کیا ضرورت تھی۔

تمہارے لیے یہ ایک تقریب ہے لیکن لیلیٰ ایسی تقریبات میں بڑے بڑے لوگوں سے کاروباری ڈیل کر لیتی ہے۔

☆......☆......☆

اف...... کیا یہ صبح شام میرے سامنے رہا کرے گی۔'' فارینہ پھر سے بولی۔''

آخر تمہیں اس سے دشمنی کیا ہے......؟ میں جھنجھلا گیا۔

مجھے زہر لگ رہی ہے یہ لڑکی...... ایک تو شکل اللہ معاف کرے...... اور اوپر سے مزاج آسمان پر رہتا ہے۔ بات ایسے کرتی ہے جیسے مالک ہو اور تم اس کے ملازم...... فارینہ اپنی خوبصورت ناک سکوڑتے ہوئے بولی۔

فارینہ کا تجزیہ بالکل درست تھا میں خود محسوس کر رہا تھا اس رات کے بعد جب میں نے لیلیٰ کا ہاتھ پکڑا تھا اور اس سے سوری کیا تھا اس واقعے کے بعد سے لیلیٰ کے مزاج آسمان پر پہنچ گئے تھے میں لیلیٰ کو دیکھتے ہی دل ہی دل میں پیچ وتاب کھانے لگتا مگر میں نے مصلحت سے کام لیا میں لیلیٰ کو معاف کرنے والا نہیں تھا مگر خاص وقت کا انتظار کر رہا تھا۔ میں کاروبار پوری طرح اپنی مٹھی میں لینا چاہتا تھا۔

جب میں نے محسوس کیا کہ اب کاروبار پوری طرح میری مٹھی میں آ چکا ہے تو میں نے لیلیٰ کو زیر کرنے کے لیے وہ ہتھیار استعمال کیا جو مردوں کا خاصہ تھا میں اپنی مظلومیت کا رونا رونے لگا اور ایک دن میں نے لیلیٰ سے کہا لیلیٰ میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔

☆......☆......☆

سر یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں آپ کی ایک عدد بیوی موجود ہے...... لیلیٰ نے حیرانگی سے کہا

مگر مجھے شریعت اجازت دے رہی ہے کہ میں دوسری شادی کرسکتا ہوں۔ میں نے دیگر مردوں کی طرح شریعت کو اپنا ڈھال بنایا مگر اس کے لیے کوئی ٹھوس وجہ ہونی چاہیے سر......۔

ہے نا ٹھوس وجہ...... مجھے اپنا وارث چاہیے میری شادی کو دو سال ہو چکے ہیں مگر...... میں نے جملہ ادھورا چھوڑا۔

آپ مایوس نہ ہوں۔ فارینہ میم ضرور ماں بنے گی اللہ کے گھر دیر ہے اندھیر نہیں۔

اللہ کے گھر اندھیر نہیں ہے مگر فارینہ خود ماں نہیں بننا چاہتی۔

کیوں......

وہ اپنا حسن وشباب خراب نہیں کرنا چاہتی پلیز لیلی مجھے میرا وارث چاہیے۔

آپ کسی سے بھی شادی کر سکتے ہیں مجھ ہی سے کیوں......؟

میں ایک کیا دس شادیاں کرسکتا ہوں مگر میں چاہتا ہوں اس سے شادی کروں جو مجھ سے محبت کرتی ہو میری دولت سے نہیں بولو کیا تم مجھ سے محبت نہیں کرتی...... میں نے تمہاری آنکھوں میں اپنے لیے محبت دیکھی ہے۔ پلیز لیلیٰ میرا ہاتھ تھام لو۔ میں نے عاجزانہ لہجے میں کہا پھر ایک شام جب فارینہ سیر و تفریح کے لیے یورپ گئی ہوئی تھی۔ میں نے اپنے خاص بندوں کے ذریعے پیراڈائیز پوائنٹ کے اپنے بنگلے میں سارا انتظام کیا اور لیلیٰ کو لے کر اس بنگلے میں پہنچ گیا اس وقت بنگلے میں میرے وفادار آدمیوں کے سوا کوئی اور نہیں تھا۔ لیلیٰ میرے ساتھ اطمینان سے چلتی ہوئی اس بنگلے میں داخل ہوئی اندر پہنچ کر میں نے میز پر رکھا ایک بڑا سا پیکٹ اٹھایا اور اسے دیتے ہوئے کہا...... یہ کپڑے اور میک اپ کا سامان ہے تم جلدی سے تیار ہو جاؤ۔

یہ کیسے کپڑے ہیں...... لیلی نے پیکٹ کھولتے ہوئے بولی پیکٹ میں مخصوص دلہنوں والا سرخ لباس تھا ساتھ ہی چوڑیاں اور میک اپ کا سامان تھا۔

یہ کیا ہے سر...... اس نے حیرانگی سے پوچھا

سر نہیں...... نعمت آئندہ تم مجھے نعمت کہو گی...... یہ لباس پہن لو آج ہمارا نکاح ہے مولوی صاحب تشریف لے آئے ہیں۔ ہمارا نکاح...... لیکن...... اس نے کہنا چاہا۔

بات برائے بات

ایک ٹرین اچانک جنگل میں رُک گئی۔ ایک بوڑھی باتونی خاتون نے کھڑکی سے سر نکالا تو اُنہیں ٹرین کا گارڈ بھاگتا ہوا دکھائی دیا۔

خاتون نے اُسے روک کر ٹرین کے رُکنے کا سبب پوچھا۔ اُس نے جواب دیا کہ ایک گائے انجن کے نیچے آ کر کٹ گئی ہے۔

خاتون نے سوال کیا۔ ’’کیا وہ گائے پٹریوں پر آ گئی تھی؟‘‘

’’جی نہیں! ہم نے انجن کو اُس کے پیچھے کھیتوں میں چھوڑ دیا تھا۔‘‘ گارڈ نے جل کر جواب دیا۔

میں شریعت کے مطابق تم سے نکاح کر رہا ہوں...... کیا یہ کافی نہیں ہے۔ میں نے کہا اور کمرے سے باہر آ گیا، جہاں میرے خاص آدمی اور مولوی صاحب بیٹھے ہوئے تھے میں نے نکاح نامے میں جب اپنا نام لکھوایا تو سب کو حیرانی ہوئی لیکن کسی کو ایک لفظ کہنے کی جرات نہیں ہوئی میں نے اپنے آدمیوں کو دیکھا اور پھر کہا میں تم لوگوں کی آنکھوں میں حیرانگی دیکھ رہا ہوں دنیا کی حسین ترین عورت سے شادی کرنے کے بعد میں لیلیٰ جیسی لڑکی سے شادی کیوں کر رہا ہوں...... یہ میرا پرسنل معاملہ ہے اس شادی کی خبر ہم لوگوں کے علاوہ کسی کو نہیں ہونی چاہیے ورنہ...... تم سب کی کھالیں کھنچوا دوں گا۔ پھر میں مائی جیراں کی جانب مڑا مائی جیراں اس بنگلے کی رکھوالی کرتی تھی ...... جاؤ دیکھو لیلیٰ تیار ہوئی یا نہیں۔

☆......☆......☆

تھوڑی دیر بعد میرا نکاح لیلیٰ کے ساتھ ہو گیا اور لیلیٰ کو میرے پہلو سے اٹھا کر مائی جیراں نے بیڈروم میں پہنچا دیا رات بھیگتی جا رہی تھی۔ اب مجھ سے صبر نہیں ہو رہا تھا میں انتقام کی آگ میں جل رہا تھا۔ لہٰذا میں وہاں سے بیڈروم میں آ گیا۔ لیلیٰ گھونگھٹ میں چھپی بیٹھی تھی ہر لڑکی کے دل میں ارمان ہوتا ہے کہ ایسی رات آئے وہ اپنے دل کی دھڑکنوں کو سنبھالتے ہوئے دولہا کے قدموں کی آہٹ سنتی ہے اور سمجھتی ہے کہ آنے والا اس سے پیار بھری باتیں کرے گا اور اس کا گھونگٹ اٹھا کر اس کی تعریفیں کرے گا۔ میں نے کمرے میں داخل ہوتے ہی ساری لائٹیں بند کر دیں اور لیلیٰ کا گھونگٹ کھینچ کر اتار دیا۔ اب ٹھیک ہے اب تم نظر بھی نہیں آ رہی ہو۔ لیلیٰ کے دل پر ایک گھونسا لگا وہ تاریکی میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگی میں نے مزید کوئی بات نہیں کی اور اپنی من مانی کرنے لگا ایک وقت تھا وہ مجھے دیکھتے ہی سیپ میں بند موتی کی طرح ہو جاتی تھی مگر نکاح کے دو بولوں نے مجھے اسکا مالک و مختار بنا دیا تھا اب وہ اپنی عزت کو قیمتی چیز سمجھ کر حیا کی تجوری میں بند نہیں کر سکتی تھی وہ مزاحمت کر رہی تھی مگر اب یہ مزاحمت مجھے روکنے کے بجائے بڑھاوا دے رہی تھی آخر کار میں کامیاب رہا میں نے لیلیٰ کو تسخیر کر لیا۔

اگر تم پہلے میری بات مان لیتی تو کون سا تم پر داغ لگ جاتا...... کون سی تم پر قیامت ٹوٹ پڑتی...... میں نے انداز سے ہاتھ مارا جو بالکل سیدھا اس کے گال پر پڑا وہ ہڑبڑا گئی میں نے چوٹی سے پکڑا اور اسے کھینچا اور اپنے سینے سے لگایا اب نخرے دکھاؤ...... ذلیل عورت تو میرے لیے سیپ میں بند موتی بن گئی تھی میرے لیے پراسرار بن گئی تھی مجھے بے چین کیے رہتی تھی تجھے دیکھتے ہی دیکھتے مجھے اپنی ناکامی یاد آتی تھی میں تجھے خرید نہیں سکا تجھے طاقت سے حاصل نہیں کر سکا تو نے مجھے عذاب میں مبتلا کر رکھا تھا۔ میں نے بستر سے اٹھتے ہوئے ایک لات رسید کی۔

☆......☆......☆

اب تو ساری زندگی اس بنگلے میں قید رہے گی اگر تو نے یہاں سے بھاگنے کی کوشش کی تو میرے آدمی تجھے گولی مار دیں گے یہ کہہ کر میں کمرے سے باہر آ گیا باہر آ کر میں نے اپنے آدمیوں کو ہدایت دی خاص طور پر مائی جیراں کو ہدایت دی کہ وہ لیلیٰ کا خیال رکھے اسے بنگلے سے باہر نہ جانے دے۔ کسی چیز کی ضرورت ہو تو بنگلے میں ہی مہیا کی جائے یہ ہدایت دے کر میں بنگلے سے باہر آ گیا آج میں نے بہت بڑی فتح حاصل کی تھی میں نے فریب سے ایک لڑکی کو فتح کیا تھا آخر میں مرد تھا میں فخر اور غرور سے گردن اٹھائے اپنی کوٹھی کی جانب روانہ ہو گیا۔

اس واقعے کے بعد میں نے دوبارہ کبھی لیلیٰ کی طرف پلٹ کر نہیں دیکھا۔ مرد کے لیے عورت صرف پہلی بار پراسرار ہوتی ہے ایک دفعہ عورت مرد کے خلوت میں آ جائے تو پھر مرد کے لیے اس میں کشش نہیں رہتی وہ پرانی ہو جاتی ہے۔ ایک شام جب میں اور فارینہ شام کی چائے پی رہے تھے تو میں نے فارینہ سے کہا ہماری شادی کو تین سال ہونے کو آ گئے ہیں مگر تم نے خوش خبری نہیں سنائی۔

اللہ کی مرضی ہے جب چاہے نواز دے۔

اللہ بڑا کارساز ہے مگر...... بندہ بڑا جعلساز ہے ...... بے ساختہ میرے منہ سے ایک پرانی کہاوت نکل گئی۔

''کیا مطلب۔''

''کچھ نہیں...... میں کسی اچھی لیڈی ڈاکٹر سے اپائمنٹ لیتا ہوں پھر ہم دونوں چیک اپ کرواتے ہیں۔''

''ابھی نہیں...... ابھی شہر میں اتنی گرمی ہے کہ میں تو پہاڑوں پر جانے کا سوچ رہی ہوں تم بھی میرے ساتھ چلو'' ...... فارینہ بولی واقعی اس دفعہ موسم کے تیور اچھے نہیں ہیں میں بھی فارغ ہوں اچھا ہے ہم اپنا سیکنڈ ہنی مون منا لیتے ہیں میں ابھی ٹکٹ کرواتا ہوں ہم کل ہی چلتے ہیں میں نے شوخ لہجے میں کہا تو فارینہ شرما گئی۔

☆......☆......☆

اگلے دن ہم پہاڑوں پر گھوم رہے تھے ۔اس دفعہ فارینہ کی عنایات مجھ پر کچھ زیادہ ہی تھیں۔ایک دن ہم دونوں پہاڑوں پر گھومتے گھومتے کافی دور نکل گئے دور دور تک اونچی نیچی پہاڑیاں تھیں کئی جگہ وارننگ بورڈ لگے ہوئے تھے کہ آگے گہری کھائی ہے۔ ہم لوگ کافی دور آ گئے ہیں اب واپس چلنا چاہئے میں نے چاروں طرف دیکھتے ہوئے کہا دور دور تک کوئی انسان نظر نہیں آ رہا بس تھوڑی دور پھر واپس چلتے ہیں۔

یہاں تو موبائل کے سگنل بھی نہیں آ رہے ...... میں نے اپنے موبائل کو دیکھتے ہوئے کہا۔

دیکھو کتنا حسین منظر ہے...... فارینہ بولی۔

کہاں ...... میں نے چاروں طرف نظر دوڑائی

ادھر نیچے کھائی میں...... فارینہ نے انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے کہا تو میں نے کھائی میں جھانکا اچانک مجھے ایسا لگا جیسے کسی نے میری پشت پر دونوں ہاتھ رکھ کر مجھے آگے دھکیلا میں سنبھل نہ سکا اور لڑکھڑا کر کھائی میں گرنے لگا میرے منہ سے ایک تیز چیخ نکلی اور میں اندھا دھند ہاتھ چلانے لگا اچانک میرے ہاتھوں میں کسی درخت کی شاخ آ گئی میں نے اسے مضبوطی سے پکڑ لیا۔

فارینہ...... فارینہ مجھے باہر نکالو میں نے اوپر دیکھتے ہوئے فارینہ کو پکارا فارینہ اوپر سے مجھے دیکھ رہی تھی۔

☆......☆......☆

ہاہاہاہا...... فارینہ نے ایک قہقہہ لگایا میں یہاں آئی تھی تمہاری بیوی بن کر یہاں سے جاؤں گی تمہاری بیوہ بن کر تاکہ تمہاری ساری دولت میری ہو جائے ۔ذلیل آدمی میں نے تم سے شادی صرف دولت دیکھ کر کی تھی تاکہ موقع پا کر تمہیں مار ڈالوں اور تمہاری بیوہ بن کر ساری جائیداد پر قبضہ کر لوں...... آج میری یہ خواہش پوری ہو جائیں گی۔

ذلیل ...... کمینی تجھے میں نے بیوی بنایا پیار دیا اور...... تو نے......

نہ زیادہ گالیاں مت دو...... اور ہاں تمہیں باپ بننے کا بڑا شوق تھا نا تو میں بتا دیتی ہوں میں نے دو بار تمہارے بچوں کو اپنے جسم سے کھرچ کر نکالا ہے میں نے دو بار ابارشن کروایا ہے...... اب تم اوپر جا کر اپنے بچوں سے ملنا۔جو بے چارے پیدا بھی نہیں ہو سکے اتنا کہہ کر فارینہ نے ایک بڑا سا پتھر نیچے پھینکا میں نے اس پتھر سے بچنا چاہا مگر پتھر میرے کاندھے پر لگا اور میرے ہاتھ سے درخت کی شاخ نکل گئی اور میں نیچے کھائی کی گہرائی میں گرنے لگا میرے منہ سے ایک بھیانک چیخ نکلی اور میرا ذہن اندھیروں میں ڈوبنے لگا۔نہ جانے کتنی دیر ہوش وحواس سے بیگانہ رہا جب مجھے ہوش آیا تو میرے جسم میں شدید درد ہو رہا تھا۔ میں نے آنکھیں کھول کر دیکھنا چاہا کہ میں کہاں ہوں مگر مجھے کچھ سمجھ نہیں آیا مجھے ہوش میں آتا دیکھ کر کمرے میں موجود شخص میرے پاس آیا اور کسی اجنبی زبان میں بات کرنے لگا پھر اسے شاید میری آنکھوں میں اجنبیت نظر آئی تو اس نے مجھے اشارے سے بتایا کہ وہ مجھے زخمی حالت میں کھائی سے اٹھا کر لایا ہے۔ اسی وقت باہر سے باتیں کرنے کی آوازیں آئیں تو وہ شخص باہر چلا گیا تھوڑی دیر بعد وہ شخص واپس آیا تو سکے ساتھ کچھ اور لوگ بھی تھے مجھے آنکھیں کھولنے

میں وقت ہو رہی تھی اس لیے آنکھیں بند کیے پڑا رہا۔

☆......☆......☆

ہائے میں لٹ گئی برباد ہوگئی...... میرا سہاگ لٹ گیا ہائے نعمت مجھے کس کے سہارے چھوڑ کر چلے گئے مجھے فارینہ کے بین کرنے کی آواز سنائی دی تو میں نے پوری کوشش کر کے آنکھیں کھول دیں میں نے دیکھا فارینہ پولیس والوں کے ساتھ کھڑی تھی۔

بیگم صاحبہ مبارک ہو...... یہ زندہ ہے...... ایک پولیس والا جو انسپکٹر کی وردی میں تھا مجھے آنکھیں کھولتا دیکھ کر بولا۔

نہیں فارینہ نے ایک چیخ ماری...... یہ زندہ نہیں ہے مر چکے ہیں۔

میڈم یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں آپ کو تو خوش ہونا چاہیے...... یہ معجزہ ہے۔

نہیں...... نہیں یہ مر چکے ہیں میں نے انہیں خود کھائی میں گرتے دیکھا تھا فاریہ جنون کی کیفیت میں ادھر اُدھر بھاگ رہی تھی۔

یہ ہوش میں نہیں ہے انہیں پکڑو۔ انسپکٹر نے اپنے ماتحت کو حکم دیا تو اس نے فارینہ کو مضبوطی سے پکڑ لیا میں نے آنکھوں کے اشارے سے انسپکٹر کو قریب بلایا انسپکٹر نے قریب آ کر اپنا کان میرے منہ کے پاس کیا تو میں نے اسے ساری روداد سنا دی اور بتا دیا کہ فارینہ نے مجھے دھکا دیا تھا۔ انسپکٹر نے فوراً فارینہ کے ہاتھ میں ہتھکڑی ڈال دی اور ائیر ایمبولینس کے لیے فون کیا میں نے اطمینان سے آنکھیں بند کر لیں۔

چند گھنٹوں بعد شہر کے بہترین ہسپتال میں اسٹریچر پر لیٹا آپریشن تھیٹر کی طرف جا رہا تھا۔ کہ میں نے مائی جیراں کو پریشانی کے عالم میں ہسپتال میں دیکھا مجھے حیرت ہوئی مائی جیراں کو تو میں نے لیلیٰ کی نگرانی کے لیے بنگلے میں چھوڑا تھا وہ یہاں کیا کر رہی تھی۔ میں نے پوری قوت جمع کر کے مائی جیراں کو آواز دی۔ مائی جیراں میری آواز سن کر حیران رہ گئی اور بھاگتی ہوئی میری اسٹریچر کی طرف آئی۔

☆......☆......☆

صاحب...... صاحب آپ کو کیا ہوا......؟

تم یہاں کیا کر رہی ہو میں نے بدقت پوچھا

صاحب لیلیٰ بی بی کو لے کر آئی ہوں...... صاحب آپ باپ بننے والے ہیں۔ مگر صاحب ڈاکٹر کہہ رہا ہے کہ لیلیٰ بی بی کی حالت بہت خراب ہے۔ صاحب...... صاحب...... اسی وقت ڈاکٹر نے اشارہ کیا اور میرا اسٹریچر آپریشن تھیٹر میں داخل ہوگیا۔ آپریشن تھیٹر کی دوسری جانب لیلیٰ تھی۔ جو میرے بچے کی ماں بننے والی تھی میں زندگی کو الوداع کہنے کے لیے تکلیف اٹھا رہا تھا اور وہ زندگی کو خوش آمدید کہنے کے لیے تکلیف اٹھا رہی تھی۔ آہ کتنا فرق ہے ہم دونوں میں...... آج...... آج پھر لیلیٰ سے ہار گیا میرا ذہن تاریکی میں ڈوبتا چلا گیا......

مجھے ہوش آیا تو میں ہسپتال کے بستر پر لیٹا تھا میں نے اپنے ہاتھ پیر کو حرکت دینا چاہی میرے ہاتھوں نے تو حرکت کی مگر پیروں پر ایسا لگا جیسے پلستر چڑھا ہوا ہے میں نے گردن گھما کر دیکھا ایک نرس میری طرف پیٹھ کیے کھڑی تھی میں نے اسے آواز دی اب مجھے بولنے سے دقت نہیں ہو رہی تھی میری آواز سن کر وہ نرس جلدی سے میرے قریب آئی۔

☆......☆......☆

شکر ہے آپ کو ہوش آ گیا آپ دو دن سے بے ہوش تھے میں ڈاکٹر کو بلاتی ہوں یہ کہہ کر نرس کمرے سے باہر نکل گئی تھوڑی دیر میں وہ اپنے ساتھ ایک ڈاکٹر کو ساتھ لے آئی۔ ڈاکٹر نے میرا معائنہ کیا اور کہا آپ خوش قسمت ہیں۔ جو اتنے بھیانک حادثے کے بعد بچ گئے آپ کی دونوں ٹانگوں کی ہڈیوں میں فریکچر ہوا تھا اور ریڑھ کی ہڈی بھی متاثر ہوئی تھی مگر اللہ کا شکر ہے آپ کا آپریشن کامیاب رہا...... ڈاکٹر نے تفصیل سے مجھے بتایا مگر میں اس وقت اپنے بارے میں جاننا نہیں چاہتا تھا صرف لیلیٰ کے لیے فکر مند تھا۔

میٹرنٹی ہوم میں لیلیٰ نام کی مریضہ ہے اس کا کیا ہوا؟

لیلیٰ...... ڈاکٹر سوچتے ہوئے بڑبڑایا میٹرنٹی کے اسٹاف کو معلوم ہوگا۔

پلیز ڈاکٹر مجھے لیلیٰ کے بارے میں معلوم کر کے

بتائیے بلکہ لیلیٰ کے ساتھ اٹینڈنٹ کے طور پر مائی جیراں بھی تھی اس کو بلا دیجیے ...... میں نے کہا یہ سن کر نرس کمرے سے باہر چلی گئی کچھ دیر بعد جب وہ واپس آئی تو اسکے ساتھ مائی جیراں بھی تھی۔

''کیا ہوا مائی جیراں......؟ میں نے بے قراری سے پوچھا''

مبارک ہو صاحب......آپ باپ بن گئے لیلیٰ بی بی کے بیٹا ہوا ہے مائی جیراں خوشی سے بھرپور لہجے میں بولی

لیلیٰ......لیلیٰ کیسی ہے......؟ میں نے پھر پوچھا

اللہ کا کرم ہے صاحب لیلیٰ بی بی بالکل ٹھیک ہے۔ مائی جیراں بولی تو مجھے ایسا لگا جیسے سکون اور اطمنان کی ایک لہر میرے اندر دوڑ گئی ہو وہ اطمینان جو برسوں سے میری خواہش تھی میرے اندر سرایت کر رہا تھا۔

مجھے لیلیٰ کے پاس جانا ہے......میں نے ڈاکٹر سے کہا۔

لیکن آپ کی حالت......ڈاکٹر نے کہنا چاہا

پلیز ڈاکٹر......میں نے التجائی لہجے میں کہا

اوکے......سسٹر وہیل چیئر لے آؤ۔ ڈاکٹر نے نرس سے کہا تو وہ وہیل چیئر لے آئی ڈاکٹر اور نرس نے مجھے احتیاط کے ساتھ بستر سے اٹھا کر وہیل چیئر پر بٹھایا اور مائی جیراں وہیل چیئر دھکیلتی ہوئی لیلیٰ کے کمرے کی طرف بڑھ گئی جب میں کمرے میں داخل ہوا تو لیلیٰ اپنے بیٹے نہیں ہمارے بیٹے کو دودھ پلا رہی تھی آواز سن کر اس نے جلدی سے بچے کے منہ سے دودھ چھڑایا بچہ اس ناگہانی صورتحال سے پریشان ہو گیا اور اپنی ناراضگی کا اظہار رو کر کرنے لگا میں نے نہ جانے کتنے لوگوں کو رلایا تھا۔ مگر آج اپنے بیٹے کے رونے پر تڑپ اٹھا۔ مائی جیراں وہیل چیئر دھکیلتی ہوئی لیلیٰ کے بستر کے قریب آئی لیلیٰ نے بچے کو اٹھا کر مجھے دیا میں نے بچے کو اپنے ہاتھوں میں پکڑا......میرا بیٹا......میرا وارث......میرا ولی عہد......میں نے اپنے ہونٹ معصوم بچے کے ماتھے پر رکھے۔

لیلیٰ مجھے معاف کر دو میں نے تمہارے ساتھ بہت زیادتی کی ہے اور تم نے مجھے کتنا حسین تحفہ دیا ہے......میں نے لیلیٰ کو مخاطب کر کے کہا۔

آپ میرے سر کے تاج ہیں پلیز آپ مجھ سے معافی نہ مانگیئے......لیلیٰ نے کہا تو میں نے چونک کر اس کی جانب دیکھا آج لیلیٰ کے چہرے پر وہ تقدس تھا جو میں نے کبھی فارینہ کے چہرے پر نہیں دیکھا تھا شاید یہ ممتا کا تقدس تھا ہاں یہ ممتا کا نور تھا جو لیلیٰ کے چہرے سے جھلک رہا تھا۔

☆......☆......☆

میں نے تمہارے ساتھ بہت زیادتی کی ہے معافی تو مجھے مانگنی چاہیے......اور تم نے مجھے میری زندگی کا سب سے قیمتی اور حسین تحفہ مجھے دیا ہے۔ تم میری بیوی ہو یہ بات میں اب ساری دنیا کو بتاؤں گا۔

میں نے آپ کو یہ حسین تحفہ دیا ہے تو آپ بھی میری بھی ایک خواہش پوری کریں لیلیٰ نے پراسرار لہجے میں کہا۔

''ہاں......بولو کیا چاہیے......میں نے کہا۔''

یہ غلیظ دھندا جو آپ کرتے ہیں پلیز اسے بند کر دیجیے نہ جانے اس ہیروئین نے کتنے گھر اجاڑے کتنی ماؤں کی گود ویران کی کتنی بہنوں کے بھائی ان سے چھین لیے کتنے باپوں نے اپنے جوان بیٹوں کی لاشوں کو کاندھا دیا......آپ......آپ یہ کام چھوڑ دیجیے......لیلیٰ نے کہا تو میں نے اس کی طرف دیکھا اس کی آنکھوں میں آنسو تھے پھر میں نے اپنے بیٹے کو دیکھا اور سینے سے لگاتے ہوئے کہا۔

میں اپنے بیٹے کی قسم کھا کر کہتا ہوں آج سے ہر قسم کا غیر قانونی دھندا بند کر دوں گا اب میں بھی ایک شریف آدمی کی طرح زندگی گزاروں گا میرا بیٹا اپنے باپ پر فخر کرے گا۔ یہ سن کر لیلیٰ بستر سے اتر کر میرے قریب آ گئی اور اس نے اپنا سر میرے کاندھے پر رکھ دیا سامنے لگے آئینے میں ہم تینوں کا عکس نظر آ رہا تھا......آج......آج میری زندگی کی تصویر مکمل ہو گئی۔

☆☆......☆☆



کرنی کی سزا

عبدالغفار عابد

گناہ کی شاہراہ پر کھڑی عورت کا انتقام/ چیچہ وطنی سے



میری موبائل شاپ کے بالکل سامنے ایک بیوٹی پارلر کھلا تھا۔ جی ٹی روڈ پر واقع یہ ایک چھوٹا سا شہر تھا۔ صرف دس کلومیٹر کے فاصلے پر یہ ایک بہت بڑا انڈسٹریل شہر تھا۔ شاپ کے بالکل ساتھ پاکستان کی بہت بڑی سبزی منڈی تھی۔ لوگوں کا اک سمندر تھا جو روزانہ اس اسٹاپ پر آتا تھا اور خرید و فروخت کرتا تھا صبح کے وقت لوگوں کا اک سمندر اپنے مدوجزر پر ہوتا تھا اردگرد کافی دیہات تھے۔ ان دیہاتوں کے لوگ روزانہ یہاں آتے

کوئی ضرورت کی خاطر کوئی خرید و فروخت کے لیے اس کے علاوہ یہاں اتوار اور بدھ بازار بھی لگتے تھے۔ جس میں خواتین جوق در جوق آتیں اور یہاں سے خریداری کرتیں سبزی سے لے کر کپڑوں کی خریداری تک کے مواقع یہاں حاصل تھے۔ یعنی صرف مرد ہی نہیں عورتیں بھی یہاں کافی تعداد میں آتی تھیں۔

یوں یہاں بیوٹی پارلر کا کھلنا کوئی عجیب بات نہیں تھی۔ اصل حیرانی والی بات تو وہ بیوٹی پارلر کی مالکہ تھی جس کے حسن پر موسلا دھار ساون، بہاروں کے بادلوں کی طرح برستا تھا چال ڈھال ہرنی کی طرح اٹکھیلیاں بھرتی تھی پھر اس پر قیامت اس کا فیشن ڈھاتا تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ وہ فیشن پروگرام میں ماڈلنگ کرتی ہو اور پورے ملک کے ڈیزائنر اس کے گھر آ کر نت نئے ملبوسات دیتے ہوں کہ انہیں پہن کر کے ملبوسات کی تشہیر کرد۔ جس جگہ سے گزرتی دیکھنے والوں کی آنکھیں حیرت سے دیکھتی رہ جاتیں۔

من چلے صبح اس حسین مالکہ کی اک جھلک دیکھنے کو بے چین نظر آتے۔ اور بیوٹی پارلر کھلنے کے منتظر رہتے اس کی ذات میں ایسی کشش تھی کہ میں بھی منتظر لوگوں میں شامل ہوگیا۔ کام کرنے کے سلیقے کی وہ ماہر تھی کچھ دنوں میں ہی پارلر چل نکلا اور خوب رش رہنے لگا۔

☆......☆......☆

چونکہ پارلر میری دکان کے بالکل سامنے تھا اس لیے کبھی کبھار دیدار حسن نصیب ہو جاتا۔ جس دن مجھے اس مالکہ کا دیدار حسن نصیب ہو جاتا میرا سارا دن مسرور گزر جاتا۔ میں چونکہ ہمیشہ اس کی تاک میں رہتا لہٰذا میری نظریں کبھی کبھار دوچار ہو ہی جاتیں اب تو وہ بھی کبھی مجھے محبت بھری نظروں سے دیکھتی وقت نے دنوں کا فاصلہ گھنٹوں تک محدود کر لیا پھر درمیانی منازل خود بخود طے ہونے لگیں۔ محبت کی پینگوں پر ہلکورے لینے لگے وقت نے ہم کو ایک دوسرے کے بہت قریب کر دیا۔ اب ہم ایک دوسرے کی محبت کے سمندر میں غوطہ زن رہنے لگے۔

☆......☆......☆

مجھ کو تکلیف اس وقت ہوتی جب ایک شخص اس کے پاس پارلر میں آتا اور دیر تک پارلر میں موجود رہتا۔ اس دوران وہ مجھے بھی نظر انداز کر دیتی اور گاہک خواتین کو انتظار کی سزا کے حوالے کر دیا جاتا پارلر ایک گھر کی شکل میں تھا۔ جب وہ آدمی چلا جاتا تو وہ انتظار میں بیٹھی خواتین کو کہتی میرے شوہر تھے ہم گھریلو مسئلے پر بات کر رہے تھے۔ ایک دن جب ہم شہر کے ایک ہوٹل میں اکھٹے کھانا کھا رہے تھے تو میں نے اپنے دل کا غبار نکالا خوب شکوہ کیا آخر وہ شخص کون ہے؟ دیکھو عاصمہ جھوٹ کا سہارا نہیں چلے گا ''اس بات کا مجھے یقین ہے کہ وہ تمہارا شوہر نہیں ہے اگر تمہارا کوئی دوست ہے تو آپ نے آج تک مجھے بتایا کیوں نہیں سچ سچ بتاؤ اس کا کیا رشتہ ہے آپ کے ساتھ اس کے آتے ہی تم سب کچھ بھول جاتی ہو اس نے آخر کیا جادو کر رکھا ہے تم پر؟' بتاؤ وہ کون سی مجبوری ہے جو تم اس شخص کو گھنٹوں پارلر میں بٹھائے رکھتی ہو یہ بات میں نے کیا کہی کہ ایک بم تھا جو اس کے اندر پھٹ گیا اور اس کا وجود ریزوں میں تقسیم ہوگیا۔''

☆......☆......☆

وہ یوں گویا ہوئی۔

''ہم دو بہنیں اور ایک بھائی والد بچپن میں ہی فوت ہوگئے تھے ماں نے محنت مزدوری کر کے ہمیں پالا پوسا میٹرک تک تعلیم حاصل کر پائی بھائی لفنگے لڑکوں کا دوست بن گیا چرس کے سگریٹ پینے لگ گیا شراب بھی پیتا گھر میں آمدنی کا کوئی ذریعہ نہ تھا نشہ پورا کرنے کے لیے وہ چوری کرنے لگا۔ ایک دفعہ زمیندار کے ہاں چوری کرتا پکڑا گیا زمیندار نے پولیس کے حوالے کر دیا پیروی کرنے والا کوئی نہ تھا یوں بھائی کو جیل ہوگئی ہم گھر میں اکیلے رہ گئے۔ پیٹ دو وقت کی روٹی مانگتا ہے اس دوزخ کو بھرنے کے لیے میں شاہراہ زندگی پر چل پڑی۔

پیٹ کے دوزخ کے ایندھن کے حصول کے لیے میں اس درندے کے دفتر جا پہنچی اس نے میرا حسن اور جوانی دیکھ کر فوراً مجھے اپنے دفتر میں نوکری دے دی۔ دفتر میں میرا کام اس درندے نما آدمی یعنی Boss کی خواہشات کی تکمیل کرنا تھا بدلے میں ہمارے گھر کا چولہا جلنے لگا۔ میں غریب لڑکی سے انتہائی خوبصورت اور امیر لڑکی بن گئی بلکہ لڑکی سے عورت میں بدل گئی مجھے بولنے کا سلیقہ آ گیا روپیہ پیسہ انسان کی بہت سی کمزوریوں پر پردہ

ڈال دیتا ہے۔ اب میں بھی ایک معزز خاتون بن گئی غربت کے صحرا میں مسافت کے دوران اس نے مجھ پر پیسہ پانی کی طرح بہایا۔ اس دوران میں نے بیوٹی پارلر کا کام سیکھ لیا۔ گندے کاموں سے مجھے نفرت ہوگئی اس شخص سے جان چھڑانے کے لیے میں آپ کے چھوٹے سے شہر میں آ گئی اس نے یہاں بھی مجھے ڈھونڈ لیا۔ اب بھی پرانا قرض چکانا پڑتا ہے اس نے مجھے لالچ دے رکھا ہے کہ پارلر والی دکان خرید کر دے گا۔ یوں اس شخص نے مجھے اپنے چنگل میں پھنسا رکھا ہے آپ سے گزارش ہے کہ اس شخص سے میری جان چھڑا دیں میں تاحیات آپ کی ممنون رہوں گی۔"

☆......☆......☆

"عاصمہ کی داستان سن کر مجھے بھی تکلیف ہوئی۔ میں نے وعدہ کیا کہ یہ شخص تمہارے سائے کے قریب بھی نہیں آئے گا میرا تعلق ایک دو مقامی صحافیوں سے تھا اس کے علاوہ میرا اپنا شہر تھا پورا شہر مجھے جانتا تھا۔ اب میں اس کی آمد کا منتظر رہنے لگا۔ آخر ایک دن وہ آ ہی گیا ایک اخبار والا اور بازار سے چند آدمی لے کر میں پارلر پہنچ گیا اس سے آنے کا مقصد پوچھا اس کے بتانے سے قبل ہی عاصمہ رونے لگی اور تمام ماجرا اس نے کہہ ڈالا یہ سننا تھا کہ وہ شخص بہت شرمندہ ہوا ہماری منت سماجت کرنے لگا پاؤں پڑ کر معافیاں مانگنے لگا آئندہ کبھی اس شہر میں نہ آنے کی قسمیں کھانے لگا اس بار مجھے معاف کر دو یوں اس کی خلاصی ہوئی۔"

اگلے دن عاصمہ پارلر کھولنے کے بجائے میری شاپ میں آ گئی کرسی پر بیٹھنے کے بجائے میرے پاؤں میں بیٹھ گئی۔ زار و قطار رونے لگی اور میرا شکریہ ادا کرنے لگی "امجد تم نے مجھ پر بہت بڑا احسان کیا ہے اب میں ساری زندگی تمہاری بن کر رہوں گی۔" یوں ایک دفعہ ہم پھر پیار کی راہوں پر محوسفر ہوگئے وقت نے ہم دونوں کو ایک دوسرے کے قریب کر دیا۔ اور وہ باقاعدہ پارلر آنے لگی اب تو ہماری روز عید ہوتی میں جہاں بلا تاون ہو یا رات وہ وہاں آ جاتی اکثر ہماری راتیں شہر کے ہوٹل میں گزرنے لگیں۔

☆......☆......☆

خوشیوں کے نگر میں آباد ہوئے تھوڑے دن ہی گزرے تھے کہ نظر بد نے پیچھا کرنے شروع کر دیا۔ خوشیوں کو کسی کی نظر لگ گئی پریشانیوں کو ہمارے محلے کا پتا چل گیا۔ ہماری حسین راتوں کے چاند کو گرہن نے آ گھیرا وہ روزانہ واپس بڑے شہر جاتی اس بازار میں ایک بہت بڑی کپڑے کی دوکان تھی۔ جس کا مالک روزانہ آتے جاتے اسے دیکھتا لاکھوں پتی آدمی تھا۔ ایک دن اس نے جرات کر کے صبح کام پر آنے کے لیے اسے اپنی گاڑی میں لفٹ دی جو اس نے قبول کر لی وہ اس کو پارلر سے تھوڑا دور چھوڑ کر چلا گیا۔ شام کو لینے بھی آیا پھر تو وہ روزانہ اسی کے ساتھ گاڑی پر آتی جاتی۔ اب تو اس نے مجھ پر بھی توجہ دینا کم کر دی میرے احسان بھی اس کو بھولنے لگے۔

اب تو پارلر بھی اکثر بند رہتا پوچھنے پر پتا چلتا کہ شہر سے باہر اپنے عزیزوں کے ہاں گئی تھی۔ جب میں نے تحقیق کی تو پتا چلا کہ وہ اس گاڑی والے کے ساتھ اسلام آباد اور مری کی سیر کو جاتی آبپارہ مارکیٹ اسلام آباد سے خریداری کرتی۔ اب تو اس کی پانچوں انگلیاں گھی میں اور سر کڑاہی میں تھا۔

مجھ پر احسان کر کے کبھی کبھار وہ مجھے فون کر لیتی...... ایک وہ وقت تھا کہ صبح پارلر پر آتے اور شام کو جاتے وقت وہ مجھے سلام کر کے جاتی۔ اب ہفتوں بعد ہی ملاقات ہو پاتی وہ بھی انتہائی عجلت میں اب اس کے رکھ رکھاؤ میں نوابوں والی رعونیت آ چکی تھی۔ یہ حالات میری برداشت سے باہر تھے میں اس کی شکل دیکھنے کو بھی ترستا تھا۔ اس قربت تو بہت دور کی بات تھی میں نے بھی اب اس سے انتقام لینے کی ٹھان لی۔ میں اس کی راہوں میں اپنی آنکھیں بچھانے لگا وہ جتنی مجھ سے نظریں چراتی میں اتنا ہی دیوانگی کا مظاہرہ کرتا پورا ہفتہ میں اس کی آؤ بھگت میں لگا رہا آخر میں اس کو لاہور لے جانے کے لیے قائل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔

لاہور میں میرا ایک بہت ہی قریبی دوست رہتا تھا۔ جس کے ذمے میں نے لگایا کہ وہ کسی ہوٹل میں کمرے کا انتظام کر دے ہم میاں بیوی نے لاہور آنا ہے اور وہاں داتا دربار بی بی پاک دامن کے مزار پر اولاد کے لیے منت مانی ہے۔ میرا پروگرام وہاں ہوٹل میں یہ تھا کہ اس کے ساتھ جنسی ہوس کی پیاس بجھاؤں گا میں نے ایک آٹو میٹک کیمرے کا انتظام کیا کہ اس کی فلمیں بناؤں گا اور بلیک میل کر کے اس کو ہمیشہ کے لیے اپنے تابع رکھوں گا اس پروگرام سے میں نے اپنے دوست کو لاعلم رکھا......

☆......☆......☆

دوست صبح سے ہمارا منتظر تھا ہم دس بجے شہر سے نکلے اور تقریباً ایک بجے لاہور پہنچے اور وہیں اڈے پر میرا دوست ہمارا منتظر تھا۔ رکشہ لیا اور گلبرگ کے ایک ہوٹل میں چلے گئے جہاں کمرہ پہلے ہی بک تھا میں نے کیمرے کو کمرے میں ایک محفوظ جگہ رکھا پھر ہم دنیا و مافیا سے بے خبر ہو گئے۔ سات بجے اپنے دوست کو بلایا وہ ہمیں لاہوری اڈے تک چھوڑ گیا۔ اور یوں ہم واپس گھر کو عازم سفر ہوئے راستے میں میں نے اسے فلم کے بارے میں بتایا لیکن تم پریشان نہ ہونا ان کو Delete کر دوں گا کیمرا میرا اپنا ذاتی ہے۔ یہ سن کر وقتی طور پر اس کا رنگ متغیر ہو گیا لیکن پھر اس نے اپنے آپ کو سنبھالا اور ہم دیگر باتوں میں مشغول ہو گئے اب اس نے پینترا بدلا۔

''امجد میں تمہاری ہوں'' اور تمہاری ہی رہوں گی میں دل و جان سے تم سے محبت کرتی ہوں میں نے کبھی آپ سے اپنی کوئی چیز چھپائی ہے۔ جو تم تصاویر اور فلمیں بنا رہے ہو آخر تم نے ان تصاویر کا کیا کرنا ہے۔......!

آخر میں آپ کو ایک بات کہوں آپ کا دوست مجھے بہت پیار بھری نظروں سے دیکھتا رہا تھا۔ آپ جو اس کے ساتھ نیچے ہوٹل میں گئے تو آپ کو ادھر بٹھا کر وہ مجھ سے پیار بھری باتیں کرتا رہا آپ کی بہت سی برائیاں کیں ہوٹل کا کرایہ میں نے دیا اور رکشہ کا کرایہ بھی میں نے دیا جو آدمی ہوٹل اور رکشے کا کرایہ برداشت نہیں کر سکتا وہ آپ کو کیسے خوش رکھے گا۔ میں یہاں ایک فیکٹری کا مینیجر ہوں تم میرے ساتھ دوستی کر لو تم کو پھولوں کی طرح مہکائے رکھوں گا۔ تمہاری ہر خواہش پوری کروں گا تمہارا ادنیٰ غلام بن کر رہوں گا۔ میں نے بڑی مشکل سے جان چھڑائی ہے۔ عاصمہ جو کچھ تم نے بتایا ہے کیا یہ واقعی سچ ہے؟ امجد بالکل سچ ہے میں نے سب کچھ ریکارڈ کیا ہوا ہے ابھی میں ٹینشن میں ہوں بعد میں آپ کو سناؤں گی...... یہ سننا تھا کہ میرے جسم میں آگ لگ گئی میں تو نفرت کے دہکتے انگاروں پر لوٹنے لگا میری آنکھوں میں خون اتر آیا جی چاہتا تھا کہ ابھی لاہور واپس جا کر اپنے دوست کو جان سے مار دوں یا خود مر جاؤں بڑی مشکل سے اپنے جذبات پر قابو کیا۔ پھر بڑے ٹھنڈے مزاج

سے اس کو فون کیا خوب اس کی بے عزتی کی میں نے کہا ''تم نے مجھے اسی لیے لاہور بلایا تھا کہ تم میری بیوی سے اظہار محبت کرو کیا تم اب دوست کہنے کے قابل ہو میری بیوی کی عزت سے کھیلنا چاہتے تھے ۔ تمہارے تمام کرتوت اور جذبات کا اظہار عاصمہ نے موبائل کے ذریعے ریکارڈ کر لیا ہے تم اتنے گھٹیا انسان ہو یہ میرے وہم و گمان میں نہ تھا۔ میں تو تم کو بھائیوں کی طرح عزیز سمجھتا تھا۔ کتنی دفعہ میرے گھر آئے میں نے تمام گھر والوں سے بھائی کی حیثیت سے تعارف کروایا میں نے تم پر اعتبار کر کے بہت بڑی بھول کی لعنت ہے تیری دوستی پر آئندہ خبردار جو مجھے فون کر کے بلایا یا میرے گھر آئے مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔''

یہ الفاظ کیا تھے ایٹم بم تھا جو ناصر پر پھٹا وہ انسان سے راکھ کے ڈھیر میں بدل گیا وہ تو شرم سے ڈوب مرنے لگا...... ناصر نے حلفاً کہا ''میں نے عاصمہ سے ایسی کوئی بات نہیں کی یہ بات ضرور کی کہ تم میرا دوست امجد کی جو بھی لگتی ہو میرے لیے ایک بہن کا درجہ رکھتی ہو میرے لیے کوئی بھی حکم ہو تو میں حاضر ہوں امجد زندگی کے کسی بھی موڑ پر آپ سے بے وفائی کرے مجھے ضرور بتانا میں امجد کو راہ راست پر لاؤں گا وہ ہمیشہ تمہارا رہے گا۔''

تمہارے پاس ریکارڈ ہے اس سے بڑا کوئی اور ثبوت نہیں میں جمعہ کو تمہارے گھر آ رہا ہوں سب گھر والوں کے سامنے مجھے ریکارڈ سنانا اگر ریکارڈ میں یہ سب کچھ ہو تو میں سزا کا حق دار ہوں گا۔ اگر آپ کے پاس ریکارڈ نہ ہوئی تو پھر میں آپ کے تمام گھر والوں کو بتاؤں گا کہ تم جمعہ کے دن لاہور ہوٹل میں کیا گل کھلا رہے تھے۔

☆......☆......☆

یہ سننا تھا کہ میرے تو اوسان خطا ہو گئے اگر میرے دوست نے یہاں آ کر سب کچھ بتا دیا تو میں برباد ہو جاؤں گا میری بیوی سنے گی تو کیا کہے گی یقیناً میرا گھر اجڑ جائے گا میں نے فوراً اپنے دوست ناصر کو فون کیا اپنے الفاظوں کی معافی مانگی عاصمہ کو گالیاں دیں۔ میں نے عاصمہ سے ریکارڈ مانگی مگر وہ صاف مکر گئی۔ بولی تم نے مجھے برباد کیا میری فلمیں بنائیں میں نے جوش کے بجائے ہوش سے کام لیا اب میں نے تمہاری بربادی کا انتظام کر لیا ہے۔ تمہارے گھر جوان خوبصورت بیوی تھی تمہاری دو معصوم بچیاں تھیں تم کو ان پر ذرا بھی ترس نہ آیا۔

آخر میں بھی کسی کی بیٹی ہوں کوئی میرا بھی بھائی ہے تم نے تو مجھے بے غیرتی کے اندھے کنویں میں دھکیل دیا تھا۔ اگر میرے گھر والے تمہارے کرتوت سنیں گے تو وہ مجھے کس نظروں سے دیکھیں گے تم تو عشق میں بے غیرت بن گئے ہو کیا پورے جہاں کو اپنے جیسا سمجھتے ہو اب اپنے گھر میں آگ لگی ہے تو پریشان ہو گئے ہو مرد بنو اور حالات کا مقابلہ کرو......!!

یہ جواب سن کر نہ میں جی سکتا تھا نہ میں مر سکتا تھا۔ ناصر کی بڑی منتیں کی کہ تم میرے گھر مت آنا میرا گھر اجڑ جائے گا میں معاشرے میں بدنام ہو جاؤں گا۔ امجد اس کا جواب تم دو کہ آپ نے بھائی جیسے دو مقدس رشتے پر تہمت کیوں لگائی میں ہر حال میں تصدیق کروں گا۔ آپ بھی کریں اگر مجھ پر کوئی ایک معمولی سا جرم بھی ثابت ہو جائے تو مجھے وہیں گولی مار دینا میرا خون بھی تم کو معاف ہے۔

☆......☆......☆

بہر حال میری لاکھ منت سماجت کے باوجود ناصر جمعہ کو ہمارے گھر آ گیا۔ سب گھر والوں کی موجودگی میں لاہور میں گزرے ایک ایک لمحہ کی روداد سنا دی ناصر نے کہا مجھے ''ریکارڈنگ'' سناؤ ریکارڈنگ ہوتی تو میں سناتا ناصر رات کو بھی نہ ٹھہرا میرے ہنستے بستے گھر کو شعلوں کی نظر کر کے چلا گیا۔ بقیہ رات میرے ساتھ گھر والوں نے کیا سلوک کیا یہ میں ہی جانتا ہوں۔ میرے والد صاحب کی آنکھوں میں خون اتر آیا وہ تو مجھے ختم کرنے پر تل گئے میری ماں نے بڑی مشکل سے منت سماجت کر کے ان کو ٹھنڈا کیا اگلے دن بیوی اپنی دونوں بیٹیوں کو لے کر میکے چلی گئی۔ میں نے بڑی منت سماجت کی آئندہ ہر قسم کے گناہوں سے توبہ کی مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئی اور چلی گئی وہاں جاتے ہی اس نے عدالت میں خلع کا دعویٰ کر دیا۔ مجھے آج نوٹس ملا ہے سوچ سوچ کر پاگل ہو رہا ہوں۔ کہ میں کیا کروں؟ اپنے ہی شعلے میں گھر کے چمن کو دہکتی آگ سے کیسے بچاؤں؟ پر شاید یہ سب میری کرنی کی سزا ہے جو مجھے بھگتنا پڑے گی۔

☆☆......☆☆

صبر کا پھل

محمد زبیر ساگر

صبر و تحمل کا انعام پانے والی دوشیزہ کی کہانی / کوئٹہ سے

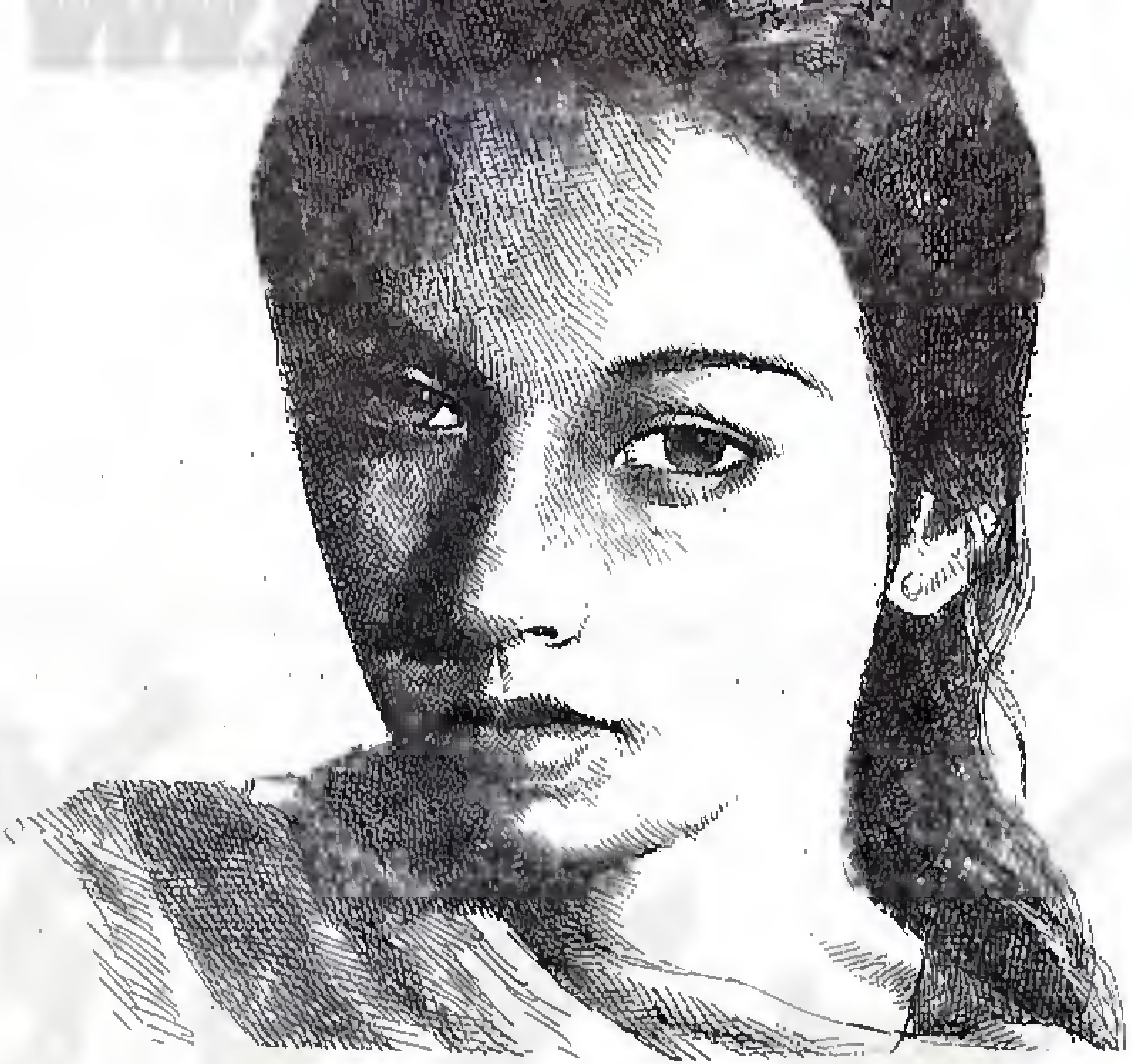
"دیکھو زویہ میں تمہیں آخری بار کہہ رہی ہوں میری بات کو اچھی طرح اپنے ذہن میں لو مجھے جلد از جلد بچہ چاہیے کچھ بھی کرو۔" پروین آج اپنی بہو پر برس رہی تھی آج وہ بہت غصے میں تھی دو برس ہو گئے شادی کو لیکن بچے کا کوئی نام ونشان نہیں تھا۔

"کمبخت کہیں کی پتا نہیں میرے معصوم بیٹے نے کون سا گناہ کیا جس کی اسے اتنی بڑی سزا مل رہی ہے کہیں جاتی بھی نہیں ہے۔ ہمارا پیچھا بھی نہیں چھوڑتی ہے منحوس کہیں کی کان کھول کے سن لے مجھے بچہ چاہیے اگر نہ ہوا تو پھر میں تیرے ساتھ کیا کروں گی۔ یہ تم نہیں جانتی ...... یاد رکھنا!!" اپنی بات ختم کر کے وہ تیز قدموں سے سیڑھیاں چڑھتی ہوئی اوپر کمرے میں چلی گئی۔

☆......☆......☆

زویہ وہیں کھڑی رو رہی تھی پروین کا تو یہ ہر روز کا کام تھا۔ مگر پہلے کبھی بھی زویہ اتنی روئی نہیں تھی مگر آج اس کے دل کو بہت ٹھیس پہنچی تھی۔ اس میں اس کا کیا قصور تھا سوائے رونے کے وہ اور کر بھی کیا سکتی تھی۔ بچہ پیدا کرنا اس کے بس میں تھا یہ تو اللہ تعالیٰ کی دین ہے۔ زویہ نے تھوڑی دیر رونے کے بعد اپنے آنسو صاف کرتے ہوئے ایک لمبی طویل سانس لی اور ہال میں پڑے صوفے پر بیٹھ گئی۔ اور اپنے دونوں ہاتھ اٹھا کر عاجزانہ لہجے میں دعا کی۔ "اے میرے اللہ تجھے تیرے حبیب کا واسطہ مجھ پر رحم فرما تو بڑا رحم کرنے والا ہے تیرے سوا میری دعا سننے والا کوئی نہیں میرے صبر کو اور نہ آزما۔ یہ کہہ کر زویا نے دل مضبوط کیا اور کبھی ہمت نہ ہارنے کا فیصلہ کیا اور دل میں یہ ارادہ بھی کر لیا کہ آج کے بعد وہ ہر وقت درود شریف پڑھے گی۔ صبح وشام رات ہر وقت کیوں کہ اس نے ٹی وی پر اذان کے بعد سنا تھا کہ جو شخص مجھ پر ایک مرتبہ درود بھیجے گا اللہ تعالیٰ اس پر دس مرتبہ رحمت فرمائے گا۔ یہ نبی پاک ﷺ نے فرمایا تھا اور پانچ وقت کی نماز بھی پڑھے گی اور کبھی ناغہ نہیں کرے گی۔ یہ ارادہ پکا کرنے کے بعد وہ پھر کام کرنے میں لگ گئی زویہ بہت صبر اور ہمت رکھنے والی لڑکی تھی۔ اس کے ساتھ جو کچھ بھی ہوتا تھا کبھی اس نے کسی کو نہیں بتایا اپنے ماں باپ کو بھی نہیں۔

آصف پروین کا اکلوتا بیٹا تھا پڑھا لکھا اور خوبصورت نوجوان تھا ماں سے بہت محبت کرتا تھا۔ مگر ماں کی طرح ہر وقت زویہ سے لڑتا جھگڑتا رہتا تھا جو ماں کہتی وہی کرتا تھا۔ دونوں ماں بیٹا پڑھے لکھے کم عقل تھے جن کو یہ معلوم نہیں تھا کہ بچہ پیدا کرنا زویہ کے بس میں



نہیں ہے یہ تو خدا کے بس میں ہے وہ تو بے بس ہے۔

☆......☆......☆

پروین کا خاوند پانچ سال پہلے ایکسیڈنٹ میں اللہ کو پیارا ہو گیا تھا۔ جس کی وجہ سے پروین ہر وقت لڑائی جھگڑا کرتی رہتی تھی وہ اپنے آپ کو اکیلا سمجھتی تھی۔ جس کی وجہ سے اس کے مزاج میں بہت چڑچڑا پن آ گیا وہ اپنے خاوند ناصر سے بہت محبت کرتی تھی اسے گھر کی کوئی بھی چیز اچھی نہیں لگتی تھی۔ محمد ناصر بہت سی کپڑے کی فیکٹریوں کا مالک تھا اس کے مرنے کے بعد ساری فیکٹریاں اور کاروبار آصف نے سنبھال لیا تھا۔ پروین کے پاس ایک خوبصورت کوٹھی کار اور بے پناہ دولت ہونے کے باوجود دل کا سکون نہیں تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ ہمارے گھر میں بچے ہوں شور شرابا ہو جن سے اس کا دل لگے وہ اتنے بڑے محل نما گھر میں وہ اپنے آپ کو تنہا محسوس کرتی تھی۔ شام کو جب آصف گھر آیا تو سیدھا سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اپنی ماں کے کمرے میں گیا تو دیکھا ماں بہت غصے میں بیٹھی ہوئی تھی۔ آصف جب بھی گھر آتا تو پہلے ماں کے کمرے میں جاتا پھر زوبیہ کے پاس آتا۔ پروین نے آصف کو دیکھ کر ایک لمبی سانس لی ......طیش بھرے انداز میں۔ ”آصف بیٹا آج میں نے زوبیہ کو صاف صاف بتا دیا ہے“ آصف ماں کے پاس بیٹھ کر کیا بتا دیا؟

”یہ ہی کہ مجھے بچہ چاہیے صرف بچہ اور جلدی چاہیے اگر ایسا نہ ہوا تو اسے ایسی سزا ملے گی۔ وہ ساری زندگی یاد رکھے گی۔ دو سال ہو گئے ابھی تک کچھ بھی نہیں تم بھی اسے صاف صاف کہہ دینا۔“

آصف کھڑا ہوا ”آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں امی جان میں تو اسے کئی بار کہہ چکا ہوں آپ فکر نہ کریں میں پھر کہہ دوں گا“ یہ کہہ کر آصف کمرے سے باہر نکل گیا۔

☆......☆......☆

پروین نے ایک سانس لیا اور کہا اے میرے اللہ پتہ نہیں کب اس گھر میں خوشیاں اور رونق آئے گی اسی

طرح دن گزرتے گئے۔ آصف نے ماں کے کہنے پر کئی بار زوبیہ سے لڑائی جھگڑا کیا اسے مارا بھی گالیاں بھی دیں۔ مگر زوبیہ نے اُف تک نہیں کی بس صبر و شکر کیا پانچ وقت کی نماز اور دن رات ہر وقت درود شریف پڑھتی رہی۔ اور تہجد کے نفل بھی پڑھتی اور ہر وقت رو رو کر اللہ تعالیٰ کے آگے دعائیں کرتی تھی۔

وقت کا پہیہ چلتا رہا اور چھ ماہ گزر گئے ایک دن پروین نے کہا ''آصف بیٹا کسی دن زوبیہ کا چیک اپ تو کروالو چار ماہ ہوگئے ہیں چیک اپ کروائے ہوئے شاید اللہ نے ہماری دعا قبول کرلی ہو آج کل تو زوبیہ بہت عبادت کررہی۔ ہے ٹھیک ہے امی جان میں آج شام کو ہی زوبیہ کو کلینک لے جاؤں گا۔ یہ کہہ کر آصف چلا گیا ''اے میرے رب اب تو ہماری دعا قبول کرلے'' ہمیں بھی ایک ننھا منا سا بچہ دے دے ہمارے اس سونے گھر میں بھی رونق آجائے۔ تجھے تیرے حبیب کا واسطہ۔ شام ہوئی تو آصف زوبیہ کو کلینک لے کر گیا ڈاکٹر نے تسلی سے زوبیہ کا چیک اپ کیا پھر ڈاکٹر نے خوش لہجے میں آصف سے کہا آصف صاحب مبارک ہو آپ کی بیوی کو حاملہ ہوئے تین ماہ ہوگئے ہیں۔ یہ سن کر آصف کی خوشی کی انتہا نہ رہی اس نے بڑی مشکل سے اپنے آپ کو قابو میں کیا اور جلد ہی زوبیہ کو گھر لے کر آگیا۔ اور خوشی کی یہ خبر اپنی ماں کو سنائی یہ خبر سن کر پروین اتنی خوش ہوئی کہ خوشی کے مارے اسکی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

آصف اور پروین جسے اتنی گالیاں دیتے تھے۔ جس پر صبح و شام ظلم کرتے تھے۔ آج ان کے دل میں زوبیہ کے لیے صرف محبت ہی محبت تھی زوبیہ کا صبر اور عبادت رنگ لائی۔

☆......☆......☆

اللہ کو اس کی عبادت پسند آئی اور اس نے زوبیہ کی دعائیں قبول کرلیں۔ آج زوبیہ بہت خوش تھی کہ اللہ نے اسکی فریاد سن لی اس کی آنکھوں سے خوشی کے آنسو نکل رہے تھے۔ اس نے اللہ سے یہ وعدہ کرلیا تھا کہ جس عبادت سے مجھے اتنی خوشیاں ملی ہیں اس عبادت کو میں ساری زندگی نہیں چھوڑوں گی۔ پروین نے آگے بڑھ کر زوبیہ کو گلے لگایا۔ اس کے آنسو صاف کیے اور ماتھا چوما

هونٹوں پہ کبھی اُن کے میرا نام ہی آئے
آئے تو سہی بر سر الزام ہی آئے
حیران ہیں لب بستہ ہیں، دل گیر ہیں غنچے
خوشبو کے زبانی تیرا پیغام ہی آئے
تاروں سے سجالیں گے رہ شہر تمنا
مقدور نہیں صبح چلو شام ہی آئے
کیا راہ بدلنے کا گلہ ہمسفروں سے
جس رہ سے چلے تیرے در و بام ہی آئے
تھک ہار کے بیٹھے ہیں سر کوئے تمنا
کام آئے تو پھر جذبۂ ناکام ہی آئے
باقی نہ رہے ساکھ ادا دشت جنوں کی
دل میں اگر اندیشۂ انجام ہی آئے
ادا جعفری

اور کہا ''بیٹی ہمیں معاف کردو ہم دونوں ماں بیٹے نے تم پر بہت ظلم کیے ہیں'' ہمیں معاف کردو بیٹی یہ سن کر زوبیہ نے خوشی سے کہا یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں امی جان میں نے تو کبھی آپ کی باتوں کا برا نہیں منایا۔ یہ سن کر آصف کی آنکھوں میں آنسو آگئے وہ زوبیہ کو محبت بھری نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔

پروین نے زوبیہ سے پوچھا کے یہ سب کیسے ہوا تم نے ایسا کیا کیا جو اتنی جلدی تمہاری دعا قبول ہوگئی۔ زوبیہ نے پروین کو اس عبادت کے بارے میں سب کچھ بتایا یہ سن کر آصف اور پروین کے دل میں خوف خدا آیا تو انہوں نے پکی توبہ کرلی اور یہ فیصلہ کرلیا کہ آج کے بعد وہ بھی زوبیہ کی طرح عبادت کریں گے۔ نو ماہ بعد اللہ تعالیٰ نے چاند سا بیٹا دیا زوبیہ پروین اور آصف نے اللہ پاک کی اس نعمت کا شکریہ ادا کیا اور ہنسی خوشی رہنے لگے۔

جو بھی میری یہ کہانی پڑھے ان سے میری یہ گزارش ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کو راضی کرنا ہو یا کوئی دعا قبول کروانی ہو تو پھر زوبیہ کی طرح عبادت کریں ایسا ضرور کرکے دیکھیے گا۔

☆☆......☆☆



اجتماعی دکھ

رانا محمد شاہد

سقوط ڈھاکہ کا غم لیے ایک حقیقی داستان / بورے والا سے

''کیا کہہ رہا تھا وہ پروفیسر......؟''

''اپنا فلسفہ جھاڑ رہا تھا، سالگرہ ہمیں زیب نہیں دیتی، یہ عیسائیوں کی رسم ہے اور ویسے بھی فضول خرچی ہے۔'' طاہر کے پوچھنے پر منیر نے ناک چڑھاتے ہوئے جواب دیا۔

''اسے کہنا تھا وہ اپنا فلسفہ اپنے پاس رکھے۔ اگر اسے آنا ہے تو سالگرہ میں آئے ورنہ...... ہمیں پڑھانے کی ضرورت نہیں طاہر نے غصے سے کہا تو قادر بول پڑا قادر نے اس کی حمایت میں کہا ''نہیں یار اگر سوچا جائے تو حقیقتاً سالگرہ ہماری رسم نہیں ہے اور ویسے بھی......''

''کیا...... کیا ہم زندگی کی چھوٹی چھوٹی خوشیوں کو بھی انجوائے نہ کریں۔'' طاہر پھٹ پڑا۔ ''سوری یار تم تو ناراض ہونے لگے میں نے تو ایسے ہی کہہ دیا۔'' قادر نے طاہر کو ناراض ہوتے دیکھ کر کہا۔

☆......☆......☆

یہ ایک انگلش میڈیم ہائر سیکنڈری اسکول تھا۔ طاہر، منیر، سلیم، قادر اور شیراز دسویں جماعت کے طالب علم تھے اور ایک ہی کلاس میں پڑھتے تھے۔ تین دن بعد طاہر کی سالگرہ تھی اسی حوالے سے وہ اپنے دوست شیراز کے متعلق باتیں کر رہے تھے، شیراز کو کلاس کے سب دوست حتیٰ کہ ٹیچر پروفیسر کہہ کر بلاتے تھے۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ اس نے موٹا سا چشمہ لگایا ہوا تھا اور اپنا زیادہ وقت کتابوں کے مطالعہ میں گزارتا تھا اور بولتا بھی بہت کم تھا۔

☆......☆......☆

اگلے دن چھٹی کے وقت شیراز اپنے دوستوں کے پاس بیٹھا تھا۔ طاہر نے موقع دیکھ کر بات چھیڑ دی۔ ''یار تم سالگرہ وغیرہ کے خلاف کیوں ہو؟ ہم تم سے کوئی تحفہ نہیں لیں گے...... بس تم سالگرہ میں ضرور آنا......'' شیراز طاہر کی طنزیہ باتیں سُن کر مسکرا رہا تھا۔ جب کہ دوسری طرف طاہر کی گفتگو کا سلسلہ جاری تھا۔

''یار! سالگرہ عیسائیوں کی رسم ہے، یہ ہم سب جانتے ہیں لیکن یہ برسوں سے ہمارے ہاں رائج ہے بلکہ اب تو ہمارے کلچر کا ایک حصہ بن چکی ہے۔ اور پھر سالگرہ ہی کیا اور بہت سی رسمیں ہم نے یہودیوں، عیسائیوں اور ہندوؤں سے لی ہیں۔ ویلنٹائن ڈے، اپریل فول، بسنت اور نیو ایئر وغیرہ۔'' کچھ لمحے خاموشی میں گزرے اور پھر سلیم نے کہا ''یار میں تو سالگرہ کے حق میں ہوں زندگی میں چند دن ہی تو ہوتے ہیں جنہیں یاد رکھا جا سکتا ہے۔ جس دن انسان اس دنیا میں آئے، اس دن کو بھلا کون بھول سکتا ہے اسی لیے تو ہم سالگرہ مناتے ہیں۔ کہ ہمیں اپنا جنم دن یاد رہے اور میرے خیال میں تو

انسان کو اس دن خوب ہلا گلا کرنا چاہیے۔'' سب دوستوں نے اس کی تائید کی، جب کہ شیراز خاموشی سے سب کی باتیں سن رہا تھا۔

☆......☆......☆

''یار مجھے تو وہ دن بھی یاد ہے جب میں اس اسکول میں داخل ہوا تھا اور وہ دن بھی جب پانچویں کلاس میں سیکنڈ آنے پر انعام ملا تھا۔ اور یار ایک اہم دن اور بھی......''

''وہ کون سا دن......؟'' تمام دوست منیر کی طرف متوجہ ہوئے۔ ''مجھے تو وہ دن بھی یاد ہے جس دن ہم سب کینٹین پہ دوست بنے تھے۔ کیوں نا اگلے سال سے دوستی کی سالگرہ بھی منایا کریں......'' منیر کی اس بات پر سب دوست کھلکھلا کر ہنس دیے۔

''بھئی تم کچھ بھی کہہ لو یہ پروفیسر سالگرہ میں نہیں آئے گا، یہ سالگرہ کو ایک فضول رسم سمجھتا ہے اور سمجھتا رہے گا۔'' قادر نے شیراز کی طرف دیکھ کر کہا۔

''یار تمہارے بغیر طاہر کی سالگرہ بے رونق، بے مزہ رہے گی۔'' منیر نے کہا پھر کافی تگ ودو کے بعد سب دوستوں نے شیراز کو سالگرہ پہ آنے کے لیے راضی کر لیا۔ سالگرہ کے موقع پر سب دوستوں نے طاہر کو کارڈ اور تحفے دیے۔ جب کہ شیراز نے بھی سالگرہ میں شرکت کی کیک کھایا اور طاہر کو ایک خوبصورت کتاب کا تحفہ دیا۔

طاہر کی سالگرہ کے اختتام پر سب دوست اس وقت حیران رہ گئے جب شیراز نے جانے سے پہلے کہا ''دوستو! پرسوں میری سالگرہ ہے میں طاہر کی سالگرہ میں اس لیے آیا ہوں کہ تم سب دوست میری سالگرہ میں بھی آؤ گے۔ لیکن کسی تحفے کے بغیر......'' یہ کہنے کے بعد شیراز سب دوستوں کو حیران و پریشان چھوڑ کر چلا گیا۔

☆......☆......☆

''یار پروفیسر کا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا۔ آج سے پہلے تک تو یہ سالگرہ کو ناپسند کرتا اور ایک فضول رسم سمجھتا تھا اور آج......'' سلیم ایک لمحے کے لیے رکا تو طاہر طنزیہ انداز میں بولا ''یار آج کے دور میں لوگوں کے قول و فعل میں بڑا تضاد ہے۔ کہتے کچھ اور ہیں کرتے کچھ اور خیر ہمیں اس سے کیا؟ بہر حال یہ طے ہے کہ ہم سب دوستوں نے شیراز کی سالگرہ تقریب میں شریک ہونا ہے۔''

شیراز کی سالگرہ جمعرات کے دن تھی مقررہ وقت سے پہلے ہی تمام دوست اس کے گھر پہنچ گئے۔ جب کافی دیر گزر گئی تو طاہر نے شیراز سے پوچھا ''یار پروفیسر! کیک کاٹو کافی دیر ہو گئی ہے اور یہ اب تک ہمارے علاوہ تمہارا کوئی مہمان نہیں آیا۔''



''میں نے تمہارے علاوہ کسی کو بلایا ہی نہیں۔''
شیراز نے دھیمے لہجے میں کہا اور پھر وہ تمام دوستوں کو اس کمرے میں لے آیا جہاں سالگرہ کا انتظام تھا۔
''یار یہ تمہاری سالگرہ ہے یا تمہارے ڈیڈی کی......؟'' شیراز منیر کی اس بات پر مسکرا دیا منیر کی حیرت صحیح تھی کیوں کہ کیک کافی بڑا تھا۔ اس کے ساتھ تین درجن سے زائد موم بتیاں جل رہی تھیں۔ مزید حیرت کی بات یہ تھی کہ کیک کسی مزار کے مشابہ بنوایا گیا تھا۔

☆......☆......☆

''ارے یار یہ کیا ہے؟ تم سالگرہ منا رہے ہو یا برسی۔'' طاہر نے شیراز کی طرف دیکھتے ہوئے حیرت سے پوچھا۔ یہ سن کر شیراز کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ پھر اس کی آنکھیں آنسوؤں سے آباد ہو گئیں اور وہ اداس لہجے میں بولا ''ہاں تم نے ٹھیک کہا یہ سالگرہ نہیں برسی ہے۔'' ''تمہارے دادا کو فوت ہوئے 41 برس گزر چکے ہیں کیا......؟ قادر شاید موم بتیاں گن چکا تھا اس کی بات سن کر شیراز آنسوؤں میں بھیگی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔
''نہیں یہ میرے دادا کی نہیں...... میرے وطن کے ایک بازو کی برسی کا دن ہے۔ آج کے دن میرے وطن کا مشرقی بازو ٹوٹ گیا تھا آج 16 دسمبر ہے...... یوم سقوط ڈھاکہ۔ کیوں منیر تمہیں تو یاد ہوگا تم تو اہم دنوں کو بہت یاد رکھتے ہو؟'' اس سوال کے جواب میں منیر خاموش کھڑا تھا اور باقی دوستوں کے پاس بھی کہنے کو کچھ نہ تھا۔ اور وہ شیراز جسے سارے دوست ''پروفیسر'' کہا کرتے تھے اس عظیم سانحے پر پھٹ پڑا تھا۔

☆......☆......☆

''یوم سقوط ڈھاکہ...... ایک ایسا زخم جو شاید ہم کبھی نہیں بھلا سکیں گے قومیں اور معاشرے غلطیاں کرتے ہیں۔ ان اجتماعی غلطیوں سے اگر خود ہی سیکھا جائے تو دنیا کے لیے قابل فخر ہوتا ہے۔ ٹھوکر کھا کر اگر خود ہی اٹھا جائے تو اچھا ہوتا ہے۔ ورنہ دوسروں کے لیے یہ ٹھوکر اور غلطی جگ ہنسائی کے سوا کچھ نہیں ہوتی شاید اسی لیے غیروں نے یہ کہہ کر ہمارے زخم کو مزید بڑھا دیا کہ ''آج ہم نے نظریہ پاکستان بحیرہ عرب میں غرق کر دیا۔ دشمنوں نے تو یہاں تک کہہ دیا ''پاکستانی قوم سانپ کی لکیر پیٹنے کے لیے پیدا ہوئی ہے۔'' انفرادی غلطی کی تلافی ہوا کرتی ہے مگر اجتماعی غلطیوں کی تلافی نہیں ہو سکتی ان سے سبق ہی سیکھا جا سکتا ہے خود احساس جگانے میں جو عزت و بڑائی ہے۔ وہ کسی اور کے بتانے سے باقی نہیں رہتی...... وہ حقیقتاً ایک پروفیسر کی طرح بول رہا تھا۔ ''ناکام ہونا کوئی برائی نہیں اصل برائی ناکامی کی وجہ کو تلاش کرنا نہ اور پھر کامیابی کے لیے اس وجہ کو ختم نہ کرنا ہے۔
ابراہیم لنکن تاریخ عالم میں ایک بڑا مقام رکھتا ہے۔ ابراہیم لنکن سے ایک روز برطانوی سفیر ملاقات کے لیے آیا تو اس نے دیکھا کہ امریکی صدر اپنے جوتے خود پالش کر رہا ہے۔ وہ خاصا حیران ہوا اور اسی حیرت سے اس نے پوچھا۔
''مسٹر لنکن!'' آپ اپنے جوتے خود پالش کرتے ہیں؟ لنکن اس کی بات پر ہلکا سا مسکرایا اور پھر بولا ''جی ہاں! میں تو اپنے جوتے خود پالش کرتا ہوں آپ کس کے کرتے ہیں؟'' شیراز کے دوست غور سے اس کی باتیں سن رہے تھے۔

☆......☆......☆

''دوستو!'' آج آپ کے پاس کوئی ایک ایسی مثال ہے کہ ہمارا کوئی حکمران اپنے کام خود کرتا ہو اور آج بھی ہمارے ملک کے کروڑوں لوگ بھوکے سوتے ہیں۔ اور ہمارے حکمران روزانہ تین تین لاکھ کا سوٹ زیب تن کرتے ہیں آج بھی ہم 16 دسمبر کے اسی خطرے سے گزر رہے ہیں، کراچی کے حالات کسی سے ڈھکے چھپے نہیں جو حکمران ماضی کی خراب روایات غلط فیصلوں اور نامناسب طرز عمل کی اصلاح نہیں کرتے، انہیں دنیا میں جینے کا حق ملتا ہے اور نہ ہی عزت و وقار کی زندگی......''
یہ کہتے کہتے شیراز آبدیدہ ہو گیا ''ہم لوگ کتنے بے حس و بے مروت ہیں کہ ہمیں اپنی زندگی کی چھوٹی چھوٹی انفرادی خوشیاں تو یاد رہتی ہیں۔ لیکن زندگی کے بڑے بڑے اجتماعی دکھ بھول جاتے ہیں حالانکہ یہی دکھ ہمیں بتاتے ہیں کہ ہم سے کہاں غلطی ہوئی اگر ہم اتنی بڑی بڑی غلطیوں کو بھول جائیں گے تو بار بار ٹھوکر کھائیں گے۔ اور بار بار ٹھوکر کھانے والوں کو تاریخ کبھی معاف نہیں کرتی۔''

☆☆......☆☆



ادھوری محبت

علی حسنین تابش

محبت اور خود غرضی کے گرد گھومتی کہانی / چشتیاں سے



میرا نام امجد علی ہے۔ میرا تعلق ایک امیر گھرانے سے ہے میں اپنے والدین کی اکلوتی اولاد ہوں میری پیدائش پر بہت خوشیاں منائی گئیں۔ میری پرورش وہت لاڈ پیار اور امیرانہ انداز میں کی گئی۔ میری ہر خواہش کو پورا کیا جاتا میرے والد صاحب مجھے بہت پیار کرتے تھے۔ اس لیے میری ہر خوشی اور ہر خواہش کا پورا خیال رکھتے مجھے پڑھنے کا بہت شوق تھا اس لیے والد صاحب نے مجھے ایک اچھے اسکول میں داخل کروایا میں بہت ذہین تھا اور شوق سے پڑھائی کرتا تھا۔ میں ہر کلاس میں اول آتا میں اپنی پڑھائی میں پوری طرح محو تھا۔ دوستوں کے ساتھ ہنسی مذاق کھیلنا کودنا یہاں تک

کہ میری زندگی بہت خوشگوار تھی۔

میرے سارے کزن بہت اچھے تھے۔سارے ہمارے گھر گرمیوں کی چھٹیاں گزارتے تھے ہم سب خوب مزے سے گرمیوں کی چھٹیاں گزارتے تھے ہمارے گھر میں ایسی رونق ہو جاتی تھی جیسے کے ایک شادی والے گھر میں ہوتی ہے۔ ہم سب نے اکھٹے چھٹیوں کا ہوم ورک کرنا اور اکھٹے کھیلنا کودنا ہم مقابلے پر ہوم ورک جلدی ختم کر لیتے تھے۔

میں 8th کلاس میں تھا جب میری زندگی میں ایک نیا موڑ آیا ہم سب کزن اکھٹی چھٹیاں گزارتے تھے اس لیے ہم سب میں کافی دوستی تھی۔ مگر میری ایک کزن سے کچھ زیادہ ہی دوستی تھی کیوں کہ شروع ہی سے وہ مجھے اچھی لگتی تھی اور میں پورا سال بے چینی میں اس کے آنے کا انتظار کرتا تھا۔وہ میری ہم عمر بھی تھی میں 8th کلاس میں تھا اور وہ 7th کلاس میں تھی۔اب میں یہ چاہ رہا تھا کہ جتنی جلدی ہو سکے میں اس سے اپنی دل کی بات کہہ ڈالوں، مگر ایسا کوئی موقع نہیں مل رہا تھا اور پھر وہ لوگ چلے گئے اور میری بات دل میں ہی رہ گئی۔

☆......☆......☆

میرے انکل یعنی ماہ نور کے ابو میرے والد صاحب کے شاگرد تھے اور اکثر ہی ہمارے پاس آیا کرتے تھے ۔لیکن ہم سب کزنوں کی ملاقات ایک سال بعد یعنی گرمیوں کی چھٹیوں میں ہوا کرتی تھی اس بار انکل آئے تو انہوں نے ابو جان سے کہا میں امجد کو کچھ دن کے لیے اپنے ساتھ لے جاؤں یہ کچھ دن رہ لے گا اور ہمارا شہر بھی دیکھ لے گا۔ مگر ابو جان نے انکار کر دیا اور کہا کہ دسمبر کی چھٹیوں میں ہم آپ کے پاس آئیں گے خیر انکل مان گئے اور میں اب شدت سے دسمبر کی چھٹیوں کا انتظار کرنے لگا۔

اللہ اللہ کر کے دسمبر بھی آ گیا ہم لوگ انکل کے گھر چلے گئے ۔ایک دن سب گھر والے اپنے اپنے کاموں میں مصروف تھے اور میں گھر کہ صحن میں لگے پیپل کے درخت کے نیچے لیٹا ڈائجسٹ پڑھ رہا تھا۔ ماہ نور میرے پاس آ کر بیٹھ گئی اور پوچھا ''امجد میں تمہارا ہوم ورک کر دوں؟ میرا تو ختم ہو گیا ہے'' میں نے مسکرا کر کہا'' جی ضرور کر دو یہ تو میری خوش نصیبی ہوگی۔'' وہ بھی مسکرا دی میں نے کہا ٹھیک ہے تم کچھ دیر تک میرے سے بکس لے جانا۔ یہ اچھا موقع تھا اپنے دل کی بات کہنے کا وہ چلی گئی اور میں نے جلدی سے ایک خط لکھا اور اس کی کتاب میں رکھ دیا جس میں، میں نے اپنے دل کی بات کہہ دی وہ کچھ دیر کے بعد کتابیں لینے آئی تو میں نے اسے کتاب اور رجسٹر دے دیا اور سارا کام بھی سمجھا دیا اور اسے کہا کہ ماہ نور کتاب میں ایک خط ہے اس کا جواب ضرور دینا میں انتظار کروں گا۔ اس نے کہا ٹھیک ہے اور وہ چلی گئی۔

رات ہو گئی رات کے کھانے کے بعد سب بڑے اپنی باتوں میں مصروف تھے ماہ نور نے کہا'' امجد تمہارا جتنا کام میں نے کیا ہے وہ تم دیکھ لو ٹھیک ہے؟'' میں نے کہا'' اچھا میں دیکھ لوں گا۔'' اس نے میرے سرہانے کتاب اور رجسٹر رکھ دیا رات دیر تک ہم باتیں کرتے رہے اور پھر سب سونے کے لیے اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے مجھے بھی تو نیند آ ہی رہی تھی مگر میں نے تو ابھی خط کا جواب بھی لکھنا تھا۔ سب چلے گئے تو میں نے کتاب میں سے خط نکالا اور پڑھنے لگا جو کچھ یوں تھا۔

ڈیئر امجد! میں اس بات پر بہت خوش ہوئی کہ تم مجھ سے پیار کرتے ہو سچ کہوں تو میں بھی تم سے پیار کرتی ہوں مگر کہنے کی ہمت نہ تھی بچپن سے ہی تم مجھے اچھے لگتے ہو میں تمہیں دل سے چاہتی ہوں امجد یہ تم نے بہت اچھا کیا کہ خط دے دیا میں تو پہلے ہی تم سے بہت زیادہ پیار کرتی ہوں اور امید کرتی ہوں کہ تم بھی مجھے اتنا ہی پیار کرتے ہو گے۔خط کا جواب ضرور دینا۔

میں خط پڑھ رہا تھا اور اتنا خوش تھا کہ بتا نہیں سکتا۔ میری خوشی کی انتہا نہ رہی جسے میں چاہتا ہوں وہ بھی مجھے پہلے سے چاہتی ہے جلدی سے میں نے جواب لکھنا شروع کیا۔

☆......☆......☆

خط لکھ کر جلدی سے میں نے اپنی کتاب میں رکھا اور لیٹ گیا۔ رات بھی بہت تھی۔ میری تو خوشی سے نیند ہی اڑ گئی تھی ساری رات انہی سوچوں میں رہا خیر ہماری باتوں کا سلسلہ اسی طرح خطوں کے ذریعے چلتا رہا اور وہ دس دن کیسے گزرے پتا ہی نہ چلا اور میرے گھر آنے کا دن آ گیا۔ اس دن وہ کافی افسردہ تھی اس کے چہرے پر اداسی چھائی ہوئی تھی دل میرا بھی نہیں چاہ رہا تھا اس وقت ان کے گھر میں ایک ہی موبائل تھا جو کہ اس کے ابو کے پاس ہوتا تھا۔ اب تو گرمیوں کی چھٹیاں بھی اداسی اور غم میں گزر جاتی کیوں کہ انکل نے یہ کہہ کر سب کو گھر لانا چھوڑ دیا تھا کہ بچے اب سب جوان ہوگئے ہیں۔ پھر جو سال بعد دیدار ہوتا تھا وہ بھی ختم ہوگیا اس بات کو دو سال بیت گئے۔ ہماری محبت پروان چڑھتی رہی اس کی بہن تو ہماری اس بات سے باخبر تھی ایک بار جب ہمارے گھر ہمارے نانا ابو کا سالانہ ختم شریف تھا تو انکل اور آپی فرزانہ آئیں۔ آپی نے مجھے بازو سے پکڑا اور ایک طرف لے گئیں اور کمرے میں جا کر اپنے بیگ سے ایک بڑا سا گفٹ نکال کر مجھے دیا اور کہا کہ رات میں کھولنا ابھی اسے کہیں چھپا دو میں نے سب سے نظریں بچا کر اس گفٹ کو اپنے کمرے میں رکھ دیا۔ کیوں کہ گھر تو مہمانوں سے بھرا پڑا تھا۔ اللہ اللہ کر کے رات ہوئی میں جلدی سے اپنے کمرے میں آیا اور وہ گفٹ جو میری جان مانو نے بھیجا تھا اسے کھولنے لگا ایک ڈائری ایک پین اور کچھ رنگین اوراق پر پینٹنگ اور شاعری لکھی ہوئی تھی اور ساتھ ہی ایک لیٹر تھا میں نے وہ بھی جلدی سے کھولا اور پڑھنے لگا۔

رات کے نو بجے تھے اور سب لوگ جا چکے تھے کچھ دور کے رشتے دار ہمارے گھر رک گئے تھے میں نے جلدی سے اپنے دوست کو کال کی اور کہا کہ جلدی میرے گھر آؤ کچھ کام ہے۔ اس کے بعد ہم بازار چلے گئے چند ایک دکانیں کھلی تھیں۔ میں نے ایک اچھی سی گھڑی ایک اچھا سا چوڑیوں کا سیٹ اور وصی شاہ کی ایک کتاب ''میں محبت اور تم'' خریدلی اور ان کو پیک کروالیا خط بھی ساتھ میں لے آیا تھا باقی تصویریں آپی کو ویسے ہی دینی تھیں کیوں کہ اتنے کم وقت میں بنوا نہیں سکتا تھا تو موبائل کے میموری کارڈ میں ہی ڈال کر آپی کو کارڈ اور گفٹ دے دیا۔

☆......☆......☆

میں نے میٹرک پاس کرلیا تھا اور وہ بھی 9th کے پیپر دے چکی تھی۔ سالگرہ پر انکل نے مانو کو موبائل دے دیا جس پر وہ بہت خوش ہوئی میرے پاس تو پہلے سے ہی موبائل تھا اب ہماری روز باتیں ہوتی انتظار ختم ہو چکا تھا دوری موبائل نے ختم کردی تھی۔ اب تو دن رات باتیں ہر پل کی خبر ایک دوسرے کو دیتے تھے ہماری زندگی بہت اچھی گزر رہی تھی۔

ایک دن میں نے امی جان کو بتا دیا کہ میں ماہ نور کو پسند کرتا ہوں اور اسی سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ امی جان میری بات سن کر مسکرائیں اور کہنے لگیں مجھے خوشی ہوئی کہ تم ماہ نور کو پسند کرتے ہو اور جو کہ پہلے سے ہی تمہاری ہو چکی ہے۔''

میں امی کے یہ الفاظ سن کر حیران ہوگیا۔ میں نے پوچھا کیا مطلب امی جان......؟ امی کہنے لگی امجد جب تم پیدا ہوئے تھے تو ماہ نور ایک سال کی تھی اور تمہارے انکل اور آنٹی نے کہا تھا کہ ماہ نور ہم نے امجد کو دی۔ یعنی تمہارا دونوں کا رشتہ تو بچپن سے ہی ہو چکا ہے۔ مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا میں بہت خوش ہوا کے مجھے دنیا بھر کی خوشی مل گئی ہے۔ امی نے مسکرا کر کہا اب جلد میں اور ابو ماہ نور کے گھر جائیں گے تمہاری شادی کی بات کرنے۔ یہ بات سن کر میں اور خوش ہوگیا میں نے کچھ کہا بھی نہیں اور سب کچھ میری مرضی کے مطابق ہو رہا ہے۔ واہ میرے مالک تو کتنا بے نیاز رحمن اور غفور رحیم ہے میری خوشی میں شکرانے کے کئی الفاظ میرے منہ سے بے ساختہ ہی نکلے۔

رات کو مانو کو کال کی اور اسے یہ خبر سنائی تو اس کی بھی خوشی کی انتہا نہیں رہی میں تو ڈرتی تھی پتہ نہیں کیا

ہو گا۔

کچھ دن بعد امی اور ابو انکل کے گھر گئے اور میرے رشتے کی بات کی انکل نے کہا ماہ نور تو ہم پہلے ہی آپ کو دے چکے ہیں اب تو یہ ہمارے پاس آپ کی امانت ہے آپ جب چاہیں اس کو لے جا سکتے ہیں۔ ابو نے کہا" منگنی کی رسم ادا کی جائے پھر......؟" اس بات پر بھی انکل اور آنٹی بہت جلد راضی ہو گئے اور منگنی کی انگوٹھی امی جان نے بڑے پیار سے ماہ نور کو پہنائی چند دن بعد وہ بھی آ کر منگنی کی رسم ادا کر کے چلے گئے امی نے جب مجھے فون پر بتایا تو میں اتنا خوش ہوا کہ کیا بتاؤں جس پر فوراً ربّ کا شکریہ ادا کیا اور کالج کے سب دوستوں کو پارٹی دی وہ دن میری زندگی کا سب سے اہم دن تھا۔ اس دن میں اپنے آپ کو دنیا کا سب سے بڑا خوش نصیب سمجھ رہا تھا۔

امی ابو گھر آ گئے اور شادی کی تیاریاں شروع ہو گئی انکل نے ایک سال کا ٹائم رکھا تھا۔ شادی کے لیے سب رشتے داروں نے مبارکباد دی سارے کالج کے فرینڈ نے بھی مجھے مبارکباد دی یعنی ہر طرف میری منگنی کی ہی خبر تھی۔ اور ہمارے گھر میں شادی کی تیاریاں شروع ہونے لگیں۔ ہماری ہر روز فون پر بات ہوتی کئی بار تو ساری ساری رات گزر جاتی مگر ٹائم گزرنے کا احساس تک نہ ہوتا۔

☆......☆......☆

میری ہر خواہش تو بچپن سے ہی پوری ہوتی تھی مگر یہ خواہش تو ان سب سے بہت اہم تھی۔ میری منگنی کو اب چھ ماہ گزر چکے تھے اور اب انکل بھی ہمارے گھر کم آتے تھے۔ ان کا اب اپنا کاروبار بھی ٹھیک تھا۔ میرے بڑے کزن اور آپی فرزانہ کی شادی بھی ہو گئی دونوں شادیوں پر میں گیا تھا اور ہماری ملاقات بھی ہوئی تھی۔ میرے کزن کی بیوی یعنی میری بھابھی جان اور ان کی ساری فیملی لندن میں ہوتے ہیں اور وہ انکل کے رشتے داروں میں سے تھے۔ اب تو ان کے دن ہی پھر گئے تھے بھابھی جان اپنے ساتھ ساتھ ڈھیر سارا جہیز بھی لائیں تھیں انہوں نے تو پہلے ایک بڑی سی کوٹھی بنائی اور پھر تمام زندگی کی ضروریات اشیاء ان کے گھر میں آنے لگیں۔ مانو نے میٹرک پاس کر لیا تھا شرط بھی یہی تھی کہ جب ماہ نور کا میٹرک ہو جائے گا تب شادی کریں گے۔ میرے بھی فرسٹ ایئر کے امتحانات ہو چکے تھے ایک دن امی نے ابو سے بات کی کہ امجد کے ابو ایک سال ہو گیا ہے اب ہمیں ماہ نور کے گھر والوں سے شادی کی تاریخ لے لینی چاہیے۔ وہاں پر تو سارے حالات ہی بدل چکے تھے بس ہر طرف پیسہ ہی پیسہ سب رشتہ داروں کو وہ بھول چکے تھے۔

ماہ نور مجھے روز کال کرتی تھی اور کہتی تھی کہ" اب بھیجو اپنے گھر والوں کو" امی اور ابو جان نے فیصلہ کیا کہ ہم جائیں گے۔ لیکن اس سے پہلے اطلاع کر دیں ابو نے انکل کو کال کی کہ اب ہمیں آپ کے پاس آ جانا چاہیے ماہ نور نے بھی میٹرک اچھے نمبروں سے پاس کر لیا ہے اور ایک سال گزر چکا ہے۔ انہوں نے کوئی اچھا جواب نہیں دیا بلکہ کہا کہ ابھی آپ لوگ مت آئیں میں گھر مشورہ کر کے اپنی بہو سے مشورہ کر کے آپ لوگوں کو کال کروں گا ابو جان نے کہا ٹھیک ہے اس بات کو ایک ہفتہ گزر گیا مگر کوئی کال نہیں کی ابو اور امی اس بات پر پریشان تھے ہم نے تو شادی کی ساری تیاریاں مکمل کر لی تھیں۔ ابو نے پھر کال کی پر انکل نے بہت بے رخی سے بات کی اور کہا کہ آپ انتظار کریں ہماری بہو آئے گی تب اس سے بات کر کے پھر آپ کو بتائیں گے۔

☆......☆......☆

ان دنوں بھابھی لندن گئی ہوئی تھیں ماہ نور بھی اب بات کرتے ہوئے ڈرتی تھی پہلے تو ہم ساری ساری رات بھی بات کرتے تو اسے کوئی پرواہ نہ ہوتی تھی اب تو ایک منٹ سے زیادہ بات بھی نہ کرتی تھی۔ مجھے اس بات کی ٹینشن تھی کہ کوئی پرابلم ہے جو یہ وجہ بن رہی ہے۔ ایک دن انہی سوچوں میں گم اپنے کمرے میں بیٹھا ہوا تھا اچانک میرے موبائل کی لائٹ روشن ہوئی اور کال آئی مانو کی کال تھی۔ میں نے جلدی سے پوچھا کیسی ہو مانو؟ کہاں تھی اتنے دن سے

بات کیوں نہیں کی؟ کوئی پریشانی ہے تو مجھے بتاؤ؟ میں نے کال اٹھاتے ہی سب سوالات کر دیے اس نے کوئی نہ کوئی جواب دیا اتنا کہہ کہ فون کاٹ دیا کہ ''امجد مجھے بھول جاؤ'' مجھے اس بات پر یقین نہ آیا میں سمجھا کہ شاید مذاق کر رہی ہو گی مگر جب میں نے کال بیک کی تو نمبر آف جا رہا تھا مجھے کچھ سمجھ نہ آ رہی تھی کہ کیا ہوا ہے یہ سب......

میں کافی پریشان ہو گیا کہ آخر کیا وجہ ہو سکتی ہے؟ اس کی روتی ہوئی دبی ہوئی آواز میں یہ الفاظ کے ''امجد مجھے بھول جاؤ'' میرے کانوں میں گونج رہی تھی میرا سر چکرا رہا تھا کمرے میں ہر چیز گھومتی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔ مجھے کافی تیز بخار ہو گیا اور میں کالج بھی نہ جا سکا۔ میرے دوست بھی گھر آ گئے اور کہا کہ امجد کیا ہوا ہے تمہیں کیا بات ہے تم اتنے پریشان ہو اور اتنا تیز بخار کیسے ہوا؟۔ میں نے انہیں تو کچھ نہ بتایا، مگر یہ بات مجھے اندر ہی اندر کھائی جا رہی تھی اور بار بار میرے کانوں سے ٹکراتی تھی کچھ دیر بیٹھ کر سب چلے گئے میری طبعیت سے گھر والے بھی کافی پریشان تھے میری نیند بھوک پیاس مر چکی تھی چند ہی دنوں میں، میں ایک ہڈیوں کا ڈھانچہ بن گیا تھا۔

ایک دن امی جان میرے پاس آئیں اور کہنے لگی ''بیٹا آخر بات کیا ہے مجھے تو بتاؤ ماہ نور سے بات ہوئی تمہاری؟'' اس نے کچھ کہا ہے کیا؟ میں ان کی بات سن کر رونے لگا اور روتے روتے ہوئے بتا دیا امی جان میری بات سن کر بہت پریشان ہوئیں اور کہنے لگیں۔ ''میں فون کرتی ہوں اور ماہ نور سے پوچھتی ہوں کہ یہ بات اصل میں کیا ہے؟'' امی کو بھی اسکی بات پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ کیوں کہ وہ ایسی تھی ہی نہیں اگلے دن امی نے ان کے گھر کال کی اور بات کرنے کی پوری کوشش کی مگر نہ انہوں نے مانو سے بات کروائی اور نہ خود سیدھے طرح سے بات کی امی کافی پریشان ہو گئیں اور ابو بھی اب تو ہم سب گھر والے پریشان تھے۔

ابو نے انکل کو کال کی مگر انہوں نے فون ہی نہیں اٹھایا۔ میں نے فرزانہ آپی کو کال کی باجی کیا بات ہے آپ ماہ نور سے بات کر کے بتاؤ اور میں نے وہ رات والی بات بھی آپی کو بتائی وہ بھی کافی پریشان ہو گئیں اور سارا معاملہ دیکھا وہاں تو سب کچھ بدلا ہوا تھا۔

☆......☆......☆

آپی نے مجھے فون پہ سب کچھ بتا دیا کہ ماہ نور سے موبائل لے لیا گیا ہے اور انکل نے ماہ نور کا موبائل اور سم توڑ دیے ہیں اس کا اب کسی سے کوئی رابطہ نہیں ہے۔ کسی سہیلی کو بھی نہیں ملنے دیتے اور نہ ہی کسی اور سے ماہ نور کو ایک کمرے میں بند کر دیا گیا ہے اور جب وہ امجد تمہاری یا تمہارے گھر کی بات کرتی ہے تو اسے مارا جاتا ہے۔ یہ فون بھی اس نے دباؤ میں آ کر کیا تھا کہ ماجد مجھے بھول جاؤ آپی نے بتایا کہ امجد ماہ نور آج بھی تمہیں اتنا ہی چاہتی ہے جتنا شروع سے چاہتی تھی مگر اب تمہارے انکل یعنی ماہ نور اور آپی کے ابو ماہ نور کی شادی بھابھی کے بھائی جو کہ لندن ہوتا ہے اس سے کرنا چاہتے ہیں۔ یہ بات سنتے ہی جیسے میرے سر پہ قیامت ٹوٹ پڑی ہو جس نے بہت مشکل سے اپنے آپ کو سنبھالا آپی نے مجھے بتایا کہ معاملہ بہت خراب ہو چکا ہے میں بھی کچھ نہیں کر سکتی میری بات سننے کو بھی تیار نہیں ہے۔

ماہ نور کو کسی سے ملنے جلنے تک نہیں دیا جاتا تھا ایک سال سے چھوڑ کر کر 4 سال گزر گئے لیکن نہ ہی ان لوگوں نے آج تک اس بارے میں کوئی بات کی تھی اور نہ ہی کرنا چاہتے تھے۔ کبھی وہ دن تھے کہ انکل کے پاس اتنا بھی نہ تھا کہ وہ اپنی اولاد کا پیٹ پال سکے ایک ٹوٹے پھوٹے گاؤں کے دیہاتی ماحول کے مکان میں رہتے تھے یہاں تک کے ان کے گھر باتھ روم تک نہیں تھا۔ میرے والد صاحب نے انکل پر ترس کھا کر انہیں اپنا شاگرد بنا لیا تھا انکل کو اپنے بیٹوں اور چھوٹے بھائی کی طرح شفقت اور پیار دیا اپنا ہنر اور ساری عمر کا تجربہ انہیں سکھایا میرے والد صاحب نے انکل کا بھرپور ساتھ دیا۔ میں کبھی کبھی سوچتا ہوں

کے خود غرض اور بے فیض لوگ اس طرح کے ہوتے ہیں۔ احسان فراموش اس طرح کے ہوتے ہیں۔ چلو کچھ نہیں میرے والد صاحب کے شفقت اور پیار کا یہ صلہ دیا انکل نے؟ اتنا بھی کیا دولت کے لالچ میں اندھا ہونا کہ انسان اپنے محسن کو ہی بھول جائے۔

بچپن میں رشتہ کرنے والے بھی یہ انکل اور آنٹی خود تھے۔ میرے والد صاحب کا خیال اس وقت نہ تھا نہ ہی انہوں نے اس بات کا اظہار کیا تھا۔ بلکہ آنٹی نے خود ماہ نور کو میرے لیے منتخب کیا تھا اور کہا تھا ماہ نور ہم نے آپ کو دی خدا کو حاضر اور ناظر جان کر......کیا اللہ پاک کو حاضر ناظر جان کر جو اقرار جو عہد کیا جائے ایک مسلمان اس اقرار سے منہ پھیر سکتا ہے۔ بس اللہ پاک معاف کرے ان منافق لوگوں سے جو دولت کی لالچ میں آ کر اپنے اللہ پاک سے کئے اقرار وعدے تک بھول جاتے ہیں۔

☆......☆......☆

مجھ میں برائی ہی کیا تھی؟ امیر ہوں دنیا کی ہر چیز ہے میرے پاس اللہ نے رنگ روپ اچھا دیا ہے شکل اچھی دی ہے ہر لحاظ سے اللہ پاک کا بے حد مشکور ہوں مگر......؟ کیوں؟ 4 سال گزر جانے کے بعد بھی اس کی یاد دن رات ستاتی ہے۔ میں اس کے لیے آج بھی اتنا ہی تڑپتا ہوں جتنا شروع سے تڑپتا تھا وہ میرے دل میں آج بھی آباد ہے میں روز اس کی تصویر کی سامنے بیٹھ کر آنسو بہاتا ہوں اس سے کئی باتیں کرتا ہوں مگر سب فضول وہ مجھے دیکھتی رہتی ہے اپنے لب نہیں ہلاتی میرا مستقبل میرا حال سب میرے ماضی کی یادوں کی بھینٹ چڑھ چکے ہیں۔

والدین سب دوست میری حمایت سے بے حد پریشان تھے۔ میری بیماری کی وجہ سے ابو کافی پریشان ہو چکے تھے اور اب مجھے کچھ احساس ہونے لگا تھا کہ ان لوگوں کے لیے اپنا آپ کیوں گنوانا جن کی ماں باپ ہی دولت ہے اور وہ دولت کی ہوس میں اتنے اندھے ہو چکے ہیں کہ اپنے کسی رشتے دار کی کبھی انہیں یاد نہیں ستاتی ایسے لوگوں کے لیے خود کو کیوں برباد کرنا میں نے اسی رات فیصلہ کیا اب اسے بھلا کر اپنی ایک نئی دنیا بساؤں گا اپنے والدین کے لیے۔

قارئین مجھے دنیا کی حقیقت سمجھ آ گئی مجھے زندگی کی حقیقت سمجھ آ گئی یہ دنیا کا ایک دھوکہ ہے سب مطلبی ہیں اپنی غرض کے لیے لوگ سب رشتے ناطے برسوں سے جڑے بندھن بھی توڑ دیتے ہیں ان والدین کا کیا قصور جنہوں نے مجھے پالا جوان کیا۔ ایک لڑکی ایک پیار کے لیے اپنے ماں باپ کو دکھ پہنچاؤں؟ نہیں نہیں مجھے اپنا مستقبل بنانا ہے ایک نئی دنیا بسانی ہے جہاں دور دور تک اسکی یاد نہ ہو میں 4 سال کے بعد اسے بھلانے کی ناکام کوشش کر رہا ہوں۔

☆......☆......☆

میں نے اس پیار کے کھیل سے کچھ حاصل نہیں کیا بس ظلم ستم ہی سہتا رہا ماہ نور تو آج بھی مجھے اتنا چاہتی ہے یا نہیں آج مجھے اس بات سے کوئی لینا دینا نہیں وہ کہاں ہے کیسی ہے اپنی زبردستی اور مجبور زندگی میں خوش ہے بھی یا نہیں ہے۔ اب مجھے اس سے کوئی مطلب نہیں میں اپنی زندگی کو اس کی یاد سے رہائی دلوانا چاہتا ہوں میں چاہتا ہوں کے میں اب اپنے والدین کی بات مان لوں اور شادی کر لوں۔ اور میری پروردگار سے دعا ہے کہ یا اللہ مجھے کوئی ایسا جیون ساتھی دے جو مجھے اتنا پیار دے کہ میں اس بے وفا کو بھول جاؤں مگر اسے بے وفا بھی تو نہیں کہہ سکتا وہ تو مجبور تھی مجھے اتنا پیار دے کہ مجھے ماہ نور کی یاد تک نہ آئے۔

جی تو میرے پیارے قارئین تو یہ تھی امجد کی داستان محبت، جس میں امجد کو پیار میں ناکامی ہوئی جس کی وجہ نہ تو اس کا جواب تھا اور نہ ہی ماہ نور کا جواب تھا۔ بلکہ اس بے رحم زمانے نے ان دونوں کو ایک نہ ہونے دیا ایک دولت کی ہوس نے دو پیار کرنے والوں کی زندگی کو تباہ و برباد کر دیا۔ اب امجد کو ہوش آ چکا ہے اور اسے زندگی کی حقیقت سمجھ آ چکی ہے۔ انسان کو زندگی میں بہت سی خوشیاں تو ملتی ہیں مگر کئی ایسی خواہشات ہوتی ہیں جو لاکھ کوششوں کے باوجود بھی پوری نہیں ہوتیں۔

☆☆......☆☆



یوں چاہے گئے

عظمیٰ شکور

ایک ضدی عورت کی نفرت کا شکار ہونے والے نوجوان کا قصہ/ سرگودھا سے




گزرتا وقت بہت کچھ دان کر گیا دکھوں کا ایک لا متناہی سلسلہ جیسے زندگی کے ساتھ چپک گیا تھا۔ اور ہم سادہ دل ہنستے ہی رہے، ہنستے ہی رہے لب پہ حرف شکایت نہ لائے ان دکھوں کو تقدیر سمجھ کر چنتے رہے بے بسی سے آنکھوں میں آنسو ضرور آئے مگر اندر ہی کہیں اتر گئے۔ آنکھوں سے بہہ جاتے تو مردانگی پر حرف آتا ہم مرد بھی بہت سخت جان ہوتے ہیں۔ غم کی تصویر تو بن جاتے ہیں۔ مگر ہمیں آنسو بہانے کی اجازت نہیں ہوتی ہمیں ہنسنا ہے اور ہنستے ہی رہ جانا ہے غم سگریٹ کا دھواں تو نہ تھے۔ جو ہوا میں شامل ہو کر ختم ہو جاتے یہ تو جان کا روگ تھے جو جان میں سانس بن کر چل رہے تھے۔

☆......☆......☆

بچپن امرتسر میں گزرا جب کھیلنے کے دن تھے پانی میں کشتیاں بنا کر چلانے کا وقت تھا۔ ان وقتوں میں اپنے اردگرد دھڑکتی آگ دیکھی خون دیکھا اور خون کی ہولی دیکھی۔ لوح گڑھ کی گلیوں میں ہندوؤں اور سکھوں کا آگ لگانا۔ اور میرا سہم کر اپنی ممانی کے ساتھ لگ جانا اور ممانی کا اپنا زیور کا ڈبہ میرے ہاتھ میں تھما دینا کہ اب تو بچنے کی کوئی امید نہیں یہاں سے نکلنا پڑے گا جب آنکھوں کے سامنے گھومتا ہے تو روح تک تھرا جاتی ہے۔

میری نانی اماں، میں اور ممانی گھر سے باہر نکل آئے اور روڈ پر اچانک ہندوؤں کی جیپ کا آ جانا اور ایک ہندو کا میرے گلے پر گن رکھ دینا۔ اس کی گن کی چبھن اب تک اپنے گلے پر محسوس ہوتی ہے۔ اور میں اس عمر میں بھی کانپنے لگتا ہوں ایک لمحے کو مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے میں اب بھی وہیں کھڑا ہوں اور چاروں طرف آگ بھڑک رہی ہے اور لوگ اپنی جان بچاتے زندگی کو ڈھونڈ رہے ہیں۔ مگر یہ کیفیت صرف چند لمحات کی ہوتی ہے۔ میں فوراً سے آنکھیں کھول دیتا ہوں کہ مجھے یہ سب نہیں یاد کرنا مگر نہیں گولیوں کی گرجدار آوازیں اب تک مجھے یاد دلاتی ہیں۔

☆......☆......☆

پاکستان جس ٹرین میں ہم آئے تھے وہاں پھیلے ہوئے خون کی بو اب تک مجھے محسوس ہوتی ہے۔ ٹرین میں جا بجا بکھری ہوئی لاشیں اور ان کو کراس کرتے ہوئے ٹرین سے اترنے کا عمل کس قدر ہولناک ہوتا تھا۔ میں اب تک بھلا نہیں سکا اور

میں کیوں کر بھول جاؤں کہ کتنی قیمتی جانیں دے کر ہم وطن عزیز پاکستان حاصل کر پائے تھے۔ مگر ہائے افسوس کہ ہم نے آزادی اور اس پیاری سرزمین کی قدر نہ جانی یہ وہ پاکستان نہیں جسے ہم نے شہدا کے خون سے سینچا تھا یہ تو وہ سرزمین بن کر رہ گیا ہے۔ کہ جہاں خود اس ملک کے رہنے والے بھی محفوظ نہ رہے۔

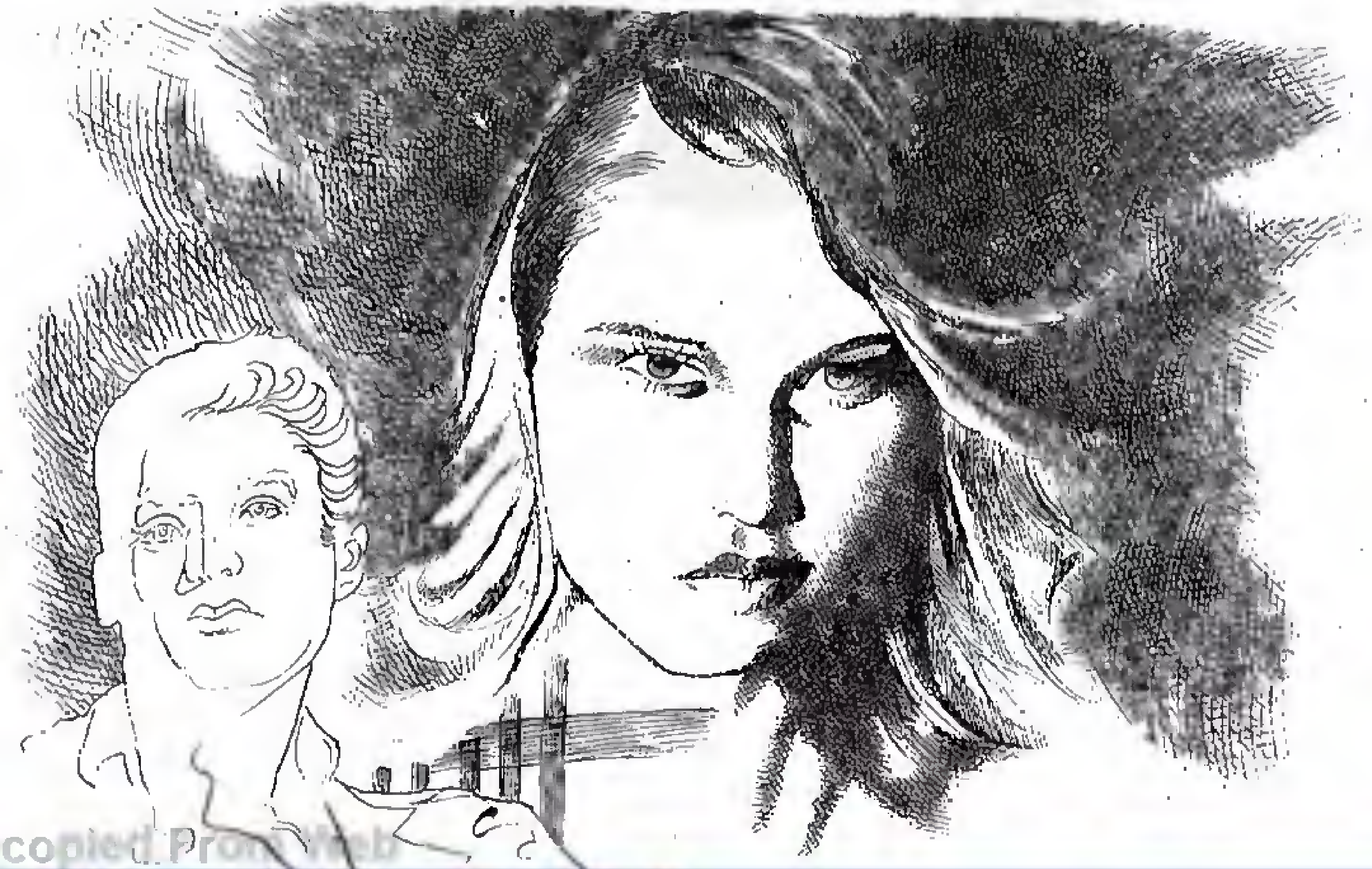
☆......☆......☆

جب ٹرین پاکستان کی حدود میں داخل ہوئی تو میں ان پُرتشکر لمحات کو الفاظ کا لباس نہیں پہنا سکتا جذبات اور دلی کیفیات صرف محسوس کی جا سکتی ہے۔ کہ ایک طرف تو آنکھوں میں خوشی کے آنسو تھے۔ اور دوسری طرف بکھری لاشوں کے انبار کا غم، دونوں کیفیات ایک ساتھ تھیں۔

لوگ ہمیں دیکھ کر یوں ٹرین کی طرف دوڑے چلے آ رہے تھے جیسے ٹرین نہ ہوئی سونے کی کان ہوئی لوگ یوں کھانا سروں پر اٹھائے بھاگ رہے تھے جیسے اپنے بھائیوں پر سب کچھ قربان کر دینا چاہتے تھے۔ آج وہ پُرخلوص جذبہ کہیں نظر نہیں آتا وہ جذبات مفقود ہو چکے ہیں اس قوم سے۔

خیر! ہم لاہور کی تنگ گلیوں سے گزرتے سوچی دروازے کے ایک بڑے مکان میں داخل ہوئے جس کا قفل بمشکل توڑا یوں محسوس ہوتا تھا جیسے کسی بڑی قید سے نکل آئے ہوں۔ وہ رات کی تاریکی کس قدر ویران اور پراسرار تھی جو ہم نے اس گھر میں گزاری تھی امرتسر آنکھوں کے سامنے گھومتا تھا۔ وہ بچپن، معصوم بچپن جو گولیوں کی گن گرج سن کر پروان چڑھا تھا آج اس بڑے گھر میں تنہا سا تھا۔

وقت پر لگا کر اڑا بچپن سے جوانی میں قدم رکھا خود کو کچھ سمجھنے کے دن آئے تھے جوانی ہوتی ہی ایسی ہے کہ انسان طاقت کے نشے میں جھومتا ہے۔ جیسے خود کو کوئی توپ چیز سمجھنے لگتا ہے۔ میری زندگی میں اب تک میں نے محبت کو کوئی خاص جگہ نہ دی تھی مگر یہ تو شاید خود ہو جاتی ہے۔ خود ہی خون میں شامل ہونے لگتی ہے خود کو منوانے لگتی ہے اور ایک تناور درخت بن جاتی ہے آپ کی سوچوں میں پتہ بھی نہیں چلتا میں بھی تو جان نہیں پایا تھا۔ اس جذبے کو، مگر اخلاقیات اور بزرگوں کے ادب و احترام کو ہمیشہ مقدم اور فرض جانا تھا ان کی شان



میں کوئی گستاخی نہ ہو حتی الامکان یہی کوشش رہی تھی۔ اگر محبت رکاوٹ بنتی بزرگوں کے احترام اور خوشی کے سامنے تو میں وہ بھی قربان کر دیتا اور یہی کچھ کر گزرا تھا میں نے۔

☆......☆......☆

میری نسبت پھوپھی زاد کے ساتھ طے تھی وہ مجھے پسند تھی مگر دوسری طرف وہ مجھ سے عشق و محبت سے بھرپور جذبات رکھتی تھی۔ یہ پسند کب محبت میں بدلی میں نہ جان پایا بہر حال وقت گزرنے کے ساتھ حالات نے پلٹا کھایا اور میرے دادا جی نے میری منگنی کسی دوسری جگہ رکھ کر دی میں تو سدا کا بزرگوں کی ہاں میں ہاں ملانے والا تھا فوراً سر جھکا کر بولا تھا جیسے آپ مناسب سمجھیں۔ میرا یہ فیصلہ محترمہ کو اندر تک ہلا گیا وہ رو رو کر ہلکان ہو رہی تھی اور مجھے فوراً ملنے کو کہا تھا میں ٹال مٹول کرتا رہا مگر ایک دن دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر اس سے ملنے پہنچ گیا تھا اور شاید میری یہ سب سے بڑی غلطی تھی جو مجھے ساری عمر کے لیے پچھتاوے کی آگ میں دھکیل گئی تھی۔

میں پھوپھی اماں کو سلام و آداب کہہ کر محترمہ کے کمرے کی جانب بڑھا۔ وہ جیسے میرا ہی انتظار کر رہی تھی فوراً پھٹ پڑی تھی اس کی دھواں دھواں آنکھیں، آنسوؤں کے بوجھ سے جھکی آنکھیں اب تک میری نظروں کے سامنے گھومتی ہیں۔ مگر میں اس کے آنسوؤں سے موم نہ ہوا تھا میرا فیصلہ اٹل تھا میں اپنے فیصلے پر قائم تھا کہ بزرگوں کی عزت اور رضا بہر حال مجھے زیادہ عزیز ہے میں ایسی ہزاروں محبتیں اپنے بزرگوں کی عزت و خوشی پر قربان کر دوں۔ مگر اس کے میرے سامنے جڑے ہاتھ کہ خدا کا واسطہ کچھ تو نرمی کرو تمہیں میری چاہت کا واسطہ ہے۔

☆......☆......☆

اس سے پہلے کہ اُس کے بہتے آنسو مجھے میرے فیصلے سے ڈگمگا دیتے میں فوراً سے پیشتر اس کمرے سے نکل جانا چاہتا تھا لیکن میرے نکلنے سے پہلے اس کے دونوں بھائی اندر کمرے میں آ گئے اور اس رشتے کے ٹوٹنے پر سخت غصے اور طیش میں آ کر مجھے برا بھلا کہنے لگے۔ اور پھر اچانک ایک بھائی نے مشتعل ہو کر مجھ پر چاقو سے قاتلانہ حملہ کر دیا۔ میں جان بچانے کی خاطر باہر کی طرف لپکا لیکن تقدیر اپنا فیصلہ سنا چکی تھی دروازے کی کنڈی لگی ہوئی تھی۔ اور یہ کنڈی لگانے والی کوئی اور نہیں وہی محترمہ تھی جو مجھے دل و جان سے چاہتی تھی۔ جس کے کہنے کے مطابق وہ مجھ سے عشق کرتی تھی اب وہی محترمہ چاہتی تھی کہ ”علی! اگر تم میرے نہ ہو سکے تو میں تمہیں کسی کا نہ ہونے دوں گی۔“

میں جیسے تیسے کر کے آگے بڑھا مگر چاقو میری ٹانگ میں پیوست ہو چکا تھا۔ گرم خون کی ایک لہر میں نے اپنی ٹانگ پر محسوس کی تھی اور پھر وہ خون فواروں کی شکل اختیار کر گیا تھا۔ میں کنڈی کھولنے میں کامیاب ہو گیا اور گرتا پڑتا سیڑھی اتر گیا تھا باہر گلی میں چچی اماں نظر آئیں وہ شاید مجھے ہی ڈھونڈتی یہاں آئیں تھیں۔ مجھے اس حالت میں دیکھ کر بے ہوش ہو گئیں تھیں۔ پھر ایک رحم دل گاجر کے ریڑھے والے نے مجھے اپنے ریڑھے پر ڈالا اور بڑی مشکل سے میو ہسپتال تک پہنچایا۔

☆......☆......☆

اس کے بعد مجھے پتا نہیں کیوں کہ میں ہوش میں نہیں تھا ہوش تو جب آیا جب زندگی ایک نئے غم کی داستان رقم کرنے جا رہی تھی۔ اور میں تکلیف سے کراہ رہا تھا تکلیف اس قدر تھی کہ آنسو بہے جا رہے تھے آج میں بھول گیا تھا کہ میں ایک تندمند جوان ہوں۔ مرد ہوں دکھ ایسے بھی چرکے لگاتے ہیں کہ انسان بے بسی میں بس رو ہی سکتا ہے یا صبر کے علاوہ کوئی چارہ کار نہیں ہوتا بے چارے کے پاس میں بھی زخمی پرندے کی طرح تڑپ رہا تھا زندگی اپنے بڑے کے فیصلوں کے بھینٹ چڑھ گئی تھی۔ میری معصوم سادہ سادہ زندگی!۔

چاند کو گرہن لگنے جا رہا تھا ابھی زندگی میں دیکھا ہی کیا تھا کہ اتنا بڑا حادثہ زندگی کو نگلنے کی کوشش میں

تھا۔ میں ہمیشہ سخت جان رہا تھا برداشت کر رہا تھا صبر کر رہا تھا۔

مجھے تو اس خاکروب کی زندگی خود کی زندگی سے زیادہ حسین دکھ رہی تھی جو کوڑا کرکٹ اکٹھا کرنے میں مصروف تھا درخت پہ بیٹھا وہ پرندہ بھی مجھ سے زیادہ سکھ میں تھا۔ جو سب سے بیگانہ صرف آج کی فکر میں زندہ تھا۔ وقت آ گیا تھا جب زندگی آدھی ہونے جا رہی تھی میرے وجود کے ایک حصے کو الگ کر دینے کی تیاری میں تھے اور ڈاکٹرز اور میں بس بین رہا تھا مگر تکلیف اس قدر تھی کہ مجھے پرواہ نہیں تھی کہ میری ٹانگ کو الگ کر دیا جاتا ہے۔ میرے جسم سے میں بس ڈاکٹر سے ایک ہی لفظ کہہ رہا تھا کہ میں بہت تکلیف میں ہوں۔

☆......☆......☆

خون پیر تک گردش نہیں کر رہا تھا نسیں کٹ گئی تھیں۔ اس لیے ٹانگ کو الگ کر دینا ضروری تھا مانا کہ یہ اذیت ناک عمل تھا مگر اس اذیت سے زیادہ نہیں جو میں اس ٹانگ کی وجہ سے سہہ رہا تھا۔ پھر زندگی نے وہ کچھ دکھایا کہ جس کا تصور بھی ہولناک ہے میری کمر میں انجیکشن لگا دیا گیا۔ کہ میرے نیچے کا دھڑ سن ہو جائے اور جب ڈاکٹر کو یقین ہوتا چلا گیا کہ میں اپنی ٹانگوں کو محسوس نہیں کر سکتا پھر انہوں نے ایک پردہ میرے اور ٹانگوں کے درمیان حائل کر دیا کہ یہ قیامت میں نہ دیکھ سکوں جو مجھ پر گزرنے جا رہی تھی۔

ہاں یہ سچ ہے کہ وقت نہیں رکا تھا سوئیاں اسی رفتار سے محو سفر تھیں جو بھی گزر رہا تھا میری جان پر گزر رہا تھا میں محبت کی سزا پا رہا تھا۔ کہ نبھا نہ پایا تھا میرے وجود پر چلتی آری کی آواز آج بھی میری سماعتوں میں محفوظ ہے۔ کیوں کہ میں مکمل طور پر بے ہوش نہ تھا نیچے کا دھڑ سن تھا مگر میں خود بھی پوری طور پر ہوش میں نہ تھا مگر جانتا تھا کہ میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔

زندگی جینے کا خراج وصول کر رہی تھی۔ اور میں چپ چاپ بے بسی کے اندھیروں میں گم ہو رہا تھا مجھ میں سکت نہ تھی خود کو یوں ٹوٹا ہوا دیکھنے کی مگر یہ حوصلہ بھی شاید زندگی نے دینا تھا کہ جینا تھا بہر

ذکر جل پری کا

کوپن ہیگن میں خواتین اسمارٹ، سنہرے بالوں اور شفاف جسم کی ہوتی ہیں۔ ہمارے شاعر نے انہی کے لیے کہا تھا۔
چاندی جیسا رنگ ہے تیرا، سونے جیسے بال
ایک تو ہی دھن وان ہے گوری، باقی سب کنگال
یہ ہمارے دل کی آواز ہے۔
سمندر کے نزدیک پہنچے تو ہر طرف پریاں ہی پریاں۔
ایک گھاس کے خطے پر پیٹ کے بل۔
ذرا فاصلے پر کمر گھاس سے لگائے، اپنے جسم کو سورج کی کرنوں سے سونا سونا کرتی۔
سفر نامہ ڈنمارک، قمر علی عباسی

حال جینا تو تھا۔

میں نے کسی کے خلاف کوئی بیان نہ دیا تھا۔ نہ کوئی رپورٹ لکھوائی تھی۔ کیوں کہ یہ کام کرنے والے میرے اپنے ہی سگے تھے میں کیسے برداشت کر پاتا اپنوں کے دکھ میں زندہ ہوں اب تک اور نشان عبرت بن کر ایک مصنوعی ٹانگ کے سہارے ساری زندگی گزار دی ہاں مگر شکوہ زبان پر نہ لایا کہ میں اپنے کیے پر شرمندہ نہ تھا میں نے اپنے بڑوں کی رضا خوشی اور احترام کے لیے محبت کی قربانی دی تھی جو کچھ ہوا میرا نصیب تھا سو میں نے سہا۔

ناکامی محبت کا انتقام لینے والی محترمہ بھی موجود ہے۔ اور ایک پاگل شوہر کے ساتھ زندگی گزار رہی ہے۔ شاید اپنے کیے کی سزا پا رہی ہے میں اسے بھی قصور وار نہیں سمجھتا کہ وہ دل کے ہاتھوں مجبور تھی اس نے دل کی مانی اور میں نے بزرگوں کی عزت کی لاج رکھی ان کے کہے ہوئے لفظوں پر اپنی زندگی داؤ پر لگا دی۔

☆☆......☆☆



گناہوں کی دلدل

ایم اشفاق بٹ

ذلت اور گناہ سے لپٹی ایک آپ بیتی / لالہ موسیٰ سے

تین دن ہوگئے تھے، بارش موسلا دھار برس رہی تھی جو کہ رکنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔ اچانک میرے دوست خالد کی کال آگئی۔ میں نے اٹینڈ کی تو خالد کے رونے کی آواز آ رہی تھی۔ میں ایک دم پریشان ہوگیا کہ اسے کیا ہوا ہے میں نے چلاتے ہوئے پوچھا کہ کیا ہوا ہے؟ خالد نے روتے روتے بتایا کہ اس کی امی فوت ہوگئی ہیں اور میں جلدی سے آ جاؤں۔

☆......☆......☆

خالد کا گھر ہمارے شہر سے پندرہ کلو میٹر دور کھاریاں میں تھا۔ میں نے جلدی جلدی کپڑے تبدیل کیے اور اتنی دیر میں بارش بھی ہلکی ہوگئی تھوڑی تھوڑی بونداباندی ہو رہی تھی۔ میں نے موٹر سائیکل نکالا اور امی کو بتایا کہ خالد کی امی فوت ہوگئی ہیں اور میں وہاں جا رہا ہوں۔ مجھے وہاں دو تین دن لگ جائیں گے۔ میں جیسے ہی اپنی گلی سے نکلا تو ایک لڑکی کو اپنے گھر کے سامنے پریشان حالت میں دیکھا۔

اس لڑکی کو میں کیا پورا محلہ جانتا تھا کوئی اسے طوائف کہتا اور کوئی بکاؤ مال۔۔

اس لڑکی کا نام پاکیزہ تھا۔ میں جب اس کے پاس سے گزرنے لگا تو اس نے مجھے آواز دی کہ ''پلیز اشفاق صاحب بات سنیں۔'' پہلے تو میرا دل چاہا کہ نکلوں ادھر سے پھر پتا نہیں میں کیا سوچ کے رک گیا۔ میں نے کہا ''جی فرمایئے'' وہ کہنے لگی میں اپنے دونوں بچوں کو ساتھ لے کر اپنی ایک سہیلی کے گھر جانے لگی تھی باہر گلی والا کا دروازہ بند کر کے تالا لگا دیا ہے۔ لیکن چابی اندر رہ گئی ہے۔ پلیز آپ میری مدد کریں میں نے اسے کہا کہ میں اس وقت بہت جلدی میں ہوں کہنے لگی۔ پلیز میری مدد کر دیں، میں نے گلی کے ایک بچے کو دیوار کے سہارے اس کے گھر کے اندر اتارا تالے کی چابی اندر ٹیبل کے اوپر رکھی تھی۔ اس لڑکے نے چابی باہر پھینکی باہر کا تالا کھول کر لڑکے کو باہر سے نکالا اور چابی پاکیزہ کے حوالے کر کے خود اپنے دوست کالد کے گھر پہنچ گیا۔ اس موقع پر مجھے اپنے ابا جان کی شدت سے یاد آئی جو ہم کو روتا ہوا چھوڑ کر بہت دور چلے گئے تھے۔

☆......☆......☆

قُل وغیرہ کروا کر میں واپس آ گیا۔ ایک دن میں باہر نکلا تو پاکیزہ کا خاوند مل گیا۔ میرے ساتھ باتیں کرنے لگا۔ باتوں باتوں میں اس نے مجھے کہا



’’تم کو ایک لڑکی کا نمبر دیتا ہوں‘ میں نے کہا نہیں یار مجھے نہیں چاہیے۔ کہنے لگا یار ایک دفعہ بات تو کر کے دیکھو اتنی خوبصورت آواز تم نے زندگی میں نہیں سنی ہوگی۔ آخر ایک رات میں نے اس نمبر پہ کال کی تو آگے سے لڑکی نے اٹینڈ کی کہنے لگی جی کون کس سے بات کرنی ہے؟ میں اس کی آواز کے سحر میں ایسا ڈوبا کہ بولنا ہی بھول گیا اس نے غصے سے یہ کہتے ہوئے کال ڈراپ کر دی اگر بات نہیں کرنی تو کال کیوں کی؟

کچھ دیر بعد اس نے مجھے کال کی تو میں نے اٹینڈ نہ کی پھر میں نے کال اٹینڈ کی اس نے سلام کیا میں نے سلام کا جواب دیا تو کہنے لگی’’ پہلے آپ کی کال آئی تھی پر آپ نے بات کرنا گوارہ نہیں کی ہم غریبوں سے۔‘‘

میں نے کہا ایسی کوئی بات نہیں’’ آپ کا نام اور آپ کہاں رہتی ہیں؟‘‘

’’میرا نام پاکیزہ ہے۔‘‘

اس نے میرے محلے کا نام لیا اس کا نام اور اپنے محلے کا نام سن کر مجھے جھٹکا سا لگا کیوں کہ پاکیزہ تو میری گلی میں ہی رہتی تھی جس کو میں جانتا تھا۔ میں نے پوچھا آپ کس گلی میں رہتی ہیں۔ اس نے میری والی گلی کا نام لیا پھر میں نے اجازت مانگ کر کال ڈراپ کر دی۔

☆......☆......☆

میں سوچنے لگا کہ پاکیزہ کے خاوند نے مجھے اپنی بیوی کا نمبر کیوں دیا تھا۔ پاکیزہ کے خاوند کا نام پرویز تھا۔ میں نے سوچا کہ غلطی سے اس نے اپنی بیوی کا نمبر دے دیا ہوگا۔ اگلے دن پرویز مجھے گلی میں مل گیا

میں نے کہا ''پرویز یار تم نے غلطی سے اپنی بیوی کا نمبر مجھے دے دیا تھا وہ ہنس کر کہنے لگا'' بٹ صاحب آپ بھی بھولے بادشاہ ہیں نمبر میں نے غلطی سے نہیں دیا تھا خود دیا تھا جائیں موج کریں اگر موڈ بنا تو کچھ چائے پانی دے دینا۔ اس کی باتیں سن کر میں حیران و پریشان ہوگیا وہ مجھے حیران کر کے چلا گیا۔

پھر ایک رات پاکیزہ کے نمبر سے مجھے کال آئی میں سو رہا تھا میری آنکھ کھل گئی تو ٹائم دیکھا رات کے گیارہ بج رہے تھے ہر طرف ہو کا عالم تھا۔ میں نے کال اٹینڈ کی تو پاکیزہ کی کھنکتی ہوئی آواز میرے کانوں میں پڑی ''جناب بے نام کیا حال ہے آپ کا؟'' میں نے کہا میں ٹھیک ہوں آپ سناؤ آپ کا کیا حال ہے۔ وہ کہنے لگی میں بھی ٹھیک ہوں۔ آپ کا نام کیا ہے۔

جب تم مجھ سے ایک دفعہ ملاقات کر و گی تو پھر تم کو اپنا نام بتاؤں گا کل ملاقات ہو سکتی ہے کس جگہ پر۔

تاج ریسٹورنٹ میں ٹھیک بارہ بجے اس نے کہا ٹھیک ہے میں آ جاؤں گی پھر کچھ دیر باتیں کیں اور پھر ہم سو گئے۔

میں ٹھیک بارہ بجے تاج ریسٹورنٹ میں لیڈیز کیبن میں بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے ویٹر سے کہا میری ایک دوست آنے والی ہے، اس نے کہا ٹھیک ہے صاحب۔

بارہ بج کر پانچ منٹ پر پاکیزہ گیٹ سے اندر داخل ہوئی تو میں نے ہاتھ کے اشارے سے اسے اپنی طرف بلا لیا وہ میرے سامنے آ کر کرسی پر بیٹھ گئی۔ اور مجھے دیکھتے ہی کہنے لگی'' اشفاق آپ ہیں''. میں نے کہا جی کہنے لگی'' آپ تو بڑے چھپے رستم نکلے ہیں۔''

☆......☆......☆

میں نے ویٹر سے کو کھانے کا آرڈر دیا آرڈر لے کر وہ چلا گیا۔ پھر میں نے پوچھا پاکیزہ ایک بات پوچھوں اس نے کہا ہاں پوچھو میں نے کہا یہ سب کیا ہے تمہارے خاوند پرویز نے مجھے تمہارا نمبر دیا کہ اس سے گپ شپ لگاؤ موج کرو اگر موڈ ہو تو چائے پانی دے دینا اور سب ہی لوگ یہ کہتے ہیں کہ پاکیزہ ایک طوائف ہے۔ اس نے کہا'' ہاں اشفاق یہ سچ ہے کہ میں ایک طوائف ہوں میں یہ کام شوق سے نہیں کرتی میرے خاوند نے مجھے دھمکی دی ہے اگر تم ایسا نہیں کرو گی تو میں تمہیں طلاق دے دوں گا۔''

اس کے ساتھ تمہاری شادی کیسے ہوئی؟ اتنی دیر میں ویٹر کھانا لے آیا کھانا رکھ کے وہ چلا گیا۔ میں نے پاکیزہ سے کہا پہلے کھانا کھاؤ بعد میں باتیں کرتے ہیں کھانا کھانے کے بعد پاکیزہ نے اپنے لفظوں میں کہانی شروع کی۔

اخبار میں زیادہ تر وہ خبریں چھپتی ہیں جن میں چسکا ہوتا ہے لیکن عورتوں پر جو ظلم ہو رہا ہے اس کے بارے میں کبھی کسی اخبار نے نہیں لکھا۔

میری تین بہنیں تھیں بھائی کوئی نہیں تھا میں سب سے بڑی بہن تھی۔ مجھ سے چھوٹی تین بہنیں تھیں ۔ہمارا گھرانہ نا اتنا امیر اور نہ اتنا غریب تھا میرے ابا کی موٹر سائیکلوں کی ورکشاپ تھی دوکان پہ تین چار لڑکے کام کرتے تھے۔ ایک دن دروازے پر دستک ہوئی میں دروازے پر گئی تو باہر ایک لڑکا کھڑا تھا۔ اس کے کپڑے کالے سیاہ تھے ہاتھوں پہ بھی کالک لگی ہوئی تھی اس کے۔ ہاتھ میں سبزی والا شاپر بیگ تھا لڑکا کافی خوبصورت تھا گھنگھریالے بال تھے اس کے اس نے کہا میرا نام جواد ہے اور میں آپ کے ابو کی ورکشاپ سے آیا ہوں۔

☆......☆......☆

استاد جی نے یہ سبزی بھیجی ہے اس نے سبزی والا شاپر میری طرف بڑھایا۔ میں نے شاپر پکڑنے کے لیے اپنا ہاتھ آگے کیا تو میرا ہاتھ بے دھیانی میں اس کے ہاتھ سے جا ٹکرایا تو اس کے ہاتھوں کی کالک میرے گورے گورے ہاتھ پہ لگ گئی۔ جلدی سے شاپر بیگ پکڑ کر اندر آ گئی اور اپنے ہاتھ پہ لگی کالک کو دیکھنے لگی جو جواد کے ہاتھ سے لگی تھی۔ وہ کالک مجھے بہت اچھی لگ رہی تھی جواد کالک سمیت میرے دل میں اتر گیا میں اس کے بارے میں سوچنے لگی جواد بھی بہانوں بہانوں سے ہمارے گھر کے چکر لگانے لگا۔

ہماری محبت دن بدن پروان چڑھنے لگی پھر میں جواد کو باہر ملنے لگی ایک دن جواد نے مجھ سے کہا "پاکیزہ میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔" میں تو چاہتی ہی یہی تھی اس نے مجھ سے کہا تم گھر سے آجاؤ ہم کسی اور شہر میں جا کر اپنی نئی زندگی کا آغاز کریں گے اور گھر سے آتے وقت کچھ روپے اور اپنا زیور بھی لے آنا کیوں کہ اس زیور پر صرف تمہارا حق ہے اور میں بھی اپنے ساتھ روپے لے آؤں گا میں نے کہا ٹھیک ہے کل میں بارہ بجے ریلوے اسٹیشن پہ پہنچ جاؤں گی تم بھی پہنچ جانا" اور میں دوسرے دن ریلوے اسٹیشن پر تھی۔ تھوڑی دیر بعد جواد بھی آ گیا جواد گھر سے دو ٹکٹ لے آیا گاڑی آئی اور ہم گاڑی میں بیٹھ گئے دس گھنٹے کے طویل سفر کے بعد ہم ایک اسٹیشن پر اتر گئے۔ تو وہ ملتان شہر تھا ولیوں کا شہر ہم نے گاڑی سے اتر کر قریبی ہوٹل میں ایک کمرہ کرایہ پر لیا۔

ہم دونوں سو گئے جب میری آنکھ کھلی تو دن کے دس بج رہے تھے۔ میں نے جواد کو جگایا منہ ہاتھ دھو کر اس نے ویٹر کو ناشتے کا کہا ویٹر ناشتہ لے کر آیا ناشتہ کرنے کے بعد جواد مجھ سے کہنے لگا "پاکیزہ آج میں بہت خوش ہوں میں نے جسے چاہا اسے حاصل کیا آج ہم دونوں ایک ہو گئے ہیں ہم بہت جلد شادی کر لیں گے۔"

☆......☆......☆

پھر مجھے وہ یہ کہہ کر باہر چلا گیا کہ پاکیزہ مولوی صاحب کا بندوبست کر کے آتا ہوں اور آج ہی ہمارا نکاح ہو جائے گا۔ میں نے خوش ہو کر کہا کہ ہاں جاؤ پر جلدی آنا جواد چلا گیا شام کو اکیلا ہی واپس آیا۔ میں نے پوچھا کہ کیا ہوا تو کہنے لگا کہ ابھی تک کوئی مولوی صاحب ایسا نہیں ملا جو یہاں آ کر ہمارا نکاح پڑھائے اس لیے ہمیں خود مولوی صاحب کے پاس جانا ہوگا میں نے کہا ٹھیک ہے ہم چلے جائیں گے۔

اگلے دن مجھے لے کر وہ ایک کوٹھی نما گھر میں لے آیا اور تھوڑی دیر بعد ایک مولوی اور دو بندے اور تھے اور ان کے ساتھ ایک عورت بھی تھی جواد کہنے لگا کہ یہ ہماری شادی کے گواہ ہیں۔" مولوی صاحب نے بس

اک بار کہو تم میری ہو

ہم گھوم چکے بستی بن میں
اک آس کا پھانس لیے من میں
کوئی ساجن ہو کوئی پیارا ہو
کوئی دیپک ہو کوئی تارا ہو
جب جیون رات اندھیری ہو
اک بار کہو تم میری ہو

جب ساون بادل چھائے ہوں
جب پھاگن پھول کھلائے ہوں
جب چندا روپ لٹاتا ہو
جب سورج دھوپ نہاتا ہو
یا شام نے بستی گھیری ہو
اک بار کہو تم میری ہو

ہاں دل کا دامن پھیلا ہے
کیوں گوری کا دل میلا ہے
ہم کب تک پیت کے دھوکے میں
تم کب تک دور جھروکے میں

کب دید سے دل کو سیری ہو
اک بار کہو تم میری ہو

کیا جھگڑا سود خسارے کا
یہ کاج نہیں بنجارے کا
سب سونا روپا لے جائے
سب دنیا دنیا لے جائے
تم ایک مجھے بہتیری ہو
اک بار کہو تم میری ہو

ابن انشاء

سورت فاتحہ پڑھی دعا مانگی اور ہمیں مبارکباد دی اور کہا کہ اب آپ دونوں میاں بیوی ہیں۔نہ کسی نکاح نامے پہ دستخط کروائے نہ کوئی نکاح رجسٹرار تھا میں تو جواد کو پانے کی خوشی میں سب بھول گئی تھی اور ویسے بھی مجھے اتنا کچھ پتا بھی نہیں تھا نکاح کے بعد وہ لوگ چلے گئے۔اور ہم واپس ہوٹل آ گئے مجھے کیا پتا تھا کہ جواد مجھے دھوکہ دے رہا ہے وہ بغیر نکاح کے میرے ساتھ رہ رہا تھا مجھے تو جواد پر بہت ہی یقین تھا اپنے آپ سے بڑھ کر ایک ہفتہ ہمارا ہر دن خوشیوں کا پیغام لے کر آتا آخر ایک دن ایسا طلوع ہوا جو ہمیشہ کے لیے میری دنیا اندھیر کر گیا۔ایک دن صبح میری آنکھ کھلی تو جواد نظر نہ آیا میں کافی پریشان ہوگئی کہ پتہ نہیں جواد کہاں چلا گیا میں نے کافی دیر انتظار کیا انتظار کرتے کرتے رات ہوگئی پر جواد نہ آیا۔میں نے اپنے پیسے اور زیور دیکھے تو وہ غائب تھے۔تو مجھے پتہ چل گیا کہ جواد میرے پیسے اور زیور لے کر بھاگ گیا ہے۔

ویٹر کھانا دینے آیا تو میں نے ویٹر سے جواد کے بارے میں پوچھا کہ کیا تم کو اس کے بارے میں پتا ہے۔اس نے جو بتایا اسے سن کے میرے اوسان خطا ہوگئے اس نے کہا اور ''بھولی لڑکی وہ تو لڑکیوں کو بیچنے کا دھندہ کرتا ہے اور پیسے لے کر چلا گیا ہے۔'' میں جیسے جیسے اس کی باتیں سن رہی تھی میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا ہو رہا تھا۔ویٹر نے مجھے کہا ہوٹل کے مالک سیٹھ اکرام تمہیں بلا رہے ہیں۔میں ویٹر کے ساتھ ہوٹل کے مالک کے کمرے مین پہنچی تو سیٹھ نے ویٹر کو جانے کا اشارہ کیا۔قیامت کی رات مجھ پر گزری مجھے نیند آ گئی اور جب میری آنکھ کھلی تو میں یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ یہ وہ کمرہ نہیں تھا جس میں، میں سوئی ہوئی تھی۔ابھی میں سوچ میں ہی گم تھی کہ اچانک ایک لڑکی میرے کمرے میں آئی اس نے میرا ہاتھ منہ دھلایا اور چائے کا کپ اور ساتھ ایک پراٹھا تھا میں نے ناشتہ کیا میں نے اس لڑکی سے پوچھا میں یہاں کیسے آئی ہوں؟ اس نے کہا میرا نام فرح ہے تم کو یہاں لایا گیا ہے زینت بائی اس کوٹھے کی مالکہ ہے۔ اس سے آگے مجھ میں سننے کی تاب نہ رہی میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔میں نے فرح سے کہا میرا تو نکاح ہوا تھا جواد کے ساتھ جواد کو اب بھول جاؤ وہ تمہیں چوہدری کے ہاتھ بیچ گیا ہے۔

☆......☆......☆

میں ایک نوجوان کی محبت میں پھنس کر ان کے جال میں آ پھنسی ہوں اور اب پچھتا رہی ہوں۔میں نے اسے بتایا میں بھی جواد کی محبت میں اپنا گھر بار چھوڑ آئی تھی اور میری ماں میرا باپ مجھ پر اتنا زیادہ اعتماد کرتے تھے پر میں ان کا اعتبار اپنے پاؤں تلے روند کر گھر سے نکل آئی تھی۔میں سوچنے لگی کہ اب کروں تو کیا کروں تھوڑی دیر میں ایک زرق برق کپڑوں میں ملبوس عورت میرے کمرے میں داخل ہوئی۔اس کے ساتھ دو تین لڑکیاں بھی تھیں اس نے آتے ہی مجھے کہا پاکیزہ مجھے تمہارے بارے میں سب کچھ علم ہوا ہے کہ تم جواد چھوکرے کی محبت میں اس کے ساتھ گھر سے بھاگی ہو۔وہ تو ابھی خود خوبصورت چھوکرا ہے پر تمہارے ساتھ کام بہت بڑا کر گیا ہے تم کو ہمارے ہاتھ بیچ گیا کیا یہ تھا اس کا پیار......

مجھے پتا ہے اب تم واپس گھر نہیں جاسکتی کیوں کہ جو لڑکی ایک دفعہ گھر سے نکل آئے وہ دوبارہ گھر نہیں جا سکتی نہ گھر نہ معاشرہ اس کو قبول کرتا ہے۔اور تمہارے گھر والوں نے کہا ہے کہ اب پاکیزہ ہمارے لیے مرگئی ہے اب ہمارا اس سے کوئی تعلق واسطہ نہیں ہے۔اگر تم میری بات نہیں مانو گی تو'' مجھے اور بھی طریقے آتے ہیں منوانے کے لیے میں نے کہا کہ مجھے آج رات کچھ سوچنے کا موقع دو'' اس نے کہا ٹھیک ہے تم اچھی طرح سوچ لو اتنا کہہ کر وہ چلی گئی۔میں رات کو سوچتی رہی کہ میں نے جواد کی محبت میں اپنا گھر بار چھوڑا اپنے ماں باپ اپنی بہنوں کو چھوڑا بس جواد کی محبت میں لیکن اس نے میری محبت کا مذاق اڑایا۔اگلے دن میں نے اپنا فیصلہ زینت بائی کو بتا دیا میری بات سن کر وہ خوش ہوگئی۔رفتہ رفتہ میں خود بھی بھول گئی کہ میں کیا ہوں کس کی بیٹی ہوں پھر مین بھی اس ماحول کی عادی ہوگئی۔بڑے بڑے تماش بین مجھے دیکھنے آتے اور جب میں ناچتے ناچتے گانا

گاتی تھی تو سب ہی تماش بین اٹھ کر مجھ پہ روپیوں کی بارش کر دیتے تھے۔ ان میں ایک ایسا بھی تماش بین تھا وہ بس چپ چاپ اپنی جگہ پہ بیٹھا رہتا تھا اور دوسرے تماش بینوں کے جانے سے پہلے وہ چلا جاتا تھا۔ جب وہ اٹھ کر چلا جاتا تو اسکی جگہ جہاں پر وہ بیٹھتا تھا وہاں سو کا نوٹ پڑا ہوتا تھا۔ حالانکہ دوسرے تماش بین کوئی پانچ سو کوئی ہزار ہزار کے نوٹ مجھ پہ نچھاور کرتے تھے۔

☆......☆......☆

وہ تھا تو ایک نوجوان لڑکا مگر دیکھنے میں ایک شریف خاندان سے لگتا تھا۔ پر وہ اس بدنام بازار حسن میں کیوں آتا تھا یہ وہ سوال تھا جو مجھے پریشان کرتا تھا۔

وہ لڑکا اب میرے لیے معمہ بنتا جا رہا ہے۔ ہمارے بازار حسن میں تو شام ڈھلتے ہی بازار حسن کی رونقیں بحال ہونا شروع ہو جاتی ہیں۔

میں ایک دن صبح کی سیر کرنے قریبی پارک میں چلی گئی آج پتہ نہیں کتنے عرصے بعد میں نے صبح کا منظر دیکھا تھا ہر کوئی اپنے اپنے کاموں کو چل پڑا تھا پھر میں ہر روز سیر کو جانے لگی صبح کی سیر کر کے آتی تو آ کے سو جاتی۔ ایک دن میں صبح کی سیر کرنے پارک میں گئی میں پارک میں ایک بینچ پر بیٹھی تھی تو ساتھ سڑک تھی وہاں کافی سارے لوگ پیٹ کی خاطر دیہاڑی لگانے کے لیے ادھر ادھر کھڑے تھے۔ میں نے دیکھا کہ وہی نوجوان لڑکا جو میرا گانا سننے آتا تھا اور ہر روز سو کا نوٹ ادھر رکھ جاتا تھا۔ وہ بھی ان لوگوں میں کھڑا مجھے نظر آیا میں نے نزدیک جا کے اس کو اپنے پاس بلایا وہ میرے ساتھ بینچ پر بیٹھ گیا میں نے پوچھا ''تم ادھر کیوں کھڑے ہو'' اس نے جواب دیا کہ کسی مستری کے ساتھ جا کر دیہاڑی لگانے کے لیے رات کو آپ کا گانا سننے بھی تو آنا ہے نا اور سو روپیہ بھی تو آپ کو دینا ہے میں نے کہا ''کیوں اس بدنام جگہ پر آتے ہو'' اس نے کہا آپ اور آپ کا گانا سننے آتا ہوں آپ کا گانا اور ''آپ مجھے اچھی لگتی ہیں اس لیے بازار حسن جاتا ہوں'' میں نے کہا تمہارا نام کیا ہے''۔ اس نے کہا میرا نام نعمان ہے'' میں نے کہا'' نعمان میرا نام پاکیزہ ہے پاکیزہ کا مطلب ہوتا ہے پاک صاف لیکن میں تو اب نام کی پاکیزہ ہوں ورنہ پاکیزگی والی بات مجھ میں کوئی نہیں رہی ہے۔''

☆......☆......☆

نعمان کہنے لگا پاکیزہ تم جیسی بھی ہو بس مجھے اچھی لگتی ہو پاکیزہ میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں میں تم کو اس گناہ کی دلدل سے نکالنا چاہتا ہوں تم میرے ساتھ چلو میرے گھر وہاں جا کر ہم شادی کر لیں گے۔ میرے ماں باپ فوت ہو گئے ہیں ایک چھوٹی بہن ہے اور ایک بڑا بھائی ہے۔ بہن کی شادی ہو گئی ہے۔ میں خود بھی اب اس گناہوں کی دلدل سے نکلنا چاہتی تھی میں نے کہا ٹھیک ہے نعمان لیکن ایک بات میری یاد رکھنا مجھے دھوکہ مت دینا۔ میں نے زندگی میں بہت دکھ دیکھے ہیں اس نے کہا میں تم کو اپنے دل کی رانی بنا کر رکھوں گا میں نے کہا کل تم اسی جگہ میرا انتظار کرنا میں آ جاؤں گی اس نے کہا ٹھیک ہے۔

رات کو میں نے اپنے کمرے میں آ کے ایک بیگ تیار کیا جس میں کافی روپے اور زیور رکھ لیا اور سو گئی۔ صبح ہوئی تو زینت بائی اور سب ہی سو رہے تھے۔ میں نے بیگ اٹھایا برقعہ پہنا تاکہ مجھے کوئی پہچان نہ لے میں مطلوبہ جگہ پہنچ گئی نعمان پہلے سے وہاں موجود تھا ہم دونوں رکشے میں بیٹھ کر ریلوے اسٹیشن آ گئے نعمان نے گوجرانوالہ کے دو ٹکٹ لیے گاڑی دن کے دو بجے آئی ہم گاڑی میں بیٹھ گئے گاڑی میں بیٹھتے ہی میں نے برقعہ اتار دیا۔ جب تک گاڑی کھڑی رہی میری جان پہ بنی رہی گاڑی چلتے ہی ہم نے سکھ کا سانس لیا ہم دونوں بہت خوش تھے۔ ہمارے سامنے ایک مرد اور ایک لڑکی بیٹھی ہوئی تھی وہ بار بار میری طرف دیکھ کر سرگوشیوں میں باتیں کر رہے تھے۔ گاڑی چلتے چلتے پتہ نہیں کون سے اسٹیشن پہ رکی رات کا اندھیرا تھا جس کی وجہ سے پتا نہیں چل سکا۔

☆......☆......☆

نعمان چائے لینے کے لیے گاڑی سے نیچے اترا تو چائے کا اسٹال ٹرین سے ذرا دور تھا۔ نعمان جیسے ہی

اسٹال پر پہنچا تو گاڑی چل پڑی اور دیکھتے ہی دیکھتے گاڑی نے اسپیڈ پکڑ لی نعمان نے کافی دوڑ لگائی لیکن وہ گاڑی پر سوار نہ ہوسکا۔ میں بہت پریشان ہوگئی اور میں نے اونچی آواز میں رونا شروع کر دیا اس آدمی اور لڑکی نے مجھے دلاسا دیا۔ وہ بندہ کہنے لگا میرا نام پرویز ہے۔ یہ میری کزن ہے۔ اور ہم کراچی سے آرہے ہیں میں نے جھوٹ بولا کہ وہ میرا کزن تھا ہم گوجرنوالہ جارہے تھے۔ کہ نعمان گاڑی میں سوار نہ ہو سکا وہ مجھے کہنے لگی ''آپ فکر نہ کرو جب گوجرنوالہ آئے گا تو ہم آپ کو بتا دیں گے'' میں سوچ رہی تھی کہ اب میں کدھر جاؤں گی؟

گوجرنوالہ اتر کر مجھے پھر نیند آ گئی جب میری آنکھ کھلی تو گاڑی ایک اسٹیشن پہ کھڑی تھی۔ وہ گجرات کا اسٹیشن تھا۔ میں سمجھی کہ ابھی گوجرنوالہ آگے ہے اتنی دیر میں پرویز نامی شخص اور وہ لڑکی بھی جاگ گئے۔ گجرات اسٹیشن کو دیکھ کر وہ کہنے لگے کہ گجرانوالہ کا اسٹیشن تو گزر گیا ہم سو گئے تھے ہمیں پتا ب نہ چلا وہ لڑکی کہنے لگی ''میرا نام شکیلہ ہے ہمارا شہر لالہ موسیٰ ہے تم ہمارے ساتھ ہمارے شہر لالہ موسیٰ چلو بعد میں ہم تم کو خود تم جہاں کہو گی چھوڑ آئیں گے۔''

میرے پاس اور کوئی ٹھکانہ بھی نہیں تھا رہنے کے لیے میں نے کہا ٹھیک ہے ہم لالہ موسیٰ اسٹیشن پر اترے۔ پرویز نے رکشے والے کو ایک محلے میں چلنے کو کہا محلے کا نام میں نہیں بتاؤں گی پرویز اور وہ لڑکی جس کا نام شکیلہ تھا مجھے ایک گھر میں لے آئے جس گھر میں ہم آئے وہاں اور کوئی بھی نہیں تھا سوائے ایک بوڑھی عورت کے پرویز کے بقول کہ یہ میری ماں ہے میں نے رات وہاں بسر کی اگلے دن شکیلہ چلی گئی۔

☆......☆☆......☆

دن پہ دن گزرتے گئے 6 ماہ کا عرصہ گزر گیا ایک دن پرویز نے مجھ سے کہا ''پاکیزہ کیا تم مجھ سے شادی کرو گی؟'' میرا آگے پیچھے تو کوئی تھا نہیں میں نے پرویز سے شادی کر لی پتہ نہیں پرویز کا کیا کاروبار تھا مجھے نہیں بتاتا تھا ایک دن رات کو میری آنکھ کھلی تو پرویز اپنے بستر پر نہیں تھا۔ میں اٹھی کہ دیکھوں کہ وہ کہاں ہے ساتھ والے کمرے میں مجھے پرویز کی آواز آئی وہ فون پہ کسی لڑکی کو کہہ رہا تھا جمیلہ رات بارہ بجے تم ساجد صاحب کے ہاں چلی جانا میں نے اس سے پے منٹ لے لی تھی۔ اس کی بات سن کر مجھے پتا چل گیا کہ پرویز لڑکیوں کا بروکر ہے بڑے لوگوں کو لڑکیاں سپلائی کرتا ہے۔ رفتہ رفتہ ہمارے دو بچے ہو گئے ایک دن پرویز رات کو اپنے ایک دوست کے ساتھ آیا پرویز نے دوست کو بیٹھک میں بٹھایا اور مجھے چائے لانے کو کہا۔ میں جب چائے لے کر آئی تو پرویز کے دوست نے ہزار ہزار کے کافی نوٹ دیے اور کہا یار کچھ کھانے کے لیے لے آؤ پرویز مجھ سے کہنے لگا پاکیزہ تم اسلم کے ساتھ بیٹھ کر چائے پیو میں کھانے کا سامان لے کر آتا ہوں۔ جب پرویز چلا گیا تو پرویز کا دوست میرے ساتھ آ کر بیٹھ گیا میں نے کہا ایسا مت کرو تو اس نے کہا میں نے تمہارے خاوند کو اس کام کے کافی سارے پیسے دیے ہیں اور یہ کام تمہارے خاوند کی مرضی سے ہورہا ہے اس کے بعد پرویز کبھی کسی کو گھر لے آتا کبھی کسی کو یہاں تک پاکیزہ نے مجھے اپنی کہانی سنائی۔

کچھ عرصے بعد ایسا ہوا کہ ایک دن مجھے پتہ چلا کہ پرویز فوت ہوگیا ہے۔ محلے کے کافی بندے اس کے جنازے پر گئے پر میں نہ گیا میرا دل ہی نہ مانا پاکیزہ کے اب دو بچے ہیں وہ ان کو پالنے کے لیے غلط راہ پہ نکل پڑی ہے۔ کبھی کوئی اس کے گھر میں جارہا ہوتا ہے۔ کبھی رات کو اس کے گھر سے کسی کو نکلتے دیکھتا ہوں ایک دن میں نے اس سے کہا کہ ''تم کس راہ پہ چل پڑی ہو تو وہ کہنے لگی۔''

''اشفاق صاحب میں نے ایک غلطی کی تھی گھر سے بھاگنے کی جس کی مجھے اتنی بڑی سزا ملی ہے میں کہاں سے کہاں آ پہنچی ہوں ان بچوں کو پالنے کے لیے کچھ نہ کچھ تو کرنا ہے نا میں گناہوں کی دلدل میں بری طرح پھنس گئی ہوں اگر نکلنا بھی چاہوں تو نہیں نکل سکتی۔'' میں اس کی بات سن کر چپ ہوگیا اور نم آنکھوں کے ساتھ اس کو چھوڑ کر آگے چل دیا۔

☆☆......☆☆

ہم شکل

ایم اے راحت

سچی کہانیاں میں پہلی بار، برصغیر کے نامور
قلم کار، ایم اے راحت کے قلم کا جادو

سطر سطر تجسس سموئے، نئے سنسنی خیز سلسلے کی چوتھی کڑی



خلاصہ

شاہ زیب کا تعلق روایت پسند گھرانے سے تھا۔ مشترکہ خاندان پر مبنی اس خاندان میں شاہ زیب سب سے چھوٹا اور لاڈلا فرد ہے۔ خاندان کی بزرگ دادی اماں بڑی اہمیت کی حامل شخصیت ہیں۔ اُن کے قصوں اور ٹوٹکوں سے ہر فرد مستفید ہوتا ہے۔ ایک دن قصوں کے درمیان دادی اماں نے کہا کہ دنیا میں اللہ نے ہر انسان کے سات ''ہمشکل'' بنائے ہیں۔

ایک دن شاہ زیب کی اچانک طبیعت خراب ہوگئی۔ اسپتال لے جانے کے بعد ڈاکٹر شاہ زیب کو برین ٹیومر ہونے کی اطلاع دیتا ہے۔ شاہ زیب زندگی کے باقی ماندہ دنوں کو ہسپتال کی نظر کرنے کے بجائے اپنی مرضی کی زندگی گزارنے کو ترجیح دیتا ہے اور یوں وہ گھر والوں کو اطلاع دیئے بغیر شہر سے دور سفر پر نکل جاتا ہے۔

دلاور ایک عادی مجرم ہے اور اس کی شکل شاہ زیب سے مشابہ ہے۔ دلاور کے دھوکے میں پولیس شاہ زیب کو گرفتار کر لیتی ہے۔ دلاور ضمیر کے ہاتھوں مجبور ہو کر شاہ زیب کی مدد کرنے کا فیصلہ کر لیتا ہے۔ جیل سے فرار ہونے کے بعد دلاور شاہ زیب چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔

طویل سفر کرنے کے بعد ریل اسٹیشن پر رکتی ہے تو ایک مجمع اُسے نظر آتا ہے۔ ایک لڑکی شاہ زیب کو ''عالی'' کہہ کر مخاطب کرتی ہے۔ مجمع میں موجود ایک بزرگ اُسے زبردستی اپنے ساتھ گھر لے جانے پر مجبور کرتا ہے۔ شاہ زیب کو اپنی دادی کی بات یاد آتی ہے سات ہمشکل والی یعنی کہ ایک اور ''ہمشکل'' اس نئی صورت حال سے نمٹنے کے لیے ذہنی کوفت کا شکار ہو جاتا ہے۔

اب آگے ملاحظہ کیجیے

''بیٹھو بیٹے کمال احمد صاحب نے کہا ان کی بیگم نے آگے بڑھ کر شاہ زیب کی صورت دیکھی اور پھر آنکھوں پر دوپٹہ رکھ لیا پھر بیٹھ گئیں ان کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں تھیں نشاط۔ بھی ساتھ ہی موجود تھی اور سر جھکائے مجرموں کی طرح بیٹھی ہوئی تھی کمال احمد نے کہا۔

☆......☆......☆

تمہیں معلوم ہے کہ ہم لوگ تمہاری آمد کا سن کر آئے ہیں بیٹے بزرگوں کو عزت دینا عزت داروں کا ہی کام ہے اور تمہارے خاندان سے میں پوری طرح متفق ہوں کہ نیک لوگوں کا خاندان ہے۔ بیٹا یقین کر لو نشاط نے تمہیں جو کچھ بتایا ہے وہ ٹھیک ہے بلاوجہ ایک ایسی مشکل در پیش آ گئی تھی جس کا اصلیت سے کوئی تعلق ہی نہیں ہے ناصر کے بارے میں تمہیں علم ہے کہ میرا قریبی عزیز ہے اور بچپن سے نشاط کے ساتھ پلا بڑھا ہے ہوتا ہے بچپن سے اگر اتنا ساتھ ہوا اور رشتے ایسے ہوں تو ذہنوں میں فتور آ ہی جاتا ہے لیکن بیٹا کرنا وہ ہوتا ہے جو تقدیر کا فیصلہ ہوتا ہے تقدیر ہی راستے متعین کرتی ہے۔ میں اگر تم مجھے ایک سچا انسان سمجھو اور جیسا کہ میرے پورے ماضی سے ظاہر ہے تو تمہیں اس بات کا یقین دلاتا ہوں دونوں بہن بھائیوں کی طرح پلے بڑھے ہیں بس رشتہ ایسا تھا کہ بات سوچی جا سکتی تھی لیکن یہ ممکن نہیں تھا۔ میں یہ نہیں کہتا مجھ سے غلطی ہوئی ہے ممکن تھا اگر تمہارے ساتھ نشاط کی شادی نہ ہوئی ہوتی تو میں نشاط کی شادی کہیں اور کرتا لیکن ناصر سے نہیں کرتا یہ ایک خاندانی مسئلہ تھا خیر میں تم سے خدا کے نام پر ایک درخواست کرتا ہوں کہ غلط فہمیاں اپنے دل سے نکالو اور نشاط کو زندگی دو میری اولاد ہے وہ دیکھو کس قدر لاغر ہوگئی ہے وہ اگر کسی کے دل میں چور ہوتا ہے عالی تو وہ اس طرح سے اپنے آپ کو غمزدہ نہیں کرتا وہ تم سے محبت کرتی ہے ایک شریف بیوی کی طرح خدا کے لیے اس کی زندگی کو یہ روگ مت لگاؤ مر جائے گی میری بیٹی'' کمال احمد صاحب کی آواز بھرا گئی شاہ زیب بری طرح دکھی ہو گیا تھا تھوڑی دیر تک وہ گردن جھکائے بیٹھا رہا تھا پھر اس نے کہا۔

☆......☆......☆

''محترم! جو کچھ میں کہہ رہا ہوں اسے غور سے سنیے گا اور اگر ممکن ہو تو خدا کے لیے اس پر یقین کر لیجیے میرا بھی ایک خاندان ہے، گھر ہے بہن بھائی ہیں بھابیاں ہیں دادی اماں ہیں بہت عرصے پہلے میری دادی اماں نے مجھ سے ایک بات کہی تھی پرانے زمانے کی خاتون ہیں اور اپنے کچھ افکار خیال رکھتی ہیں لیکن اس سے پہلے پرانے

زمانے کی کہاوتوں کا قایل نہیں تھا دادی اماں نے مجھے ایک بار کہا تھا اللہ تعالیٰ نے دنیا میں ہر انسان کے سات ہمشکل پیدا کیے ہیں ایسی بہت سی روایتیں اور کہانیاں بزرگوں کی بیشتر باتیں سچی ہوتی ہیں اور ہم ان کا مذاق اڑا کر رہ جاتے ہیں لیکن میرا تجربہ یہ ہے کہ بزرگوں کی بیشتر باتیں سچی ہوتی ہیں میں آپ سے جو کچھ کہہ رہا ہوں خدا کو حاضر و ناضر جان کے کہہ رہا ہوں اللہ تعالیٰ کا احسان ہے کہ مسلمان ہوں اللہ پر ایمان رکھتا ہوں اور جب میں اس حوالے سے کچھ کہوں تو میرے دل میں خدا ہوتا ہے عالی کی تصویر میں دیکھ چکا ہوں وہ کارنس پر رکھی ہوئی ہے میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں اس میں اور مجھ میں سرمو کوئی فرق نہیں ہے میں عالی نہیں ہوں بلکہ اس کا ہمشکل ہوں آپ لوگ اگر محسوس کر سکتے ہیں تو میرے اندر کوئی تبدیلی محسوس کیجیے آپ کو اندازہ ہو جائے گا کہ میں غلط نہیں کہہ رہا میں اپنے ہم شکلوں کی تلاش میں ہوں ایک ہمشکل مجھ سے مل کر جدا ہو چکا ہے اور دوسرا عالی جس کے بارے میں کوئی بھی دھوکا کھا سکتا ہے کہ وہ میں ہوں اب اتنا برا بھی انسان نہیں ہوں کہ اتنی فضول بات اپنی زبان سے نکالوں عالی سے نشاط کا نکاح ہوا ہوگا لازمی بات ہے اس نے ایجاب و قبول میں نشاط کو اپنی بیوی تسلیم کیا ہوگا لیکن میں پورے خلوص اور سچائی کے ساتھ نشاط کو اپنی بہن کہہ سکتا ہوں اپنی سگی بہن سمجھ سکتا ہوں کیوں کہ میں عالی نہیں ہوں میرا نام شاہ زیب ہے یہ سب لوگ غلط فہمی کا شکار ہو کر مجھے یہاں لے آئے ہیں جیسا کہ میں نے آپ سے عرض کیا کہ میں ایک خوشحال گھرانے سے تعلق رکھتا ہوں اور ایک شوق کے طور پر اپنے ہمشکلوں کی تلاش میں نکلا ہوں مجھے دو ہمشکل مل گئے ہیں ایک دلاور اور ایک عالی جو خدا کرے کے آپ لوگوں کو بھی مل جائے ، اور آپ کے معاملات ہموار ہو جائیں میں نے نشاط بہن کو بہت سمجھایا ہے ان کی عزت آبرو کی حفاظت کے لیے میں نے انھیں اپنے اس کمرے میں داخل ہونے نہیں دیا بلکہ ان لوگوں سے درخواست کی ہے کہ نشاط کو اپنے پاس سلائیں تاکہ جب عالی آجائے تو کوئی غلط فہمی درمیان میں نہ آسکے میں آپ سے بالکل سچائی کے ساتھ یہ بات کہہ رہا ہوں کہ میں عالی نہیں ہوں اور دل سے دعا کرتا ہوں میری بہن نشاط اپنی منزل پا جائے۔''

شاہ زیب کا ہر لفظ ان لوگوں پر بجلی بن کر گر رہا تھا سب کے سب حیرت سے مجھے دیکھ رہے تھے یہی کیفیت کمال احمد صاحب کی بھی تھی چند لمحات وہ پتھر کے بت بنے بیٹھے رہے پھر ٹھنڈی سانس لے کر بولے۔

''اگر تم سچ بول رہے ہو تو بیٹے تم فرشتے ہو ہمارے لیے خدا تمہیں اس نیکی کا اجر دے تمہاری بات دل کو لگتی ہے ایک درخواست کریں گے تم سے۔

''جی فرمائیے شاہ زیب نے کہا اور سوالیہ نظروں سے کمال صاحب کو دیکھنے لگا تھا نہ جانے کمال احمد کیا کہنا چاہتے تھے۔......؟؟

کمال احمد کے چہرے پر کشمکش کے آثار نظر آتے رہے۔ پھر انہوں نے دوسرے لوگوں کی طرف دیکھا اور آنکھیں بند کر کے گردن جھٹکنے لگے پھر بولے۔

''خدا کی قسم زندگی میں اس سے زیادہ حیرت ناک بات اور کوئی نہیں ہو سکتی، سرمو تو فرق نہیں ہے، لیکن جہاں تک میری زندگی کا تجربہ کام کرتا ہے یہ سچ بول رہا ہے، واقعی سچ بول رہا ہے۔ اور لازمی امر ہے کہ کسی بہت ہی اونچے گھرانے سے تعلق رکھتا ہے نیک اور دیندار گھرانے سے ورنہ اس دور کے نوجوان جس قدر بگڑے ہوئے ہیں اس کا اندازہ ہی لگانا مشکل ہے، خیر نوجوان شاہ زیب، ہم انسان تمہاری اس انسانیت کا کیا صلہ دے سکتے ہیں، درحقیقت تم نے ہمیں ایک ایسے المیے سے بچالیا ہے جو شاید ہماری زندگی ہی لے جاتا، کیا نہیں کر سکتے تھے تم یہاں اس گھر میں، تم نے میری بچی کو زندہ درگور ہونے سے بچالیا، تم اگر چاہتے تو یہاں کی دولت پر ہاتھ صاف کر سکتے تھے، لیکن ثابت ہوا ہے یہ کہ اچھا خون ہی اچھا ہوتا ہے، خداوند عالم تمہیں اس کا بھرپور صلہ دے۔''

''آپ لوگوں کو اس بات پر یقین آ گیا ہے اب میرا یہاں رکنا کیا معنی رکھتا ہے جس انداز میں یہاں تک پہنچا تھا وہ بڑا سنسنی خیز تھا میرے لیے، لیکن جس طرح یہ لوگ میری طرف سے الجھن کا شکار ہو گئے تو میرا دل چاہا کہ ان کی الجھن

دور کروں اور خدا کا شکر ہے کہ میں کامیاب ہو گیا۔"
"نہیں۔" اچانک ہی بزرگ خاتون رو پڑیں۔ "ابھی نہ جاؤ بیٹے۔ ایسے نہ جاؤ، تمہارا احسان ہوگا ہم پر بڑے غم زدہ ہیں ہم لوگ، خوشیاں آتی ہیں اس طرح چلی جاتی ہیں کہ انسان ہاتھ ملتا رہ جاتا ہے، تھوڑا وقت اور گزارو ہمارے ساتھ تھوڑا وقت اور گزارو۔"
شاہ زیب نے گردن جھکالی کیا کہتا وہ ان لوگوں سے، لیکن اس دن کے بعد سے اس کے ساتھ جو سلوک کیا وہ بڑا وی آئی پی تھا، ہر شخص اس سے پیار سے ملتا اور بات کرتا، شاہ زیب کو بہت اچھا اس وقت لگا جب ایک دن نشاط اس کے کمرے میں آ گئی۔
"میں آپ کو بھائی نہیں کہہ سکتی کیوں کہ آپ میرے شوہر کے ہمشکل ہیں، لیکن میرے دل میں آپ کے لیے جو مقام پیدا ہو گیا ہے، وہ گمنام سا ہے، میرے لیے دعا کریں کہ عالی واپس آجائیں، ان کے دل سے غلط فہمی دور ہو جائے خدا کرے وہ زندہ ہوں۔"
"ٹھیک ہے، میں پیر ہوں نہ درویش، لیکن دلوں میں جو عقیدے ہوتے ہیں وہ انسان کے بڑے کام آتے ہیں، میں دعا کرتا ہوں نشاط کہ عالی واپس آجائیں اور آپ کے اور ان کے درمیان سارے جھگڑے دور ہو جائیں۔" شاہ زیب نے خوش دلی سے کہا، لیکن اب وہ الجھن کا شکار ہو گیا تھا۔
وہ اس خاندان میں رہنے کے لیے یہاں تک نہیں آیا تھا، وسیع و عریض شہر تھا، زندگی کی ہر شے سے آراستہ، پر رونق سڑکیں، پر رونق بازار، بلند و بالا عمارتیں، سمندر کے ساتھ ساحل، کیا نہیں تھا اس شہر میں، زندگی بھی تو رواں دواں تھی، سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اب کیا کیا جائے۔ سات ہمشکلوں کی تلاش، ایک شاہ زیب، ایک دلاور اور تیسرا عالی، چوتھے کہاں ہیں بڑے بھائی، اب یہ تو یقین ہو گیا ہے کہ دادی اماں کا کہنا بالکل ٹھیک ہے، بلکہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ ہمشکل سات سے بھی زیادہ نکل آئیں، لیکن اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اب انہیں کہاں تلاش کیا جائے۔
دوسری بات وہ یہ سوچتا کہ "ڈاکٹر سلیمان بھائی کہ آپ کو منہ کی کھانی پڑے گی، اندر سے تو میں اپنے آپ کو بڑا تندرست و توانا محسوس کر رہا ہوں، بلکہ دل چاہتا ہے کہ دیواروں کو پکڑ کر پیٹنا شروع کر دوں، کبھی کبھی تو واقعی ایسی ہی کیفیت ہو جاتی ہے لیکن یہاں سے نکلنا چاہیے یہاں میری تلاش محدود ہو گئی ہے۔" بہر طور یہ ساری باتیں تھیں، پھر شاہ زیب نے کمال احمد صاحب سے کہا۔
"میں اب یہاں سے جانا چاہتا ہوں، آپ یقین کریں میری عزت نفس مجروح ہو رہی ہے، میں محسوس کر رہا ہوں کہ ایک چہرے کا فائدہ اٹھا کر میں پورے خاندان کے ساتھ غلط طریقہ کار اختیار کیے ہوئے ہوں۔"
"کیسی باتیں کرتے ہو بیٹے، کیسی باتیں کرتے ہو، تم ہمارے لیے بہت بڑی حیثیت رکھتے ہو۔"
"پھر بھی جناب۔" میں نے کہا تو جمال الدین اسی وقت بول اٹھے۔
"ہمیں اپنے بارے میں اور کچھ نہیں بتاؤ گے؟"
"مختصر بتا چکا ہوں، ایک اچھے خاندان سے تعلق ہے، دادی اماں نے ایک بار کہا کہ ہر انسان کے سات ہمشکل ہوتے ہیں بس میرا دل چاہا کہ میں اپنے ہمشکلوں کو تلاش کروں۔ آپ یقین کریں مجھے میرے دو ہمشکل مل گئے۔ عالی صاحب مجھے ملے نہیں ہیں، لیکن جس طرح آپ لوگوں نے مجھے عالی کا مقام دیا اور جیسے میں نے ان کی تصویر دیکھی تو بڑا مطمئن ہوا ہوں کہ مجھے اپنا تیسرا ہمشکل مل گیا، اب چھوتھے کی تلاش ہے۔"
"بڑا عجیب کام ہے بیٹے، ویسے ایک بات کہوں خود کو عملی زندگی میں لاؤ چھوڑو ان فضولیات کو۔" "ہاں کیوں نہیں، بس تھوڑا سا وقت میں نے اپنے لیے مخصوص کیا ہے، اس کے بعد کچھ نہ کچھ کروں گا۔"
"تو جانا چاہتے ہو؟"
"جی۔"

''ٹھیک ہے جیسا تم مناسب سمجھو'' جمال الدین شیخ صاحب نے کہا اور میں وہاں سے نکلنے کے لیے تیار ہو گیا۔ دل میں سوچا تھا کہ ابھی اسی شہر میں آوارہ گردی کروں گا اور اس کے بعد یہاں سے باہر جانے کے بارے میں سوچوں گا ،انہوں نے جاتے ہوئے شاہ زیب کو خاصی رقم دی۔ اس نے بہت انکار کیا اور کہا کہ یہی تو دکھ کی بات ہے کہ زندگی ناموافق حالات میں گزرے تو جمال الدین شیخ نے کہا۔

''یہ لے جاؤ بیٹے ،ہمیں خوشی دے دو، ظاہر ہے تھوڑے دن یہ تمہارا ساتھ دیں گے ،تم دوبارہ کون سا ہم سے مانگنے کے لیے آؤ گے ،لے جاؤ پلیز لے جاؤ۔''

شاہ زیب نے وہ رقم رکھ لی، واقعی اس کی ضرورت بھی تھی، وہاں سے اس طرح یہاں کر کیا کرتا کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی تھا ،چنانچہ وہ وہاں سے نکل پڑا، سب سے پہلے سوچا کہ اپنے لیے کوئی ٹھکانہ کرنا ضروری ہے دل میں خیال آیا کہ رقم تو اب بھی اتنی تھی کہ اگر کسی فائیو اسٹار ہوٹل میں بھی وقت گزارتا تو مہینہ پندرہ دن آرام سے گزر جاتے کیوں نہ زندگی کا تھوڑا سا لطف لیا جائے، چنانچہ شاہ زیب نے ایک چھوٹا سا سوٹ کیس جو اس نے تیار کر لیا تھا لے کر ایک بہت ہی خوبصورت ہوٹل کا رخ کیا۔

ہوٹل فائیو اسٹار تو نہیں تھا ،لیکن فور اسٹار ضرور تھا۔ شاہ زیب نے اس میں ایک کمرہ حاصل کیا جو تیسری منزل پر تھا اور اس میں فروکش ہو گیا ،اس دن پہلی بار رات کو بستر پر لیٹ کر اس نے اپنے ماضی پر غور کیا۔

''گھر والوں کو چھوڑ آیا تھا۔ سارے کے سارے مجھ سے محبت کرتے تھے ،دادی اماں خاص طور سے مجھے چاہتی تھیں دونوں بھائی بھی بڑا پیار کرتے تھے ،بھابیاں ،سارا سب کچھ ،کیا میں حماقت نہیں کر رہا ہوں ،کیا بلاوجہ دربدر مارے مارے پھرنے سے بہتر نہیں ہے کہ میں اپنے گھر جاؤں گا تو میرے بھائی اور ڈاکٹر سلیمان مجھے بدستور کینسر کا مرض قرار دیں گے اور میرا علاج شروع کر دیں گے۔ سب سے برے غصے والی بات ڈاکٹر سلیمان پر تھی کہ انہوں نے میری زندگی کا وقت متعین کر دیا تھا جب کہ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے مجھے بالکل یہ محسوس نہیں ہو رہا تھا کہ میری زندگی اس قدر مختصر ہے۔''

اس کے علاوہ شاہ زیب کو مجری بھی یاد آئی۔ شاہ زیب کو اس سے عشق نہیں تھا لیکن جس طرح کی لڑکی تھی اور جیسے اس نے شاہ زیب کی پذیرائی کی تھی اس نے اس کے دل میں تھوڑا سا گداز ضرور پیدا کر لیا تھا، وہ اس سے وعدہ کر کے آیا تھا، لیکن جانتا تھا کہ یہ ایک جھوٹا وعدہ ہے ،کون زندگی کے ان لوازیات سے گزرنے کے بعد کسی ایسی جگہ پہنچ کر لڑکی کے قدموں میں اپنے آپ کو ڈال سکتا ہے۔ انہی سوچوں میں نیند آ گئی تھی۔ اور شاہ زیب گہری نیند سو گیا تھا۔

اب یہ بالکل نہیں پتا تھا کہ یہ گہری نیند کس نوعیت کی حامل ہے ،صبح ہوئی تو اجالا ایک روشن دان سے باہر آ رہا تھا ،لیکن ہوش و حواس مکمل طور پر قائم تھے۔ اسے یہ اندازہ ہو گیا کہ ہوٹل کا وہ کمرہ نہیں ہے جہاں میں سویا تھا اور اس احساس نے اس کے بدن میں چنگاریاں بھر دیں ،یہ کیا ہوا ،کوئی خواب ،کوئی انوکھا واقعہ ،کیا ہے یہ سب کچھ۔ شاہ زیب برق رفتاری سے اچھل کر بیٹھ گیا ،بلاشبہ یہ وہ کمرہ نہیں تھا بلکہ ہوٹل کے کمرے ہی کی طرح ایک اور شاندار بیڈ روم تھا ،جس میں قیمتی ترین فرنیچر اور پردے وغیرہ لٹکے ہوئے تھے ،میرے خدا کیا یہ داستان الف لیلیٰ شروع ہو گئی جس میں ابوالحسن نامی نوجوان کو شاہی محل میں جاگنا پڑا تھا۔''

بستر پر پاؤں لٹکا کر لیٹ گیا اور گزرے ہوئے واقعات کو یاد کرنے لگا ،سب کچھ ٹھیک تھا کوئی بات جو سمجھ میں آ رہی ہو ،اچانک ہی بازو میں ہلکی سی چبھن کا احساس ہوا اور شاہ زیب نے اس پر ہاتھ رکھ دیا ،ایک لمحے میں پتا چل گیا کہ یہ چبھن کسی انجکشن کی سوئی کی ہے ،اوہ میرے خدا ،گویا کوئی بڑا گھپلا ہو گیا اس نے انگلی سے اس کے انجکشن کے اس نشان کو سہلایا اور ادھر ادھر دیکھنے لگا ،پھر اپنی جگہ سے اٹھ کر ٹوائلٹ کی جانب بڑھ گیا۔ منہ ہاتھ وغیرہ دھو کر اپنے آپ کو سنوارا، باہر نکلا تو ایک حیرت سے اس کی منتظر تھی ،لیکن بے حد خوبصورت حیرت ،غالباً کسی سفید فام ملک سے تعلق رکھتی تھی یا اگر فارنر نہیں تھی تو فارنر جیسی تھی ،شاہ زیب چونک کر اسے دیکھنے لگا تو وہ مسکرا دی ،مسکراہٹ بھی بڑی دلکش تھی ،بال اخروٹی رنگ کے اور بڑے حسین لگ رہے تھے اس کے چہرے پر مسکراتی نگاہوں سے شاہ زیب کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''ہیلو۔''

اس کے منہ سے کوئی آواز نہ نکلی تو وہ آہستہ سے بولی کہ میرا خیال تھا تم مجھے دیکھ کر چونکو گے مسٹر ڈیزل، لیکن میں جانتی ہوں کہ تم انتہائی طاقتور اعصاب کے مالک ہو، ڈیزل کسی معمولی شخصیت کا نام نہیں ہے اس وقت اپنے سامنے دنیا کی عظیم ترین شخصیت کو پا رہی ہوں جس نے مجھے کئی ملکوں کو اپنی انگلیوں پر نچا رکھا ہے۔''

''میڈم میں بالکل بے ہوش ہونے کے موڈ میں نہیں ہوں، آپ براہ کرم ایسی کوشش نہ کیجئے گا، ڈیزل ارے باپ رے، میرے پورے خاندان میں ڈیزل نامی شخص پیدا نہیں ہوا، آپ کی شخصیت ایسی ہے کہ آپ کو عزت واحترام دیا جائے لیکن جو کچھ کر رہی ہیں آپ وہ میری سمجھ سے باہر ہے۔''

لڑکی کے چہرے پر افسردگی کے آثار نظر آنے لگے، اس نے ہمدردانہ نگاہوں سے شاہ زیب کو دیکھا اور بولی۔''ہاں مجھے اس بات کا علم بھی ہو چکا ہے میری زندگی، لیکن کوآن لی، بلکہ یہ کہنا چاہیے سرجن کوآن لی نے آپ کے لیے جو کچھ کیا ہے وہ بھی دنیا کا بہترین عجوبہ ہے؟''

''ماشاءاللہ ماشاءاللہ سرجن کوآن لی، کہاں سے تعلق ہے ان کا؟''

''جاپانی ہیں۔''

''یقیناً ہوگا یقیناً ہوگا اور آپ کا تعلق کہاں سے ہے؟''

میری ماں ترکی نژاد تھی اور والد کا تعلق پیرس سے میرا مطلب ہے فرانس سے تھا۔''

''اور یہ مسٹر کوآن لی۔''

''میرے استاد محترم اور صحیح بات تو یہ ہے کہ ایف آراد کے روح رواں۔''

''ایف آراد، یہ کیا چیز ہے؟''

''ڈیزل، اپنے ذہن پر زور مت دو، مسٹر کوآن لی بھی یہیں پاکستان میں موجود ہیں، بلکہ انہوں نے ہی تمہارا سراغ لگایا ہے۔''

ارے باپ رے، ارے باپ رے، کوئی بہت بڑی غلط فہمی ہو رہی ہے آپ کو، مگر ایک بات بتایئے یہ آپ مجھے کہاں لے آئی ہیں؟''

''تمہارے بارے میں ہمیں خبریں جگہ جگہ سے ملتی رہی ہیں، کچھ عرصے پہلے تم ایران میں تھے، ایران میں جب ہمارے میرا مطلب ہے ایف آراد کے نمائندے تمہاری تلاش میں پہنچے تو تم وہاں سے فرار ہو گئے دوبارہ تمہیں ملائیشیا میں دیکھا گیا، ہم نے وہاں بھی تمہیں حاصل کرنے کی کوشش کی لیکن تم ہاتھ نہیں آئے، اب مسٹر کوآن لی کو اطلاع ملی کہ تم پاکستان میں ہو تو اب ہم لوگ یہاں پہنچ گئے اور پورے شہر میں تمہیں تلاش کرتے پھرے کیوں کہ ہمیں اسی شہر میں تمہاری موجودگی کا علم ہوا تھا اور تھینکس گاڈ کہ تم ہمیں ایک ہوٹل میں نظر آ گئے، تمہارا تعاقب کیا گیا تھا بس پھر اس کے بعد اس ہوٹل میں تمہیں بے ہوش کیا گیا اور ہم تمہیں یہاں لے آئے۔''

شاہ زیب یہ تمام باتیں سن رہا تھا لیکن پھر اچانک اسکے ذہن پر بچھو نے ڈنک مارا، ڈیزل، ڈیزل، ڈیزل گویا میرا چوتھا ہمشکل جس کے دھوکے میں یہ مجھے یہاں لے آئے ہیں، ارے واہ، ارے میری جان زندہ رہو، بڑی تیزی سے مراحل طے ہو رہے ہیں۔ یہ تو واہ واہ واہ، سو فیصدی سو فیصدی، اور اس بار اچانک ہی اس نے اپنے دل میں فیصلہ کیا کہ اسے ڈیزل بن جانا چاہیے خواہ مخواہ ہر ایک سے اپنی تردید کرتا رہتا ہوں کہ میں فلاں نہیں، فلاں نہیں، فلاں نہیں ہوں اور ہمشکلوں کو روتا پھرتا ہوں، اس بار ان لوگوں کی بات ہی کیوں نہ مان لی جائے۔'' شاہ زیب نے لڑکی کی طرف دیکھا تو وہ بولی۔

''ہاں مسٹر کوآن لی ہی نے تمہارے پہلے آپریشن کیے تھے، ہوائی حادثے میں آپ کا سر ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا تھا مسٹر کوآن لی نے تم پر اپنی پوری مہارت صرف کر دی تھی اور یہ تو تم جانتے ہی ہو کہ وہ دنیا کے ماہر ترین سرجن ہیں، حکومت جاپان

ان کی پوجا کرتی ہے، لیکن بعد میں یہ پتا چلا کہ تمہارا ذہنی توازن تھوڑا سا خراب ہے اور تم مکمل طور پر ریکور نہیں کر پائے، مسٹر کوآن لی تمہارے لیے کچھ اور بھی کرنا چاہتے تھے، لیکن اس کے بعد تم فرار ہو گئے، اور اس کے بعد ہم نے پتا نہیں کہاں کہاں تمہیں تلاش کرتے پھر رہے تھے اور ایک بار پھر میں خدا کا شکر ادا کروں گی کہ تم ہمیں مل گئے۔''

صورتحال شاہ زیب کی سمجھ میں آ گئی تھی، چوتھا ہمشکل ڈیزل، اور یہ ڈیزل کوئی بہت ہی توپ چیز تھی، شاہ زیب نے دل میں یہ فیصلہ کیا تھا کہ اس بار کچھ عرصے کے لیے ڈیزل بن کر دیکھ ہی لیا جائے، یہ فیصلہ اسکے ذہن میں منجمد ہو گیا اور اس نے دل میں سوچا کہ اب اسے ڈیزل ہی بن جانا چاہیے، اس کے لیے اداکاری ضروری تھی، چنانچہ شاہ زیب نے کھوئے کھوئے انداز میں اسے دیکھا اور پھر بولا۔

''تمہاری شکل تمہاری شکل مجھے جانی پہچانی لگ رہی ہے لیکن کوششوں کے باوجود مجھے تمہارا نام یاد نہیں آ رہا ہے۔''

لڑکی ایک دم خوش ہو کر شاہ زیب کے قریب آ گئی۔ ''ایمل ہوں میں ایمل براؤن۔''

''ہاں ہاں کوآن لی کا نام بھی ذہن میں آ رہا ہے اور ایمل براؤن، ایمل براؤن۔''

''اوہ مائی ڈیئر میری زندگی، میرے پیار۔'' ایمل براؤن بے قابو ہو گئی اور اس نے ایک لمحے میں شاہ زیب پر چھاپا مار کر اس پر قابو پالیا۔

یہ افتاد شاہ زیب کے لیے نئی تھی، لیکن بہر حال بے وقوف نہیں تھا وہ، ایمل براؤن کو اس نے جہاں تک ممکن ہو سکا سنبھالا، اس میں اسے بڑی مشکل پیش آئی تھی، لیکن اس نے یہ طے کر لیا تھا کہ اس شخص کو ضرور تلاش کرے گا جس کا نام ڈیزل ہے اور خود ایک عرصے کے لیے ڈیزل بن جائے گا مسٹر کوآن لی بھی اس سے ملے، زبردست شخصیت کا مالک تھا یہ شخص، انتہائی اعلیٰ درجے کا سرجن۔

پتہ یہ چلا کہ ڈیزل ایف آر او نامی تنظیم جرائم پیشہ تنظیم کا انتہائی خطرناک ترین شخص تھا اور ایک حادثے میں اس کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے تھے، لیکن سرجن کوآن لی نے انہیں نئی زندگی دی البتہ یہ پتہ چلا کہ ڈیزل کا ذہنی توازن تھوڑا سا خراب ہے اور وہ اپنے آپ کو پہچان نہیں سکا۔ ان لوگوں کو امید تھی کہ ڈیزل بہت جلد اپنی اصلی حیثیت میں واپس آ جائے گا لیکن وہ ان کے چنگل سے فرار ہو گیا۔ تاہم شاہ زیب نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ جب تک ممکنات میں سے ہو وہ ڈیزل بنا رہے اور واقعی اس بار اسے لطف ہی آ گیا تھا۔

ایمل براؤن اس کے ساتھ سائے کی طرح چپکی ہوئی تھی اور اس سائے نے شاہ زیب کو بہت سی اجنبی لذتوں سے روشناس کرا دیا تھا۔ شاہ زیب کو اپنی شخصیت کے اس ہلکے پن کا احساس تھا لیکن بس وہ بھی انسان ہی تھا۔ کہاں تک اپنے آپ کو سنبھالے رکھتا، پھر اس کے بعد مسٹر کوآن لی اسے جاپان لے گئے، جاپان آ کر پتہ چلا کہ شیلوزان نامی ایک گروہ سے ایف آر او کی زبردست دشمنی چل رہی ہے، ایک دوسرے کے ممبر قتل ہوتے رہتے ہیں اور ایک دوسرے کی تاک میں رہتے ہیں، یہ بالکل نئی دنیا تھی، شاہ زیب کو اس میں لطف آنے لگا۔

وہ ایسے ماحول سے دوچار ہو گیا جس کا اس کے فرشتوں کو بھی علم نہیں تھا۔ لیکن انسانی فطرت اسی کا نام ہے، جرائم پیشہ افراد کے ساتھ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کا مزاج نہیں ملتا تھا لیکن زندگی سے واقفیت بھی کمال کی چیز تھی، اسے ایف آر او کے پروگراموں کے بارے میں اطلاع ملتی رہی اور یہ بھی پتا چلتا رہا کہ خود ڈیزل کا جرم کی زندگی میں کیا مقام تھا، جب وہ اس کے بارے میں سوچتا اور اپنی شخصیت پر غور کرتا تو اس کے پیٹ میں قہقہے مچل اٹھتے، کینسر کا ایک مریض جسے ڈاکٹر سلیمان نے صرف چھ ماہ کی زندگی دی تھی ایک انتہائی خطرناک مجرم کی حیثیت سے لوگوں کے لیے سر درد بنا ہوا تھا اور اس دردسری میں بہت سے ایسے ہنگامے آئے جنہوں نے اسے موت کے قریب سے گزرا، لیکن یہ بھی ایک دلچسپ عمل تھا، خاص طور سے اس تصور کے ساتھ کہ اسے کینسر ہے اور کچھ عرصے بعد اُسے مر جانا ہے۔

وہ عرصہ ابھی ختم تو نہیں ہوا تھا، لیکن اس کے قریب قریب ہی چل رہا تھا، اب البتہ زندگی کے بہت سے ایسے مرحلے آ گئے تھے کہ وہ حیران رہ جاتا تھا، اسی ہنگامہ آرائی میں اسے ایک انتہائی خطرناک عورت پیٹریشا سے واقفیت ہوئی، پیٹریشا

بھی جرائم پیشہ گروہ کی رکن تھی اور شاید یہ گروہ شیلوزان ہی کا تھا، پیٹریشیا اس قدر خطرناک عورت تھی کہ بعض اوقات اس کے تصور ہی سے پسینہ آنے لگتا تھا، غالباً اسے اس بات کا علم تھا کہ شیلوزان کا بدترین دشمن ڈیزل ہے اور اسے ڈیزل پر کنٹرول دیا گیا تھا کہ وہ اس کی نگرانی کرے، پیٹریشیا اپنا کام بخوبی سرانجام دے رہی تھی اور شاہ زیب ایک انوکھے عمل سے دوچار تھا پھر یہ ہوا کہ پیٹریشیا اسے فرانس لے آئی ڈیزل پر اس نے پوری طرح قابو پایا ہوا تھا بقول شاہ زیب کے اور یہ شاہ زیب محسوس کر چکا تھا یہ پیٹریشیا کے چنگل سے نکلنا آسان کام نہیں ہے، البتہ اسے اس بات کی بہت خوشی تھی کہ اسی ہنگامہ آرائی میں اسے پاکستان سے نکل کر دنیا کے دوسرے ملک دیکھنے کا موقع ملا ہے اور اس کے خواب اس نے زندگی میں بیشتر دیکھے تھے، چشم تصور میں وہ ملک ملک گھوما تھا اور پیرس تو اس کے لیے خوابوں کی سرزمین تھا۔

پیٹریشیا اسے پیرس لائی تھی اور یہاں اس نے اسے بڑے شاندار علاقے میں رکھا تھا، وہ یہاں آکر بہت خوش تھا، جاپان بھی اسے پسند آیا تھا، لیکن یہاں آنے کے بعد اسے جو نئی زندگی ملی تھی وہ بڑے کمال کی تھی، بہت ہی اعلیٰ درجے کی رہائش مہیا کی گئی تھی ہر طرح کی آسانیاں دی گئی تھیں، غالباً پیٹریشیا کو یہ ہدایت کی گئی تھی کہ شیلوزان کی طرف سے کہ ڈیزل کو اپنے گروپ میں شامل کرنے کے لیے تیار کیا جائے اور پیٹریشیا اسی کے لیے کام کر رہی تھی۔

وہ پیرس آنے کے بعد کافی وقت یہاں گزارتی رہی تھی، ابھی شاہ زیب نے بہت زیادہ چیزیں نہیں دیکھی تھیں، اس کے ذہن میں پیرس کے بارے میں بہت زیادہ تصورات نہیں تھے، تعلیم کے دوران اس نے پیرس کے بارے میں جو کچھ پڑھا تھا وہ اس کے لیے بڑی دلچسپی کا حامل تھا۔ غرضیکہ وقت گزرتا رہا، پیٹریشیا نے اسے بہت سی جگہوں کی سیر کرائی اور اس کے علاوہ وہ خود بھی ایک نوجوان اور خوبصورت لڑکی تھی اور شاہ زیب کو ایمل براؤن نے بہت سی دنیاوی رازوں سے روشناس کرا دیا تھا، چنانچہ پیٹریشیا کو ایک حد تک اس نے اس لیے برداشت کیا کہ آنے والے وقت کے لیے اسے بہت کچھ کرنا تھا۔

ادھر ایمل براؤن اور کوآن لی نجانے کہاں غائب ہو گئے تھے، شروع شروع میں شاہ زیب نے انہیں بہت تلاش کیا لیکن پھر ان کا پتہ نہیں چل سکا، تاہم وہ یہ سوچ رہا تھا کہ دیکھیں کہ یہ چوتھے ہمشکل یعنی ڈیزل کا مسئلہ کب حل ہوتا ہے اور کب ان کی زندگی میں آتا ہے، فی الحال وہ ڈیزل ہی بنا ہوا تھا، پیٹریشیا کے ساتھ یہ رات بھی ایک بہت ہی خوبصورت جگہ گزری اور دوسری صبح ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد وہ کسی کام سے چلی گئی۔ شاہ زیب یہاں مقیم تھا لیکن پیرس کے مختلف علاقے دیکھنے کی آرزو اس کے دل میں مچل رہی تھی چنانچہ پیٹریشیا کے جانے کے بعد وہ تیاریاں کر کے باہر نکل آیا

باہر ایک باوردی ملازم موجود تھا شاہ زیب نے اس سے کہا ''میں باہر جانا چاہتا ہوں۔''

''کار موجود ہے جناب۔'' ملازم نے مؤدب لہجے میں کہا۔

''ٹھیک ہے گاڑی نکالو میں تیار ہوں۔'' ڈرائیور نے فوراً ہی ایک خوبصورت کار گیراج سے باہر نکال کر کھڑی کی اور اس کا پچھلا دروازہ کھول کر منتظر نگاہوں سے شاہ زیب کو دیکھنے لگا، چنانچہ شاہ زیب اس میں بیٹھ کر چل پڑا، اسے بے پناہ خوشی تھی، یہ مسئلہ تو بہت ہی آسان نکلا کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کیا ہے، ابھی پچھلے ہی دنوں انہوں نے پیرس کے نقشے کو بہت غور سے دیکھا تھا مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پیٹریشیا اسے اس طرح تنہا چھوڑ کر کہاں چلی گئی ہے، ہو سکتا ہے ڈرائیور کو اس سلسلے میں ہدایات دی جا چکی ہوں، اور ڈرائیور کم بخت شاہ زیب کو اپنی آنکھوں سے اوجھل نہ ہونے دے لیکن شاہ زیب سوچ رہا تھا کہ بہت وقت اس ہنگامہ آرائی میں گزر گیا، اب کچھ اپنے طور پر زندگی گزارنی چاہیے۔

پیرس آیا ہے تو کم از کم پیرس کو اچھے طریقے سے دیکھا جائے، اس کے ذہن میں بہت سارے تصورات تھے اس نے پیرس کے نقشے بھی دیکھے تھے چنانچہ وہ ڈرائیور کو ایفل ٹاور لے گیا، ایفل ٹاور پہنچ کر وہ نیچے اترا اور ایک دور دراز گوشے میں جا کر اس نے اندازہ لگانے کی کوشش کی کہ کیا ڈرائیور اس کی نگرانی کر رہا ہے، لیکن ڈرائیور اطمینان سے کھڑکی کی دوسری جانب رخ کیے باہر کے مناظر دیکھ رہا تھا، شاہ زیب کو سخت حیرت تھی، اسے لگا کہ کچھ اور لوگ بھی اس کی نگرانی پر

مامور ہیں، اگر ہیں تو کوئی بات نہیں دیکھا جائے گا۔

چنانچہ اس نے فوراً ہی سڑک عبور کی اور ایک گزرتی ہوئی ٹیکسی کو روک کر اس میں بیٹھ گیا۔ ٹیکسی ڈرائیور کو شاہ زیب نے آگے بڑھنے کے لیے کہا تھا اور ٹیکسی اس کے اشارے کی سمت چل پڑی، کوئی اندازہ نہیں ہو رہا تھا سخت حیرت ہو رہی تھی کہ آخر اتنی آسانی سے وہ پیٹریشا کے چنگل سے کیسے نکل آیا، حالانکہ بڑی تیز اور چالاک عورت تھی اور لمحہ لمحہ شاہ زیب سے محتاط رہی تھی، ڈیزل اس کے لیے بڑی اہمیت کا حامل تھا، لیکن تعجب ہے کہ اس وقت اس نے اتنی آسانی سے کیوں نکل جانے دیا۔

وہ بار بار پیچھے دیکھ رہا تھا، گاڑیاں تو آ جا رہی تھیں، لیکن کوئی ایسی گاڑی نہیں تھی جسے وہ یہ سمجھ لیتا کہ وہ اس کی نگرانی پر مامور ہے، اچانک ہی اسے اس ڈرائیور کا خیال آیا جس کی ٹیکسی میں وہ بیٹھ کر جا رہا تھا، اس نے سہمی ہوئی نگاہوں سے ڈرائیور کو دیکھا لیکن ڈرائیور پرسکون چہرہ لیے آگے بڑھا چلا جا رہا تھا، کافی دور دراز علاقے میں جا کر شاہ زیب نے ایک سنسان جگہ ٹیکسی رکوائی اس سے تھوڑے فاصلے پر ایک کیفے نظر آ رہا تھا اس کے قدم اس کی جانب بڑھ گئے، کیفے میں داخل ہونے کے بعد، اس نے ایک میز منتخب کی اور ویٹر کو کافی کا آرڈر دینے کے بعد کرسی کی پشت سے ٹک کر آنکھیں بند کر لیں اور اس سلسلے میں غور کرنے لگا۔

ذرا دیر کے بعد آہٹ محسوس کر کے اس نے آنکھیں کھولیں، غالباً ویٹر کافی لے آیا تھا، لیکن اس کمبخت کا لباس، اس لباس کے نچلے حصے کو دیکھ کر ہی شاہ زیب کے بدن میں تھرتھری سی دوڑ گئی اور اس کی نگاہیں آہستہ آہستہ اس کے لباس کے ساتھ اوپر اٹھتی چلی گئیں اور پھر بلندی پر جو چہرہ نظر آیا اسے دیکھ کر شاہ زیب نے پھر سے آنکھیں بند کر لیں اور اپنی کھوپڑی کو ہتھیلی سے ٹھوکنے لگا، کیا حماقت ہے یہ ویٹر تو نہیں ہے، تبھی اس کے کانوں میں آواز ابھری۔

''کیوں جناب مجھے دیکھ کر آنکھیں کیوں بند کر لیں۔'' اس آواز پر شاہ زیب نے پھر سے آنکھیں کھول دیں، واقعی یہ وہم نہیں تھا بلکہ جو کچھ تھا اس کے سامنے تھا، ہاں یہ ایمل براؤن ہی تھی، حسین ترین لڑکی جس کی دلکشی ناقابل بیان، بس کیا کہا جائے اور کیا نہ کہا جائے، دل چاہا کہ قہقہے لگانے لگے، ایک لمحے کے لیے اس کا منہ کھلا اور پھر بند ہو گیا، ادھر ایمل براؤن نے کرسی گھسیٹ لی اور بیٹھ گئی، پھر وہ سرگوشی کے انداز میں بولی۔

''یہاں کوئی خطرہ تو نہیں ہے، کیا تم ایسے لوگوں میں گھرے ہوئے جو تمہاری نگرانی کر رہے ہیں'' شاہ زیب نے کوئی جواب نہیں دیا، بس آنکھیں پھاڑے اسے گھورتا رہا، تب ایمل نے کسی قدر برا ماننے والے انداز میں کہا۔

''کیا ہو رہا ہے یہ، کیا تم مجھے دیکھ کر بدل گئے ہو کیا واقعی، کیا واقعی.....'' اس کے لہجے میں ایک افسوس بھرا انداز پیدا ہو گیا، جیسے شاہ زیب کے رویے سے اسے دلی دکھ ہوا ہو، اب شاہ زیب کے لیے سنبھلنا بہت ضروری تھا، چنانچہ وہ خاموشی سے ایمل کو گھورتا رہا، ایمل بے چین ہو کر بولی۔

''میں پوچھتی ہوں ڈیزل تمہیں کیا ہو گیا ہے؟''

''میں الجھ رہا ہوں، بہت الجھ رہا ہوں تم یقین کرو ابھی تک مجھے کبھی کبھی یہ احساس ہونے لگتا ہے کہ میں ڈیزل نہیں ہوں، بلکہ کوئی اور ہوں۔''

''اب بھی؟'' ایمل نے حیرت کا مظاہرہ کیا۔

''ہاں۔''

ایمل کے چہرے پر تشویش کے آثار پھیل گئے، پھر وہ آہستہ سے بولی ''اس کا مقصد ہے کہ کوئی الجھن رہ گئی ہے، کوئی تھوڑا سا ایسا احساس میں اپنے اس احساس کو کوئی لفظ نہیں دے سکتی، ویسے اس دوران جو گزری ہے وہ بڑی حیران کن ہے، یہ تو میں تمہیں بتا ہی چکی ہوں کہ شیلوزان میں بھی دنیا کے بہترین دماغ موجود ہیں اور وہ اس بات پر تلے ہوئے ہیں کہ الف آراو کو فیل کر دیں۔ ہم لوگوں کو یہ ایک اضافی الجھن کا سامنا کرنا پڑتا ہے، مگر، مجھے معاف کرنا ڈیزل، میں یہ محسوس کر رہی ہوں جیسے مجھے دیکھ کر تم الجھ سے گئے ہو۔''

''میں نہیں جانتا کہ تمہارے دل میں یہ خیال کیوں آتا ہے، ویسے جس طرح سے تم لوگ مجھے چھوڑ کر نکل گئے تھے ،اس نے ذرا سا مجھے الجھایا ہے۔''

''میں جانتی تھی، میں جانتی تھی، مسٹر کوآن لی بھی یہی کہتے ہیں کہ ڈیزل کو وہ تحفظ نہیں دے سکے جس کی اسے ضرورت تھی مگر وہ یہ کہتے تھے کہ ڈیزل ایسی عظیم شخصیت کا مالک ہے کہ اسے قابو میں کرنا بہت مشکل کام ہوگا۔ خیر میں اور کیا کہوں۔''

''جو کہو کہہ سکتی ہو۔''

''ہم جن حالات سے دوچار ہوئے تھے اس میں ہم زندگی میں پہلی بار پولیس کے ہاتھ میں پڑ گئے تھے اور پولیس ہم سے ہمارے بارے میں معلومات حاصل کرتی رہی تھی، نجانے کہاں سے اسے کچھ غلط سن گن مل گئی تھی، ہمارا یہ خیال تھا کہ پولیس کو مطمئن کر کے خاموشی سے نکل جائیں گے لیکن جو اطلاعات ہم کو ملی تھیں انہوں نے ہمیں خوفزدہ کر دیا اور پھر ہمیں لاک اپ توڑ کر بھاگنا پڑا۔ مسٹر کوآن لی کے ہاتھوں تین پولیس مین ہلاک ہو گئے اور اس کے بعد تمہیں اندازہ ہوگا کہ ہمیں کیسی کیسی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا۔''

شاہ زیب نے ایک گہری سانس لی اور کافی کے گھونٹ لیتا رہا ایک لمحے کے بعد ایمل براؤن نے پھر کہا۔

''اور اس کے بعد ہم تمہاری تلاش میں سرگرداں رہے، ہمیں پیرس کے ایک انتہائی گندے سے محلے میں قیام کرنا پڑا اور اس کے بعد ہم تمہاری تلاش میں مصروف رہے، ویسے مسٹر کوآن لی کو یقین تھا کہ تم اپنا تحفظ بخوبی کر سکو گے، ہمیں یہ بھی پتا چل گیا تھا کہ شیلوزان کا سب سے خطرناک آدمی ہلاک ہو گیا تھا، بہت سے لوگ جو تمہارے قبضے میں تھے ہمیں نہیں مل سکے، اچھا ایک بات بتاؤ، وہ فلم جو اس وقت تمہارے پاس موجود تھی جب تم زخمی ہوئے تھے تمہارے قبضے میں ہے یا تمہارے ہاتھ سے نکل گئی؟''

ایک لمحے کے لیے شاہ زیب کی کھوپڑی گھوم گئی تھی، کون سی فلم کیسی فلم، کوئی بات جو سمجھ میں آ رہی ہو، لیکن اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کرنا کیا چاہیے پیرس کی سیر کے لیے ان دونوں خواتین میں سے کس کا انتخاب مناسب رہے گا، پیٹریشا بھی معمولی لڑکی نہیں تھی، کسی بھی طور ایمل براؤن سے کم ذہانت کی مالک نظر نہیں آتی تھی، البتہ شاہ زیب نے ایسا محسوس کیا کہ ایمل براؤن کچھ بے چین سی ہو گئی ہے، وہ کہے بغیر رہ نہ سکی۔

''ڈیئر ڈیزل میں محسوس کر رہی ہوں کہ تم کچھ الجھ سے گئے ہو؟''

''ہاں ہے تو سہی، چلو خیر ایسی کوئی بات نہیں۔'' شاہ زیب نے گہری نگاہوں سے ایمل براؤن کا جائزہ لیا اور دل ہی دل میں پیٹریشا کو خدا حافظ کہہ دیا، لیکن اس بات کا اس نے دل میں اعتراف کیا تھا کہ پیٹریشا ایمل براؤن سے زیادہ شاطر تھی۔ اب یہ فیصلہ تو بعد میں ہی کیا جا سکتا ہے کہ آگے کیا کیا جائے، ویسے اس فلم کا نام کئی بار شاہ زیب کے علم میں آ چکا تھا، شاہ زیب کے فرشتوں کو بھی ایسی کسی فلم کا علم نہیں تھا جس کے لیے دو خطرناک گروہ آپس میں برسرپیکار ہوں اور اس فلم کو ڈیزل کی تحویل میں سمجھا جائے، بہر طور اب دو ہی باتیں تھیں، پیٹریشا شیلوزان کی ممبر تھی اور ایمل براؤن الیف آر او کی، ایمل براؤن سے فی الحال دوستی کا مطلب یہ تھا کہ شیلوزان سے باقاعدہ پنگا لیا جائے، خیر اب جو ہوگا دیکھا جائے گا ،شاہ زیب نے اس سے پوچھا۔

''اب یہ بتاؤ کہ تم اس وقت کہاں قیام کیے ہوئے ہو؟''

''ہم نے اپنے لیے ایک جگہ بنالی ہے اور مسٹر کوآن لی وہاں ایک بوڑھے آدمی کی حیثیت سے رہ رہے ہیں اور میں ان کی بیٹی کے طور پر ان کے ساتھ ہوں، پڑوسیوں سے ہمارے کوئی تعلقات نہیں ہیں اور ہونے بھی نہیں چاہیے تھے کیوں کہ ہم انتہائی سنگین حالات کا شکار ہیں۔''

''یہاں سے اٹھیں۔'' شاہ زیب نے کہا اور ایمل براؤن نے گردن ہلا دی چنانچہ دونوں وہاں سے اٹھ گئے، ایمل براؤن کے پاس ایک خوبصورت گاڑی موجود تھی گاڑی میں بیٹھ کر اس نے پیار بھری نگاہوں سے شاہ زیب کو دیکھا اور بولی۔

''کہاں چلیں؟''

''کلیسائے نارٹرڈیم۔'' شاہ زیب نے جواب دیا اور وہ تعجب سے اس کی صورت دیکھنے لگی، شاہ زیب کے ذہن میں نجانے کیا کیا خیالات گردش کر رہے تھے غرضیکہ کار چل پڑی اور تھوڑی دیر بعد یہ لوگ نارٹرڈیم پہنچ گئے، شاہ زیب نے مسکراتے ہوئے کہا۔
''نجانے کیوں مجھے ان تمام چیزوں سے بڑی دلچسپی محسوس ہوتی ہے۔''
''ہاں واقعی۔''
کافی دیر تک یہ لوگ کلیسائے نارٹرڈیم کا سفر کرتے رہے اور کچھ دیر کے بعد پرانے پیلس اور ایک بوسیدہ علاقے میں پہنچ کر ایمل براؤن نے گاڑی روک دی اور ایک چھوٹے سے خوبصورت کاٹیج کا بٹن دبایا۔ جواب میں ایک کانپتے ہوئے بوڑھے نے دروازہ کھول دیا۔ لیکن شاہ زیب کو دیکھتے ہی اس کی جسمانی توتیں بحال ہوگئیں، وہ بہت پھرتی سے دوڑ کر شاہ زیب سے لپٹ گیا تھا، ایک لمحے کے اندر شاہ زیب کو پتہ چل گیا کہ کوآن لی ہے اور میک اپ میں ہے، کوآن لی نے مسکراتے ہوئے کہا۔
''مجھے یقین تھا کہ تم ہمیں دھوکہ نہیں دو گے۔''
''کیسا دھوکہ؟''
''اس فلم کے حوالے سے تم کیا کہتے ہو؟''
''افسوس کی بات ہے کہ فلم کے بارے میں مجھے ابھی تک کچھ معلوم نہیں ہوسکا۔''
یہ لوگ ایک چھوٹے سے کمرے میں داخل ہوگئے، اس خوبصورت کاٹیج میں کئی کمرے تھے، کوآن لی شاہ زیب سے اس کی خیریت دریافت کرنے لگا، بہر حال وقت گزرتا رہا، یہاں قیام بھی کیا جاسکتا تھا، اور بہت سی باتیں بہتر انداز میں ہوسکتی تھیں، خیر وقت گزرتا رہا اور پھر دوسرے معاملات شروع ہوگئے، کوآن لی نے کہا۔ ''تم کہیں جانا چاہتے ہو تو میں تمہارے لیے بندوبست کروں۔''
''نہی مسٹر لی، یہ کہیں نہیں جائیں گے اور اگر انہوں نے جانے کی کوشش بھی کریں گے تو کیا ہم انہیں جانے دیں گے۔ کیوں مائی ڈیئر ڈیزل، کیا ں تم جانا چاہو گے؟''
''نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے، لیکن اگر آپ کو کوئی دقت ہو تو میں آپ کے اوپر بوجھ بھی نہیں بننا چاہتا۔''
''کیسی باتیں کرتے ہو، تم سے ہمیں جتنے فائدے ہوئے ہیں تم سوچ بھی نہیں سکتے، ڈیزل بہت بڑی شخصیت ہے ہمارے لیے ایف آر او کی ناک سمجھا جاتا ہے وہ۔''
''خیر جیسا آپ چاہیں۔'' شاہ زیب نے جواب دیا۔ غرضیکہ کافی دیر تک مختلف قسم کی باتیں ہوتی رہیں، ویسے شاہ زیب محسوس کر رہا تھا کہ مسٹر کوآن لی بار بار اس کا چہرہ دیکھتا رہتا تھا، اس کے بعد اس نے کہا۔
''ایک بات بتاؤ ڈیزل، یہاں پیرس میں کتنا وقت گزارنا چاہتے ہو؟''
''کوئی خاص نہیں۔''
''میرا خیال ہے ہمیں فرانس سے نکل جانا چاہیے، خاص طور پر تمہیں۔ اگر تم مناسب سمجھو تو ڈنمارک چلے جاؤ، اولبرگ میں تمہیں ہر طرح کی آسانیاں حاصل ہوں گی، کیا سمجھے، میں تمہیں وہاں بھیجنے کا بندوبست کرسکتا ہوں۔''
شاہ زیب دل ہی دل میں مسکرا اٹھا اس نے کہا ''تقدیر مجھے کہاں کہاں لے جاتی ہے مسٹر کوآن لی، یہ میں نہیں جانتا، لیکن میں آپ کو ایک بات بتادوں، میرے دل میں بہت بڑی ہی خواہش ہے کہ میں اپنے باقی چھ ہمشکل بھی تلاش کرلوں اور تقدیر مجھے بار بار اس کا موقع دے رہی ہے۔ دلاور اور اسکے بعد عالی جسے میں نے ابھی تک دیکھا نہیں اور اب ڈیزل، گویا ہم سب ملا کر چار ہوگئے، تین باقی ہیں، دادی اماں نے کبھی غلط نہیں کہا ہوگا، وہ باقی تین بھی مل ہی جائیں گے حالانکہ میں اس طرح کا انسان نہیں ہوں، لیکن پھر بھی میرے دل میں بڑی خواہش ہے کہ بقول ڈاکٹر سلیمان کے، زندگی کے بقیہ دن پورے کرنے سے پہلے میں ساتوں ہمشکل تلاش کرلوں۔'' بہر طور شاہ زیب نے ڈنمارک جانے کا فیصلہ کرلیا، کوآن لی بولا۔

میں نے کہا تھا کہ تمہیں اولبرگ میں ہر طرح کی آسانیاں حاصل ہوں گی، جس فلائٹ سے تم سفر کرو گے وہ تیج ساڑھے دس بجے اولبرگ پہنچے گی اور وہاں پر تمہیں ایک ہوٹل کا نمائندہ مل جائے گا، یہ فائیو اسٹار ہوٹل ہوگا، جس کا نام بلیو مون ہے، تم اطمنان سے اس میں قیام کرو گے، میں اور ایمل براؤن بھی کچھ وقت کے اندر اندر پہنچ جائیں گے۔ اپنے مزاج کے مطابق تم جس طرح چاہو وقت گزار سکتے ہو، لیکن اس کے باوجود اپنے تحفظ کا خیال رکھنا۔“

”کیا یہ میرے ساتھ نہیں جاسکتی؟“ شاہ زیب نے ایمل براؤن کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

”ہاں لیکن کوئی بھی انسان بے غرض نہیں ہوتا، تمہاری صلاحیتوں سے فائدہ نہ اٹھانا بھی حماقت ہے میں نے ایک ایسا کام تلاش کیا ہے جس کی ابتداء ہمیں ڈنمارک سے کرنا ہوگی اور اسی لیے میں تمہیں ڈنمارک منتقل کرنا چاہتا ہوں، لیکن کام آگے بڑھانے کے لیے ہمیں یہاں قیام کرنا پڑے گا اور ہم اپنی معلومات کی تکمیل کرنے کے بعد ڈنمارک پہنچیں گے اور وہاں سے اپنے کام کا آغاز کریں گے، مائی ڈیئر ڈیزل ایف آر او تمہاری صلاحیتوں سے ایک اور فائدہ اٹھانا چاہتا ہے اور تمہیں اس پر کوئی اعتراض نہ ہوگا۔“

”ٹھیک ہے مسٹر لی جیسا آپ پسند کریں۔“ شاہ زیب نے پراعتماد لہجے میں کہا۔

اس رات شاہ زیب کے ذہن پر بڑی سوچیں مسلط تھیں۔ دنیا میں ایسے کم ہی لوگ ہوں گے جن کا کوئی بھرا پرا گھر ہو اور اس کے بعد ان سب سے کٹ کر وہ زندگی کو خوشگوار انداز میں محسوس کریں شاہ زیب بھی ایسے ہی گھرانے کا فرد تھا، بہن بھائیوں کے درمیان زندگی گزارنے والا، بھابیاں جان دیتی ہیں اور سب سے بڑی شخصیت دادی اماں کی تھی جن کی آنکھوں کا وہ خاص طور سے تارا تھا۔ حقیقت یہ تھی کہ انسان کتنا ہی اپنے آپ کو معاملات سے الگ رکھنے کی کوشش کرے لیکن اس کی ذات سے اگر کچھ ایسی باتیں منسلک کر دی جائیں جو اس کے لیے دکھ کا باعث ہوں تو کسی بھی حقیقت کا مالک ہونے کے باوجود اس کے دل پر ایک اثر ضرور ہوتا ہے۔

شاہ زیب بھی ایسی ہی ایک شخصیت تھی، ڈاکٹر سلیمان نے اسے کینسر بتایا تھا اور اس کی عمر مختصر بتا دی تھی، ادھر دادی اماں نے ایک انوکھا شوشہ چھوڑا تھا، اگر اس کی زندگی عام زندگی ہوتی اور کوئی ایسا تصور اس سے منسلک نہ ہوتا تو شاید وہ کبھی اپنے ہمشکلوں کو تلاش کرنے کی کوششوں میں مصروف نہ ہو جاتا، لیکن اب جب یہ احساس دامن گیر ہو گیا تھا کہ زندگی مختصر ہے تو کیوں نہ اس زندگی کو اپنی مرضی سے گزارا جائے، ہمشکل ہی تلاش کیے جائیں اس کے بعد اگر واقعی موت قریب آگئی ہے تو پھر اس سے کیسے بچا جاسکتا ہے، لیکن ہمشکلوں کی تلاش کا کھیل کافی دلچسپ ہو گیا تھا۔ اسے یقین نہیں آتا تھا کہ اس سمیت اب تک تین ہمشکل سامنے آچکے ہیں، یعنی وہ خود، ولاور اور عالی اور اب یہ نیا کھیل ڈیزل کا شروع ہو گیا تھا لیکن اسے یہ بھی احساس ہو رہا تھا کہ وہ ذرا غلط قسم کے لوگوں میں پھنس گیا ہے۔

یعنی ایف آر او جو ایک جرائم پیشہ افراد کی بین الاقوامی تنظیم کا تھی اور اس تنظیم کے دو خطرناک رکن یعنی مسٹر کو آن لی اور وہ لڑکی ایمل براؤن، اس دوران شیلوزان کے نمائندے بھی اس پر مسلط ہو گئے تھے اور اسے اندازہ ہو رہا تھا کہ دونوں گروہ کافی خطرناک ہیں اور ان کے درمیان شدید جنگ چل رہی ہے۔ جس کی وجہ کوئی فلم تھی جس کا بھلا شاہ زیب کو کیا علم ہو سکتا تھا، لیکن ادھر کو آن لی یہ سمجھتا تھا کہ شاہ زیب فلم کے قریب ہے اور ادھر شیلوزان کا بھی یہی خیال تھا پیٹریشا نامی اس خطرناک لڑکی نے شاہ زیب پر کافی وقت صرف کیا تھا، شاہ زیب کو یہ اندازہ تھا کہ ان دونوں گروہوں کے ٹکراؤ میں کہیں اس پر کوئی مصیبت نہ نازل ہو جائے۔ ڈیزل کی حیثیت سے وہ بے شک حالات کو برا نہیں سمجھتا تھا، لیکن یہ ڈیزل کہیں مصیبت میں گرفتار نہ ہو جائے، چنانچہ اب جب کہ ایک بہت ہی دلچسپ اور دلکش کھیل شروع ہو گیا تھا جس کا اس نے زندگی میں تصور بھی نہیں کیا تھا یعنی کہ وہ اپنے وطن سے نکل آیا تھا اور اب اسے جگہ جگہ کی سیاحت کا موقع مل رہا تھا چاہے کیسے ہی سہی، لیکن اسے یہ سب کچھ بڑا دلکش لگ رہا تھا۔

شاہ زیب بچپن سے خواب دیکھتا تھا کہ وہ دنیا گردی کر رہا ہے۔ جگہ جگہ جا رہا ہے، اور سیر کر رہا ہے۔ لیکن اس کے خواب کو کبھی حقیقت کا درجہ ملے گا، یہ اس نے کبھی ان خواب میں بھی نہیں سوچا تھا اور اب، اب دلچسپ بات یہ ہے کہ وہ

پیرس میں تھا اور اسے آگے بڑھنے کے مواقع بھی میسر تھے۔ دل میں سوچا کہ کیوں نہ آلبرگ پہنچنے کے بعد ان لوگوں کے چکر سے نکل جائے اور اپنے طور پر دنیا دیکھے۔ ظاہر ہے سارے کاغذات وغیرہ اس کے پاس موجود تھے جس کا بندوبست انہی لوگوں نے کیا تھا لیکن اس سے آگے کا کام تو وہ خود بھی کرسکتا تھا۔ دل میں یہ فیصلہ کرنے کے بعد وہ سو گیا۔

دوسرے دن تمام معمولات سے فارغ ہونے کے بعد اسے اطلاع ملی کہ اسے آلبرگ روانہ ہونے کے لیے اب کوئی قباحت نہیں رہ گئی۔ تمام تفصیلات مسٹر کو آن لی نے سمجھا دی تھیں۔ چنانچہ تھوڑی تیاریوں کے بعد وہ آلبرگ روانہ ہوگیا۔ اسے بتا دیا گیا تھا کہ ہوٹل بلیومون کا نمائندہ اس سے آ کر ملے گا اور اس کے لیے قیام گاہ منتخب کرے گا، لیکن شاہ زیب نے یہ فیصلہ کرلیا تھا کہ اس کے چکر میں نہیں پڑے گا اور وہ اپنے اس فیصلے پر پوری طرح تیار تھا۔ چنانچہ آلبرگ پہنچنے کے بعد جب ہوٹل بلیومون کا نمائندہ اس کے پاس پہنچا اور اس نے اس سے سوال کیا کہ کیا وہ مسٹر ڈیزل ہے تو شاہ زیب نے معذرت کے انداز میں گردن ہلائی اور نمائندہ سوری کہہ کر وہاں سے آگے بڑھ گیا۔

شاہ زیب جانتا تھا کہ اگر وہ بلیومون میں قیام کرے گا تو ایف آر او کی نگاہوں میں رہے گا اور کسی بھی لمحے وہ دونوں باپ بیٹی اس پر مسلط ہوجائیں گے، ڈنمارک آتو گیا تھا، لیکن اب یہ سیاح کی حیثیت سے یہاں وقت گزارنا چاہتا تھا اور ان لمحات کا انتظار کرنا چاہتا تھا جو یا تو اسے موت کی آغوش میں پہنچا دیں یا پھر زندگی بخش دیں اور وہ آگے بڑھ کر دوسرے ملکوں کا بھی جائزہ لے۔ یہ ایک بڑا سا سوالیہ نشان تھا جس کا جواب کہیں سے بھی حاصل نہیں ہوسکتا تھا۔ چنانچہ اس نے وہاں بھی رکنے کے بجائے اپنے مخصوص انداز میں سفر شروع کردیا اور کسی پاگل بیل کی طرح ناک کی سیدھ میں دوڑ پڑا اور ناک کی اس سیدھ نے اسے اوڈنگزے پہنچا دیا۔ چند دن اوڈنگزے میں رہ کر کوپن ہیگن کے بارے میں معلومات حاصل کی، پھر اس کی دوسری منزل کوپن ہیگن ہی تھی۔ کوپن ہیگن پہنچنے کے لیے ایک بس کا سہارا لینا پڑا اور آخر کار وہ حسین شہر میں داخل ہوگیا جس کا لٹریچر اس نے کبھی جوانی میں پڑھا تھا بلکہ ایک بار ٹیلیویژن پر اس نے اس شہر کے بارے میں تفصیلات بھی دیکھی تھیں۔ عملی زندگی میں تو کبھی خواب میں بھی نہیں سوچ سکتا تھا کہ ان حسین و جمیل چہروں اور ملکوں کی سیر کرے گا اور کچھ اسے زندگی سے ملا ہو یا نہ ہو لیکن یہ ایک بہت بڑی خوبی تھی اس کی کہ تقدیر نے اسے اس جگہ پہنچا دیا تھا۔

اس کی اپنی معلومات کے مطابق کوپن ہیگن کسی زمانے میں ایک چھوٹی سی بندرگاہ تھی جس نے آخر کار ایک وسیع تجارتی مرکز کی حیثیت حاصل کرلی اور تاجروں کی بندرگاہ کہلانے لگی۔ سینٹرل اسٹیشن کے ساتھ ہی کوپن ہیگن کا صدیوں پرانا تفریحی پارک تیوالی تھا۔ تیوالی پارک کے صدر دروازے پر ڈنمارک کا پرچم لہرا رہا تھا اور اس کے نیچے مختلف کھڑکیوں کے آگے ٹکٹ خریدنے والوں کے ہجوم لگے ہوئے تھے۔ تیوالی پارک کے بارے میں بھی اس نے اسی پروگرام میں دیکھا تھا چنانچہ اس وقت اسے اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھ کر اسے بڑا عجیب سا محسوس ہوا۔

ٹکٹ خرید کر وہ باغ میں داخل ہوگیا اور تقریباً باقی وقت اس نے باغ میں ہی گزارا، رات کے ڈیڑھ بجے وہ تیوالی سے باہر آیا اور ٹاؤن ہال کے پہلو میں جانے والی سڑک اسٹروگیٹ پر چل پڑا۔ یہ سڑک کوپن ہیگن میں خرید و فروخت کا سب سے بڑا مرکز ہے اور صرف پیدل چلنے والوں کے لیے مخصوص ہے۔ اتنی رات ہونے کے باوجود یہاں خوب رونق تھی، نائٹ کلبوں میں ہونے والی خوفناک وارداتوں کی تصاویر آویزاں تھیں۔ جنہیں دیکھ کر آنکھیں شرم سے جھک جاتی تھیں وہ رکے بغیر آگے بڑھتا رہا، اندازہ یہ ہو رہا تھا کہ یورپ کے دوسرے ملکوں کی نسبت یہاں خاص طور سے اخلاقی قدروں کا کوئی گزر نہیں ہے۔ ہوٹلوں اور نائٹ کلبوں کے سامنے تماشائیوں کے ہجوم تھے اور وہ ان بے ہودگیوں میں بہت زیادہ دلچسپی کا مظاہرہ کر رہے تھے ان میں زیادہ تر غیر ملکی تماشائی تھے کیوں کہ ملکی لوگ تو ان تمام چیزوں کے مستقل طور پر عادی ہوچکے تھے۔ ایک بک اسٹال کے قریب شاہ زیب نے ایک دبلی پتلی جسامت اور لمبے قد کے مالک شخص کو دیکھا جس کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں اور مخصوص خدوخال اسے جاپانی نسل کا کوئی باشندہ ظاہر کرتے تھے۔ باریک سی چونچ نما ڈاڑھی اور ایک باریک مونچھوں کے ساتھ اس کا چہرہ حماقتوں کا گہوارہ نظر آرتا تھا۔

وہ اس طرح شرما رہا تھا جیسے کسی نئی نویلی دلہن کو لا کر بازار میں کھڑا کردیا گیا ہو، اس کے سامنے کھڑی پینتالیس سالہ سیلز

گرل اسے دلچسپ نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ اس منظر نے شاہ زیب کی توجہ اپنی جانب مبذول کر لی، اور وہ تفریحی انداز میں آگے بڑھ کر ان کے قریب پہنچ گیا۔ جاپانی شخص کو شاید اس کی قربت کا احساس ہوا اس نے پلٹ کر شاہ زیب کو دیکھا اور جھینپے ہوئے انداز میں واپسی کے لیے مڑ گیا۔ نجانے کیوں شاہ زیب کو اس شخص میں دلچسپی محسوس ہوئی تھی، شاہ زیب نے آگے بڑھ کر اس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''اس میں شرمانے کی تو کوئی بات نہیں ہے۔'' یہ جملہ تو شاہ زیب نے انگریزی زبان میں ادا کیا تھا، وہ شخص جھینپے ہوئے انداز میں ہنسنے لگا پھر بولا۔

''یہ سب کچھ، یہ سب کچھ کتنا عجیب ہے کتنا عجیب۔''

''مگر جاپان کے بارے میں بھی یہی سنا ہے کہ وہاں یہ سب کچھ اجنبی نہیں ہے۔''

''ممکن ہے، لیکن میں کبھی جاپان نہیں گیا۔''

''کیا مطلب؟''

''میں کوریا کا باشندہ ہوں میرا نام سیزارد ہے ایڈمنڈ سیزارد، البتہ میری ماں جرمن تھی۔ کورین باشندے نے میری ماں کے ساتھ شادی کر کے مجھے جنم دیا اور میری شناخت ہی گم ہو گئی۔''

کچھ ایسا عجیب سا لہجہ تھا اس شخص کا کہ شاہ زیب کو اس سے کافی دلچسپی محسوس ہوئی۔ ''مسٹر سیزارد'' شاہ زیب بولا تو اس نے جلدی سے کہا۔

''میں یہ سب کچھ تنہا نہیں دیکھ سکتا مجھے بڑا عجیب لگتا ہے۔''

میں جانتا ہوں اس لیے کہ تمہاری رگوں میں تھوڑا سا ایشیائی خون موجود ہے۔''

''تھوڑا بہت کیوں، اچھا خاصا کہو، مگر تم نے اپنا نام نہیں بتایا دوست۔''

''تعلق میرا بھی ایشیا ہی سے ہے، لیکن پہلے تم مجھے ایک بات بتا دو۔''

''آؤ کہیں بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں اب تو رات بھی اپنے ڈھلان پر ہے۔'' اس نے کہا اور شاہ زیب نے مسکراتے ہوئے گردن ہلا دی۔

''ٹھیک ہے آؤ، ویسے میرا نام شاہ زیب ہے تم مجھے شاہو کہہ سکتے ہو مسٹر سیزارد۔'' شاہ زیب اسے ساتھ لیے ہوئے ایک چھوٹے سے ریسٹوران میں جا بیٹھا، سیزارد نے کافی طلب کر لی تھی، پھر وہ ہنستے ہوئے بولا۔

''یہاں کے نائٹ کلب مائی گاڈ کیا تم نے باہر لگی تصویریں دیکھیں؟'' ''تمہیں یہ تصویریں اچھی نہیں لگیں؟

''نہیں، میں نے یہ سب کچھ بہت کم دیکھا ہے، ویسے بھی میں ان جھگڑوں میں بہت زیادہ نہیں پڑنا چاہتا۔ میری کمپنی نے مجھے ایک خاص کام سے کوپن ہیگن بھیجا ہے، اس کی تکمیل میں کچھ وقت لگے گا، لیکن میں کوپن ہیگن کی تفریحات میں تنہا تو حصہ نہیں لے سکتا۔ ویسے کیا یہ ممکن نہیں ہو سکتا مائی ڈیئر مسٹر شاہو کہ ہم دونوں دوستی کر لیں، میں تفریحات میں گندگی کا قائل نہیں ہوں اور تم بھی ایشیائی ہو، ہمارے ساتھ اچھی دوستی رہے گی، میرے ہوٹل میں میرے پاس ڈبل روم ہے، اگر تم پسند کرو تو۔''

شاہ زیب نے فوراً ہی اس دلچسپ موقع سے فائدہ اٹھانے کا فیصلہ کر لیا اور اس کی دوستی قبول کر لی۔ سیزارد کافی دلچسپ آدمی لگتا تھا، کبھی کبھی اس کی باتوں میں گہرا فلسفہ جھلکتا تھا جس سے یہ احساس بھی ہوتا تھا کہ وہ بہت قابل آدمی ہے اور کبھی کبھی اس کے انداز میں ایسی بچکانہ معصومیت پیدا ہو جاتی کہ اس کی شخصیت مضحکہ خیز لگنے لگتی۔ البتہ یہ اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ غلط آدمی نہیں ہے۔ پھر اس وقت صبح ہونے میں کچھ ہی لمحات باقی تھے، جب شاہ زیب اس شخص کے ساتھ اس کے ہوٹل کے کمرے میں پہنچ گیا۔

ڈبل روم بہت شاندار تھا، سیزارد نے غسل خانے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا ''میں بس دو منٹ میں باہر نکل آتا ہوں، اس کے بعد تم غسل کر لینا، ویسے کیا تم نے یہاں کوئی کمرہ نہیں حاصل کیا؟''

''ابھی تک تیوالی پارک کی دلچسپیوں نے مجھے خود میں گم کر لیا تھا، میں نے یہی سوچا تھا کہ دن کی روشنی میں اپنے لیے قیام گاہ تلاش کروں گا۔''

''اوہ...... یہ تو بہت اچھا ہوا او کے۔'' اس نے کہا اور غسل خانے میں داخل ہو گیا۔

شاہ زیب نے کمرے کا جائزہ لیا اور جوتیوں اتار دیے، پھر جب سیزار و باتھ روم سے باہر آیا تو شاہ زیب خود غسل خانے میں داخل ہو گیا۔ غسل کرنے کے بعد جب شاہ زیب باہر آیا تو سیزار و روم سروس سے اپنے لیے کھانے پینے کی چیزیں منگوا چکا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد ویٹر نے وہ چیزیں لا کر لگا دیں، ہلکی پھلکی چیزیں طلب کی گئی تھیں کیوں کہ رات کو ویسے بھی خاصا کھایا پیا گیا تھا۔ اس کے بعد شاہ زیب اور سیزار و اپنے اپنے بستر پر لیٹ گئے اور نجانے شاہ زیب کو کب نیند آ گئی۔

جاگنے کے وقت کا کوئی بھی اندازہ نہیں ہو سکا تھا، لیکن جاگا تو سیزار و کمرے میں نہیں تھا۔ شاہ زیب کی نگاہیں غسل خانے کی جانب اٹھ گئیں، لیکن وہاں بھی خاموشی تھی، پھر اس نے دروازے کی طرف دیکھا، دروازہ کھلا ہوا تھا۔ نجانے کیوں شاہ زیب کے ذہن میں ایک عجیب سا خیال آیا اور اس نے پھرتی سے اپنے سامان کو دیکھا اس کے کاغذات وغیرہ اور ہر چیز جوں کی توں تھی۔ چند لمحات سوچتا رہا، پھر ہلکا پھلکا چہرہ وغیرہ دھویا، بال سنوارنے اور ہوٹل سے باہر نکل آیا۔ کوئی بات سمجھ میں نہیں آ رہی تھی، وہ پیدل ہی سڑک پر چلنے لگا، لیکن ابھی زیادہ دور نہیں گیا تھا کہ چند افراد اس کے قریب پہنچ گئے ان میں سے ایک نے شاہ زیب کی کمر میں کوئی چیز چبھوتے ہوئے کہا۔

سڑک بے شک بھری پڑی ہے، لیکن اگر سائلنسر لگے ہوئے ریوالور کی نال سے تین گولیاں نکل کر تمہارے دل میں پیوست ہو جائیں تو ظاہر ہے تم لوگوں کو یہ بتانے کے لیے زندہ نہیں رہو گے کہ تم پر گولی کس نے چلائی ہے۔ رہے ہم لوگ تو آسانی سے منتشر ہو جائیں گے اور کیوں کہ فائر کی کوئی آواز نہیں ہو گی اس لیے لوگ اس وقت ہی تمہاری طرف متوجہ ہوں گے جب تمہارا خون ابلتا ہوا بدن زمین پر تڑپ رہا ہو گا۔'' خاصی پر رعب اور گرج دار سی آواز تھی جو شخص بھی تھا اپنا لہجہ دبا دبا کر بول رہا تھا۔ شاہ زیب نے گردن گھما کر اسے دیکھا، بڑی خطرناک سی شخصیت کا بھورے چہرے والا آدمی تھا۔ شاہ زیب نے ایک لمحے تک کچھ سوچا اور پھر نجانے کیوں اس کے ذہن میں ایک اطمینان کی لہر دوڑ گئی۔

''اور اگر میں گولیوں سے بچنا چاہوں تو مجھے کیا کرنا ہو گا۔؟''

''صرف سڑک پار کرنا ہو گی لیکن خاموشی کے ساتھ۔'' اس شخص نے بھی مسکراتے ہوئے ہی اس طرح دوستانہ انداز میں جواب دیا تھا جیسے شاہ زیب کو کسی حسین لڑکی کے بارے میں بتا رہا ہو۔

شاہ زیب نے کہا واہ اتنا آسان نسخہ۔ وہ تو کوئی مشکل کام نہیں ہے۔''

چنانچہ وہ لوگ شاہ زیب کو لے کر سڑک عبور کرنے لگے، دوسری جانب ایک قیمتی کار کھڑی ہوئی تھی جس کی ڈرائیونگ سیٹ پر ایک بھاری بھرکم آدمی بیٹھا ہوا تھا، وہ لوگ جو اسے یہاں تک لے کر آئے تھے شاہ زیب کو کار میں بٹھا کر اس کے ساتھ ساتھ ہی گھس گئے۔ شاہ زیب تفریح لے رہا تھا، اب یہ لوگ اس سے کیا چاہتے تھے یہ اسے معلوم نہیں تھا۔ بہر طور پچھلی سیٹ پر چار آدمیوں کی گنجائش نہیں تھی، لیکن وہ سب کسی نہ کسی طرح بیٹھ ہی گئے تھے۔ ڈرائیور نے گاڑی اسٹارٹ کر کے آگے بڑھا دی، شاہ زیب کا موڈ کافی خوشگوار تھا اس نے گہری گہری سانسیں لیتے ہوئے کہا۔

''بھائی صاحب جب گاڑی میں اتنی جگہ نہیں تھی تو آپ لوگ مل کر کیوں بیٹھ گئے اور یہ صاحب یار تم اپنی اس موٹی سی توند کو تھوڑا سا پچکا نہیں سکتے۔'' شاہ زیب کے الفاظ مذاق اڑانے والے بے شک تھے، لیکن جس بھاری بھرکم شخص سے اس نے یہ بات کہی تھی وہ بھی خاصا دلچسپ اور فراخ دل تھا، اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''یقین کرو میں نے اپنی خوراک آدھی کر دی ہے، لیکن پتا نہیں یہ بدن کیوں پھولتا جا رہا ہے، بس تھوڑی دیر کی بات ہے۔''

''کیا بدتمیزی ہے یہ تمہارا مذاق اڑا رہا ہے اور تم......''

''چھوڑو یار چھوڑو کوئی ایسی خاص بات نہیں ہے۔''

بات ختم ہو گئی یہ سفر جتنا تکلیف دہ تھا، شاہ زیب کو اس کا اندازہ تھا۔ وہ لوگ کہاں جا رہے ہیں اور ان کا آگے کیا

منصوبہ ہے دوسری بات یہ کہ اسے اس طرح اغواء کیوں کیا گیا ہے۔ اس کے بارے میں وہ بھلا کیسے جان سکتا تھا، سڑکوں کے بارے میں بھی کوئی اندازہ نہیں ہورہا تھا کیوں کہ کوپن ہیگن کی سڑکوں سے وہ بالکل واقف نہیں تھا۔ کار کا سفر تقریباً بیس سنٹ تک جاری رہا، پھر وہ ایک خوبصورت عمارت میں داخل ہوگئی، جب کار رکی تو انہوں نے شاہ زیب کو نیچے اترنے کے لیے کہا، شاہ زیب گہری گہری سانسیں لے رہا تھا۔

''چلو آگے بڑھو۔''

''بڑھنے کی ہمت ہو تو بڑھوں تم لوگوں نے سینڈوچ بنا کر رکھ دیا ہے۔''

''آگے بڑھو۔'' دوسرے بد دماغ آدمی نے شاہ زیب کو پیچھے سے دھکا دیا اور وہ اوندھے منہ گرتے گرتے بچا۔ وہ جس کمرے میں پہنچایا گیا اسے دیکھ کر شاہ زیب کی آنکھیں غصے سے سرخ ہوگئیں، یہ سیزارو تھا جو ایک کرسی پر بندھا ہوا تھا اور اس کے چہرے پر مردنی چھائی ہوئی تھی، شاہ زیب کو اس پر سخت غصہ آیا۔ کمبخت کا بچہ زخموں کی طرح بک اسٹال پر لگی تصویروں کو دیکھ کر لپک نہ رہا ہوتا تو بھلا شاہ زیب اس کی جانب متوجہ ہوتا، کیا ضرورت تھی کہ اس گدھے سے دوستی گانٹھی جاتی اور اس کے ساتھ ہی قیام کرتا لیکن شاہ زیب کو نجانے کیوں اس بات کا یقین ہوگیا کہ شاہ زیب کی گرفتاری بھی اسی گدھے کی وجہ سے ہوئی ہے، قصور اس کا ہوگا اور خود شاہ زیب پھنس گیا تھا۔

''غرضیکہ شاہ زیب کو بھی ایک کرسی سے باندھ دیا گیا تھا، وہ شخص جو بدن کا بھاری تھا، ذرا اچھے مزاج کا آدمی تھا لیکن باقی سب خالص قسم کے جنگلی تھے، شاہ زیب کی کرسی شیزارو کی کرسی کے برابر ہی تھی، جب وہ شاہ زیب کو باندھ کر چلے گئے تو شاہ زیب نے غصیلے لہجے میں کہا۔

''ہوں تو یہ بات تھی۔'' سیزارو نے کوئی جواب نہیں دیا وہ خاموشی سے سامنے دیکھتا رہا۔

''ایک بات میں تمہیں بتائے دے رہا ہوں، اگر مجھ پر یہ مصیبت تمہاری وجہ سے ٹوٹی ہے تو میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گا۔''

سیزارو خاموش رہا تو شاہ زیب نے اپنے بدن کو ہلایا، لیکن جس طرح اسے باندھا گیا تھا، اس کی وجہ سے اس کے ہاتھ نہیں کھل سکتے تھے، اس نے کہا۔

''اگر میرا ہاتھ کھل جاتا تو کم از کم تیرے آگے کے دانت توڑ دیتا، الو کے پٹھے خاموش بیٹھا ہوا ہے۔ میں کہتا ہوں کچھ تو بکواس کر کیا دشمنی تھی تیری ان لوگوں سے جنھوں نے مجھے بھی تیری مصیبت میں پھنسا دیا۔''

سیزارو خاموش بیٹھا رہا، ایسا لگ رہا تھا جیسے اس کے کان ساتھ نہ دے رہے ہوں۔ حالانکہ شاہ زیب نے یہ الفاظ انگریزی میں کہے تھے تاکہ جو کچھ وہ کہہ رہا تھا وہ اس کی سمجھ میں آجائے گا، اس کی مزید خاموشی نے شاہ زیب کو اور مشتعل کر دیا۔ وہ غراتے ہوئے لہجے میں بولا۔

''کم از کم مجھے صورت حال سے تو آگاہ کر دے۔ منحوس صورت یہ تو بتا دے کہ تو ہے کون ہے، اور یہ لوگ کون ہیں جو ہمیں یہاں لائے ہیں۔'' ابھی شاہ زیب کے یہ الفاظ ختم ہی ہوئے تھے کہ دفعتاً دروازہ کھلا اور کچھ افراد اندر داخل ہوئے تھے۔ ان میں سے دو تو وہی تھے جو ذرا سخت مزاج کے تھے، لیکن تیسرا ایک نیا آدمی تھا، بالکل ہاتھی کی طرح لمبا چوڑا طاقتور نظر آرہا تھا۔ سر کے بال غائب تھے اور کھوپڑی کئی حصوں میں تقسیم تھی، شاہ زیب نے اب غور سے ان لوگوں کو دیکھا، کافی خطرناک لوگ نظر آتے تھے، ان میں سے دو کا اضافہ اور ہوگیا تھا، لیکن چانک ہی شاہ زیب نے سیزارو کے حلق سے ہلکی ہلکی آوازیں نکلتی ہوئی محسوس کیں اور چونک کر اس طرف دیکھا، سیزارو کا چہرہ خوف زدہ نظر آرہا تھا۔ آنے والے سیزارو ہی کی جانب بڑھے اور اس کی بندشیں کھولنے لگے۔

سیزارو کے چہرے پر ایک لمحے کے لیے خوشی کے آثار نظر آئے تھے، غالباً وہ سمجھا تھا کہ اس کی گلوخلاصی ہوگئی لیکن دوسرا لمحہ اس کے لیے انتہائی سنسنی خیز تھا انہوں نے اس پر حملہ کیا اور اس کا لباس تار تار کر کے اس کے بدن سے اتار دیا، بلکہ شاید لباس اتارنے کے لیے اسے کھولا گیا تھا کیوں کہ ننگا کر کے انہوں نے اسے کرسی پر دوبارہ باندھ دیا اور پھر جو کچھ ہوا

وہ بڑا سنسنی خیز تھا۔ اچانک ہی شاہ زیب کی آنکھیں بند ہوگئیں۔ حالانکہ اس ہزاروں وولٹ کے بلب کا رخ شاہ زیب کے چہرے کی جانب نہیں تھا، لیکن شاہ زیب کو یوں محسوس ہوا جیسے سورج زمین پہ اتر آیا ہو۔ چاندی جیسے چمکتے ہوئے پیالے یہ انتہائی طاقتور بلب صحرا کی دوپہر میں سورج کی مانند معلوم ہو رہا تھا، اور اس کے جلتے ہی کمرے کی فضا میں تپش پیدا ہوگئی تھی۔ روشنی کی کرنیں ریت کے ذروں کی طرح آنکھوں میں چبھ رہی تھیں اور آنکھیں بند کرنے یا کھلی رکھنے سے کوئی فرق نہیں پڑ رہا تھا۔ تب ان میں سے ایک نے آہستہ سے کہا۔

''کیا تم اب بھی اپنی زبان بند رکھو گے سیزارو؟'' جواب میں سیزارو نے ایک نہایت بدبودار گالی انہیں دی تھی اور اس کے ساتھ ہی اس نے پوری قوت سے اپنے پاؤں سے جوتا اتار کر جھٹک دیا تھا۔ پہلا جوتا تو بے مقصد رہا لیکن دوسرا جوتا اس بلب میں جا لگا اور بلب ایک چھناکے کے ساتھ جا کے ٹوٹ گیا۔ وہ لوگ روشنی سے گہری تاریکی میں آ گئے تھے، اس لیے وہ بھی چند لمحات کے لیے اندھے ہو گئے تھے لیکن چند ہی لمحوں کے بعد انہوں نے دوبارہ روشنی کر دی جو کمرے میں دوسرے بلبوں کی تھی اور اس کے بعد سیزارو کے پاؤں بھی باندھ دیے گئے۔ البتہ یہ بات الگ تھی کہ انہوں نے سیزارو کی اس حرکت کے باوجود اس کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی تھی، لیکن اب وہ اسے گھور رہے تھے۔ ادھر کچھ اور کام ہو رہا تھا کیوں کہ تھوڑی دیر کے بعد اسی طرح کا بلب لا کر پیالے میں لگا دیا گیا تھا اور اس کا رخ سیزارو کی جانب کر دیا گیا، شاہ زیب کی جان نکل گئی تھی، جو کچھ ہوا تھا اس نے شاہ زیب کو لرزا دیا تھا اس نے کہا۔

''دوستو! اگر تم مجھے اس شخص کا ساتھی سمجھتے ہو تو یہ خیال دل سے نکال دو، میں ایک غیر متعلق آدمی ہوں، بس زات میری اس سے تیوالی میں ملاقات ہوگئی تھی اور وہاں اس نے مجھے اپنے ساتھ رہنے کی دعوت دی کیوں کہ میں نے کسی ہوٹل کا انتخاب نہیں کیا تھا اس لیے میں اس کے ساتھ......'' شاہ زیب نے اتنا ہی کہا تھا کہ ان میں سے ایک آدمی نے آگے بڑھ کر شاہ زیب کے منہ پر ایک زوردار تھپڑ رسید کر دیا اور غراتے ہوئے لہجے میں بولا، دوبارہ منہ سے آواز نکلی تو تو......''

اتنی زور کا تھپڑ تھا کہ شاہ زیب کے منہ سے خون نکل آیا، شاہ زیب خاموش ہوگیا تھا وہ پھر سیزارو کی جانب متوجہ ہوگئے اور ان میں سے ایک نے کہا۔

''سیزارو تمہاری آنکھیں ہمیشہ کے لیے اپنی بینائی کھو بیٹھیں گی اور تم دوبارہ ساری زندگی اپنی بینائی نہیں پا سکو گے، یہ بلب اس وقت تک تمہاری آنکھوں کے سامنے روشن رہے گا، جب تک تم اپنی زبان نہیں کھولو گے۔''

سیزارو نے زبان کھولی اور کچھ نئی قسم کی گالیاں شاہ زیب کے علم میں آئیں جو غالباً اور جاپان کی کسی خاص اشترا کی کیفیت کا اظہار کرتی تھی، لیکن وہ لوگ گالیوں کا بالکل برا نہیں مانتے تھے اور انہیں سن کر اس طرح پرسکون رہتے تھے جیسے گالیاں ان کے کانوں کے لیے عمدہ قسم کی موسیقی کی حیثیت رکھتی ہوں، پھر وہ سیزارو سے وہی گفتگو کرنے لگے، اسی وقت شاہ زیب نے غراتے ہوئے لہجے میں کہا۔

''کتے کے بچو، اگر اردو میں گالیاں سننے کا اتنا ہی شوق ہے تو ذرا میری طرف بھی توجہ دو میں تمہیں دنیا کی کئی زبانوں میں گالیاں سنا سکتا ہوں اور اردو کی گالیاں تو بے مثال ہوتی ہیں، اور اگر ایسا نہیں کر سکتے تو میری کرسی کا رخ ہی تبدیل کر دو۔ نجانے کیوں یہ بات ان کی سمجھ میں آ گئی تھی کہ ایک کے بجائے دو اندھے ان کے لیے سودمند نہیں ہوں گے۔ چنانچہ انہوں نے از راہ کرم شاہ زیب کی کرسی کا رخ تبدیل کر دیا۔ ایک روشنی میں کمرے کی ایک ایک چیز صاف نظر آ رہی تھی اور ان کم بختوں کے بھیانک سائے دیواروں پر لرز رہے تھے۔ وہ سیزارو سے ایک ہی سوال دہراتے رہے، لیکن سیزارو نے بھی کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ اسے وارننگ دے کر وہاں سے چلے گئے، لیکن سیزارو کی اذیت کا شاہ زیب کو اچھی طرح اندازہ تھا۔ وہ تیز بلب کی روشنی میں تھا اور اب اس کے پاؤں بھی بندھے ہوئے تھے، غالباً جس کرسی پر وہ بیٹھا ہوا تھا وہ اپنی جگہ فکس تھی کیوں کہ سیزارو اس کرسی کو ہلا بھی نہیں سکا تھا۔ وہ رخ بدلنے کی کوشش کر رہا تھا، ویسے یہ تیز روشنی کے بدلے ہوئے رخ کے باوجود شاہ زیب آنکھوں کو سخت تکلیف دے رہی تھی، تھوڑی دیر بعد شاہ زیب نے کہا۔

(اس سنسنی خیز سلسلے کی تیسری کڑی ماہِ فروری میں ملاحظہ کیجیے)

”کوپن ہیگن“

انسان دوست صحافی اور بہترین شاعر ”محمود شام“ کے قلم سے

محمود شام 1940ء میں انڈیا کے شہر پٹیالہ میں پیدا ہوئے۔ تقسیم کے بعد 1947ء میں پاکستان کے شہر جھنگ میں رہائش پذیر ہوئے۔ 1962ء میں گورنمنٹ کالج جھنگ سے بیچلر کیا۔ انگریزی ادب میں ایم اے فلاسفی کی ڈگری گورنمنٹ کالج لاہور سے حاصل کی۔ متعدد اخبارات اور میگزین میں مدیر کی حیثیت سے فائز رہے۔ اُس دوران بے شمار ممالک کا سفر کیا۔

آج ہم اُن کے ایک سفر ”کوپن ہیگن“ کو آپ کی خدمت میں پیش کر رہے ہیں۔

بات بہت پرانی ہے، لیکن میرے لیے، آپ کے لیے نہیں کیونکہ آپ نے تو سُنی ہی نہیں۔

سال ہوگا 1975ء کا، راوی ہر طرح سے چین لکھ رہا تھا۔ کرنا خدا کا یہ ہوا کہ پی آئی اے نے فیصلہ کیا کہ سکینڈے نیویا بھی پروازیں جانی چاہئیں۔ سو طے ہوا کہ سبز پرچم والے طیارے کوپن ہیگن اتریں گے۔ ہم تو اسے کوپن ہیگن پڑھتے ہیں اور بولتے ہیں لیکن اس شہر میں پہنچ کر معلوم ہوا کہ وہ تو بڑے پیار سے ’کوبن ہاں‘ کہتے ہیں۔

یہ ڈنمارک کا دارالحکومت ہے۔

یہ ان دنوں کی بات ہے۔ جب پاکستانیوں کے لیے بھی کہیں ویزے کی پابندیاں نہیں تھیں۔ ہماری شہرت صرف چرس، حشیش لے جانے کی تھی۔ جہاد کا الزام ابھی نہیں لگا تھا۔ اب تو یاد نہیں پڑ رہا کہ جہاز میں کون کون ہمارے ساتھ تھے۔ اچھے دن تھے، اخباروں کے مالکان، ایڈیٹرز بھی کچھ دن نکال لیا کرتے تھے، جہاز پر بھی خوب گپ شپ رہتی تھی۔ موبائل فون تھے، نہ انٹرنیٹ نہ لیپ ٹاپ، نہ آئی پیڈ زندگی بہت سکون سے گزرتی تھی۔

کراچی سے روانہ ہونے لگے ہیں تو کئی جہاں گرد سکینڈے نیویا کے تینوں ملکوں کے حسن و عریانی کی مدح خوانی کرنے لگے۔ بتا رہے ہیں کہ وہاں تو سڑکوں کے کنارے پر ہر طرف حسن ہی حسن کی فراوانی ہے۔ ایسی ایسی کتابیں رسالے ملتے ہیں کہ دل باغ باغ ہو جائے جی عش عش کر اٹھے۔ موقع لگے تو ایک آدھ رسالہ ہمارے لیے بھی لیتے آیئے گا۔ یہاں کسٹم والوں سے بات کر لیں گے۔

ابھی مجھے یاد آ رہا ہے کہ کسٹم والے ان دنوں بہت سخت ہوتے تھے۔ پورا سامان اتھل پتھل کر دیتے تھے۔ ان دنوں وہ پاکستانی بڑے معتبر ہوتے تھے جن کی کسٹم والوں سے سلام دعا ہو۔

کوپن ہیگن واقعی بہت خوبصورت شہر ہے۔ بہت پرسکون۔

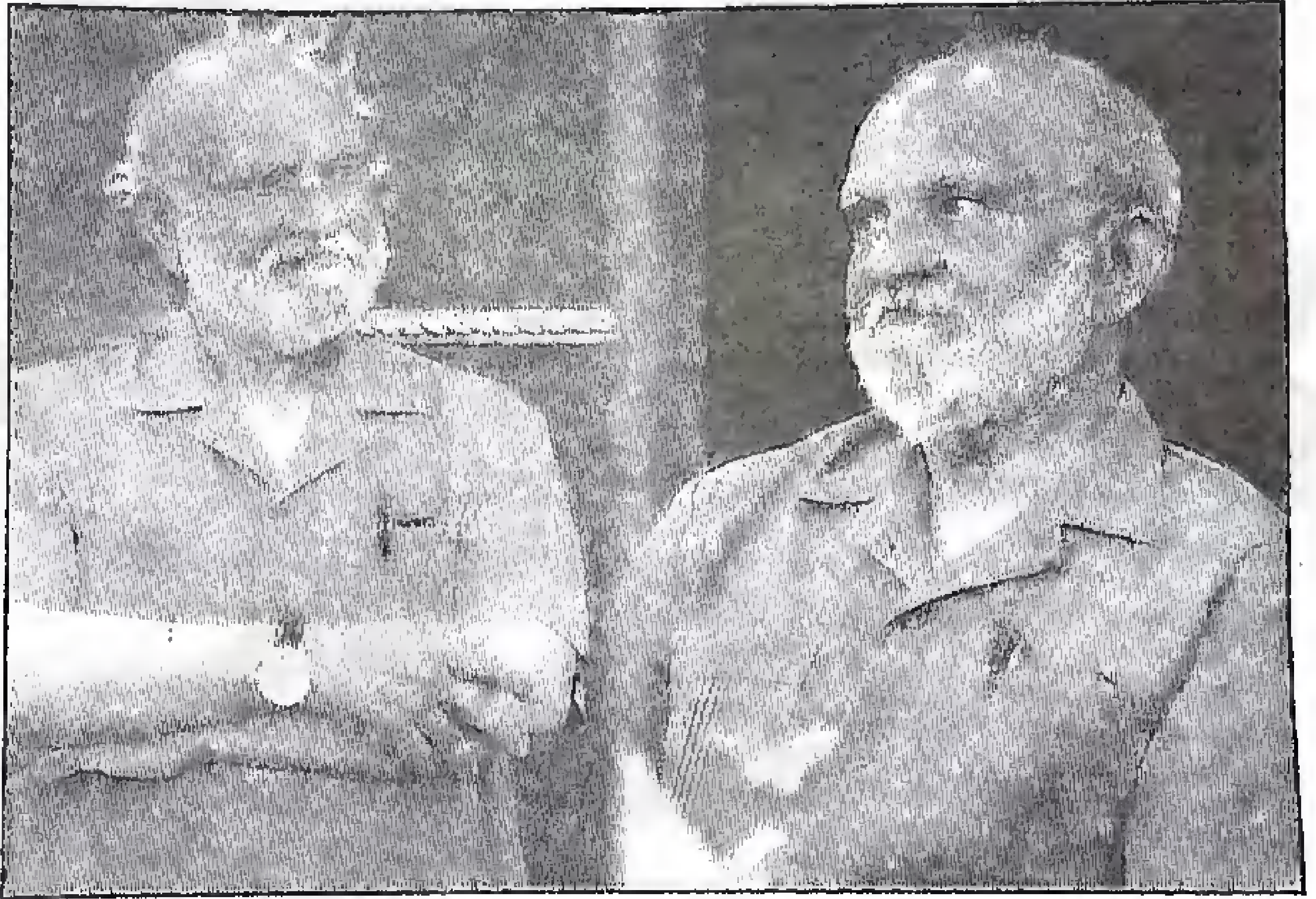
ہر شہر کی ایک نشانی ہوتی ہے۔ جیسے کراچی کی قائد اعظم کا مزار ہے۔ کوپن ہیگن کی نشانی ایک جل پری ہے۔ جس کا بہت بڑا مجسمہ سمندر کے کنارے مقامی غیر مقامی سیاحوں کی نگاہوں کا مرکز بنا رہتا ہے۔ اس مجسمے کی چھوٹی چھوٹی شبیہیں سوغات کے طور پر عام ملتی ہیں۔ بہت ہی مہارت سے تراشی ہوئی۔

نظر لبوں سے پھسل کر کہیں نہ رُک پاتی
تراش سنگ بدن ایسے زاویوں سے تھی

میں نے بھی کچھ جل پریاں خرید لی ہیں۔ دوست

تاریخ کے اوراق میں دفن ہوگیا ہے۔ ہم نے جب یہ سفر اختیار کیا اور جس زمانے کی بات کر رہے ہیں۔ یہ سرد جنگ کا دور ہے۔ آپ تو گرم جنگ کے عہد میں جی رہے ہیں۔ سرد جنگ کا آپ کو کیا علم، ویسے تو آپ گرم جنگ سے بھی بے خبر ہی رہیں تو اچھا ہے۔ آدمی کو اپنی روٹی رزق ڈھونڈنے سے فرصت ملے تو سرد اور گرم جنگ کے بارے میں کچھ جاننا بھی چاہے۔ ہر ذی روح اپنی بقاء کی جنگ میں مصروف رہتا ہے۔ یا اپنے آپ سے جنگ کرتا رہتا ہے۔

معاف کیجیے میں بھٹکنے لگ جاتا ہوں۔ پاکستان میں بھٹکنے کے مواقع ہیں بھی بہت۔ جو زیادہ بھٹک سکتا ہے۔



احباب میں بانٹنے کے لیے، ایک میرے پاس اب بھی موجود ہے۔ بیسویں صدی کی یادگار۔

کوپن ہیگن میں آپ کو ساتھ لے کر چلوں۔ مگر یہ ایسے ہوگا کہ میں وقت کی مشین میں گردش ایام کو پیچھے کی طرف لوٹ آنے پر زور دوں۔ اب تو سب کچھ بدل گیا ہے۔ کوپن ہیگن اور خوبصورت ہوگیا ہے۔ ایسا شہر کہ جہاں بار بار جانا چاہیے۔ رہنے والوں کی صحت، تعلیم اور سماجی ضروریات کا خیال اس وقت بھی رکھا جاتا تھا۔ اب اس دیکھ بھال میں اور اضافہ ہوگیا ہے۔ اب تو کمیونزم

وہ اتنا ہی بڑا رہبر بن جاتا ہے۔

میں یہ بتانا چاہ رہا ہوں کہ کمیونزم کی یلغار سے بچنے کے لیے یورپ کے بہت سے ملکوں نے اپنے شہریوں کو وہ آسانیاں اور سہولتیں کسی اور نام سے فراہم کی ہیں۔ جو کمیونسٹ ممالک میں قانوناً ہر شہری کو ملتی ہیں۔ سکینڈے نیویا میں سوشلزم کا ان دنوں بہت چرچا ہوتا تھا۔ ہم نے جب جاننا چاہا تو معلوم ہوا کہ بے روزگاروں کو یورپ میں مملکت وظیفے جاری کرتی ہے۔ جب تک کسی کو معقول روزگار نہ ملے۔ تو اسے اتنا پیسہ سرکار کی طرف سے ملے

کہ وہ ناشتہ، دوپہر اور رات کا کھانا کھا سکے۔ مکان کا کرایہ دے سکے۔ ضروری اشیا خرید سکے۔ سکینڈے نیویا کے تینوں ممالک ڈنمارک، سویڈن اور ناروے میں جو وظیفہ دیا جاتا ہے۔ اس میں یہ خیال بھی رکھا جاتا ہے کہ کسی بے روزگار کا اگر جی سینما دیکھنے کو چاہے۔ کسی نائٹ کلب میں غم دور کرنا چاہے تو اندازہ کر کے ہر مہینے یہ خرچے بھی وظیفے میں شامل کر دیے جاتے ہیں تاکہ اسے احساسِ محرومی نہ ہو۔ دیکھیں کہ یہاں کی مملکتیں کتنی انسان دوست ہیں۔ کیسی کیسی ضروریات کا خیال رکھتی ہیں۔

پی آئی اے والوں نے ہماری ایسی خواہشات کا خیال نہیں رکھا ہے۔ ہمیں یہ اخراجات اپنی جیب سے پورے کرنے پڑ رہے ہیں۔ کتنی زیادتی اور ناانصافی ہے۔

میں آپ کو اصل میں کہانی سنانا چاہتا ہوں ایک مسافر بحری جہاز کی، جس کی چودہ منزلیں ہیں۔ ہر منزل پر عجائبات ہیں۔

کوپن ہیگن میں جب ہم گھوم پھر لیتے ہیں تو اکثر مسافر تو یہیں سے واپس پاکستان جا رہے ہیں۔ کچھ لندن جانا چاہتے ہیں۔

بلوچستان ٹائمز، اور زمانہ کوئٹہ کے مالک و مدیر فصیح اقبال، سیلانی ہیں۔ جہاں گردی کا اشتیاق رکھتے ہیں۔ پہلے بھی گھاٹ گھاٹ کا پانی پی چکے ہیں۔ زندگی کو جی بھر کے گزارنا چاہتے ہیں۔ انہیں ایک ہم سفر کی تلاش ہے۔ کیونکہ ان کا ارادہ لندن ایک بحری جہاز کے ذریعے جانے کا ہے۔ پاکستان سے چلنے سے پہلے انہیں ٹریول ایجنٹ نے بتایا تھا کہ ایک نیا چودہ منزلہ بحری جہاز سویڈن سے برطانیہ جا رہا ہے۔ پورے یورپ میں اس جہاز کی دھوم ہے۔ وہ اس کے مزے لینا چاہتے ہیں۔

ہمیں بھی ان دنوں دنیا دیکھنے کا شوق ہے۔ 'اخبار جہاں' کی ادارت کی ذمہ داری ہے۔ ایک دو ہفتوں کا انتظام کر کے آیا ہوں۔ اس لیے اس پیشکش کو قبول کر لیتا ہوں۔ دیکھیں گے کہ دنیا بحری جہاز سے کیسے لگتی ہے۔

ہم ہوٹل آتے ہیں۔ پروگرام صبح سویرے ٹرین پکڑنے کا ہے۔ یورپ میں ٹرین کا سفر بھی بہت پُرکشش اور آرام دہ ہے۔ چلتے چلتے پُرسکون جھیلوں، باغات، شہروں پر بھی نظر ڈالی جا سکتی ہے۔ کوپن ہیگن اسٹیشن پر بھی ہجوم اسی طرح ہے۔ جیسے ایئرپورٹ پر تھا۔

ڈبے میں ہمارے علاوہ کوئی ایشیائی نہیں ہے۔ گرمیوں کا موسم ہے۔ بہت سے خاندان تعطیلات لندن اور دوسرے شہروں میں گزارنے کے لیے نکلے ہوئے ہیں۔ عمر رسیدہ بھی ہیں۔ نوجوان بھی بچے بھی اور بعض خاندانوں کے ساتھ ان کے پالتو جانور بھی ہیں۔ کتے، بلیاں، پرندے اچھی بات ہے کوئی ہمیں نہیں پوچھ رہا کہ کہاں سے آئے ہیں۔ کہاں جا رہے ہیں۔ سب اپنی اپنی دنیا میں مست ہیں۔ سنہری بالوں والے بچے بچیاں کن انکھیوں سے ہمیں دیکھ لیتے ہیں کہ ہمارا رنگ گورا نہیں ہے۔ کچھ بچے کامکس میگزین کی ورق گردانی میں مصروف ہیں اور کچھ خواتین ناول پڑھنے میں منہمک ہیں۔ سڈنی شیلڈن مقبول ترین مصنف ہیں۔

ٹکٹ چیکر آ رہا ہے۔ ٹکٹ دیکھ رہا ہے۔ کچھ مسکراہٹوں اور پُرلطف جملوں کا تبادلہ بھی۔

ٹرین فراٹے بھر رہی ہے۔ مجھے آگے سمندر نظر آ رہا ہے۔ میں پریشان ہو رہا ہوں کہ اب آگے کیسے سفر ہوگا۔ کیا ہمیں یہیں سے بحری جہاز پر بیٹھنا ہے۔ لیکن بندرگاہ کہاں ہے۔

فصیح اقبال صاحب سے پوچھتا ہوں۔ وہ مسکراتے ہیں، کہتے ہیں، دیکھتے رہیے، ٹرین رُک گئی ہے۔

ڈنمارک کی سرحد ختم ہو گئی ہے۔

سویڈن کی سرحد شروع ہو رہی ہے۔

کسٹم والے امیگریشن والے ڈبوں کے اندر ہی آ رہے ہیں۔ پاکستانی پاسپورٹ دیکھ کر بھنویں تن جاتی ہیں۔ اس لیے ہمارا سامان کتوں کے سونگھنے کے لیے پیش کر دیا جاتا ہے۔ پاکستانی حشیش لے جانے کے لیے مشہور ہیں۔ یہ مرحلہ بھی گزر جاتا ہے۔

اب تو سمندر بالکل نزدیک نظر آ رہا ہے۔ یہ مالمو شہر ہے۔ چھوٹی سی بندرگاہ بھی ہے۔ ہم ریل گاڑی میں ہی سوار ہیں۔ لیکن اب ریل گاڑی خود سوار ہو رہی ہے۔ سمندر پار کرنا ہے۔ فیری کے ذریعے، یہ ایک بڑی لانچ ہے۔ جو پوری ٹرین کو لے کر دوسرے کنارے لے جائے گی۔ میں حیران پریشان کہ سائنس نے کتنی ترقی

کرلی ہے۔ پوری ٹرین ایک کشتی میں سما گئی ہے۔ سینکڑوں مسافروں سمیت ہم تو اسی ڈبے میں بیٹھے ہیں۔ بس ہچکولوں سے محسوس ہورہا ہے کہ ہم خشکی کے بجائے پانی پر سفر کررہے ہیں۔

ہم سویڈن میں داخل ہوگئے ہیں۔ سویڈن کا ذکر ہو تو نوبل پرائز یاد آتے ہیں۔ ادب امن فزکس میڈیکل اور دوسرے شعبوں میں یہ انعامات تقسیم کیے جاتے ہیں۔ دنیا بھر میں اس انعام کی بہت قدر و اہمیت ہے۔ سویڈن کے حوالے سے مجھے ہمیشہ تاریخ کا ایک اور واقعہ یاد آتا ہے۔

ہندوستان میں جب شاہجہاں بادشاہ نے اپنی چہیتی ملکہ ممتاز کے انتقال پر تاج محل جیسی یادگار بنانے کا فیصلہ کیا۔ سویڈن میں بھی اسی دور میں ملکہ کا انتقال ہوا تھا۔ ممتاز محل کی سانس کی ڈور بھی بچے کی پیدائش کے دوران ٹوٹی، سویڈن کی ملکہ نے بھی آخری ہچکی دنیا کی آبادی میں ایک جان کا اضافہ کرنے کے دوران لی۔ اب ذرا ہندوستان کے بادشاہ، سویڈن کے بادشاہ، ایک مسلمان حکمران ایک غیر مسلم حکمران کی سوچ کی پرواز میں فرق ملاحظہ کریں۔ شاہجہاں نے تو بیش بہا اخراجات سے ایک ایسی عمارت بنانے کا منصوبہ بنایا جو صدیوں یاد رہے۔ دنیا بھر سے سیاح آئیں، دیکھیں سویڈن کے بادشاہ کی سوچ یہ تھی کہ انسانیت کو تحفظ دیا جائے۔ یہ تو ملکہ تھی، علاج پر جو بھی خرچ ہوسکتا تھا کیا گیا، جو احتیاط ہوسکتی تھی برتی گئی، ایسی کتنی مائیں ہوں گی۔ جو زچگی کے دوران چل بستی ہیں۔ ان کے پاس تو اتنے احتیاطی اقدامات بھی نہیں ہوں گے اور نہ ہی اخراجات برداشت کرنے کی سکت۔ شاہجہاں نے تو مستریوں، معماروں مزدوروں کو بلایا۔ سویڈن کے بادشاہ نے ڈاکٹروں اور معالجین کو اور ایسے اسپتال کی بنیاد رکھی۔ جہاں بچے کی پیدائش کے دوران ماؤں کا بہت زیادہ خیال رکھا جائے۔

سویڈن کا ذکر ہو تو مجھے 17 ویں صدی کا یہ موازنہ یاد آجاتا ہے۔ ایک رات ہمیں ایک چھوٹے سے قصبے میں گزارنا ہے۔ ایک بڑی بی اکیلی ہیں۔ اپنے گھر کو انہوں نے گیسٹ ہاؤس بنا رکھا ہے۔ یہاں صرف ٹھہرنے کی سہولت ہے کھانا وغیرہ آپ باہر سے کھا کر آئیں۔ بڑی بی اسی کے پیٹے میں ہیں۔ خود ہی منیجر ہیں۔ خود ہی اکاؤنٹنٹ بھی، کوئی آٹھ کمرے ہوں گے۔ اتفاق سے یہاں ایک اور پاکستانی بھی مل جاتے ہیں۔ روزنامہ 'مشرق' کے چیف ایڈیٹر مکین احسن کلیم کے بھائی 'مشرق' مقبول اخبار ہے۔ نیشنل پریس ٹرسٹ کے زیر اہتمام بہت سے اخبارات میں سے ایک مکین صاحب کے بھائی کا نام ابھی یاد نہیں آرہا ہے۔ شاید مبین احسن ہے۔ وہ گارمنٹس برآمد کرتے ہیں۔ سال میں ایک چکر یورپ کا لگاتے ہیں۔ آرڈرز اکٹھے کرتے ہیں۔ پھر جاکر اُن کی تعمیل کرواتے ہیں۔ خوش ہیں کہ اللہ کا فضل ہے۔ کام اچھا چل رہا ہے۔ وہ ہمیشہ اسی گیسٹ ہاؤس میں قیام کرتے ہیں۔ بڑی بی ان کا بہت خیال رکھتی ہیں۔

اس قصبے کی گلیاں بہت تنگ ہیں۔ سڑکیں بھی پتلی پتلی، ہم نے پیدل ہی ایک چکر لگایا تو آبادی ختم ہوگئی۔ اہمیت یہ ہے کہ ایک دو اور ملکوں کی سرحدیں بھی اس سے ملتی ہیں۔ اس لیے سیاحوں کی آمد و رفت جاری رہتی ہے۔ خوبصورت ہیں لوگ، اپنی بستیوں کو بھی صاف ستھرا رکھتے ہیں۔ پینے کے پانی کا بھی اچھا انتظام ہے۔ مارکیٹیں چھوٹی لیکن بہت حسین، رنگین۔

اگلی صبح ہمیں گوتھن برگ پہنچنا ہے۔ یہاں سے ہماری امنگوں اور تمناؤں کا مرکز 'تور برطانیہ' ملنا ہے۔ فی الحال ہمارے خوابوں کی تعبیر، گوتھن برگ ادب، صحافت کی تاریخ میں بہت اہم مقام رکھتا ہے کیونکہ پرنٹنگ کی ایجاد یہیں ہوئی۔ طباعت سے گوتھن برگ کا رشتہ بنیادی اور ازلی ہے۔ کاغذ اور سیاہی کا طباعت سے بنیادی تعلق ہے۔ کاغذ کے کارخانے بھی یہاں ہیں۔ پاکستان کے کچھ پرانے کمیونسٹ بھی سنا ہے کہ یہاں رہتے ہیں۔ اپنے ملک میں آمریتوں کے خلاف جدوجہد میں احتجاج کرتے، پلک جھپکنے میں پوری کی پوری بس جلانے کے ماہر بھی یہاں آکر پرامن اور قانون کے پابند شہری بن گئے ہیں۔

گوتھن برگ میں ایک اپنائیت محسوس ہورہی ہے۔ نہ جانے کیوں۔ لوح و قلم، کاغذ اور پریس (مطبع) کا جہاں وجود ہو۔ تو گھر جیسا ماحول تو لگتا ہے۔ کاغذ کی ریلیں دیکھ کر اپنے چھاپے خانے یاد آجاتے ہیں۔

میں ابھی جھنگ میں زیرِ تعلیم تھا۔ اپنے کالج میگزین کی ادارت کی ذمہ داری میسر آ گئی تو پریس آنا جانا شروع ہو گیا۔ کچھ عرصہ خوش نویسی بھی کی شوقیہ۔

میں کہاں یہ باتیں لے بیٹھا ہوں۔ پڑھائی، لکھائی، چھپائی بلکہ لکھائی چھپائی پڑھائی سے آج کل دلچسپی کسے ہے۔ اب تو موبائل فون ہے اور ہم آپ، فون تو سنتے، کرتے ہی ہیں ایس ایم ایس، ای میل، فیس بک، جدید ترین ٹیکنالوجی، ٹوئٹر، فلمیں، گیمز ہم خود کچھ ایجاد نہیں کرتے۔ ہم صرف استعمال کرتے ہیں اور استعمال ہوتے ہیں۔ لیکن اگر ٹیکنالوجی ایجاد کریں۔ تو آپ ٹیکنالوجی کو استعمال بھی کرتے ہیں۔ لیکن اگر ٹیکنالوجی کسی اور نے ایجاد کی ہے۔ تو ٹیکنالوجی آپ کو استعمال کرتی ہے ہو کیا رہا ہے؟ دوسرے فون بناتے ہیں۔ ہم صرف باتیں بناتے ہیں۔

فصیح اقبال خوش ہیں کہ بحری جہاز کی اپر کلاس کے ٹکٹ مل گئے ہیں۔ سفر اچھا کٹے گا۔ وہ تو پہلے کئی سمندری سفر کر چکے ہیں۔ انہیں خشکی اور فضا سے مسافت طے کرنے سے زیادہ مزا سمندر عبور کرنے میں آتا ہے۔

بہت سے خاندان اپنی اپنی کاروں سے آ رہے ہیں۔ اوپر سامان بندھا ہے کاریں جہاز پر چڑھ رہی ہیں۔ اپنی اپنی مخصوص پارکنگ میں لگ رہی ہیں۔ بچے خوش ہو رہے ہیں۔ اپنے اپنے بیگ کندھوں پر لٹکا کر امی ابا کے منتظر ہیں۔ کاریں پارک کر کے جس میں منزل کے ٹکٹ ہیں۔ ادھر روانگی ہے۔ سب سے نیچے پارکنگ، اس کے اوپر عرشہ، سب سے سستے ٹکٹ والے، ہمیں چوتھی منزل پر جانا ہے۔ جہاں ہمارے کیبن ہیں۔ بالکل کسی ہوٹل کی طرح، طویل کوریڈورز (راہداریاں) اب کیبن نمبر یاد نہیں۔ اس سے فرق بھی کیا پڑتا ہے۔ کیبن میں ایک طرف باتھ روم، کپڑے لٹکانے کی الماریاں دوسری طرف، پھر بستر، اس کے ساتھ ہی ایک چھوٹی سی میز، کرسی ٹیبل لیمپ، جہاں کتابیں پڑھ سکتے ہیں لکھ سکتے ہیں۔ بستر کے ساتھ ہی دریچہ ہے۔ سمندر دیکھنے کا شوق ہے۔ تو پردہ ہٹالیں۔ موجیں آپ کی طرف لپکتی ہیں۔ آپ چاہیں بھی تو چھو نہیں سکتے۔

سامان کیبن میں رکھ کر یہ طے ہوا ہے کہ جہاز کے مختلف مالے (منزلیں) دیکھی جائیں۔ لفٹ بھی لگی ہوئی ہے۔ بہت تیز رفتار، سیڑھیاں بھی ہیں۔

لفٹ سے پہلے بالکل چھت پر چلتے ہیں۔ پھر سیڑھیوں سے ایک ایک منزل نیچے اتریں گے۔ ایک دنیا آباد ہے۔ چھت پر صرف ایک حصہ ہے۔ جہاں آپ گھوم پھر سکتے ہیں۔ دوسرے حصوں میں جہاز کے اپنے آلات مشینیں ہیں۔ یہ ہمارے سمجھنے کی چیزیں نہیں ہیں۔ ہر قدم احتیاط کی ضرورت ہے۔ چھت پر ہوا زیادہ تیز ہے۔ ایک منزل نیچے اترتے ہیں۔ یہ ہے تیرہویں منزل، مگر اسے چودھویں منزل قرار دیا گیا ہے کیونکہ تیرہ نمبر مغرب میں منحوس سمجھا جاتا ہے۔ اس منزل پر رنگ رلیاں منانے کا اہتمام ہے۔ وسیع و عریض کیسینو، درمیان میں نائٹ کلب، میزبان مرد خواتین، رنگ رنگ وردیوں میں، میٹھی میٹھی مسکراہٹوں کے ساتھ ایک بڑے حصے میں قمار بازی کے لیے انتظام ہے۔ مشینوں سے بھی، ہاتھ سے بھی، تاش کے پتے سمت سنوار رہے ہیں۔ ہر عمر کے مرد و زن بڑے انہماک سے مقابلے میں مصروف ہیں۔ کچھ جیک پاٹ کی آس لگائے ہوئے ہیں۔ نہ جانے کتنے برس سے، خواہش تو میری بھی ہے۔ تمنا آپ کو بھی ہو گی کہ کسی وقت اوپر والا چھپڑ پھاڑ کے آپ کو نواز دے۔ کہتے تو سب ہیں کہ محنت کرو کچھ نہ کچھ مل جائے گا۔ لیکن محنت سے اتنا کہاں ملتا ہے۔ جو بغیر محنت کے بہت سے قسمت والے کر رہے ہیں۔

کیسینو میں نیلا رنگ غالب ہے۔ کہیں کہیں نارنجی رنگ کے حاشیے بھی ہیں۔ میکدہ بھرا ہوا ہے۔ تل رکھنے کی جگہ نہیں ہے۔ البتہ دل رکھنے کی ہے۔ لیکن جب دل پہلے ہی کہیں رکھا ہوا ہو تو یہ موقع بھی کوئی کشش نہیں رکھتا۔

فصیح اقبال ذرا پارسا قسم کے پاکستانی ہیں۔ یا کم از کم میرے سامنے نہیں کھل رہے۔ صراحیاں، جام، حسن فراواں، مستیاں، بے خودی، سب آنکھوں کے سامنے ہے ہم دیکھ رہے ہیں۔ گھوم رہے ہیں، کہیں رُک نہیں رہے۔

تک دیکھ لیا دل شاد کیا اور چل نکلے

میں فصیح اقبال صاحب سے کہتا ہوں آیئے اس گوشے میں بیٹھ جاتے ہیں۔ یہاں سے سمندر کا جوش

دیدنی ہے۔ تور برطانیہ، ایک پورے شہر کو بازوؤں میں سموئے موجوں کے سینے پر رواں ہے۔ پانی بار بار جہاز کو چومتا ہے۔ چلا جاتا ہے، پھر قریب آ جاتا ہے۔
مغنیہ گا رہی ہے۔ خوش شکل بھی ہے۔ خوش لباس بھی، بلکہ کچھ اختصار سے کام لیتے ہوئے۔
بعض سننے والے ہوتے ہیں، بعض دیکھنے والے۔
مغنیہ جب اسٹیج پر آتی ہے۔ تو اسے دونوں خواص کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔

میں نے جی بھر کے تجھے دیکھا ہے
اب تری شکل نکھر آئی ہے

ہم کھڑے کھڑے اس مغنیہ کا سراپا دیکھ چکے ہیں بلکہ دل میں اُتار چکے ہیں۔

سراپا پہ جس جا نظر کیجیے
وہیں عمر ساری بسر کیجیے

ایک گوشہ ہم بیٹھنے کے لیے چُن لیتے ہیں۔ جہاں آواز ہم تک بہت اچھے طریقے سے پہنچ رہی ہے۔ چہرہ سامنے نہیں ہے۔ میں نے اکثر محفلوں میں غزلیں سنی ہیں۔ کنسرٹ دیکھے ہیں۔ اگر آپ کو موسیقی سے محظوظ ہونا ہے۔ نغمگی سے لطف اندوز ہونا ہے۔ شاعری سے سرشار ہونا ہے تو چہرہ دیکھنے سے گریز ہی مناسب ہوتا ہے۔ آپ کی توجہ الفاظ اور دھنوں پر ہونی چاہیے۔ فراق گورکھپوری نے اسی لیے کہا تھا۔

تم مخاطب بھی ہو قریب بھی ہو
تم کو دیکھوں کہ تم سے بات کروں

فصیح اقبال صاحب نے کافی اور میں نے چائے کے لیے کہہ دیا ہے۔ کھانے سے اجتناب ہی بہتر رہتا ہے۔ حلال و حرام کی جستجو شروع ہوتی ہے۔ اپنا تجربہ یہی ہے کہ غیر مسلم ممالک میں سب سے محفوظ آسان اور ارزاں کھانا فش اینڈ چپس رہتا ہے۔ 'مچھلی اور آلو کے قتلے' مغنیہ کی آواز میں سحر ہے۔ اور زندگی سے محبت کا پیغام۔

زندگی ایک بار ہی ملتی ہے
اس سے جی بھر کے پیار کیجیے

وقت اپنی مٹھی میں سینکڑوں لمحے لے کر آتا ہے۔ کس کے لیے، آپ کے لیے۔

فصیح صاحب کو شاعری سے تو بہت لگاؤ ہے۔ لیکن نغمگی سے اتنا شغف نہیں ہے۔ مگر میں اس وقت دیکھ رہا ہوں کہ وہ بہت پیار سے کان لگائے سُن رہے ہیں۔

زندگی ایک بار ہی ملتی ہے
اس سے پیار کیجیے

وہ گنگنا بھی رہے ہیں۔ ویٹر بھی خوش لباس ہیں۔
کافی آ گئی ہے چائے بھی۔
''گلوکارہ کا نام کیا ہے؟'' وہ ویٹر سے پوچھ رہے ہیں۔
''آپ نے انہیں پہچانا نہیں؟''
''نہیں...... کبھی پہلے سننے دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا۔''
''یہ ڈنمارک کی مشہور سنگر ہیں۔ یہ مہینے میں ایک بار آتی ہیں۔''
''پھر تو ہم خوش قسمت ہیں کہ ہم اسی روز سفر کر رہے ہیں۔''
''جی بالکل! ان کا نام 'این گراس وڈ' ہے۔'' فصیح اقبال اور ویٹر کے مکالمے میں گیت کی ایک دو لائنیں پوری طرح سنی نہیں جا سکی ہیں۔ آواز آ رہی ہے۔

یہ مرغزار، یہ گلستان، لانبے لانبے درخت، سب تمہارے لیے ہیں۔ تمہارے دن رات کو حسین بنانے کے لیے۔

تمہاری زندگی میں رنگ بھرنے کے لیے زیادہ تر گیت تو سننے والوں کو اُداس کر دیتے ہیں۔ بہت دنوں بعد ایسی اُمید بھری شاعری سننے کو مل رہی ہے۔
حالانکہ شیلے نے کہا تھا۔

ہمارے سب سے شیریں نغمے وہ ہیں
جو سب سے غمگین خیالات کو بیان کرتے ہیں

مگر کیسنیو میں خوشیاں بکھیر رہے ہیں۔ قہقہے گونج رہے ہیں۔ اور اسی میں این سب سے کہہ رہی ہے

زندگی سے بات کرو، زندگی کو بانہوں میں لے لو
کسی لمحے بھی اپنے آپ سے دور نہ ہو
اپنے اندر جھانکو، ساری دنیا تمہارے اندر سمٹی ہوئی ہے
دل کی سنو، دل ہمیشہ خوبصورت راستہ دکھاتا ہے
دل کو زندہ رکھو

اسے مکمل کر دھڑکنے دو
دھڑکنیں ہی زندگی کی نشانی ہیں
مجھے اردو کا شعر یاد آ رہا ہے
زندگی زندہ دلی کا نام ہے،
مردہ دل خاک جیا کرتے ہیں،
لمحے بیت رہے ہیں، گھڑیاں فنا ہو بکھر رہی ہیں۔
آج کا دن بہت طویل ہو گیا ہے۔ لیکن نعمتوں اور راحتوں سے بھرپور، ایک ایک ثانیہ، اپنی اہمیت دلاتے ہوا گزر رہا ہے۔

اب نیند کی دستکیں بھی شروع ہو رہی ہیں۔ ارادہ تو یہ تھا کہ سارے مالے دیکھیں۔ لیکن اب غنودگی بے بس کر رہی ہے۔ سیڑھیوں کی بجائے لفٹ، بستر پر گرتے ہی خواب کی وادیاں۔

☆......☆......☆

سمندر کی صبح، خشکی کی صبحوں سے بالکل مختلف ہوتی ہے۔ دریچے سے پردہ ہٹا کر دیکھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ دور دور تک ایک سفید منظر ہے۔ لہریں فوجی دستوں کی صورت میں آتی دکھائی دیتی ہیں۔ میں اب باہر عرشے پر جا کر یہ منظر دیکھنا چاہتا ہوں۔

ہم پانچویں منزل پر ہیں۔ بہتر منظر 9 ویں منزل سے نظر آئے گا۔ یہ ٹور برطانیہ کے بروشر میں لکھا ہوا ہے۔ لفٹ بھی خوش قسمتی سے جلد مل جاتی ہے۔ میں سوچ رہا تھا کہ شاید میں اکیلا ہی سحر خیز ہوں۔ وہاں تو ایک ہجوم تھا۔ جو ریلنگ (حفاظت کے لیے لگے جنگلے) سے لگا نظریں سمندر پر جمائے موجود ہے۔ سمندر دیکھنے کی خواہش انسان میں اتنی ہی پرانی ہے جتنی دنیا۔

یہیں ذکر ہو رہا ہے کہ نارتھ سی (شمالی سمندر سے تیل وافر مقدار میں نکل رہا ہے۔ اس پر برطانیہ اور سکینڈے نیویا میں کچھ تنازع بھی ہے۔

سمندر کچھ برہم ہے۔ ٹور برطانیہ کا یہ اتنا بڑا جہاز بھی ڈول رہا ہے۔ کچھ دیر میں فصیح اقبال بھی عرشے پر پہنچ گئے ہیں۔ وہ کئی ملکوں میں سمندر اتنے قریب سے دیکھ چکے ہیں پہلے غیر ملکی سفر زیادہ تر بحری جہازوں سے ہوتے تھے۔ کچھ سستے بھی تھے۔ چند سال پہلے تک حج کے لیے بھی ہمارے ہاں سے پاکستان نیشنل شپنگ کارپوریشن کے جہاز یہ خدمت انجام دیتے تھے۔ سمندر کی برہمی کے باوجود انسان دیکھنے سے نہیں ہٹ رہے ہیں۔

موسم ویسے خوشگوار ہے۔ ہمارے لیے سمندر میں اس طرح ڈولنا، ڈگمگانا ذرا خطرانگیز ہے۔ اس لیے ہم طے کرتے ہیں کہ جہاز کے دوسرے حصے دیکھتے ہیں۔ دو منزلوں پر شاپنگ مال بنائے گئے ہیں۔ کچھ دیکھ لیں، اگر کوئی سوغات مل سکے تو خرید لی جائے۔ شاپنگ مال میں سب کچھ دستیاب ہے۔ تعطیلات کا موسم ہے اس لیے ہر کھیل کا سامان بھی رکھا ہے۔ فٹ بال، کرکٹ، کیمپنگ، بستر، کاڑیوں کے لیے مختلف قسم کا سامان، برتن بھی ہیں۔ کچھ دکانیں قدیم اور نادر اشیا کی ہیں۔ جن میں پرانے بحری جہازوں کی تاریخی تصویریں بھی ہیں۔ آئینے، کھڑکیاں، کنڈے، فریم، گھنٹیاں، رسیاں، پائپ، بہت سے خاندانوں کو شوق ہوتا ہے اپنے بنگلوں میں جہاز کی آرائشی اشیاء لگانے کا۔ کراچی سے کچھ میل دور بلوچستان کے علاقے گڈانی میں شپ بریکنگ کی دنیا میں چند بڑی صنعتوں میں سے ایک موجود ہے۔ یہاں بحری جہاز توڑے جانے کے بعد اس کے مختلف حصے، سجاوٹ کی چیزیں قدیم نادرات کی دکانوں پر بڑی مہنگی بکتی ہیں۔ ایک دکان پر بحری قزاقوں سے متعلقہ اشیاء فروخت کے لیے موجود ہیں۔ ان کا لباس، چشمے، ٹوپیاں، جوتے، بچوں کی زیادہ بڑی تعداد یہاں موجود ہے۔ خریداری بھی زوروں پر ہے۔

مجھے تو سب سے زیادہ خوشی کتابوں اور رسالوں کی دکان دیکھ کر ہو رہی ہے۔ یہاں بھی خریدار کافی تعداد میں موجود ہیں۔ میگزین زیادہ بک رہے ہیں۔

ہمارا سفر مختصر ہے۔ دوراتوں تین دن کا کئی گروپ تو آگے بھی جائیں گے۔ انہیں راستے میں پڑھنے کے لیے کچھ درکار ہے۔

ایک دکان صرف خوشبوؤں کی ہے۔ مہنگی مشہور پرفیوم بھی ہیں۔ اور عام والی بھی، یورپ کے مختلف ممالک کی تاریخ کے حوالے سے بھی سوغاتیں دستیاب ہیں۔

ہمارا ارادہ قطعی طور پر جیب خالی کرنے کا نہیں ہے۔ ڈالر، پاؤنڈ بچانے ہیں۔ لندن بلا رہا ہے، کتابیں بھی

خریدنی ہیں۔ بچوں بڑوں کے لیے تحائف بھی، ہائیڈ پارک دیکھنا ہے۔ بیکر اسٹریٹ، مادام تساؤ، پکاڈلی سرکس، بی بی سی،

ٹور برطانیہ کے ایک مالے پر سوئمنگ پول بھی بنایا گیا ہے۔ ہم شاپنگ والی منزل سے سیڑھیوں کے ذریعے پانچویں منزل پر جاتے ہیں۔ وہاں سوئمنگ پول کی طرف اشارہ دکھائی دیتا ہے۔ کشاں کشاں پہنچتے ہیں۔ تو جہاز کے اندر ایک سمندر کا احساس ہوتا ہے۔ جہاز میں کئی ہزار مسافر ہیں۔ اس لیے سوئمنگ پول اس طرح فراخ بنایا گیا ہے۔ یہاں بھی ایک رونق ہے۔ ہنگامہ ہے، بچے بڑے بوڑھے، جوان، خواتین نہانے میں غوطہ زنی میں مشغول ہیں۔ ایک بڑا ریستوران بھی لذت کام ودہن کی آزمائش کے لیے موجود ہے۔ ہم دونوں میں سے کسی کو پیراکی نہیں آتی اور نہ ہی کوئی اشتیاق ہے۔ چائے کی چسکیوں کا ارادہ بن جاتا ہے۔ ہر طرف بڑے بڑے شیشوں کا حصار ہے۔ جس سے سمندر کو دیکھ سکتے ہیں۔

بھوک چمکنے لگی ہے۔ چائے کے ساتھ مچھلی اور آلو کے کچھ قتلے، میں اتنی حیرتوں اور مسرتوں کا موقع ملنے پر فصیح اقبال صاحب کا باضابطہ شکریہ ادا کر رہا ہوں کیونکہ اپنے طور پر شاید میں قدرت کے یہ نظارے دیکھ نہ پاتا۔ زیادہ سے زیادہ ہوائی جہاز سے لندن پہنچ جاتا۔ تیز رفتار، آرام دہ ٹرین کا سفر، فیری، اور اب دنیا کے جدید ترین اور چند بڑے بحری جہازوں میں سے ایک میں سفر کا موقعہ، بالکل الگ، بالکل منفرد۔

فصیح اقبال صاحب کہہ رہے ہیں۔ موقع ملا تو کچھ اور ممالک میں بھی چلیں گے۔ سیاحت اُن کا جنون ہے۔ سال میں ایک یا دو مہینے ضرور کسی نہ کسی ملک کی سیر میں گزارتے ہیں۔ زیادہ تر اکیلے ہی نکل پڑتے ہیں۔ وہاں وہ سٹی ٹورز کے ٹکٹ خرید لیتے ہیں۔ کسی نہ کسی گروپ کا حصہ بن جاتے ہیں، پروگرام کیسے ترتیب دیتے ہیں۔

ٹریول ایجنٹ بھی اس سلسلے میں مدد کرتا ہے۔ بعض ایئر لائنز بھی نئے مقامات کا رُخ کرتی ہیں تو افتتاحی پرواز میں بھی ساتھ لے جاتی ہیں۔ بعض اوقات وہ ہوٹلوں میں قیام کی پیشکش بھی کرلی ہیں۔ بعض ٹریول ایجنٹ بھی سیاحتی پیکیج کا اہتمام کرتے ہیں۔

کافی دنیا دیکھ چکے ہیں اور باقی دیکھنے کی آرزو ہے۔ لیکن وہ بڑے دکھ کا اظہار کر رہے ہیں کہ ہمارے اپنے ملک میں ایسے ایسے عجائبات ہیں۔ حسین مناظر ہیں۔ ایسے علاقے ہیں جہاں تاریخ انتظار کرتی رہتی ہے کہ کوئی آئے سبق حاصل کرے۔ سر سبز پہاڑوں کے دامن میں دلہنوں کی طرح سجی وادیاں ہیں۔ وہ سال میں ایک دو ہفتے اپنے وطن کے ان خوبصورت مقامات پر بھی ضرور جاتے ہیں۔ وہ فطرت کے قریب رہنا چاہتے ہیں۔ بلوچستان میں وہ ایک ایک گوشہ دیکھ چکے ہیں۔ سارے قبائلی سرداروں سے بھی ان کی قربت ہے، دانشوروں، اور قوم پرستوں سے بھی۔ وہ سب کی عزت کرتے ہیں۔ سب ان کی عزت کرتے ہیں۔ ہم اپنے وطن کی خوشگوار یادوں میں کھوئے ہوئے ہیں کہ جہاز میں لرزش شروع ہوجاتی ہے۔ سمندر زیادہ برہم ہو رہا ہے۔ اتنا بڑا جہاز دیکھ کر غصے میں آرہا ہے۔ شاید اپنی طاقت اور دبدبے کا مظاہرہ کرنا چاہتا ہے۔

ہم چائے کا بل ادا کر کے اپنے کیبن میں جانے کا سوچتے ہیں۔ کیونکہ اور مسافر بھی یہاں سے روانہ ہوتے نظر آ رہے ہیں۔

جہاز جب زیادہ لرزتا ہے۔ ڈولتا ہے۔ کبھی اِدھر جھکتا ہے۔ کبھی اُدھر، ایسے میں مناسب یہی ہوتا ہے کہ آپ سمندر کو نہ دیکھیں۔ کہیں بیٹھ جائیں۔ بہتر یہی ہوتا کہ کیبن میں چلے جائیں۔ ایسی صورتِ حال میں مسافر کو بھی چکر آنے لگتے ہیں۔ جنہیں اس سفر کی عادت اور تجربہ نہ ہو۔ وہ گھبرا بھی جاتے ہیں۔ صرف مضبوط اعصاب والے ایسی حالت میں اپنے آپ کو یکجا رکھ پاتے ہیں۔

آپ نے فلموں میں ایسے مناظر دیکھے ہوں گے۔ ہم تو خود اس تجربے سے گزر رہے ہیں۔ بس یہ ہے کہ زیادہ گھبرانا نہیں چاہیے۔ اور نہ ہیجانی کیفیت میں دوڑ لگا دینی چاہیے۔ جہاز میں ریلنگ ہر جگہ ہوتی ہے۔ اسے

ایک ہاتھ سے تھام کر چلتے رہیں۔
اب جہاز پر اعلان بھی ہو رہا ہے۔ کپتان کا خیال ہے کہ یہ کیفیت ایک سے ڈیڑھ گھنٹے جاری رہ سکتی ہے۔ اپنے آپ کو سنبھالیں۔ تشویش کی بات نہیں ہے۔ کچھ مسافر کرسیوں پر اسی طرح براجمان ہیں۔ یہ معلوم نہیں کہ ان کے اعصاب قوی ہیں یا بے خودی ان کو طاقت پہنچا رہی ہے۔

مے سے غرض نشاط ہے کس رو سیاہ کو
اک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہیے

تجربہ کار، بحری مسافر ہم نو واردان بساطِ عشق کو بتا رہے ہیں کہ سمندر کا یہ جلال کم از کم دو سے تین گھنٹے کا ہوگا۔ کیبن میں جا کر کسی ناول کی ورق گردانی کریں۔ اپنی دنیا بسالیں تو سمندر کی برہمی آپ کے ذہن سے محو ہو جائے گی۔

پہلے ایک دو بار ہم نے بحیرہ عرب میں لانچوں پر تو سمندر کے ناز اٹھائے ہیں۔ مگر ان میں اپنائیت ہوتی ہے۔ کشتی کے ناخدا کو جب کوئی بڑی سرکش لہر آتی دکھائی دیتی تھی تو وہ انجن بند کر دیتا تھا۔ ہم پہلی بار تو گھبرائے کہ یہ کیا کر رہا ہے۔ کیا کوئی پرانی دشمنی کا بدلہ لے رہا ہے۔ مگر اس ملاح نے ہمارے پوچھنے پر اس کا جو سبب بتایا وہ زندگی میں آج تک بہت کام آیا ہے۔ کراچی کے اس ماہی گیر نے بڑے پتے کی بات بتائی کہ یہ جو بڑی لہر آ رہی ہوتی ہے۔ اس میں ہمارے انجن سے کہیں زیادہ طاقت ہوتی ہے۔ ہم اگر انجن چالو رکھیں گے تو اس لہر کی طاقت سے انجن کی طاقت ٹکرائے گی۔ انجن کمزور ہے اس لیے لہر کشتی کو الٹ بھی سکتی ہے۔ بہتر یہ ہوتا ہے کہ لہر کو گزر جانے دو اپنے آپ کو لہر کے رحم و کرم پر چھوڑ دو۔ اس طرح ٹکراؤ نہیں ہوگا۔ سمندر میں زندگی اسی طرح گزارنی پڑتی ہے۔

پاکستان میں ایسے بحران بہت آتے ہیں۔ جب خوفناک ٹکراؤ کے امکانات ہوتے ہیں۔ آپ کو اندازہ کر لینا چاہیے کہ آپ کے اندر کتنی طاقت ہے۔ برابر کی ٹکر ہو تو ضرور پنجہ آزمائیں۔ لیکن اگر طاقت کم ہے تو براہِ راست تصادم سے گریز کریں۔ آپ کے پاس جو طاقت ہے۔ اسے بچائیں، جمع کریں۔ جب آپ کے پاس طاقت زیادہ ہو جائے تو آپ خود لہر بن جائیں۔

کیبن میں بستر پر لیٹے ہوئے کراچی کا سمندر یاد آ رہا ہے۔ جب اس لانچ والے نے طوفانی لہروں کے سامنے زندہ رہنے کا گر بتایا تھا۔ کشتیوں کے ناخدا، لمبے راستوں کے ٹرک ڈرائیور بلوچستان جانے والی بس ڈرائیور، لالو کھیت، اور نئی کراچی میں کچی چلانے والے نوجوان، گلی کی دانش رکھتے ہیں۔ یہ زندگی کے مصائب کا ہم سے کہیں بہتر ادراک رکھتے ہیں۔

ٹور لائن کمپنی کا یہ جہاز ٹور برطانیہ 22528 ٹن وزنی ہے۔ اس کی لمبائی 18235 فٹ اور چوڑائی 2363 فٹ ہے۔ مسافر 1592، عملے کے ارکان 143 ہیں۔

ہم جب 1975ء میں سفر کر رہے ہیں تو یہ بالکل نیا بنا ہے۔ اب جب میں اپنی یادوں کے سہارے آپ کو ساتھ لے کر چل رہا ہوں۔ اس جہاز کے بارے میں معلومات حاصل کر رہا ہوں تو پتہ چل رہا ہے کہ بعد میں اس کا نام سکینڈے نیویا کا شہزادہ رکھا گیا۔ اور یہ گوٹے برگ سے برطانیہ کی نیا سبکس سٹود بندرگاہ اور واپسی میں اسٹرڈیم آتا رہا۔ 2003ء میں موبی لائنز سے اسے خرید لیا۔

☆......☆......☆

میں آپ کے سامنے اپنی عمر کے ماہ و سال بکھیر رہا ہوں۔ یہ ذہن بھی کتنا بڑا خزانہ ہے۔ کتنے سال، لمحے، ساعتیں، مہینے اس میں محفوظ رہتے ہیں۔ ایک نوجوان نے مجھے حیرت میں ڈال دیا۔ وہ کہنے لگا کہ آپ جب بھی ذہن پر زور دیتے ہیں۔ اپنے پیاروں کو یاد کرتے ہیں تو آپ کے سامنے اُن کی شبیہ آتی ہے۔ چہرے، عکس، الفاظ نہیں آتے۔ متن یا عبارت نہیں آتی۔ میں بھی ذہن پر زور دے رہا ہوں۔ تو یہ جہاز اپنے آٹھ بڑے عرشوں سمیت میری نگاہوں میں آ رہا ہے۔ رنگ سبز ہے، براؤن ہے، نارنجی ہے۔ سوئمنگ پول نیلگوں ہے۔ کیبن کی دیواریں نارنجی ہیں۔ ایک حاشیہ براؤن ہے۔ بستر پر چادر، تکیہ ہلکے نیلے رنگ کے ہیں۔ لکھنے کی میز سفید ہے۔ کرسی براؤن ہے۔
جہاز کیبن میں بھی ڈولتا محسوس ہو رہا ہے۔ پردہ ہٹا

کر کھڑکی سے دیکھتا ہوں۔ سمندر بہت غصے میں ہے۔ کچھ خوف سا محسوس ہوتا تو میں

وافوض امری الی اللہ...... ان اللہ بصیر بالعباد

میرے عظیم والد ہمیشہ اس آیت کا ورد کرتے تھے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ''میں اپنا کام اللہ کے سپرد کرتا ہوں۔ وہ اپنے بندوں کو اچھی طرح دیکھنے والا ہے'' اس سے آپ کو تقویت ملتی ہے کہ آپ کی جو بھی پریشانی ہے، الجھن ہے آپ اگر اس کو حل نہیں کر پا رہے ہیں تو زیادہ پریشان نہ ہوں۔ اسے اللہ پر چھوڑ دیں۔ وہ جو بہتر جانتا ہے گا۔ ویسا راستہ نکل آئے گا۔ مولانا روم نے اپنی مثنوی میں اس بات کو یوں سمجھایا ہے۔

کارساز مالنکر کار ما

فکر ما در کار ما آزار ما

ہمارے کام بنانے والا، ہمارے کام کی فکر کر رہا ہے۔ اپنے کام میں ہماری فکر ہمارے لیے آزار ہے۔ اس آیت نے بڑے بڑے بحرانوں، اور مشکلات میں مجھے بہت تقویت پہنچائی ہے۔ میرے ہم سفر، ہم نشیں بہت حیران ہوتے تھے کہ میں بہت زیادہ ہیجانی کیفیتوں میں بھی شانت اور پُرسکون رہتا ہوں۔

کچھ غنودگی طاری ہوئی طوفان گزر گیا پھر ہم جہاز کے عرشے پر نکل آئے۔

لوگ پھر باہر آ گئے ہیں۔ چہروں پر مسکراہٹیں ہیں۔ ایک دو منزلیں رہ گئی ہیں۔ لیکن وہاں دیکھنے کو کچھ خاص نہیں ہے۔ وہاں عام مسافروں، خاندانوں، گروپوں کے لیے بڑے بڑے ہال ہیں۔ جہاں غسل خانے مشترکہ ہیں۔ جہاں کرایہ کم ہوتا ہے۔ ان میں زیادہ وہ خاندان ہیں جو اپنے کارواں (کنٹینر) لے کر چل رہے ہیں۔ فیلکس اسٹوو پر اُتر کر وہ اپنے کارواں سے ہی برطانیہ کی سیر پر نکل جائیں گے۔

سورج ڈوب رہا ہے۔ اس علاقے میں گرمیوں میں دن بہت لمبے ہوتے ہیں۔ سورج بڑی مشکل سے ڈوبتا ہے۔ رات بہت ہی مختصر، صرف تین چار گھنٹے۔ ناروے میں تو کوئی ایسا مقام بھی ہے۔ جہاں 22 جون کو دنیا بھر کے سیاح بڑی تعداد میں آتے ہیں کہ وہاں اس دن رات ہوتی ہی نہیں ہے۔ ایک طرف سورج ڈوبتا ہے۔ اگلے چند منٹ میں سورج طلوع بھی ہو رہا ہوتا ہے۔ میری بڑی تمنا ہے کہ اس گاؤں میں جاؤں اور یہ منظر دیکھوں۔ آپ دعا کریں کہ یہ ممکن ہو جائے۔ میرا وعدہ ہے کہ اس کی روداد میں صرف آپ کو سناؤں گا۔

ایسی طلسم ہوشربا یہ رات ہماری آخری ہے۔ کل دوپہر تور برطانیہ لنگر انداز ہو جائے گا۔ خوابوں کا یہ سفر انجام کو پہنچے گا۔ کون جانے پھر یہ سفر نصیب ہو نہ ہو۔

راتیں بھی سہانی ہوں تری دن بھی رنگیلے
آتے ہوئے موسم سے جو لینا ہے ابھی لے

قدم از خود کیسینو کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ ایک گت سننے کی آرزو ہے۔

قمار خانہ، میکدہ، سب بھرے ہوئے ہیں۔ سب کو بچھڑنے کا احساس ہے۔ نارنجی دیوار کے پاس ایک گوشہ خالی ہے۔

مغنیہ کی آواز آ رہی ہے۔

سمندر دن بدن ایک دوسرے سے الگ ہو رہے ہیں
میں ہوش و حواس کھو رہی ہوں دھیرے دھیرے
تمہاری آواز مجھے فون پر سنائی دے رہی ہے
لیکن اس سے درد تھمتا نہیں ہے
دل سنبھلتا نہیں ہے
تنہائیاں طوفان بن گئی ہیں
ہوائیں سائیں سائیں کر رہی ہیں
بادلوں کی گرج سے دریچوں کے شیشے بول اٹھے ہیں
دل کی دھڑکنیں پورے مکان میں گونج رہی ہیں
میری اپنی سانسیں مجھے لپیٹ میں لے رہی ہیں
سمندر دن بدن ایک دوسرے سے الگ ہو رہے ہیں
میں ہوش و حواس کھو رہی ہوں دھیرے دھیرے

ماحول اُداس ہو رہا ہے۔ فصیح اقبال صاحب کی آنکھوں میں بھی نمی ہے۔ ہم دو کو بغیر کسی اہل خانہ کے دیکھ کر ایک جوڑا ہمارے پاس بیٹھنے کی اجازت مانگ رہا ہے۔ ان کے ساتھ دو بچے بھی ہیں۔ ایک بیٹی، ایک بیٹا۔

یہ بھی کوپن ہیگن سے آرہے ہیں۔ دو ہفتے برطانیہ میں گزاریں گے۔

میاں کا نام جوزف ہے، بیگم صوفیہ۔ ہم جب کوپن ہیگن کے ہوٹل میں تھے وہاں بھی استقبالیہ، منیجرز ویٹر خواتین کے نام کچھ مانوس سے تھے، ارونا، سلیمہ، ترکی سے بہت سے خاندان یہاں تلاش معاش میں آتے ہیں۔

سلسلہ تکلم کا شروع ہوجاتا ہے۔ پاکستان کیسا ملک ہے۔ آپ اور انڈیا آپس میں کیوں لڑتے ہیں۔

پاکستان کے بارے میں انہیں معلومات سیاحت کی حد تک ہیں۔ ان کا پروگرام ہے کبھی پاکستان کے شمالی پہاڑی علاقے دیکھنے کا۔ میاں بیوی دونوں کام کرتے ہیں۔ میاں ایک بینک میں بیوی ایک ٹریول کمپنی میں۔ ہر سال جب بچوں کے اسکولوں کی چھٹیاں ہوتی ہیں تو یہ بھی اپنے اپنے دفتر سے رخصت لے لیتے ہیں ایک مہینے کی، اس طرح بچوں کے ساتھ وقت گزارنے کا موقع مل جاتا ہے۔

پاکستان میں تعلیم کا معیار کیسا ہے۔ ڈنمارک میں جو پاکستانی ہیں۔ وہ زیادہ تر کم پڑھے لکھے ہیں۔ اس کی وجہ کیا ہے۔ فصیح اقبال بتا رہے ہیں کہ ہمارے لوگ بہت جفاکش ہیں محنتی ہیں۔ اس لیے وہ آپ کے ملکوں میں آ کر قسمت آزماتے ہیں۔ محنت سے گھبراتے نہیں ہیں۔ ہم جہاں انگلینڈ میں جا رہے ہیں یہاں تو پاکستان، ہندوستان کے نوجوانوں نے عمارتیں تعمیر کی ہیں۔ ریستوران بنائے ہیں۔

ڈنمارک فیملی کے بچے اب اونگھنے لگے ہیں۔ اس لیے وہ اجازت لے کر رخصت ہو رہے ہیں۔ رقص گاہ میں ایک ہنگامہ ہے۔ مغنیہ خاموش ہے۔ ایک بینڈ تیز دھنیں بکھیر رہا ہے۔ جوڑے دنیا و مافیا سے بے خبر ایک دوسرے کو تھامے تھرک رہے ہیں۔ زندگی، زندہ دلی پورے شباب پر ہے۔

جام ٹکرا رہے ہیں صراحیاں خالی ہو رہی ہیں
ہم بے نوا تنہا چائے کی چسکیاں لے رہے ہیں،
رات بھیگ رہی ہے۔

☆......☆......☆

سمندر پُرسکون ہے۔ پرندے زمین کے نزدیک ہونے کی گواہی دے رہے ہیں۔ مسافر سامان باندھے اس عرشے کی جانب رواں ہیں۔ جہاں گاڑیاں پارک کی ہوئی ہیں۔ پہلے بغیر گاڑیاں والے رخصت ہوں گے۔ اس کے بعد کاریں، کارواں، فلیکس اسٹو و بندرگاہ ہمیں خوش آمدید کہہ رہی ہے۔ چار پانچ قطاریں ہیں۔ پاسپورٹ ہاتھ میں۔

''برطانیہ کیوں آئے ہیں؟''

''سیر کرنے۔''

''یہیں رکنے کا ارادہ تو نہیں ہے۔''

''نہیں..... ہم ایک ہفتے بعد واپس چلے جائیں گے۔''

''اوکے۔''

ہمیں چھ مہینے کا ویزا مل گیا ہے۔

☆......☆......☆

یہ ان دنوں کی بات ہے جب پاکستان والوں کے لیے ہر ملک کے دروازے کھلے ہیں۔ آمد پر ویزا مل جاتا ہے۔ ایئرپورٹ ہو، بندرگاہ یا خشکی سے، ٹور برطانیہ والوں کی ہی ایک بس مسافروں کو لندن چیرنگ کراس پر چھوڑ رہی ہے۔ میں برطانیہ میں داخل ہو رہا ہوں، پہلی بار۔

بچپن نے کتابوں میں انگلینڈ کے بارے میں اتنا پڑھا ہے کہ یہ سرزمین اجنبی نہیں لگتی۔

میں نے انگریزی لٹریچر بھی بطور ایک مضمون کے پڑھا ہے۔ اس لیے چارلس ڈکنز، تھامس ہارڈی، برزنے نسٹرزر، ورڈزورتھ، شیلے، سب سے آشنائی ہے۔ آکسفورڈ اسٹریٹ، رایجنٹ اسٹریٹ، ٹریفلگر اسکوائر، پکاڈلی سرکس، سب کچھ دیکھنا ہے۔ مادام تساؤ کا عجائب گھر، موم سے بنے مجسمے۔

یہ قصہ اب یہیں ختم کرتے ہیں۔ آپ کہیں گے تو پھر لندن، بریڈ فورڈ، برمنگھم، مانچسٹر کی کہانیاں بھی سنائیں گے۔ واپسی میں دمشق بھی رکنا ہے۔ اور دوبئی کے ریگ زار بھی بلا رہے ہیں۔ مگر یہ سب کچھ آپ کی فرمائش پر ہوگا۔ اس وقت تک اللہ نگہبان۔

☆......☆......☆

یہ ملال عشق

ثناء ناز


ایثار محبت اور قربانی کی ایک تصویر ٹوبہ ٹیک سنگھ سے

لوں ادھر شہر میں جا کے مارے کو بھولوں تو نہیں جاوے گا بڑا آدمی بن کر مارا نام نہ یاد ہووے گا۔" وہ آنکھوں میں تیرتی نمی کو دوپٹے کے پلو سے صاف کرتے بولی۔

جمال اس کی گمبھیر سی آواز پر چونکا اور مسکراتے ہوئے بولنے لگا۔ "ارے نہیں بھولوں گا شبو تو فکر کاہے کو روتی ہے تارے اور اماں باوا کے واسطے تو میں پردیس جا رہا ہوں تا کہ اچھی نوکری کر کے دو چار پیسے کما سکوں۔ اب اتھرؤں کے ساتھ مجھے رخصت کرے گی اب چل رونا بند کر جھلی نہ ہووے تے......" اسکی جھیل سی آنکھوں سے جھلکتے موتی چنتے ہوئے بولا۔

☆......☆......☆

اس کی حکم عدولی کرنا تو شبو نے سیکھا ہی نہ تھا" جا جمائے اللہ سائیں تجھے اپنے حفظ وامان میں رکھے" بوجھل سی مسکراہٹ کے ساتھ بمشکل دل پر پتھر رکھ کر وہ رخصت کرتے ہوئے بولی

☆......☆......☆

جمال تو اس کے لیے متاع جان تھا۔ اس کے جانے کے بعد خود کو کمرے میں قید کر کے وہ دل کھول کر روتی تھی۔ اس کا رونا بنتا بھی تھا۔ بچپن سے لے کر اب تک اک پل بھی جمائے کے بنا نہ رہی تھی۔ وہی تو تھا ہر دکھ میں اس کا سانجھا پر اب اسے پورے پانچ سال جمال دین کی یادوں کے سہارے تنہا گزارنے تھے۔ یہ خیال ہی اس کے لیے وبال جان تھا۔

پانچ سال کی تو تھی جب سے اپنا نام جمال دین کے نام کے ساتھ سنتی آ رہی تھی۔ گو اس کا اور جمال کا کوئی خاص جوڑ نہ تھا۔ وہ سانولی سلونی رنگت اور معمولی نین نقوش والی جاہل اور جمال پنڈ کا سب سے سوہنا منڈا دراز قد سرخ اور سفید رنگت کے ساتھ وہ مردانہ وجاہت کا منہ بولتا ثبوت تھا۔

☆......☆......☆

8 سال کی تو تھی جب اس کے ماں باپ گزرے تب سے وہ اپنی تایا تائی کے ساتھ رہ رہی تھی۔ جمال ان کا اکلوتا پتر ہونے کے ساتھ ساتھ اس کا منگیتر بھی تھا۔ یہ رشتہ شبنم کے اماں ابا کی حیاتی میں ہی طے پایا تھا۔

اسے پڑھنے لکھنے کا شوق تھا مگر تائے کے گھر کی مفلسی نے حوصلے پست کر دیئے تھے۔ جیسے تیسے حالات سے نپٹتے تایا نے دونوں کو 10 جماعتیں پڑھا دیں اس کے بعد تائے نے یہ کہہ کر کے بڑی سہولت سے انھیں آگے پڑھانے سے انکار کر دیا، کہ وہ تعلیم کا فضول خرچ مزید برداشت نہیں کر سکتے۔ گھر میں بڑھتی ہوئی غربت کو دیکھ کر انھوں نے جمالے کو بھی اپنے ساتھ دیہاڑی پر لے جانے کا فیصلہ کیا تھا تا کہ وہ بھی چار پیسے کما کر گھر کا چولہا جلا سکے۔ اس نے تو چپ سادھ لی پر جمال نے تو آگے پڑھنے کی ضد ٹھان رکھی تھی۔

☆......☆......☆

گھر میں لڑائی فساد کے باوجود جب وہ ٹس سے مس نہ ہوا۔ تو شبو کو ہی اپنے دل کے سائیں کی خاطر قربانی دینی پڑی بجھتے ہوئے دل کے ساتھ پڑھائی کو خیر باد کہہ کے وہ دن بھر چودھریوں کے ہاں کام کرتی۔ اور رات گئے تک لوگوں کے کپڑے سیتی رہتی۔ بڑی کھینچ تان کر کے وہ جمالے کی فیس کے ساتھ گھر کا چولہا بھی جلائے ہوئے تھی۔

☆......☆......☆

زندگی کی الجھنوں میں کھو کر وقت گزرنے کا احساس تک نہ ہوا کہ جمال ہاتھ میں بارہویں کا رزلٹ تھامے اس کے سامنے کھڑا تھا "شبو ارے شبو ...... دیکھ پورے صوبے میں میری پہلی پوزیشن آئی ہے اب توں دیکھ اپنے دن کیسے پھرتے ہیں اس کی گہری سیاہ چمکدار آنکھوں میں یوں خمار تھا گویا کوئی محاذ فتح کر کے لوٹا ہو وہ ایک لحہ کے لیے اسکی آنکھوں میں کھو گئی۔

☆......☆......☆

یہ سب تیرا احسان ہے شبو مجھ پر۔ مجھے سمجھ نہیں آتی میں تیرا شکریہ کیسے ادا کروں وہ وارفتگی سے اس کی نازک کلائی اپنے مضبوط ہاتھوں میں تھامے ہوئے بولا۔

''چل جھلے منگ ہوں میں تیری اتنا تو فرض بنتا ہے نہ میرا تیرے لیے۔ شکر ادا کرنا ہے، تو میرے سوہنے رب کا کر جس نے تجھے اپنی مہربانیوں سے نوازا ......احسان کرنے والی میں کون ہوتی ہوں احسان تو وہ کرتا ہے مجھ پر، تم پر، ہم سب پر......اس کے احسانوں کے آگے بندے کی کیا وقعت ہے اور تو فکر نہ کر جب توں وڈا آدمی بن جاوے گا نہ تب میں سارا قرض سود سمیت واپس لوں گی تجھ سے وہ شرارت سے ہنستے ہوئے بولی۔

وہ تو چاہتی تھی اس کا جمالہ اس کی آنکھوں کے سامنے رہ کر پڑھے پر جمال لاہور میں رہ کر ڈاکٹری پڑھنا چاہتا تھا اس کی خواہش کے آگے ایک بار پھر وہ سر جھکا گئی۔

حکومت کی طرف سے مقرر کیے جانے والا وظیفہ اتنا ضرور تھا کہ وہ میڈیکل کالج کی فیس بھر پاتا۔ بڑا شہر اور بڑھتی مہنگائی اور اصل مسئلہ تو دوسرے خرچوں کا تھا جو جمال کی راتوں کی نینداڑائے ہوئے تھا۔ اسے بے چین دیکھ کر وہ کیسے چین سے بیٹھ سکتی تھی 5 مرلے کا پلاٹ اور اس کی ماں کا زیور ہی اس کی کل جائیداد تھا تائے سے کہہ کر اس نے اماں ابا کی آخری نشانی کو بھی بیچ ڈالا اور ساری رقم لا کر جمال کے ہاتھ پر دھر دی......

☆......☆......☆

''اور کتنے احسان کرے گی تو اس ناچیز پر' جمال کا سر شرم سے جھک گیا

''نہ جمالے ایسا نہ بول یار۔ دل نوں بڑی تکلیف ہووے ہے اگر اتنی ہی فکر ہے تجھے احسانوں کی جب توں ڈاکٹر بن جاوے مینوں نوا زیور بنوا دیویں، پر ایک بات یاد رکھیں میری دولت میری جائیداد اور میرا اصل زیور تو توں ہے جمالے تجھے تکلیف میں دیکھ کر یہ دولت مجھے کہاں سکھ بخش سکتی تھی اسنے بھیگے ہوئے لہجہ میں بالا آخر ہمت کرتے ہوئے اپنے دل کا راز کہہ ہی ڈالا۔

او چپ کر جا کملیئے نہ رو ہن ...... تیری کانچ سی آنکھوں میں ابھرتے آنسو میرا سکون برباد کرتے ہیں۔

ارے او وہی رانی کیوں رو رو کے ہلکی ہوئی جاتی ہے مجھے دیکھ میں نے بھی تو اپنے کلیجے کا ٹکڑا خود سے جدا کیا ہے تیرے پاس تو پورا پنڈ ہے پر وہاں پردیس میں میرا لال تو تنہا ہے اللہ جانے کہاں رہتا ہوگا کہاں سے کھاتا ہوگا شہر کی ہوا اسے راس بھی آئے گی یا نہیں تائی کی بوڑھی کمزور آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔

تائی کی اپنائیت پا کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی

''اماں میں پورے پنڈ کا کیا کروں میری تو پوری دنیا جمالے میں ہی بستی ہے۔''

☆......☆......☆

آخر پانچ سال پورے ہو ہی گئے وہ منہ پر قفل لگائے اپنی ذمہ داریاں نبھا نبھا کر ڈھ سی گئی تھی تو اس کے بے رنگ چہرے پر دھنک رنگ بکھر جاتے اور جاتے وقت وہ اس کی سیاہ آنکھوں کا سمندر پانی سے لبریز کر جایا کرتا تھا وہ جمال کے سامنے اشک بہا کر اس کا راستہ کھوٹا نہیں کرنا چاہتی تھی۔ پر نہ چاہتے ہوئے بھی کچھ باغی آنسو اس کے ضبط کو دغا دے کر گالوں پر چھلک جاتے اس کے آنسوؤں سے تو اب جمال کو چڑ ہونے لگی تھی۔

''دیکھ شبو ہر ویلے جھلی نہ بنا کر کچھ تے عقل نوں ہاتھ مار۔'' وہ درشت لہجے میں کہتا ہوا ہر بار اس کے جذبات مجروح کر کے چلا جاتا۔

☆......☆......☆

آج اس کے لیے عروج کا دن تھا اس کا متاع حیات جو آج ڈاکٹر بن کر ہمیشہ کے لیے لوٹ رہا تھا۔ شبنم کے پیر تو زمین پر ٹکائے نہ ٹک رہے تھے۔

آخر کار انتظار کی طویل گھڑیاں ختم ہو گئیں۔ ڈوبتا ہوا سورج اسے ایک روشن شام کی نوید دے کر رخصت ہو گیا شام ڈھلے گھر کے سونے آنگن میں جمالے نے اپنے قدم رکھے۔

ڈاکٹر بن کر تو جمالے کا رکھ رکھاؤ ہی بدل گیا تھا۔ وہ کھڑکی کی آڑ میں سر سے لے کر پاؤں تک بغور اس کو دیکھنے لگی جمال کی نگاہیں اپنی اور اٹھتا دیکھ کر اس نے فوراً اپنی لامبی پلکیں جھکا لیں پنڈ کا سب سے سوہنا منڈا تو وہ پہلے سے ہی تھا اب تو تعلیم نے اس کا حسن

مزید نکھار دیا تھا۔ شبنم کی نگاہیں بار بار پنسل کراس کے اجلے روشن چہرے کا طواف کر رہی تھیں۔ جو سب کچھ بھلائے اس کی ہستی سے بے خبر تایا اور تائی کے ساتھ گپیں ہانکنے میں مصروف تھا۔

☆......☆......☆

''میں تیری منگ ہوں جمالے میں اسلم سے بیاہ کیسے رچالوں جمالے تائی توں تو سمجھا اسے میرے دل نے تو سدا اس کی پوجا کی ہے اپنے سوہنے رب سے اسی کا ساتھ مانگا ہے میں اپنا آپ اسے بھلا کر کسی اور کو کیسے سونپ دوں۔'' وہ روتے ہوئے التجائی لہجے میں بولی...... دیکھ شبو زیادہ جذباتی مت بن ایک بات تو توں بھی اچھی طرح جانتی ہے کہ میرا تیرا کوئی میل نہیں ہے نہ تعلیم سے نہ شکل وصورت سے تیرے ساتھ زمانے میں چلنے سے پہلے مجھے سو بار سوچنا پڑے گا ویسے بھی مجھے ادھر شہر میں ایک ڈاکٹرنی پسند ہے اور میں اسی سے شادی کروں گا۔ توں ٹھہری گوار اور میں شہری ڈاکٹر اماں سمجھا دے اسے فالتو میں اپنا دماغ نہ کھپائے۔''

بے یقینی ہی بے یقینی تھی جو اس کی دھواں ہوتی آنکھوں میں اُمڈ رہی تھی لفظوں کے تیر چلائے جا رہے تھے اسے اپنی سماعتوں پر یقین نہیں آ رہا تھا وہ تو عرصے سے خود کو بھوکا رکھ کر اپنی ایک ایک پائی جمال پر لٹاتی چلی آئی تھی کہ بدلے میں وہ اسے اپنی محبتوں اور چاہتوں سے مالا مال کر دے گا۔

کوئی اس قدر احسان فراموش کیسے ہو سکتا ہے وہ بمشکل دیوار کا سہارا لے کر کھڑی تھی۔

''کیا کچھ نہیں...... اس نے جلدی سے لب بھینچ لیے وہ چیخنا چاہتی تھی انصاف کی بھیک مانگنا چاہتی تھی لوگوں کو چلا چلا کر اس کی بے مروتی کے قصے سنانا چاہتی تھی پر مزید بے وقعت ہونا گوارا نہ تھا۔

☆......☆......☆

اگلی سہ پہر بڑی مشکل سے وہ خود پر ضبط کرتی ہوئی جمال کے پاس آ کر بولی۔

''جا جمالے کر لے توں بیاہ محبت کے ہاتھوں اندھی ہو کے میں ہی اپنا آپ بھلائے بیٹھی تھی۔ مجھے لگا تھا محبت اوقات نہیں دیکھتی محبت کی نظروں میں تو

غزل

کچھ دن تو بسو میری آنکھوں میں
پھر خواب اگر ہو جاؤ تو کیا

کوئی رنگ تو دو میرے چہرے کو
پھر زخم اگر مہکاؤ تو کیا

جب ہم ہی نہ مہکے پھر صاحب
تم بادِ صبا کہلاؤ تو کیا

اک آئینہ تھا سو ٹوٹ گیا
اب خود سے اگر شرماؤ تو کیا

میں تنہا تھا میں تنہا ہوں
تم آؤ تو کیا نہ آؤ تو کیا

جب دیکھنے والا کوئی نہیں
جل جاؤ تو کیا بجھ جاؤ تو کیا

اک وہم ہے یہ دنیا، اس میں
کچھ کھوؤ تو کیا کچھ پاؤ تو کیا

ہے یوں بھی زیاں اور یوں بھی زیاں
جی جاؤ تو کیا مر جاؤ تو کیا

شاعر: عبیداللہ علیم

اس کی محبت ہی سب سے برتر ہوتی ہے سب سے حسین مجھے میری کوتاہی پر معاف کر دے جمالے ''......وہ اس کے سامنے ہاتھ جوڑتے ہوئے بولی۔

توں شہر جانا چاہتا ہے جا......اماں ابا کو بھی ساتھ لے جانا چاہتا ہے لے جا پر اس گھر کا سکون مجھ سے نہ چھین میں اس گھر میں تیری یاد کو محسوس کر کے پوری زندگی تنہا بتا لوں گی۔''

☆......☆......☆

''جیسی تیری مرضی شبو پر میں تیرا قرض اگلے ہی ہفتے چکتا کر دوں گا ابھی توں رہ اس گھر میں میری بیوی کے آنے سے پہلے میں خود اپنے ہاتھوں سے تیری رخصتی کر دوں گا۔ تیری اور آزمائش نہیں بنوں گا۔ بے دردی سے کہتے ہوئے وہ دروازہ پار کر گیا۔

وہ آنسو صاف کرتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئی اپنی ڈائری کھول کر چند سطریں تحریر کیں۔

''کاش میرے ماں باپ بھی زندہ ہوتے تو آج میں بھری دنیا میں تنہا نہ ہوتی۔'' اس نے لاچاری سے سوچا زخموں پر مرہم لگانا تو درکنار تایا تائی نے یوں رخ پلٹا کہ وہ اس کے قریب آ کر بھی نہ بیٹھے اسے محسوس ہوا ابھی کسی بھی پل دل پھٹ جائے گا دھڑکنیں رک جائیں گی۔ صرف محسوس نہیں ہوا سچ میں اس کی دھڑکنیں رک چکی تھیں۔ روٹی کا پیڑا پسینہ ہوتے ہاتھوں سے پھسل کر دور جا گرا ......درد کی شدت سے دل پر ہاتھ رکھتی وہ وہیں ڈھے گئی۔ تائی نے کچھ ہوش میں لانے کی کوشش کی پر وہ وہاں ہوتی تو سنتی نا وہ تو کب کی ان سے روٹھ کر کہیں اور جا بسی تھی۔

☆......☆......☆

جمال وین بڑے ہارٹ سرجن بنے پھرتے ہو نا تم......اس لڑکی کے دل تک تو نہ پہنچ پائے جو بچپن سے تمھارے ساتھ رہ رہی تھی کیسے چارہ گر ہو تم تم جو درد کا علاج جاننے کے باوجود مجھے خود موت کے منہ میں دھکیل کر چلے گئے۔

''محبت میں اپنی خواہشیں نہیں دیکھی جاتیں اور دیکھ میں نے خود کو بھلا کر تیری خواہش کا احترام کیا ہے تیری آخری خواہش بھی جلد پوری ہو جائے گی تو فکر نہ کر جمالے تو ہی اپنے ہاتھوں مجھے اس گھر سے رخصت کرے گا۔''

سچ ہی تو لکھ گئی تھی وہ اسی نے تو اپنے ہاتھوں سے اسے قبر میں اتار کر گھر سے تو کیا اس دنیا سے بھی رخصت کر دیا۔

جمالے تو بڑے مان سے کہتا ہے نہ میرا قرض چکا دے گا، تو بتا میرے کون کونسے قرض چکائے گا؟ میرے تو تجھ پر اتنے قرض باقی ہیں کہ انھیں چکاتے چکاتے تیری ہستی فنا ہو جائے گی۔ میں لاکھ گوار سہی پر اتنی کم ظرف نہ تھی کہ تیری خاطر دی گئی اپنی ایک ایک قربانی زمانے بھر کو گنواتی پھرتی۔

جمال کی آنکھوں میں بے اختیار آنسو آ گئے اس نے کانپتے ہوئے ہاتھوں کے ساتھ ڈائری کا اگلا صفحہ پلٹا......

تو سنو صاحب!
یہ میرا دعویٰ ہے تم سے
اب کی بار جو تم لوٹو گے
میں تمھیں نظر بھی نہ آؤں گی
لبوں پہ کوئی شکوہ ہو گا
نہ آنکھیں اشک بہائیں گی
میں خاموش ہو جاؤں گی
میرا ہر لفظ تمھیں ستائے گا

☆......☆......☆

وہ ٹھیک تو کہہ گئی تھی اسے اونچی اڑان اڑ کے بھی کیا ملا۔ ڈاکٹر عالیہ کو کھاتے پیتے گھرانے کا کیپٹن عالیان اس قدر بہتر لگا تھا کہ اسی وقت وہ اسے چھوڑ کر لندن جا بسی تھی۔ جب وہ اس کے لیے شبنم جیسی پر خلوص لڑکی کی چاہت کو دھتکار رہا تھا۔

سارے ملال اس کے حصے میں آئے تھے۔ احسان فراموشی کا ملال، شبنم کے قتل کا ملال، محبت کی ناقدری کرنے کا ملال، پر اب پچھتاوے کا کیا فائدہ نہ اب وقت پیچھے جا سکتا ہے نہ شبو واپس آ سکتی تھی وہ اداس ہوتا بے بس ہو کر بیٹھ گیا باقی کے آنسو بھی اس کے حصے میں آئے تھے۔

☆☆......☆☆

ادھورے بسائے آرزو

کرن شبیر

ادھورے پن میں مکمل زندگی جینے کے خواہش مند افراد کی ایک داستان / کراچی سے

فرقان سیٹھ کے بیٹے کی شادی تھی۔ رتجگے کا بھرپور اہتمام کیا گیا تھا، عزیز اقاریب وحلقہ احباب کی کثیر تعداد کمیونٹی ہال کے اندر موجود تھی، یہ تعداد صرف اور صرف مردوں پر مشتمل تھی یہاں سیٹھ حضرات اتنے آزاد خیال اور بے باک نہ ہوئے تھے۔ اپنی عورتوں کو بھی اس خصوصی محفل میں لے آئے جہاں عیاشی و مے نوشی تک کا پورا سامان تیار کیا گیا تھا۔ شادی سے ایک رات پہلے گھر سے کمیونٹی حال میں یہ رتجگا منعقد کیا گیا تھا۔ گلوکاری ، ڈرامہ تھیٹر، فنون ولطیفہ اور مجرا غرض ہر آئیٹم کا انعقاد کیا گیا تھا۔

سب سے پہلے گلوکاری کا آئیٹم پیش کیا جاتا گیا۔ نامور گلوکار اپنے ہٹ سونگز سے حاضرین کی بھرپور داد وصول کر رہے تھے ۔ یہ آئیٹم اختتام کو تھا جب بالترتیب جم کر، آئینہ مسکان اور دعا نے اپنی اپنی پائلوں کو دھیمے دھیمے چھنکاتے محفل میں قدم رکھا۔

او...... پورا ہال نوجوانوں کی شوخ سیٹیوں اور تحسین بھری پکار سے گونج اٹھا۔ سب سے پہلے خوبصورت سی کسی نازک لچکیلی شاخ جیسی جھومر نے اسٹیج پہ قدم رکھا، اتنی غضب کی ٹھنڈ میں سندوری رنگ کی اور بغیر آستینوں والی چھوٹی چولی میں نمایاں ہوتا اس کا نازک سا اور لچک دار جسم ناظرین کے جسموں کو گرمائش دینے لگا۔

اس کے پیچھے پیچھے آئینہ چڑھی بیلی الٹے آنچل کی ساڑھی میں اس کا دراز قد نمایاں ہو رہا تھا۔ سیلولیس مختصر سے بلاؤز میں اسکا گورا آئینے جیسا بدن اس کے جذبات ابھارنے میں معاون ثابت ہوتا۔ آج کی محفل میں انھیں آنکھوں میں لذت اور دل میں اُمنگ جگانے کے ہی تو منہ مانگے پیسے مل رہے تھے۔ کبھی کبھی ایسا موقعہ تو ان کے ہاتھ میں آتا تھا جس سے ان کی فاقہ کشی کو اڑان مل جاتی۔

دعا اور مسکان بھی کچھ کم نہ لگ رہیں تھیں چاروں سر سے پیر تک ہار سنگھار کے ساتھ اداؤں کے ہتھیار سے لیس تھیں۔ ابھی ان کے آئیٹم میں کچھ دیر تھی اپنی آمد پر داد تحسین ملنے کے بعد وہ لوگ اسٹیج سے نیچے اتر آئیں ۔ رات کا آخری پہر چل رہا تھا ایک کے بعد ایک چاروں انڈین ہیجان خیز گانوں کی دھن پر رقص کر چکی تھیں۔ تمام شائقین میں سے کچھ پی کر جھوم رہے تھے اور کچھ بن پیئے ہی۔ جھومر، آئینہ، مسکان اور دعا کی دلبر ادائیں، مشاق رقص اور چھیڑ چھاڑ سب پر اک نشہ طاری کر رہا تھا۔ کچھ دور دور سے دیکھنے کی حد تک مسرور تھے اور کچھ منچلے ''فائدہ'' اٹھانے کو آگے سے آگے بدمست ہاتھیوں کی



طرح منڈلا رہے تھے۔

ایک پینتالیس سالہ آدمی کے چہرے پر حقیقتاً تجربہ کاری کی خباثت جھلک رہی تھی۔قریب آیا" یہ لے ہزار کا نوٹ ..... پروگرام کے بعد خاموشی سے میری گاڑی میں جا کر بیٹھ جانا..... باقی حساب کتاب خوش کرنے کے بعد ہو جائے گا۔گاڑی کا نمبر بتانے کے بعد اس نے چپکے سے ہزار کا نوٹ تھما دیا۔جھومر وہ نوٹ اپنے گریبان میں ڈال کے اُسے آنکھ مارتے ہوئے اسٹیج کے فرنٹ پہ آ گئی تھی۔

"او نیستی ماری اب جا..... شام ڈھلتی جا رہی ہے پر اس کی کمر ہی سیدھی نہیں ہو رہی۔سب ہی کما کما کر آ ئی ہیں اور صبح سے پہلے اپنے اپنے کاموں میں لگی ہوئی ہیں اور اب تک پڑی اینٹھ رہی ہے۔"

"کیا ہے اماں..... آرام کرنے دے دن چڑھے تو آ کر سوئی ہوں" وہ بیزاری سے سیدھی ہوتے ہوئے آنکھیں بند کیے اپنی گرو سے مخاطب ہوئی تھی۔

"آئینہ ابھی تک نہیں آئی تھی" اٹھ کر تو ہی کچھ کھانے پینے کا انتظام کر دے..... آج جمعرات ہے دعا اور مسکان تو علاقے کے گھروں کے دروازے کھٹکھٹانے نکلی ہوئی ہیں" اللہ کی مار پڑے ان کنجوس لوگوں پر۔دس روپے اللہ کے نام پر نکالتے ہوئے ان کی جان نکلتی ہے۔پانچ پانچ کے سکے پکڑا دیتے ہیں۔کئی گھر تو وہ بھی دینے کی زحمت نہیں کرتے۔ادھر ہماری ٹانگیں علاقے میں پھر کر ہی جواب دے جاتی ہیں، تب کہیں جا کر چند سو آتے ہیں۔"

"اماں ..... ہم جتنا بھی کما لیں ..... پر تیرے پاس کمی ہی پڑی رہے گی۔آئینہ نے اسی دم بولتے ہوئے اندر قدم رکھا اس نے سب سے پہلے بڑا سا بیگ ایک سائیڈ پر اچھالا پھر سینڈل پیروں سے نکالتے ہوئے وہیں گداز کارپٹ پر ڈھیر ہوئی۔

"تم لوگوں کے سجنے سنورنے کے اخراجات کتنے ہیں یہ نہیں دیکھتی ہو..... اور پھر جب کبھی دھندے میں تیزی نہیں ہوتی تو یہی آج کا کمایا اور کل کے لیے بچایا ہوا ہی تو کام آتا ہے۔"ان چاروں کی گرو نے صاف صاف جتایا۔آئینہ یونہی پڑی رہی۔

"چل اٹھ...... اب رات کے لیے کچھ پکا لے میں نے دوپہر میں بھی کچھ نہیں کھایا تھا۔" "تو ہوٹل سے کیوں نہیں منگا لیتی؟ سچ اماں میں بہت تھکی ہوئی ہوتی ہوں، آج تو کوئی لفٹ بھی نہیں ملی۔ بسوں میں دھکے کھاتے ہوئے آئی ہوں۔ وہ اپنی جگہ سے نہ ہلی "بیوٹیشن کا کورس کرنے کا تجھے ہی خمار اٹھا ہے، تو پھر بسوں کی خواری بھی بھگت" جم کر کہتے ہوئے بالوں میں کیچر لگاتی اٹھ بیٹھی۔ "تمہاری شکلوں کو سدھارنے کے لیے ہی میں یہ کورس کر رہی ہوں...... ورنہ مجھے کیا پڑی ہے میرا تو ناک نقشہ جلد رنگت اور نزاکت سب ہی پچھاڑے دن ہے۔"

"کمی مجھ میں بھی نہیں ہے، کمانے میں تجھ سے آگے ہوں۔" جھومر روبرو ہو کر چڑتے ہوئے بولی آئینہ کو اپنی گوری رنگت کا بڑا نشہ تھا۔ مگر اس میں جی کو بھانے کے کم گر تھے۔ وہ جھومر کی طرح بے باک نہ تھی۔

"اب لڑنا بند کرو...... اور اپنے اپنے کام سے لگو" گرو نے گھر کا اور باہر نکلنے کا دوپٹہ اٹھایا۔

"سن ری آئینہ...... ! بھنڈی گوشت بنا لے روٹیاں ہوٹل سے لے آؤں گی اور جھومر...... ! آج تو فرقان سیٹھ کے بیٹے کی شادی میں بھی ضرور جانا...... بڑے لوگ ہیں عیاشی کے لیے موقع تلاشتے ہیں...... کیا پتہ آج بھی "کام" کے لیے لے جائے۔ آئینہ دعا اور مسکان اڈے پر چلی جائیں گی گرو کہہ کر باہر نکل گئی۔

جھومر نے ایک بھرپور انگڑائی لی اور گلابی تہکن زدہ لباس کے ساتھ ٹیرس پر چلی آئی۔ اسی ڈرائینگ روم سے ملحق ٹیرس کا ایک زینہ باہر کو بھی اترتا تھا، اسی زینے سے ابھی گرو باہر نکلی تھی۔ بہت خاص خاص لوگ اپنے اپنے کاموں کے لیے اسی زینے سے ڈرائنگ روم تک آتے تھے۔ پورے گھر میں یہی واحد ایک بالائی کمرہ بے حد پر تعیش تھا باقی پورا گھر کسی غریب مزدور کا کوارٹر لگتا تھا۔ اور یہ گھر گرو کے نام پر ہی کا تھا۔ اسی نے ہی چاروں کو پناہ دی ہوئی تھی۔

بہت سی آئیں اور چلی گئیں مگر ان چاروں کو گرو سے اور گرو کو ان سے بہت لگاؤ تھا۔ یہ چاروں زمانے کے چال چلن سے واقف ہوتے ہوتے اپنے آپ کو استعمال کرنے میں طاق ہو چکی تھیں۔ اچھا کماتی تھیں۔

اسی لیے گرو کو ان پر ناز تھا اور کتنوں ہی نے گرو سے تربیت لے کر اسی علاقے میں الگ اپنا دھندا کرنے کی کوشش کی مگر گرو نے انکی چلنے نہ دی۔

آئینہ آج کل بیوٹیشن کا کورس ایک نامور اور بڑے بیوٹی پارلر سے کر رہی تھی۔ "کیسی ہے جھومر سامنے ہی بڑی سی پرچون کی دکان کے مالک نے جھومر کو سامنے آتے ہوئے دیکھ کر آواز لگائی۔ "سنا ہے کل سیٹھ فرقان کے گھر بہت بڑا پروگرام تھا۔ اچھا خاصا کما لیا ہوگا تو نے اور کتنے دیوانے ہیں تیرے؟" معنی خیزی سے پوچھا گیا "چل چل زیادہ باتیں نہ بنا تو یہاں دکان پر بیٹھ کر کما رہا ہے، ہم نے کبھی تجھ سے پوچھا کہ کتنا کمایا...... کچھ بھجوا دے ناشتہ کروں گی" وہ نخوت سے بولتے ہوئے پلٹ گئی "ہاں ہاں بھیجتا ہوں...... جانتا ہوں ہماری رات ہوتی ہے تو تیرے لیے دن نکلتا ہے...... وقت کو اپنی مرضی چلانے کی بادشاہی ہے تو، تو...... اندر جاتے ہوئے جھومر نے سنی تھی...... منہ پر لوگ جتنی بھی واہ واہ کریں منہ پیچھے ان کے متعلق کیسی باتیں کرتے ہیں، وہ جانتی تھی۔ اگر اس کمرشل علاقے میں اتنی بدنام ہونے کے باوجود کنبہ رہ رہا تھا تو وہ صرف "بھتے" کے زور پر اعلیٰ حکام کو بھتہ پیش کر کے انہوں نے پرمیشن لی ہوئی تھی۔

ہر ویک اینڈ ان کے لیے بے حد اہم ہوتا تھا۔ پورے ہفتے اڈے پر کام نہ ملے، پر ویک اینڈ کی رات وہ سب مل کر اتنا کما لیتی تھیں کہ پورا ہفتہ آرام سے گزر جاتا، اس لیے ان سے گرو خوش رہتی تھی۔ اگر شادی بیاہ کا فنکشن مل جاتا تو بڑی اچھی کمائی ہوتی تھی۔

"آج پھر تو نے ہوٹل سے منگوالیا" دوا کھانے کے سبب بخار کو شکست دے کر اٹھتے ہی گرو کو کھانا دیکھ کر تاؤ آ گیا تھا۔ اس نے ان تینوں کی تیاری کو نظر انداز کر کے آئینہ کو گھورتے ہوئے جھاڑا تھا۔

"کتنی بار کہا ہے اتنی مہنگائی کا زمانہ ہے ہوٹل کا کھانا ہم پانچ جانوں کا پیٹ بھرنے کے لیے کم پڑتا ہے۔ پر یہ بات تیرے دماغ میں نہیں گھستی...... تجھے ہی اچھا کھانا پکانا آتا ہے پانچ دس منٹ اگر باورچی خانے میں چلی جائے گی تو گھس نہیں جائے گی...... پر تجھے تو میری......"

"اماں یہ بک بک چھوڑو۔ آج کے کھانے کا خرچہ

میں تجھے الگ سے لا دوں گی۔ آئینہ پوری طرح سجی سنوری اپنے شانوں تک آتے بالوں میں برش چلاتے چڑ کر بولی۔

''بس تو سوتی رہ اور کسی اور علاقے کی ''کٹاری'' ہمارے دھندے پر شب خون مار جائے گی۔''

کل جب اسے اپنے اڈے کے پاس والی سڑک پر کھڑے دیکھا تو نظر انداز کر دیا مگر جب وہ آج لفٹ کے انتظار میں کھڑی تھی۔ اور ایک وائٹ ہائی ایس نے اس کا اشارہ نظر انداز کر کے تھوڑا آگے اس اجنبی کے اشارے پر اسے لفٹ دے دی تو جانے اور آنے والے تمام وقت اس پر غصہ طاری رہا...... اسے یاد آیا تھا کہ کل بھی اسے وہاں دیکھا تھا۔ گرو کے فکر مندی سے پوچھنے پر اس نے اسے ساری تفصیل بتا دی۔

''میرے علاقے میں کوئی میرا کام ہتھیا لے یہ مجھے گوارا نہیں۔ دیکھتی ہوں اس خبیث کو گرو کو بھی بے حد غصہ آیا۔

''جھومر...... چل اٹھ میرا چندا...... کھانا کھا کر تیاری پکڑ'' ''سونے دے اماں......!'' میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے میں آج نہیں جاؤں گی'' جھومر بخار میں نیم غنودگی میں بولی

''پاگل ہوئی ہے'' گرو کو اور غصہ آیا

''ہفتے کی رات ہے بہترین گاہک سڑک پر منڈلائیں گے اور چھوٹے موٹے سے دل بہلانے والوں کے لیے دعا اور مسکان کافی ہیں۔ پر کام پر لے جانے والوں نے تجھے اور آئینہ کو ہی دیکھا ہے۔'' وہ اپنی ہی زبان میں اسے سمجھانے کی کوشش کرنے لگی تھی۔

''اماں! آج میں نہیں جاؤں گی تو قیامت نہیں آ جائے گی'' جھومر اچھی خاصی چڑ گئی غنودگی بھی ٹوٹ چکی تھی۔

''دیکھ میرا بچہ...... ہم جس قبیلے کے لوگ ہیں اگر جسم کی تکلیف اور بیماری کو خود پر حاوی ہونے دیں گے تو ہمیں پیٹ پر پتھر باندھ کر رہنا پڑیگا...... جو شوق شوق میں ہماری دنیا میں شامل ہوتے ہیں۔ ان نامرادوں کا کچھ نہیں بگڑتا، کام دھندا اچھال جانے پر وہ تو واپس اپنے لوگوں میں لوٹ جاتے ہیں، بال بچے دار زندگی گزارتے ہیں، پر ہمارے لیے تو اس ظالم زمانے نے جگہ محدود کر دی ہے، عزت سے روٹی کمانے نکلتے ہیں تو دھتکارے جاتے ہیں۔ ہمارا مذاق اڑایا جاتا ہے۔ یوں ہماری دنیا ہمارے جیسے لوگوں تک محدود کر دی جاتی ہے۔ ہم خود ہی ایک دوسرے کے ماں باپ ہیں بہن بھائی ہیں۔ ہمارے اپنوں نے ہمیں بے شک چھوڑ دیا ہو۔ مگر ہمیں اپنے لیے جینا ہے اپنے پیٹ کا رزق حاصل کرنے کے لیے اور ضروریات زندگی پانے کے لیے کماتے ہیں۔ ہم معاشرے کے ٹھکرائے ہوئے لوگ ہیں ہم ہی ایک دوسرے کا سہارا ہیں چل اٹھ اب جلدی کر۔''

''کیوں ری......! تجھے شرم نہیں آتی ہماری روزی پر ڈاکہ ڈالتے؟'' اگلے روز ہی سر شام گرو نے اس سرخ سفید، حسین و جمیل، نازک، اندام کو پکڑا تھا۔ فیروزی کلر کا جدید اسٹائل میں بنا سوٹ نازک سراپے پر بے حد اٹھ رہا تھا۔ رنگت بے حد ستھری، نین نقش اتنے خوب صورت کہ گرو بھی پہلی نگاہ پڑتے ہی دل تھام کے رہ گئیں ''ہائے ایسی معصوم اور چکنی صورت ہمارے کام کا تو بیڑا غرق کر دے گی'' گرو نے دل میں سوچا تھا پھر فوراً ہی اس پر دھاوا بول دیا۔

''کون ہے تو کہاں سے آئی ہے......؟ گرو کا لہجہ سخت اور تیکھا ہوا تھا۔ نووارد کی آنکھیں بے بسی سے لبا لب بھر گئیں مگر لب آپس میں پیوست ہی رہے۔

''اری! بولتی کیوں نہیں، گونگے کا گڑ کھا کر آئی ہے کیا؟ زیادہ معصومیت دکھانے کی ضرورت نہیں ہے تیرے نین کٹوروں کا پانی میرا دل موم نہیں کر سکتا...... یہ میرا علاقہ ہے میری مرضی کے بغیر کوئی بلبل یہاں داخل ہو کر تین تیرہ نہیں کر سکتی اس کی چپ گرو کو غصہ دلانے لگی۔

''میں اپنے علاقے اور اپنے لوگوں سے یہاں بہت مجبور ہو کر آیا ہوں'' ایک کمسن بے حس سی آواز سنائی دی ''آیا ہوں'' ...... گرو کو ہنسی آ گئی تھی۔

''زنانہ لباس پہن کر دھندے کے لیے کھڑی تو ''آیا ہوں'' کہہ رہی ہے جعلی نامرد ہے کیا......؟'' گرد کے لہجہ میں تضحیک تھی مقابل تڑپ تو ہی اٹھا۔

اس نامردی کے طعنے اور آگاہی نے ہی تو میری زندگی تباہ کر دی ہے گرو جی...... اٹھارہ برس کی بے فکری زندگی پر آگہی کا عذاب کیا اترا، درد کا پہاڑ گویا شانوں پر اٹھاتے پھر رہا ہوں ہر لمحہ حوصلہ ٹوٹتا ہوا محسوس ہوتا ہے

۔مگر وجود پھر بھی سالم ہے اس نے اپنے نرم ملائم آنچل سے واٹر پروف مسکارا لگی پلکوں کی گہری گہری خماد آلود آنکھوں سے صاف کرتے ہوئے کہا تھا۔

''زیادہ ہیر! پھیری کی باتیں نہ کر سیدھے سیدھے بتا کہاں سے آئی ہے تو، کیا ارادے ہیں تیرے؟

''پنجاب کے ایک گنجان قصبے سے آیا ہوں جی...... پڑھنے لکھنے کا شوق رکھتا تھا، مگر غربت کے ہاتھوں تنگ رہنے والوں میں سے میری ماں تھی۔ بچپن کی منگ سے سترھویں سن میں اس نے سادگی سے میرا بیان رچاہ دیا بس یہاں سے ہی میری بدقسمتی کے دن شروع ہوئے جو عیب میرا چھپا ہوا تھا وہ سارے زمانے پر ظاہر ہو گیا۔ جو منگ میری خوب صورتی پر عاشق تھی، اس کے لیے میری کمی ناقابل قبول تھی۔ میری ماں کا بھولا نے اور اس کے ساتھ مل کر محنت اور مشقت کا ارمان خاک میں مل گیا اس کے بیٹے کی وجہ سے اس کی بہو سارے زمانے میں اس کا منہ کالا کر دیا تھا۔ میری ماں مجھ سے سیدھے منہ بات نہ کرتی تھی، تو قصبے کے لوگ تضحیک اڑانے میں پیچھے کیوں رہتے۔

میں نے بددل ہو کر قصبہ چھوڑ دیا شہر آیا اور ایک چھپر ہوٹل میں 'چھوٹے' کا کام کرنے لگا تعلیم تو اتنی تھی ہی نہیں جو کوئی ڈھنگ کا کام ملتا۔ کم عقل بھی تھا، جب ہی ہوٹل کے ایک مستقل گاہک کو اپنے حالات کہہ سنائے۔ اس نے اچھی نوکری کا لالچ دے کر مجھے اپنے ساتھ چلنے کی آفر دی...... میں اس کے ساتھ ہو لیا۔ مگر گرو جی...... جانتے ہو اس آدمی نے مجھے کیا نوکری دی؟ ایک سستے سے ہوٹل میں گندی قوم کے بدبودار جسموں کو خوش کرنے کی نوکری...... وہ غلیظ انسان نما جانور مجھے بھنبھوڑتے تو میری روح تک بلبلا اٹھتی تھی، انسانیت کا اتنا کریہہ روپ کبھی میں نے تصور تک نہ کیا تھا۔

میری زندگی تو اسکول، گھر اور علاقے کی قریبی جانی پہچانی گلیوں تک محدود تھی۔ مجھے اپنے عیب تک کی خبر نہ تھی۔ اگر میری شادی نہ کی جاتی انسان کتنا بے درد ہے۔ کسی کا ایک عیب اس پر کھل جائے تو وہ گلی محلے اور زمانے میں ڈھنڈورا پیٹ دیتا ہے۔ اللہ تو انسانوں کے ہزاروں عیبوں سے واقف ہے۔ پھر بھی ہر ایک عیب پوشیدہ رکھتا ہے۔ لوگ اتنے بے صبرے کیوں ہیں گرو جی......؟ انسان ہی انسان کو ذلت بھری زندگی گزارنے پر کیوں مجبور کر دیتا ہے؟'' کہتے کہتے اس کے آنسو بھل بھل بہہ رہے تھے۔ گرو کی آنکھیں بھی اسے روتا دیکھ کر نم ہو گئیں تھیں۔

میں وہاں سے بھاگ کر کراچی آیا تھا کہ یہاں باعزت کام کروں گا۔ مگر جس کی قسمت پر باعزت زندگی کے دروازے بند ہو گئے ہوں وہ جانے انجانے ذلت ہی کے راستے پر جا کھڑا ہوتا ہے۔ میں بھی روزگار حاصل کرنے کے چکر میں بھوکے پیٹ جس جس فٹ پاتھ پر رات سویا وہاں کی سڑک پر میں نے سب کچھ مختلف طریقے سے ہوتے ہوئے دیکھا۔ نہ چاہنے کے باوجود تن کا پھٹا لباس، پیر کی ٹوٹی چپل، پیٹ کی بھوک اور بے سائبانی مجھے اس بہروپ میں لے آئی۔

پچھلے پانچ ماہ نے مجھے سترہ برس کے کمسن نوجوان سے ستر برس کا بوڑھا بنا دیا۔ یہ بہروپ کم از کم مجھے ضروریات زندگی تو دے رہا ہے، میری بھوک تو مٹاتا ہے...... مگر میں اس بہروپ میں خوش نہیں ہوں۔ گرو جی!'' وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دیا گرو نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر تسلی دی۔

''ہوں...... نیا نیا درد ملا ہے...... کچھ عرصے تو رلائے گا پھر زندگی معمول پر آ جائے گی...... یہ دنیا ہم جیسوں کو چھوت کی بیماری سمجھتی ہے۔ جیسے کوڑھی کے مریض کو صحت مند انسانوں سے الگ کر دیا جاتا ہے...... ایسے ہی ہماری ایک الگ دنیا بنا دی جاتی ہے، ۔جہاں پر لوگ ہم پر اپنی دولت تو نچھاور کرتے ہیں مگر اپنے برابر حق دینا گوارا نہیں کرتے۔

''میری پناہ میں آئے گی تو؟'' گرو نے غمگین ہو کر کہتے کہتے پوچھا۔ نو وارد کا سر اثبات میں ہل گیا ''نام کیا ہے تیرا؟'' ساتھ ساتھ چلتے چلتے پوچھا تھا۔

''نور الاسلام''...... اس نے ہائی ہیل کی سینڈل میں قید پیروں سے چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتے ہوئے جواب دیا تھا۔

''ہوں...... جھومر، مسکان، دعا اور نور...... آج سے میری چار نہیں پانچ بیٹیاں ہیں'' گرو کی گردن فخر سے تن گئی مگر نور الاسلام کا سر کسی احساس گناہ سے مزید جھک گیا تھا۔

☆☆......☆☆



کرشمہ قدرت کا

فیصل ندیم بھٹی

قدرت کی مہربانی سے لطف اندوز ہوتی ایک کہانی / سرگودھا سے




اتوار کا دن تھا سہ پہر کو میں ایک دوست کے ولیمے سے فارغ ہو کر جب گھر پہنچا تو گھر کے دروازے کے ساتھ ایک نئی سوزوکی کار میری نظروں کے سامنے تھی سوچ رہا تھا کہ کون مہمان ہیں؟ کہاں سے آئے ہوں گے۔؟

☆......☆......☆

چند لمحے بعد میں گھر کی دہلیز کو عبور کرتے ہوئے جب صحن سے گزرا تو وہاں پر میری والدہ خالہ نسرین ان کی بیٹی ناصرہ اور بیٹا شکیل بیٹھے تھے۔ میری نظر خالہ نسرین کے چہرے پر پڑی تو خدا یاد آ گیا۔ خالہ نسرین کے چہرے پر اتنی نورانیت سفید لباس میں ملبوس بڑی سفید چادر اپنے اوپر اوڑھے بیٹھی ہوئی تھیں۔ امی نے بتایا کہ یہ خالہ نسرین ہیں پچھلے ہی دنوں حج بیت اللہ کی سعادت حاصل کر کے آئیں ہیں۔ میں خالہ نسرین سے ملا انہوں نے میرے کاندھے پر شفقت بھرا ہاتھ پھیرا۔

مجھے ان سے مل کر خوشی بھی بہت ہوئی خالہ نسرین جن کو میں تقریباً دس سال بعد ملا تھا۔ باتوں باتوں میں خالہ کے ماضی کا ذکر چل پڑا ان کا ماضی ان کی زبانی تحریر کرتا ہوں۔

سترہ سال کی عمر میں شادی ہوگئی شادی کے ایک سال بعد شکیل پیدا ہوا پھر دو سال کے بعد کاشف اور پھر بیٹی ناصرہ گویا شادی کے پانچ سال بعد میرے تین بچے ہو گئے۔ پھر زندگی میں ایک ایسا دن آیا جو میرے لیے کرب اور اذیت بن گیا۔ میرے خاوند کا ایک ایکسیڈنٹ میں انتقال ہوا تھا۔ ہر طرف ماتم ہی ماتم سارا گھر سوگوار تھا مجھے تو اپنا ہوش ہی نہ رہا جب ان کی میت گھر میں آئی تو گویا میرے پاؤں تلے زمین نکل گئی ہو۔ شکیل کے ابا کے دنیا سے جانے کے بعد گھر وہ گھر نہ رہا اب تو مجھے اپنے ہی گھر کے در و دیواروں سے خوف آنے لگا تھا۔ شکیل کے ابا کی جدائی کے بعد گھر میں تنہائی نے ڈیرے ڈال لیے تھے۔ ان کے جانے کے بعد سب کچھ یکسر بدل کر رہ گیا۔

☆......☆......☆

خیر عدت کا عرصہ پورا ہوا تو میں نے خود کو سنبھالنے کی کوشش کی اور اپنے بچوں کے بارے میں ہر وقت آنکھوں میں آنسو ہی رہتے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے اولاد تو دی ہے لیکن اولاد دے کر بچوں کے باپ کا سہارا مجھ سے چھین لیا گیا۔ کچھ عرصہ تو رشتہ داروں

نے گھر کے انتظامات کا بندوبست کیے رکھا لیکن آخر کب تک؟۔
گھر میں فاقوں کی نوبت آنے لگ گئی میری تو سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ لیکن آخر کار میری ایک کزن ایک دن میرے گھر آئی اور اس نے مجھے تسلی دی کہ جب دنیا کے سارے رشتے چھوڑ جاتے ہیں مگر اللہ تعالی اپنے بندوں کو کبھی تنہا نہیں چھوڑتا۔

☆......☆......☆

پھر میں نے دو گھروں میں کام کرنا شروع کر دیا۔ صبح ہوتے ہی اپنا کام کرنا اپنے بچوں کو ناشتہ بنا کر دینا پھر ایک گھر میں کام کیا تھا۔ جھاڑو دینا برتن دھونا کپڑے دھونا اور کمروں کی صاف صفائی کبھی کبھار تو یوں ہوتا کہ جب بیگم صاحبہ کے مہمان ہوتے تو برتن دھوتے دھوتے شام ہو جاتی اور ہاتھ بھی درد کرنے لگتے۔ میں جن لوگوں کے گھر کام کرتی تھی ان کے بچوں کے پرانے کپڑے وہ مجھے دے دیتی اور بیگم صاحبہ اپنے کپڑے مجھے دیتے تھے۔ اس طرح زندگی کا پہیہ آہستہ آہستہ چلنے لگا۔ دوسرے صاحب کی بیگم بھی اچھی تھی وہ اکثر اوقات کھانا بھی دے دیتی لیکن جتنا میں ان کا کام کرتی تھی اس کے حساب سے مزدوری تو نہ تھی لیکن مجبوری تھی۔ اور یہ بڑے لوگ ہم جیسے غریبوں لوگوں کی مجبوریوں سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں لیکن سارے امیر لوگ ایک طرح کے نہیں ہوتے کئی احباب میں انسانیت کی ہمدردی بھی ہوتی ہے۔
یوں وقت گزرتا گیا میرے بیٹے شکیل نے آٹھویں کلاس میں فرسٹ پوزیشن حاصل کی کاشف نے ساتویں کا امتحان پاس کیا ناصرہ بیٹی نے چھٹی کا امتحان پاس کیا۔ اپنی جان کو دکھوں میں ڈال کر رات دن کام کر کے اپنے بچوں کے لیے کمائی تھی مجھے کسی



سے مانگنا اچھا نہیں لگتا تھا۔ کیوں کہ خیرات لینے سے بہتر ہے کہ انسان اپنے ہاتھوں سے کوئی نہ کوئی کام کرے۔
ایک دن شکیل کو بہت تیز بخار ہوا دوائی لینے کے بعد بھی کوئی خاص آرام نہ آیا تو ڈاکٹر نے شہر لے جانے کو کہا۔ بیگم صاحبہ سے تین سو روپے لیے اور شکیل کو لے کر شہر سول اسپتال میں آئی تو ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ بچے کو ٹائیفائیڈ ہوگیا ہے اسے کچھ دن اسپتال میں داخل رہنا پڑے گا میں نے ڈاکٹر صاحب کو بتایا کہ میں تو ایک بیوہ ہوں غربت کی چکی میں پس رہی ہوں میرے پاس تو اتنے پیسے بھی نہیں ہیں اپنی ساری کہانی میں نے ڈاکٹر صاحب کو بتادی۔
ڈاکٹر صاحب بھی بہت مہربان اور شفیق انسان تھے۔ انہوں نے مجھے کہا کہ اگر اسپتال میں تمہاری نوکری لگ جائے تو کام کرلو گی مجھے اس وقت تو بڑا عجیب لگا کہ میں شہر میں کس طرح سب کچھ کرسکوں گی لیکن ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ سرکاری کوارٹر بھی مل جائے گا۔

☆......☆......☆

یوں میں گاؤں سے شہر آ گئی اپنے بچوں کو لے کر میں ہسپتال میں بھی کام کرتی اور ڈاکٹر صاحب کے گھر بھی ان کا کام کرتی تھی۔ بہت ہی نرم دل تھی ڈاکٹر صاحب کی اہلیہ زرینہ صاحبہ یوں شہر آنے پر زرینہ صاحبہ نے مجھے بہت تسلی دی مجھے بہت سہارا دیتی تھیں۔ زرینہ باجی کہا کرتی تھیں کہ اللہ تعالیٰ کسی کی محنت کو کبھی ضائع نہیں کرتے۔
وقت گزرتا گیا شکیل نے میٹرک کرنے کے بعد گارمنٹس کی فیکٹری میں کام کرنا شروع کر دیا۔ کاشف نے بھی میٹرک کرنے کے بعد بھائی کے ساتھ فیکٹری میں کام کرنا شروع کردیا یوں زندگی میں خوشحالی کے دن لوٹ آرہے تھے۔
ڈاکٹر صاحب کا ایک بیٹا یورپ میں جاب کرتا ہے۔ گذشتہ دس سال سے بہت ہی اچھا انسان ہے 4 سال سے میرے بیٹے شکیل کو یورپ لے کر گیا وہاں اس کی جاب لگوائی کاشف نے گارمنٹس کی اپنی فیکٹری کھول لی اب کاشف لاہور میں اپنی گارمنٹس کی فیکٹری چلا رہا ہے۔ اور شکیل یورپ میں ہوتا ہے میری ساری محنت کا پھل مجھے مل گیا ہے۔

☆......☆......☆

اللہ تعالیٰ کا میں جتنا شکرادا کروں کم ہے آج شہر میں دو منزلہ مکان میرا اپنا ہے اور گاڑی بھی اللہ تعالیٰ نے دی ہے۔ اور اللہ کے فضل و کرم سے اس سال میری بیٹی ناصرہ اور شکیل بیٹا حج بیت اللہ کی سعادت حاصل کر کے آئے ہیں۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کو حج بیت اللہ کی سعادت نصیب فرمائے۔
آخر میں، میں صرف یہی کہوں گی کہ جب قدرت مہربان ہو تو اللہ تعالیٰ ہر انسان پر لطف و کرم کی بارشیں نازل ہوتی ہیں۔

☆☆......☆☆

سال نو مبارک ہو!

سب سے پہلے اس دعا کے ساتھ سال نو کی مبارک باد قبول فرمایئے کہ خدا کرے، یہ سال ہماری قوم و ملک کے لیے اور پورے عالم اسلام کے لیے مبارک ثابت ہو۔
ہر گزرنے والا سال اپنے پیچھے بہت سی اچھی بری یادیں چھوڑ جاتا ہے۔ یہ یادیں ہیں، ان کامیابیوں اور ناکامیوں سے دراصل سبق حاصل کرتے ہیں اور یہی درس خوش آئند مستقبل کا ضامن بن سکتا ہے۔ انفرادی طور پر بھی اور اجتماعی طور پر بھی۔ کیا آپ نے کبھی خود احتسابی سے کام لیا؟ اگر نہیں تو اس مرتبہ تھوڑی سی دیر کے لیے یکسوئی کے ساتھ سوچئے کہ آپ نے گزشتہ سال کیا کھویا، کیا پایا؟ یہ سوچ آپ کو وہ غلطیاں نہیں دہرانے دے گی جو ناکامیوں کا باعث بنی تھیں۔
مرزا اسہام مرزا کی کتاب 'جاگتے رہنا' سے اقتباس

سیوا کا میوہ

ام عادل

بے لوث محبت اور نیکی کا صلہ لیے ایک خاص کہانی / کراچی سے

نفیسہ خاتون بیوہ تھیں اور ان کا اس دنیا میں دو لالچی بھائیوں کے علاوہ اور کوئی نہ تھا اولاد اللہ تعالی نے دی نہ تھی شوہر سلیم بیگ پانچ سال پہلے اس بے رحم دنیا میں اکیلا چھوڑ گئے۔ شکر ہے سر چھپانے کو اپنا گھر تھا۔ اُن کے شوہر کی وفات پر بھائیوں نے بہت چاہا کہ نفیسہ بیگم مکان فروخت کر کے کسی بھائی کے گھر میں شفٹ ہو جائے نفیسہ بہن ان کی بڑی بہن تھیں بھائیوں کی لالچی طبعیت اور نیتوں سے اچھی طرح واقف تھیں کہ ان کے لالچی بھائیوں کو ان کی تنہائی کی فکر نہیں بلکہ وہ یہ مکان ہتھیانے کے چکر میں ہیں نفیسہ بیگم کے شوہر سلیم بیگ جب حیات تھے تو وہ اکثر اس موضوع کو چھیڑا کرتے تھے۔

☆......☆......☆

وہ کہتے تھے ''بیگم موت ایک اٹل حقیقت ہے کس نے پہلے جانا ہے کس نے بعد میں جانا ہے خدا کے علاوہ اور کوئی نہیں جانتا ہماری پوری زندگی کا حصول یہ ایک 120 ایک سو بیس گز کا گھر ہے خدا کی اس دنیا میں بہت سے حقیقی اور غربا اور مستحق افراد موجود ہیں میری دلی آرزو ہے، کہ ہماری زندگی میں کوئی حقیقی مستحق ہم سے آ کر ٹکرائے جس کے حوالے ہم اپنا یہ گھر کر جائیں وہ اس میں رہے اور ہمارے لیے دعائے خیر کرتا رہے۔ کاش یہی گھر ہمارے لیے صدقہ جاریہ بن جائے ورنہ بصورت دیگر تمہارے بھائی اسے ہڑپ جائیں گے۔ اور کبھی بھول کر بھی ہمارے لیے کلمہ خیر ان کی زبان سے نہیں نکلے گا میں سوچتا ہوں اگر تم مجھ سے پہلے گزر گئی تو میں ایک دن بھی اس میں تنہا نہیں رہوں گا اسے کسی ٹرسٹ کے حوالے کر کے خود بزرگوں کے ویلفیر آشیانے میں منتقل ہو جاؤں گا۔ مگر تم سے پہلے اگر میری زندگی نے بے وفائی کی تو تم اپنے لالچی بھائیوں کو ہرگز یہ مکان نہ دینا بلکہ تم بھی اپنی زندگی میں ہی گھر کو کسی ٹرسٹ کے نام لگا دینا نفیسہ بیگم اسے میری وصیت سمجھو۔ شوہر کی وفات کے بعد جب نفیسہ بیگم بھائیوں کی مکان بیچ دینے والی بات نہ مانی بڑے بھائی خلیل نے بالکل آنا اور بہن کی خبر گیری کرنا چھوڑ دیا۔ جبکہ چھوٹا جمیل اس سے بھی دو ہاتھ آگے نکلا کہ بالکل پڑوسی ہونے کے باوجود وہ غیر پڑوسیوں سے بدتر ہو گیا۔ نفیسہ بیگم کے والد نے ورثہ میں دو مکان چھوڑے تھے اس میں سے اپنی اکلوتی ماؤں جیسی بڑی بہن کو حصہ دینے کے بجائے دونوں بھائی ایک ایک مکان پر قابض ہو گئے

۔نفیسہ بیگم کا شوہر کی وفات کے سال بھر تک جمع پونجی سے گزارا ہوتا رہا مگر جب کمائی کا کوئی ذریعہ نہ ہو تو بڑے سے بڑا خزانہ بھی خالی ہو جاتا ہے۔ انہوں نے کسی کے سامنے ہاتھ پھیلانا گوارہ نہ کیا اور اپنے گھر کے کل سامان کو ایک کمرے میں سمیٹ کر گھر کے بقیہ دو کمرے کچن باتھ روم دو ہزار کرائے پر چڑھا دیا۔

☆......☆......☆

کرائے دار کی حیثیت سے آنے والے فیملی چار بچوں اور میاں بیوی پر مشتمل تھی بیوی کا نام نازش اور شوہر کا نام اعجاز تھا جو کہ ایک کوٹھی میں بحیثیت ڈرائیور ملازم تھا۔ پہلے وہ کوٹھی کہ ہی سرونٹ کوارٹر میں رہتے تھے مگر جب اعجاز کے بچے کوٹھی کے لان میں کھیلتے اور شور مچاتے تو کوٹھی کی مالکن کو شور شرابا برداشت نہ ہوتا اسی لیے مالکن نے انہیں کہیں اور رہائش کا حکم دے دیا۔ اعجاز کے ایک بھائی کے علاوہ اس دنیا میں اور کوئی نہ تھا بھائی بھی اپنے بچوں کے ساتھ اپنی ہی دنیا میں مگن جب بھی اعجاز کا دل چاہتا بھائی کے لیے اداس ہوتا تو وہ ملنے چلا جاتا تھا۔ مگر بھائی کبھی اس کے گھر نہ آیا ادھر نازش بھی زمانے بلکہ سوتیلی ماں کے ہاتھوں ستائی ہوئی لڑکی تھی۔ چھ سالہ شادی شدہ زندگی کا وقت دونوں کے لیے ڈھیروں خوشیاں لایا تھا ان چھ سالوں میں قدرت نے انہیں دو بیٹے اور دو بیٹیاں عطا کی تھیں وہ اپنی زندگی سے بہت خوش اور مطمئن تھے۔

بیگم صاحبہ کے کوارٹر سے نکالنے کے بعد وہ ہراساں اس بات پر تھے چھ ہزار تنخواہ میں کھائیں گے کیا اور مکان کا کرایہ کہاں سے ادا کریں گے۔ مگر یہاں بھی قدرت ان پر مہربان ہوئی اور نفیسہ بیگم جیسی مہربان و شفیق خاتون سے نہ صرف اُن کی ملاقات ہوئی بلکہ نہایت ہی کم کرائے میں دو کمروں کا صاف ستھرا گھر بھی مل گیا۔ دونوں میاں بیوی اس مہربان خاتون کے شکر گزار تھے انھوں نے انہیں او چار چھوٹے بچوں سمیت سڑک پر خوار ہونے سے بچا لیا تھا۔ اعجاز و نازش دونوں ہی ماں کے پیار کو ترسے



ہوئے تھے نفیسہ خاتون کی شکل میں ماں جیسی محبت ملی تو دونوں دل و جان سے اُن کے گرویدہ ہوئے انہیں اپنی حقیقی ماں کا رتبہ دینے لگے۔ نازش نے خوشی خوشی ان کے سارے کام اپنے ذمے لیے اعجاز بھی صبح ان کی دعا لے کر کام پہ جاتا تھا دونوں ان کا اسی طرح خیال رکھتے جیسے کوئی حقیقی بیٹا اور بہو اپنی ماں کا کیال رکھتے ہیں نفیسہ بیگم بھی انہیں قدم قدم پہ مفید مشورے دیتیں ان کی خدمات اور توجہ کے سلسلے میں انہیں ڈھیر ساری دعائیں دیتیں ان کے بچوں سے بے انتہاء پیار کرتیں۔

اعجاز اپنے بچوں سے یہ کہتا کہ بیٹا یہ تمہاری دادی جان ہیں انہیں دادی کہا کرو نازش کہتی نہیں یہ تمہاری نانی جان ہیں انہیں نانی اماں کہا کرو بچے کبھی نانی کبھی دادی اماں کہہ کر پکارتے تھے۔ تو ان کی روح کی ساری تشنگی دور ہو جاتی۔ کوئی کہہ ہی نہیں سکتا تھا کہ ان کا آپس میں کوئی حقیقی رشتہ نہیں اور جس سے نفیسہ خاتون کا خون کا رشتہ تھا ان کا سگا ماں جایا پڑوسی جسے خود انہوں نے ماں بن کر پالا تھا جب شیر خوارگی میں ماں دنیا سے چھوڑ کر گزر گئی تھی۔ اس کا یہ حال کے پچھلے ڈیڑھ برس میں اس کے گھر کے فرد کی شکل تک نہ دیکھی بھی بڑے بھائی نے کبھی ایک فون کر کے بہن کی خیریت دریافت کرنے کی زحمت گوارہ نہ کی۔

☆......☆......☆

ایک دن نفیسہ خاتون نے اعجاز سے کہا بیٹے مجھے صبح ٹیکسی لا دینا مجھے کسی کام سے جانا ہے آپ تنہا جائیں گی۔ کیا میں کام سے چھٹی کر کے آپ کے ساتھ چلوں ؟ اعجاز احمد نے پوچھا ارے نہیں بیٹا۔ تمہاری بیگم صاحبہ تمہیں چھٹی کرنے پر تم سے خفا ہوں گی میں خود ہی چلی جاؤں گی۔ میں اب اتنی بھی بوڑھی نہیں ہوں نفیسہ بیگم نے مسکرا کر کہا صبح انہوں نے ٹیکسی والے سے کورٹ چلنے کو کہا انہوں نے اپنے شوہر کے ایک وکیل دوست سے مل کر کچھ ضروری کام نمٹائے انہیں کچھ ہدایت دیں اور گھر واپس آ گئیں۔ نازش و اعجاز بالکل بے خبر تھے کہ نفیسہ بیگم کہاں گئی ہیں اور کیا کرنے گئی ہیں۔

اسی شام وہ محلے میں موجود ڈاکٹر صاحب کے کلینک میں گئیں یہ سب کچھ ان کے پلان کا حصہ تھا جو کئی روز سے ان کے ذہن میں تیار ہو رہا تھا اور جیسے ڈاکٹر اور وکیل صاحب کے علاوہ کوئی اور نہیں جانتا تھا۔ آج صبح نازش کو کچھ خلاف معمول لگا اس لیے کہ نفیسہ بیگم ابھی تک بستر سے نہیں اٹھی تھیں حالانکہ ان کا معمول تھا کہ وہ فجر سے قبل بیدار ہو کر اور نماز فجر سے فارغ ہو کر وظائف وغیرہ پڑھتی رہتی تھیں۔ نازش نے پہلے انہیں پکارا پھر انہیں بیدار کرنے کے لیے ہاتھ سے ہلایا مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئیں اتنے میں اعجاز بھی باتھ روم سے نکل کر ان کے قریب آ گیا اور نفیسہ بیگم کو اماں جان کہہ کر آوازیں دینے لگا مگر بے سود دونوں بہت ڈر گئے نازش نے تو بہت زور زور سے رونا شروع کر دیا اعجاز نے سب سے پہلے ان کے پڑوسی بھائی جمیل کو بلایا وہ اور اسکی لالچی بیوی دونوں دوڑے چلے آئے۔ پھر اپنے شوہر سے بولی تسلی کے لیے کے محلے کے ڈاکٹر کو بلالاؤ اور بڑے بھائی کو بھی مطلع کر دو مگر دیکھو ذرا ہوشیار رہنا کہیں وہ تمہیں کوئی ہاتھ نہ دکھائیں ابھی ڈاکٹر معائنہ کر رہا تھا۔ کہ بڑا بھائی خلیل بھی جن کی طرح حاضر ہو گیا ڈاکٹر نے نفیسہ بیگم کے مرنے کی تصدیق کر دی ان کا منہ چادر سے ڈھانپ دیا۔

پورے محلے کو بھی نفیسہ بیگم کے گزر جانے کی خبر کر دی گئی آناً فاناً محلے والوں سے گھر بھر گیا ہر کوئی پوچھ رہا تھا کہ آیا کہ نفیسہ بیگم بیمار تھیں؟۔ اسی اثناء میں دروازے پر دستک ہوئی جمیل نے دیکھا تو ان کے بہنوئی سلیم بیگ کے وکیل دوست آئے تھے اور کہہ رہے تھے" مجھے نفیسہ بھابھی سے ملنا ہے؟'' اب آپ ان سے مل نہیں سکتے! ابھی کچھ دیر قبل ان کا انتقال ہو گیا ہے بھائی جمیل نے رونے کی اداکاری کرتے ہوئے کہا، اور انا اللہ وانا الیہ رجعون کہہ کر وکیل صاحب ایک طرف لوگوں کے ساتھ بیٹھ گئے۔

☆......☆......☆

جب سب لوگ جمع ہو گئے تو نفیسہ بیگم نے آرام

سے اپنے اوپر سے چادر ہٹائی اور اٹھ کر بیٹھ گئیں۔ جس نے دیکھا دہشت اور خوف سے اس کی چیخیں نکل گئیں۔ ''حاضرین ڈرنے کی ضرورت نہیں میرا وقت ابھی پورا نہیں ہوا ہے یہ مجھے آپ سب اہل محلہ اور خصوصاً اپنے بے پروا بھائیوں کو بلانے کے لیے ڈرامہ رچانا پڑا جس سے نازش اور اعجاز بالکل بے خبر تھے۔ مگر ڈاکٹر اور وکیل صاحب میرے ہم راز تھے۔ میں نے اپنے مرحوم شوہر کی نصیحت بلکہ وصیت کے مطابق اپنا یہ گھر اپنے ان خدمت گزار اور مجھے دل جان سے ماں سمجھنے والے بچوں نازش اور اعجاز کے نام کر دیا ہے جو درحقیقت اس کے حق دار ہیں اعجاز اپنی محدود آمدنی اور رزق حلال سے شاید ہی زندگی بھر اپنا ذاتی ٹھکانہ بنا سکے اسی لیے میں نے کل کورٹ جا کر اپنا یہ گھر ان دونوں کے نام کر دیا ہے ہے۔ مجھے یہ سب ڈرامہ اس لیے رچانا پڑا میں اگر چپ چاپ ایسا کر لی تو میرے یہ دونوں دنیا پرست اور لالچی ماں جائے میرے مرنے کے بعد ان مظلوموں کو بہت تنگ کرتے ان دونوں اور آپ سب اہل محلہ کو ایک ساتھ جمع کرنے کا یہی طریقہ میری سمجھ میں آیا۔ کہ میرے مرنے کی خبر پر بھائیوں سمیت سب آئیں گے اور سب کی موجودگی میں بھائیوں کو خبردار کر دوں گی کہ میرے مرنے کے بعد اس گھر کے مالک نازش اور اعجاز ہیں لائیے وکیل صاحب گھر کی منتقل شدہ فائل دے دیجیے تاکہ سب کی موجودگی میں اُسے اس گھر کے وارثوں کے سپرد کر سکوں۔

نفیسہ بیگم نے وکیل سے فائل لے کر اعجاز کے حوالے کر دی ان کے دونوں بھائی منہ بسورتے ہوئے اپنی بیویوں کو چلنے کا اشارہ کرنے لگے دونوں بھابیاں جواب تک شاک کی کیفیت میں تھی۔ اب نفیسہ بیگم کو برا بھلا کہتے ہوئے فراڈن، مکار بڑھیا، کھنی بیگم کے القابات دیتے ہوئے روانہ ہو گئیں۔ بعد میں نفیسہ بیگم نے چائے اور دیگر لوازمات سے اہل محلہ کی خاطر مدارت کر کے انہیں رخصت کیا!!!!!

☆☆......☆☆

نسخہ

غلام عباس

ایک منچلے نوجوان کا قصہ، جس کا نسخہ خود اس کے گلے پڑ گیا/ جتوئی محمد پور سے

محبوب کا ملنا قیامت تو ہی ہے عباس
لیکن ہم صورت محبوب کا ملنا بھی قیامت ہے

میرا نسخہ ہمیشہ میرے کام آیا وہ نسخہ ہے محبوب کا ملنا تو قیامت ہے۔ لیکن ہم صورت محبوب کا ملنا بھی قیامت میں اس شعر کو نسخے کے طور پر بے دھڑک ہو کر کئی بار آزما چکا ہوں جہاں کوئی خوبصورت لڑکی ملی اس پر اپنی مہربانیاں نچھاور کرنا شروع اور جب اس نے پلٹ کر پوچھا کیا بات ہے جناب؟ آپ مجھے دیکھ کر اتنے پاگل کیوں ہو رہے ہیں؟ آپ کا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا؟

اس وقت میں اپنی آنکھوں میں آنسو بھر کر کہتا ہوں۔ '' تمہیں کیا معلوم ہے تمہارے لیے کیوں بے تاب ہو رہا ہوں؟'''' چلیں بتائیں کیوں بے تاب ہو رہے ہیں؟ اس وقت میں وہی شعر پڑھ دیتا ہوں محبوب کا ملنا تو قیامت ہی ہے۔ لیکن ہم صورت محبوب کا ملنا بھی قیامت ہے آپ یقین کرو کے میں کوئی غلط آدمی نہیں ہوں آپ چونکہ اُس سے بہت ملتی ہو جس سے میں نے محبت کی تھی اسی لیے آپ کو دیکھ کر بے اختیار ہو جاتا ہوں۔

اسی فیصد ایسا ہوتا ہے کہ لڑکی ہمدردانہ نگاہوں سے میری طرف دیکھنے لگتی ہے۔ پھر پوچھتی ہے'' وہ لڑکی اب کہاں ہے؟'' اس وقت میں گہری سانس لے کر کہتا ہوں اب کیا بتاؤں کہ وہ کہاں ہے پھر میں بتاتا ہوں کہ کس طرح وہ ایکسیڈنٹ میں مر گئی یا اسے کینسر ہو گیا تھا۔ ہم دونوں مری کی سیر کر رہے تھے اس کا پیر سلپ ہو گیا وہ گہری کھائی میں جا گری اور میں آج تک اس کی صورت نگاہوں میں بسائے گھومتا رہتا ہوں نہ جانے میں نے کس کس انداز میں اپنی تصوراتی محبوبہ کو مارا مختصر یہ کہ یہ نسخہ ہمیشہ میرے کام آیا لڑکیاں فوراً افسوس کا اظہار کرنے لگتی ہیں اور میرے قریب آجاتی ہیں۔

بس ایک بار ایک لڑکی کے سلسلے میں چوک ہو گئی تھی۔ وہ بہت خوبصورت لڑکی تھی سکی عمر زیادہ سے زیادہ بائیس تیئس برس کی ہو گی۔ دبلا پتلا جسم، گوری رنگت مریم نام تھا۔ اسکا دوسری ہی ملاقات میں اس نے غصے کا اظہار کر دیا آپ ہوش میں تو ہوتے ہیں؟ ہاں میں ہوش میں ہی ہوں اور آپ کیوں ناراض ہو رہی ہیں؟ یہ آپ مجھے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر کیوں دیکھتے ہیں؟ پہلی بار آپ نے ایسا ہی کیا تھا اور اب پھر وہی حرکت کر رہے ہیں؟ ('' کاش میں آپ کو بتا سکتا میں نے گہری سانس لی کیوں، کیوں نہیں بتا سکتے بتائیں''؟ میں نے وہی نسخہ

آ زمایا'' اوہ افسوس ہے اس کو کیا ہوا تھا؟'' کچھ نہیں ہوا تھا اس کا پلین کریش ہو گیا تھا۔'' اوہ کہاں'' ؟ تا نجیریا میں اپنی آنکھوں میں آنسو بھر لایا۔

اس طرح سے میری اور مریم کی دوستی ہو گئی۔ وہ مجھ پر بہت زیادہ مہربان ہو گئی تھی۔ اور اس مہربانی کے تحت ایک شام وہ مجھ سے کہنے لگی'' میں نے فیصلہ کر لیا ہے'' کیا فیصلہ؟ یہی کہ میں اپنے شوہر سے خلع لے لوں گی اس نے بتایا شوہر سے؟ میں چونک پڑا یعنی تم شادی شدہ ہو ہاں اور میں اب تمہاری محرومیاں برداشت نہیں کر سکتی لیکن...... میں بری طرح گڑ بڑا گیا تھا۔ کیونکہ اس نوعیت کا میرا پہلا کیس تھا نہیں میرے لیے ایسا مت کرو تم اپنی ازدواجی زندگی گزارو میری فکر رہنے دو۔

سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اس حال میں نہیں چھوڑ سکتی بلکہ میں تو اپنے شوہر سے بھی تمہارا تذکرہ کر چکی ہوں۔ وہ تم سے ملنا چاہتا ہے کیونکہ ہم دونوں اچھے دوستوں کی طرح ایک دوسرے سے الگ ہونے کے پروگرام بنا رہے ہیں۔

وہ تو ٹھیک ہے لیکن تمہارا شوہر کام کیا کرتا ہے۔'' ارے تم میرے شوہر کو نہیں جانتے بہت مشہور آدمی ہے بہت زبردست باڈی بلڈر ہے عرفان بٹ نام ہے اسکا''۔

مریم تم اپنے شوہر سے نہ لڑو بلکہ اس سے خلع لینے کا ارادہ ہی ترک کر دو میں بدنصیب سوائے محرومیوں کے اور کیا دے سکتا ہوں۔ لیکن وہ ضدی عورت تھی میرے لاکھ کہنے کے باوجود اس نے اپنے شوہر کو میرے پاس بھیج دیا۔ وہ واقعی ایک خطرناک قسم کا آدمی تھا۔

'' ہاں بھائی تم نے یہ کیا ڈرامہ لگا رکھا ہے اس نے میرا گریبان پکڑتے ہوئے کہا''



بھائی صاحب میں نے تو کچھ نہیں کیا بس مریم ہی الٹی سیدھی باتیں کرتی رہتی ہے میں اس کو بہن سمجھتا ہوں 'کیا بات ہے تم مریم کے سامنے کہہ سکتے ہو؟

''کیوں نہیں صاحب جب آپ حکم کریں تو اس طرح مریم کے سامنے یہ کہنا پڑا کہ میں اسے بہن سمجھتا ہوں۔ آپ خود اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اس وقت میری اندرونی کیفیت کیا ہوگی بہر حال یہ میری زندگی کا تلخ واقعہ ہے اسکے بعد میں محتاط ہوگیا۔ یہ معلوم کر لیتا ہوں کہ لڑکی شادی شدہ تو نہیں اگر ہو چکی ہے تو اس کا شوہر کیا ہے۔ اگر کمزور قسم کا ہوتا ہے تو STAND کر جا تا ہوں ان سب باتوں کے دوران میری ملاقات سعدیہ سے ہوئی اس کو دیکھتے ہی دل پکار اٹھا کہ یہی وہ کرشمہ ہے۔ جسے تُو برسوں سے ڈھونڈ رہا ہے وہ ایسی لڑکی تھی جس کے ساتھ زندگی گزاری جا سکتی تھی ایک جاننے والے نے مجھے اس کے بارے میں بتایا کہ سعدیہ اچھی لڑکی ہے بہت مضبوط کریکٹر کی مالک ہے تم اس سے فلرٹ نہیں کر سکتے۔ اس کا بیک گراؤنڈ کیا ہے؟ پڑھے لکھے گھرانے کی ہے دو بھائی ہیں دونوں کی شادیاں ہو چکی ہیں۔ اسکی ایک بار منگنی ہو چکی تھی۔ شادی ہونے والی تھی کہ لڑکا حادثے میں چل بسا۔ اب یہ خود کسی اسکول کی ٹیچر ہے یعنی اس کا بیک گراؤنڈ صاف ستھرا ہے۔

میں واقعی سعدیہ کے لیے سیریس ہو گیا تھا اس سے تعلقات بڑھانے کی ابتداء اپنے پرانے روائتی طریقے سے کی، کیا میں واقعی اس لڑکی جیسی ہوں جس سے آپ نے محبت کی تھی؟

ہاں سعدیہ تم بالکل اس جیسی ہو کیا نام تھا اسکا سعدیہ نے پوچھا؟ کرن نام تھا اسکا کشتی میں سیر کے لیے گئی تھی۔ اور کشتی ڈوب گئی پھر میں اسی دن سے بھٹک رہا ہوں اور اب آپ ملی ہو۔

بہت افسوس ہوا سن کر میرا خیال ہے کہ زندگی میں ایک مقام ایسا آتا ہے جب انسان اپنی سپر ڈال دیتا ہے۔ وہی اس کی منزل ہوتی ہے اسکے آگے نہیں جانا چاہیے۔ میں اس سے بہت محتاط ہو کر باتیں کرتا تھا تا کہ میں اس کا احترام کروں سعدیہ کو بھی احساس ہو گیا تھا کہ میں اس کے لیے سیریس ہو گیا ہوں۔ بلکہ ایک بار اس نے مجھ سے کہا تھا' اب میں بہت تھک چکی ہوں شاید اس کشتی کو اب کسی کنارے کی ضرورت ہے کیوں کے زندگی بہت تیزی سے اپنے انجام کی طرف سفر کر رہی ہے

میرا بھی یہی حال ہے سعدیہ اب میں سکون چاہتا ہوں کہ کوئی ہو جس کا ہاتھ تھام کے یہ سفر طے کیا جا سکے سعدیہ نے شرما کر گردن جھکالی میں نے آدھا میدان مار لیا تھا آدھی جنگ میرے نام ہوگئی تھی۔

ایک دن میرے دوست نے پوچھا یار...... تو اس رشتے کے لیے اس کے گھر والوں سے بات کیوں نہیں کرتا۔ مشورہ تو مناسب ہے لیکن میں یہ چاہتا ہوں کہ پہلے سعدیہ سے بات کرلوں'' ہاں یہ صحیح رہے گا کل سعدیہ کی سالگرہ ہے میں نے کہا میں اسے واپسی پر کوئی اچھا سا گفٹ دوں گا پھر کسی اچھے ہوٹل میں ڈنر کریں گے اور وہیں سعدیہ سے بات کولوں گا دوسری صبح خود سعدیہ نے کال کر کے مجھے کہا آپ کو یاد ہے نہ آج کونسی تاریخ ہے؟'' جناب یہ کوئی بھولنے والی بات ہے یہ دن صرف تمہاری نہیں بلکہ میری بھی زندگی کا قیمتی دن ہے کیونکہ آج وہ تاریخ ہے جب قدرت نے تمہیں پیدا کیا تھا'' وہ ہنس دی پھر اس نے جواب دیا۔

''آپ کی بس یہی باتیں کمال کی ہیں اور اور ہاں آج آپ سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔''

مجھے بھی تم سے ضروری بات کرنی ہے وعدہ کرو تم انکار نہیں کرو گی'' بتاؤ نہ وہ کیا بات ہے؟

نہیں جب شام کو ملیں گے تب بتاؤں گا۔ اس کے بعد میں نے پیسوں کی بھاگ دوڑ شروع کر دی۔ میں اس کو نیکلس کا تحفہ دینا چاہتا تھا میں اسکی قیمت معلوم کر چکا تھا پچیس ہزار روپے کا تھا بنک میں سات ہزار روپے تھے۔ نکلوا لیے اس کے بعد قرض لینے کی مہم پر نکل گیا کہیں سے دو ہزار کہیں سے ایک ہزار غرضیکہ میں نے شام تک ستائیس ہزار روپے جمع کر لیے تھے پچیس ہزار نیکلیس کے لیے دو ہزار ڈنر کے لیے شام کو جب وہ ملی تو بہت خوبصورت ڈریسنگ کر رکھی تھی۔ میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہا تھا۔

''کیا بات ہے وہ شرما گئی'' آج اس طرح کیوں

دیکھ رہے ہیں میں خدا کی شان دیکھ رہا ہوں۔
باتیں نہ بنائیں آپ یہ بتائیں کہ آپ نے کس وعدے کی بات کی تھی وہ ابھی پتا چل جائے گا، میں اسے اپنے ساتھ سنار کی دکان میں لے گیا جہاں میں نے وہ نیکلس دیکھا تھا میں نے اس سے جب وہ نیکلس خریدنا چاہا تو وہ حیران رہ گئی...... یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟
اتنی مہنگی چیز اور وہ بھی تحفے میں یہ میں نہیں لے سکتی تم کو لینا ہوگا کیوں کہ تم وعدہ کر چکی ہو کہ تم انکار نہیں کرو گی پھر اس نے کچھ نہیں کہا میں نے وہ نیکلس خرید کر اس کے حوالے کر دیا اس کی آنکھیں جگمگا اٹھیں ''میں آپ کا یہ احسان کبھی نہیں بھولوں گی۔'' میں اس کو زندگی بھر اپنے ساتھ رکھوں گی پھر پروگرام کے مطابق شاندار ہوٹل میں آ گئے کھانے کا آڈر دینے کے بعد میں نے اس سے پوچھا ہاں اب بتاؤ تم مجھ سے کیا ضروری بات کرنا چاہتی ہو؟
''آپ نے مجھ پر ایک احسان کر دیا آپ نے مجھے روشنی دکھائی ورنہ تو میں یہ سمجھ رہی تھی کہ اب خوشیوں کی گنجائش ہی نہیں'' کیسی روشنی کی بات کر رہی ہو؟ وہی آپ کا شعر محبوب کا ملنا تو قیمت ہے لیکن ہم صورت محبوب کا ملنا بھی قیامت ہے کیا...... میں بے ہوش ہوتے ہوتے بچا، کون ہے وہ؟ ''میرا ایک رشتے دار ہے اس نے بتایا وہ بے چارہ اکثر مجھ سے ملتا رہتا ہے۔ لیکن میں نے آپ کے شعر کی روشنی میں کبھی نہیں دیکھا لیکن آپ کے شعر کے بعد میں نے غور کیا تو احساس ہوا ارے وہ تو بالکل وہی ہے میرے منگیتر کی طرح۔''
تو پھر...... میری آواز حلق میں اٹکنے لگی تو پھر کیا ہوا ؟ ہونا کیا ہے اگلے ہفتے ہم دونوں کی منگنی ہے۔ مجھے امید ہے آپ اس دلفریب تقریب میں ضرور آئیں گے۔
میں اس نیکلس کی طرف دیکھتا رہ گیا جو اسکی خوب صورت گردن میں جگمگا رہا تھا۔ میرا یہ شعر پہلی بار خود میرے گلے پڑ گیا اور اب برسوں ہو گئے ہیں میں کسی لڑکی کو دیکھ کر ہم صورت محبوب والا شعر نہیں سناتا ہوں۔ آپ سے بھی گزارش ہے آپ بھی یہ نسخہ مت آزمایئے گا۔

☆☆......... ☆☆

زندگی

ایک ڈھلتی ہوئی شام کی
ملگجی اوڑھنی میں چھپی
ستاروں بھری ایک مہتاب شب
عالمِ رنگ و نور کے پھیلے ہوئے شور میں
روح کی بے کراں خامشی
آدمیت کے سب
روح فرسا نظاروں سے پُر
اک حسیں آنکھ کی بے حسی
پھر بھی دل کیوں دھڑکتا ہے ہر ایک پل
کیوں مچلتا بہلتا ہے شام و سحر
میری بے ربط سوچوں سے ظاہر ہے جو، اور جو ہے نہاں
وہ ہے دشتِ جنوں کا سفر
اس لیے، نہ کوئی راہ، اور نہ کوئی ہمسفر
آہٹوں کے تسلسل سے بنتی ہوئی
دل کی دُھن
ایک دن خاموش ہو جائے گی
زندگی تھک کے آخر سو جائے گی

شاعرہ: زرین احسان



ناگن

اعجاز احمد نواب

زندگی صرف وہی تو نہیں جو ہمیں دکھائی دیتی ہے۔ زندگی تو وہ بھی ہے جسے ہم صرف سوچتے ہیں۔ نیا سلسلہ ”ناگن۔“ آپ کو یقیناً ایک نئی دنیا نئی زندگی میں قدم رکھنے پر مجبور کر دے گا۔ ہزاروں سال کی تپسیا پر پھیلا زندگی کا نیا رنگ۔ ناگن کے روپ میں آپ کو ضرور تسخیر کرے گا

قسط نمبر:13

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

جوگی مہاراج کے پردادا کو اس کے گرو نے مرتے سے شیش ناگ کا جوڑا دان کیا تھا اور بتایا تھا کہ ان ناگوں کے سر پر تاج کے نشان ہیں اور آنکھوں میں سنہری روشنی۔ آنکھوں کی سنہری روشنی اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ بادشاہ سانپ ہیں۔ اگر یہ سو سال تک زندہ رہ گئے تو یہ نہ صرف انسان کے روپ میں آ جائیں گے، بلکہ ہر جاندار کا روپ دھار سکیں گے۔ زمین کی تہوں میں چھپے خزانے

ان کی دسترس میں ہوں گے اور اس وقت یہ جس کے قبضے میں ہوں گے یہ اسی کے حکم کے غلام ہوں گے لیکن اس کے لیے ضروری ہے ہر ساون میں اماوس کی رات ناگ دیوتا کے حضور ایک مرد اور ایک عورت کی قربانی دی جائے۔ جان جوکھوں میں ڈال کر ان کے پرکھوں نے ان ناگوں کو ناز ونعم سے پالا تھا اور نگہبانی کا یہ عمل اب جوگی مہاراج کے حصے میں آ چکا تھا۔ وہ رات بھی اماوس کی رات تھی اور ان ناگوں کی عمر کے سو سال مکمل ہونے جا رہے تھے۔ جوگی مہاراج نے یہ کہانی بیس سال سے ساتھ رہنے والے چیلے صابو کو سنائی تو اس کی نیت میں کھوٹ آنے لگا۔ گرو مہاراج ہاتھ میں خنجر تھامے ناگ منتر کا جاپ کر رہے تھے اور صابو انہیں طنزیہ نظروں سے دیکھ کر زیر لب مسکرا رہا تھا۔ جاپ مکمل کر کے جوگی مہاراج نے بلی کا عمل مکمل کیا۔ دونوں ناگ اور ناگن انسانی خون میں اشنان کر رہے تھے اور سرخ زبانیں نکال کر خون چاٹ رہے تھے۔ جوگی مہاراج بیٹھے یہ منظر غور سے دیکھ رہے تھے، یہی وہ لمحہ تھا جس کا صابو کو انتظار تھا۔ اس نے پلک جھپکنے میں خنجر کا وار مہاراج کی گردن پر کیا اور گرو مہاراج پتھرائی آنکھوں سے اپنے چیلے کو دیکھتے رہ گئے۔ صابو لاش ٹھکانے لگا کر جب کمرے میں آتا ہے تو پٹاری والی جگہ ایک خوب صورت نوجوان مرد اور سترہ اٹھارہ سالہ لڑکی موجود تھے۔ صابو انہیں کہتا ہے کہ تم میرے غلام ہو۔ وہ ان کے نام ارجن اور شکنتلا تجویز کرتا ہے۔ تب ارجن اور شکنتلا اسے بتاتے ہیں کہ انہیں معلوم ہے کہ صابو ان کا گرو مہاراج نہیں بلکہ ایک چیلا ہے۔ تب صابو کے خون سے شیش ناگ کا یہ جوڑا اپنی پیاس بجھا کر شہر کا رخ کرتا ہے۔ لوگ اسے دیکھ لیتے ہیں اور اس پر تیل ڈال کر آگ لگا کر مار ڈالتے ہیں۔ یہ منظر دیکھ کر شکنتلا غصے میں آ جاتی ہے اور کہتی ہے۔ ''ارجن کے قاتلوں! تم نے میرے ناگ کی ہتھیا کر کے بڑا انیائے کیا، تم ناگن کی طاقت اور انتقام سے واقف نہیں، شکنتلا تمہاری زندگیوں میں زہر گھول دے گی۔ میں اس گاؤں کی اینٹ سے اینٹ بجا دوں گی، تم موت مانگو گے لیکن موت بھی تم سے روٹھ جائے گی۔ ایک ایک کو تڑپا تڑپا کر ماروں گی میں پھر آؤں گی اور تمہارے لیے قیامت بن کر آؤں گی۔'' شکنتلا گاؤں کے لوگوں سے جان بچا کر بھاگتی ہے اور جنگل میں موجود ریاست تابانہ کے مہاراجہ رام ناتھ کے قافلے تک جا پہنچتی ہے۔

مہاراجہ رام ناتھ اس کی خوب صورتی دیکھ کر دنگ رہ جاتے ہیں اور اسے اپنی کنیز بنانے کا فیصلہ کر لیتے ہیں۔ مہارانی ماریہ مہاراجہ رام ناتھ کو بتاتی ہے کہ شکنتلا ناگن ہے اور انسانی روپ میں انہیں بے وقوف بنا رہی ہے اور اس کے لیے وہ چاہیں تو شاہی پنڈت گرو نرائن سے تصدیق کر سکتے ہیں۔ مہاراج اس سے کہتے ہیں کہ اگر شکنتلا ناگن ہوئی تو اس کو آگ میں جلا دیا جائے گا اور اگر یہ الزام جھوٹا ثابت ہو گیا تو ماریہ کو اسی آگ میں پھینک دیا جائے گا۔ ایک ہجوم شکنتلا کی رہائش گاہ پہنچتا ہے۔ مہارانی ماریہ اپنے لباس میں چھپا کر لایا جانے والا آئینہ اچانک شکنتلا کے سامنے کر دیتی ہے جس میں ایک بڑی سی ناگن لوگوں کو نظر آتی ہے۔ سپہ سالار بلگرام شکنتلا کے بجائے راجہ رام ناتھ کو گرفتار کر لیتا ہے۔ سامری، شکنتلا، بلگرام اور پریہ تابانہ کی حکومت پر اپنی گرفت مضبوط کر چکے تھے۔ کوئی کام ان کی مرضی کے خلاف نہ ہو سکتا تھا۔ ہر طرف ظلم کا راج تھا۔ شکنتلا جاپ کے ذریعے کالی ماتا کی مہان شکتی کے حصول میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ شکنتلا اب صرف ناگن نہ تھی بلکہ جادوگرنی بھی بن چکی تھی۔ شکنتلا سبز آنکھوں اور گھنگریالے بالوں والے نوجوان کو دیکھ کر مبہوت رہ جاتی ہے۔ وہ شکنتلا کو بتاتا ہے کہ وہ جنات کے بادشاہ حسکران کا بیٹا شکران ہے اور تمہارا کوئی جادو مجھ پر کارگر نہیں ہوگا۔ شکنتلا حسکران کو دوست بنانے کا فیصلہ کر لیتی ہے۔ وہ بھی اس کا ساتھ دینے پر راضی ہو جاتا ہے۔ سامری گرو نرائن کو منڈل جاپ سے باز رکھنے میں ناکام ہو جاتا ہے۔ وہ اپنے گرو شداد کی روح سے مدد طلب کرتا ہے۔ سامری جادوگر کی ملاقات حسکران سے ہوتی ہے۔ شکنتلا، شکران اور سامری تینوں گرو نرائن کے منڈل کے پاس جا پہنچتے ہیں لیکن گرو نرائن اپنا جاپ مکمل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ شکنتلا کی ساری شکتیاں معطل ہو گئی تھیں اب وہ بالکل ایک عام سی کمزور بے بس لڑکی تھی۔ گرو نرائن شکنتلا سے کہتا ہے کہ چنکار سے بولو کہ آئندہ تمہیں مالکن نہ کہے بلکہ براہ راست میرا حکم مانے۔ ادھر پریہ حیران تھی کہ کئی دن گزر گئے نہ شکنتلا واپس آئی اور نہ سامری یا حسکران۔ پریہ کو پتا تھا گرو نرائن شکنتلا کو غلام بنانا چاہ رہا ہے۔ وہ سوچتی ہے کہ شکنتلا کا غلام بن جانا اس کے حق میں بہتر ہے تاکہ وہ حکومت پر قبضہ کر کے ملکہ بن جائے تب اچانک حسکران آتا ہے اور اسے بتاتا ہے کہ گرو نرائن تیرتھ جاپ میں کامیاب ہو کر شکنتلا کے جسم و جان اور اس کی تمام شکتیوں پر قابض ہو گیا ہے اور سامری بھی اس کے پاس قید ہو گیا ہے، یہ سن کر وہ خوش ہو جاتی ہے۔ سامری کو ہوش آتا ہے تو سامنے گرو نرائن اور لکشم ناتھ موجود تھے۔ تب وہ اپنے دیوتا کا رحیکا کو اپنی سہائتا کے لیے پکارتا ہے، گرو نرائن منتر پڑھتا ہے اور نیلی آگ کے شعلے سامری اور شکنتلا کو گھیر لیتے ہیں۔ شکنتلا گرو نرائن کو بھی اس آگ میں کھینچ لیتی ہے اور ان کے جسم جلنا شروع ہو جاتے ہیں۔ جب شکنتلا کی آنکھ کھلتی ہے تو وہ ایک ویران اور بنجر جگہ پر موجود تھی۔ اس کا جسم بری طرح جلا ہوا تھا اور زخموں میں پیپ پڑ چکی تھی، اسی حالت میں شکنتلا تڑپتی سسکتی آبادی تک پہنچتی ہے جہاں اس پر کتے حملہ کر دیتے ہیں اور وہ بے ہوش ہو جاتی ہے۔ جب اس کو ہوش آتا ہے تو وہ ایک گھر میں موجود ہوتی

ہے ایک نوجوان لڑکا، لڑکی اور ادھیڑ عمر عورت اور مرد موجود تھے۔ علاج اچھی خوراک اور مکمل آرام سے اس کے زخم بھرنے شروع ہو چکے تھے۔ لڑکی سندری شکنتلا کی دوست بن گئی ہے۔ شکنتلا دیکھتی ہے کہ سندری کا بھائی مگن رات گئے چپکے سے روز باہر نکل جاتا ہے۔ شکنتلا کو خود میں خون کی کمی محسوس ہوتی ہے اور وہ چمکار کو یاد کرتی ہے۔ وہ اس وقت حیرت زدہ رہ جاتی ہے جب چمکار کو اپنے سامنے کھڑا دیکھتی ہے، وہ سوچتی ہے کہ اس کو کھوتی ہوئی شکتیاں واپس مل گئی ہیں۔ شکنتلا کھوئی ہوئی شکتیاں پاکر کھلکھلا اٹھتی ہے۔ گاؤں کے کھیتوں سے نوجوان کی لاش ملتی ہے جس کی شہ رگ کاٹ کر اس کا خون پی لیا گیا تھا۔ گاؤں کے لوگ اس بات سے بہت خوف زدہ ہوتے ہیں۔

ولاور نامی شخص جس کو سادھو کوٹھاری نے اپنے بس میں کیا ہوا تھا۔ کوٹھاری ولاور سے کہتا ہے کہ تمہارے ذریعے ایک جن میرے قبضے میں آئے گا جو میرے تمام کام پل بھر میں کر دے گا۔ پھر تو بھی کوٹھاری کا چیلا بن کر عیش کرنا۔ پر یہ خسکران اور دونوں کی مدد سے حکومت کر رہی تھی اور دونوں کو خوش رکھتی تھی۔ تب ایک روز خسکران شکنتلا کی تلاش میں نکلتا ہے اور پھر واپس نہیں آتا اور پھر ایک روز وہ بلگرام کو بھی قید خانے میں ڈال دیتی ہے جہاں بھوک پیاس سے ایڑیاں رگڑ کر بلگرام بھی بے بسی کی موت مارا جاتا ہے۔ شکنتلا کو چمکار بتاتا ہے کہ سندری کے بھائی مگن کو ایک چڑیل خوب صورت لڑکی بن کر اپنے جال میں قید کر چکی ہے اور روزانہ تھوڑا تھوڑا کر کے اس کا خون پیتی ہے۔ چمکار شکنتلا کو اس جگہ لے جاتا ہے جہاں مگن مدہوشی کی حالت میں تھا اور وہ لڑکی اس کا خون پینے کو اس پر جھکی ہوئی تھی۔ تب وہاں اچانک شکنتلا نمودار ہوتی ہے اور کالی دیوی کا جاپ پڑھ کر اس چڑیل کو آگ لگا کر ہلاک کر دیتی ہے۔ مگن کو ہوش آتا ہے تو وہ اسے سب بتا کر گھر واپس جانے کا کہتی ہے۔ سپیرا کرونڈیا اور اس کے چیلا شیش ناگ کو اپنے بس میں کرنا چاہتے ہیں اور اس کے لیے وہ بڑی تپسیا میں مصروف تھے۔ کوٹھاری ولاور کو ساتھ لے کر قبرستان پہنچتا ہے اور کدال سے ایک قبر کی مٹی ہٹاتا ہے۔ قبر سے جواں سالہ عورت کی لاش نکلتی ہے۔ ولاور اس کے بال کاٹ کر اپنے پاس محفوظ کر لیتا ہے۔ وہاں سے کوٹھاری اسے ایک مکان کے سامنے لاکھڑا کرتا ہے اور ولاور سے کہتا ہے کہ اس مکان میں میاں بیوی اور ان کی ایک جواں سال بیٹی ہے، بوڑھے کو باہر بلا کر میں ابھی قتل کرتا ہوں، جبکہ لڑکی کو تو ہی لائے گا میرا ہاتھ لگانا منع ہے۔ اس کے بعد ولا ور دروازہ کھٹکھٹاتا ہے اندر سے ایک ادھیڑ عمر شخص باہر نکلتا ہے، کوٹھاری اس پر حملہ کر دیتا ہے اور اسے گردن سے دبوچ لیتا ہے۔ موقع سے فائدہ اٹھا کر ولاور مکان میں گھس جاتا ہے۔ جہاں ایک کمرے میں نوجوان دوشیزہ موجود تھی اور دروازے کی آواز سے نیند سے بیدار ہوئی تھی۔ وہ ولاور کو دیکھ کر خوف زدہ ہو کر چلانے لگتی ہے۔ ولاور اس لڑکی کو بے ہوش کر کے باہر کوٹھاری کے پاس لے آتا ہے، کوٹھاری اسے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کرتا ہے، اور ولاور کے ساتھ اپنی شکتی کے ذریعے ایک بنجر اور بیابان علاقے میں پہنچ جاتا ہے۔ اور اس دوشیزہ کو ایک چتا پر لٹا کر اس کے ہاتھ پاؤں باندھ دیتا ہے۔ لڑکی ہوش میں آ کر رونے گڑگڑانے لگتی ہے۔

ولاور کو اس پر ترس آ جاتا ہے اور وہ کوٹھاری پر حملہ کر دیتا ہے۔ کوٹھاری غصے میں آ کر اسے ہاتھ پاؤں ہلانے کی طاقت سے محروم کر دیتا ہے اور پھر اپنے جنتر منتر میں مشغول ہو جاتا ہے، تب ایک نیلا شعلہ آسمان سے زمین کی طرف آتا ہے جس کے ساتھ دھواں سا تھا، وہ دھواں جو کہ خسکران جن تھا، آہستہ آہستہ بوتل میں داخل ہو جاتا ہے۔ کوٹھاری ڈھکن لگا کر بوتل کا منہ بند کر دیتا ہے اور خوشی میں ناچنا شروع کر دیتا ہے اور ولاور سے کہتا ہے کہ کوٹھاری آج بہت بڑی شکتی بن گیا ہے، ایک جن اس کے قابو میں آ گیا ہے جو اس کے سارے کام کرے گا۔ کوٹھاری اس سارے عمل کے بعد سامان سمیٹ کر اٹھنے کی تیاری کر رہا ہوتا ہے کہ راجہ ہری داس کے سپاہی اسے گرفتار کر لیتے ہیں۔ راجہ ہری داس عیاش ہونے کے باوجود ایک رحم دل اور رعایا کا خیال رکھنے والا حکمران تھا۔ اس نے جادوگر اور جادوگرنیوں کے خلاف سخت قانون بنایا ہوا تھا جس کی وجہ سے پوری راجدھانی میں جادوٹونہ کرنے والا نہیں تھا۔ کوٹھاری کئی بار اس جرم میں گرفتار ہوا تھا لیکن وہ ہر بار فرار ہو جاتا۔ اس بار اسے گرفتار کر کے ہری داس کے سامنے پیش کیا جاتا ہے اور سزا کے طور پر اس کے ہونٹ سی دیے گئے تھے۔ ہری داس کو کوٹھاری کے تھیلے سے برآمد ہونے والا سامان دکھایا جا رہا تھا جس میں ایک شیشے کی بوتل بھی تھی جس میں دھواں بھرا ہوا تھا۔ راجہ اس بوتل کو کھولنے کا حکم دیتا ہے اور چند ہی لمحوں میں میدان میں خسکران جن موجود تھا جو بوتل میں بند تھا۔ تمام لوگ اسے دیکھ کر خوف زدہ ہو جاتے ہیں۔ خسکران کوٹھاری کو آزاد کروا دیتا ہے اور وہ اسے پوری ریاست کو آگ لگا دینے کا حکم دیتا ہے۔ ادھر مگن شکنتلا کے متعلق سوچتا ہے کہ شکنتلا کو کیسے اس چڑیل کا پتا چلا اور کیسے اسے ختم کر دیا۔

شکنتلا مگن سے رات کو گاؤں سے باہر بیری کے درختوں کے پاس ملنے کے لیے کہتی ہے۔ شکنتلا کو خون کی پیاس بے تاب کرتی ہے، لیکن مگن کے گھر والوں کے احسانات کی وجہ سے وہ مگن کا خون پینا مناسب نہیں سمجھتی۔ وہ رات کے وقت سانپ کے روپ میں ایک گھر میں داخل ہو جاتی ہے اور ایک عورت کے خون سے اپنی پیاس بجھاتی ہے۔ ان خونی وارداتوں سے گاؤں میں کہرام مچ جاتا



ہے۔ پنچایت میں فیصلہ کیا جاتا ہے کہ گاؤں میں نئے آنے والوں کو علاقہ بدر کر دیا جائے اور وہ لوگ گاؤں کے مکھیا گگن کے پتا سے شکنتلا کو بھی علاقے سے باہر نکالنے کا مطالبہ کرتے ہیں۔

شکنتلا صحن میں ٹہل رہی تھی۔ صحن کے آگے مندر کی اندرونی عمارت تھی۔ چھوٹے بڑے دروازوں پر سانپوں کی شبیہہ نمایاں ہیں۔ بڑے دروازے سے اندر شکنتلا داخل ہوتی ہے۔ بے شمار یاتری ناگ دیوتا کے گرد پوجا پاٹ کرتے نظر آئے۔ اچانک ناگ دیوتا بت کے عقبی دروازے سے ایک پالکی برآمد ہوتی ہے جس پر لکشمن داس براجمان تھا۔ جس کا ناگ مندر بلکہ ناگ بھون میں سکہ چلتا تھا۔ شکنتلا نے دیکھا کہ کامنی اور ایک لڑکے کو زنجیروں میں جکڑ کر ناگ دیوتا کے مجسمے کے عقب سے گھسیٹ کر لایا گیا۔

راجکماری پریہ کو ریاست دھرم پور راجہ کی شادی میں شرکت کا موقع آیا۔ راجہ کا محل دیکھ کر پریہ نے اس سے بڑھ کر خوبصورت محل تعمیر کرنے کا سوچا اور اس مقصد کے حصول کے لیے اُس نے اپنی رعایا پر ظلم وستم کے پہاڑ توڑ کر ہر دم کام پر لگا کر آخر اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئی۔

شکنتلا ناگ دیوتا کے پیروکاروں سے مخاطب ہو کر کہتی ہے کہ میں ناگن دیوی ہوں اور دیوتا کے حکم سے تمہارے پاس آئی ہوں۔ شکنتلا لکشمن داس کا مکروہ چہرہ یاتریوں کے آگے پیش کرتی ہے جس سے عوام میں غم وغصے کی لہر دوڑ جاتی ہے پھر شکنتلا کامنی کو مندر کی مہان پجارن بنا دیتی ہے۔

خسکر ان اور ولاور گہری نیند میں تھے کہ سائیں بابا مرچو کی آمد ہوتی ہے اور وہ دلاور کو آیات قرآنی پڑھنے کی ترغیب دے جاتے ہیں۔ دلاور اُن کے کہنے کے مطابق عمل کرتا ہے۔ تھوڑی دیر میں دیکھا ابلیس کو پوجنے والی قوم کے سردار کی بیٹی کو شیر نے گھیر لیا۔ دلاور نے شیر کو ڈھیر کر کے تبریشیا قبیلے کے سردار کی بیٹی کو بچالیا۔

پریہ شکنتلا کی ذلت سے عذاب کا شکار تھی اور شکنتلا سے چھٹکارہ حاصل کرنے کے لیے شاہی پروہت سیتارام سے ملاقات کرتی ہے۔ جو اسے شکنتلا کی قید سے رہائی کے عوض شادی کی پیشکش کرتا ہے جو کہ پریہ نے مصلحت جان کر قبول کر لی۔

شکنتلا کو جب پریہ کے فرار ہونے کا پتا چلا تو وہ سامری کے ساتھ پریہ کے تعاقب میں نکلتی ہے۔

(اب آپ آگے ملاحظہ کیجیے)

اور شکنتلا شاہانہ چال اور کروفر بھری ادا کے ساتھ اس پر بیٹھ کر نخوت سے کنیزوں کو غور سے دیکھنے لگی۔ یہ تعداد میں آٹھ دس تھیں۔ سامری کے ہاتھوں قتل ہونے والی کنیز کی لاش ایک طرف پڑی تھی۔ اب انگلی کے اشارے سے شکنتلا نے سب کنیزوں کو قریب آنے کا حکم دیا تو ڈری ڈری سہمی سہمی اور ایک دوسرے سے چمٹی چمٹی کنیزیں قدم قدم آگے بڑھتی ہوئیں شکنتلا کے سامنے آ کھڑی ہوئیں۔ ان کے چہرے خوف زدہ ہونے کی بھرپور عکاسی کر رہے تھے۔

''کوئی مرد بھی ہے یہاں پر۔'' شکنتلا اپنی موٹی موٹی آنکھیں ان پر جما کر مخاطب ہوئی۔

''نن...... نہیں...... ہاں ہاں...... ہے۔'' ایک کنیز ہکلائی۔ ''پرنتو اسے کوٹھاری نے ایک شیشے کی بوتل میں بند کر کے قید کر رکھا ہے۔ جاپ مکمل کرنے کے بعد اس کا کلیجہ کھانے کے لیے۔''

''کہاں ہے؟'' شکنتلا نے ٹھہرے ہوئے انداز میں مختصر سوال کیا۔

''ادھر اندر۔ کوٹھاری کی کٹیا میں۔'' کنیز اشارہ کر کے بولی۔ وہ حواس باختہ ہو رہی تھی۔

''اسے یہاں لا سکتی ہو؟'' شکنتلا نے نیا سوال داغا۔

''کوٹھاری، ہمیں بھی کتا بنا دے گا۔'' کنیز ہاتھ جوڑ کر گھگھیائی۔

''اچھا کوٹھاری اتنا بڑا جادوگر ہے کہ اپنی نافرمانی کرنے والے کو کتا بنا دیتا ہے۔'' شکنتلا مصنوعی حیرت سے بولی۔ اور پھر کھلکھلا کر ہنس دی۔

''ابھی جو بلا کوٹھاری کے تعاقب میں گئی ہے اس کا نام سامری جادوگر ہے وہ ابھی تمہارے کوٹھاری کو چوہے کی طرح گھسیٹ کر تمہارے سامنے لائے گا۔ بس تم میں سے چار اندر جاؤ اور اس بوتل کو دھکیلتے ہوئے یہاں لے آؤ اور ہاں بھاگنے کی یا روپوش ہونے کی کوشش کی تو اس سے بھی بدتر حشر کروں گی تمہارا۔'' شکنتلا کنیز کی لاش کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔

اس کی بات سن کر وہ کنیز اپنے ساتھ چند کنیزوں کو لے کر چلی گئیں۔
''میں اپنے حکم میں ایک لمحے کی تاخیر برداشت نہیں کرتی۔تم سب کو چاہوں تو چیونٹی کی طرح مسل دوں۔میرا نام شکنتلا ہے۔میں ناگن دیوی...... کالی کی مہاپجارن اور حسن کی ملکہ ہوں۔'' شکنتلا ابھی باقی ماندہ کنیزوں پر اپنی بڑائی ثابت کر رہی تھی کہ جانے والی کنیزیں شفاف شیشے کی بند منہ والی بوتل دھکیلتی ہوئی لے آئیں۔شکنتلا نے دیکھا ایک خوب صورت دلآویز شخصیت حامل بھرپور کا نوجوان اس بوتل کے اندر لڑھک رہا تھا۔شکنتلا نے منتر پڑھ کر بوتل ٹوٹنے کی نیت سے پھونک ماری تو تڑاخ کی آواز سے بوتل کرچی کرچی ہو کر بکھر گئی اور بوتل کا قیدی ہڑبڑا کر کھڑا ہو گیا اور ہونقوں کی طرح کبھی کنیزوں اور کبھی شکنتلا کو دیکھنے لگا جو اس وقت حسن و رعنائی کا شاہکار بنی کولہوں پر ہاتھ رکھے زیر لب مسکان کے ساتھ اسے دیکھ رہی تھی۔
''کیا نام رکھتے ہو نوجوان؟'' شکنتلا بھرپور نگاہوں سے اس کا جائزہ لیتے ہوئے مخاطب ہوئی۔
''پورن لال......'' نوجوان کے ہونٹ ہلے وہ ابھی تک صورت حال سمجھنے سے قاصر تھا۔
''کوٹھاری نے تجھے بوتل میں کیوں قید رکھا تھا؟''
''کچھ پتہ نہیں۔''
''مجھ جیسی لڑکی کا خواب میں بھی تصور کیا ہے؟'' شکنتلا معنی خیز انداز میں بولی۔
''میں کچھ سمجھا نہیں۔'' پورن لال اس کا ساحرانہ انداز دیکھ کر دنگ رہ چکا تھا اور جھجک رہا تھا۔
''میرے من کی پیاس بجھانے میں تاخیر نہ کرو پورن لال ورنہ یہ حشر کر دوں گی۔'' یہ کہتے ہوئے شکنتلا پلٹی اور ایک کنیز کی طرف منتر پڑھ کر پھونکا تو اسے آگ لگ گئی۔کنیز چیختی چنگھاڑتی دیوانہ وار اپنے جلتے وجود کے ساتھ ادھر ادھر گرنے پڑنے لگی۔اور پھر اس کا کومل جسم آگ میں جل کر خاکستر ہو کر گر پڑا۔
چلو اب آ جاؤ۔شکنتلا نے آنکھ مار کر کہا تو پورن لال کپکپاتے ہوئے آگے بڑھنے لگا۔

☆......☆......☆

سامری جب درختوں کے جھنڈ کے پار پہنچا تو اسے سامنے ہی ایک سادھو منڈل کے اندر چلہ کشی میں مصروف نظر آ گیا۔اس کی حالت سے لگتا تھا کہ وہ کافی دنوں سے بے حس و حرکت اسی حالت میں براجمان ہے۔سامری شکنتلا کو جان بوجھ کر وہاں چھوڑ آیا تھا کیوں کہ کسی برہم چاری کو منڈل سے باہر نکالنے اور اس کا دھیان بھرشٹ کرنے کا راز اس نے بڑی مشکل سے حاصل کیا تھا۔وہ نہیں چاہتا تھا کہ شکنتلا اس کے عمل کو دیکھ کر عمل سیکھنے کا تقاضا کر بیٹھے۔
سامری اس سے مناسب فاصلے پر کھڑا ہو گیا اور اس نے اپنے جھولے سے ایک کالی ہانڈی نکال کر سامنے رکھ لی اور پلٹ کر ادھر اُدھر دیکھنے لگا۔اس کی نگاہوں کا مرکز درخت اور کیاریاں تھیں جہاں مختلف النسل حشرات الارض دکھائی دے رہے تھے۔اچانک اس کی نظر ایک کالے رنگ کی گلہری پر پڑی۔سامری کی عقابی نظریں اس پر جم گئیں اور دیکھتے ہی دیکھتے گلہری سامری کی جانب گھسٹنے لگی اور آخر کار اس کے قریب آ گئی۔سامری نے ہاتھ بڑھا کر اسے تھام لیا اور بغیر کسی توقف کے ٹانگیں پکڑ کر ایک جھٹکے سے اسے چیر کے ہانڈی کے اندر پھینک کر اپنی نظریں ہوا میں جما کر دیکھنے اور ایک کائیں کائیں کرتے کوے کو نگاہوں کا مرکز بنا کر گھورا تو وہ کٹی پتنگ کی مانند سامری کی طرف گرنے لگا۔جیسے ہی کوا سامری کے ہاتھ لگا سامری نے اس کا منہ دبا کر کھولا اور چونچ کے دونوں حصے دونوں ہاتھوں میں لے کر جھٹکا دیا تو کوا بھی چرتا چلا گیا۔اور دوسرے ہی لمحے کوا بھی ہانڈی کے اندر تھا۔اب سامری نے ہانڈی میں مختلف سفوف ڈالنے شروع کیے،اسی طرح مختلف حشرات الارض بھی اس نے ہانڈی میں ڈالے اور پھر ایک ٹانگ پر کھڑے ہو کر بڑبڑانے لگا۔اس کے بڑبڑانے کی آواز سن کر کوٹھاری نے آنکھ کھول کر اسے دیکھا تو اس کی آنکھوں میں حیرت کے آثار ابھر آئے۔شاید اس بات پر حیران ہو رہا تھا کہ محل کے گرد اس کے قائم کردہ حفاظتی طلسمی حصار کو توڑ کر اس دیدہ دلیری سے اس کے پاس کھڑا ہو کر اپنے طاغوتی کام میں مگن یہ کون ہو سکتا ہے؟ لیکن اپنے عمل کو چھوڑ کر وہ سامری سے سوال کرنے کی اہلیت میں نہ تھا۔اس طرح خود

اس کا عمل ضائع ہو جاتا۔ لہذا وہ پھر آنکھیں موند کر مشغول ہو گیا۔ دوسری طرف سامری کوٹھاری کو بھول کر اپنے جنتر منتر میں لگا تھا۔ ایک ٹانگ پر کھڑے ہونے کے عمل کو پورا کرنے کے بعد سامری پھرتی سے کالی ہانڈی کے قریب آیا اور لباس کو ٹانگوں سے اوپر کرنے لگا۔ یہاں تک کہ اسکی ران نظر آنے لگی اس کے بعد جھولے سے تیز چھری نکال کر اس نے سرعت سے اپنی ران سے پاؤ بھر بوٹی اتاری...... چھری چلاتے وقت ایک لمحے کو اس کے چہرے پر تکلف کے آثار ابھرے مگر پھرتی سے اس نے ہونٹ بھینچ کر تکلیف برداشت کرلی۔ اپنا گوشت ہاتھ میں لے کر اس نے ہانڈی میں ڈال دیا۔ گوشت ہانڈی کے اندر وجاتے ہی ہانڈی ایک دفعہ میں حرکت آ ئی اور اس کا سر ہلنے لگا۔ ہانڈی کا سر ہلتے ہی سامری کے کاندھے پر بیٹھا کانا اُلو پھڑ پھڑا کر اڑتا ہوا سادھو کوٹھاری کی طرف پرواز کرنے لگا اور قریب پہنچ کر دائرے میں اس کے چکر کاٹنا شروع کر دیے۔ ادھر ہانڈی شوں شوں کرنے لگی اور ایسی آوازیں آنے لگیں جیسے ہانڈی ابل رہی ہو۔ سامری گھٹنوں کے بل کھڑا ہو کر اور ہاتھ بلند کر کے اشلوک پڑھنے لگا۔ ہانڈی کی شوں شوں ہر لحظہ تیز ہونے لگی اس کا ہلنا بھی پہلے کی نسبت زور پکڑ گیا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے ہانڈی اوپر کو اٹھنے لگی اور اپنے محور کے گرد اڑن طشتری کی مانند گھومنے لگی۔ شوں شوں کی آواز بلند ہوتی جارہی تھی۔ سامری کی آواز بھی اونچی ہونے لگی تھی شور شرابا سن کر کوٹھاری نے پھر آنکھیں کھولی تو کالی ہانڈی اپنی طرف بڑھتے ہوئے دیکھ کر اس کی آنکھوں میں خوف لہرانے لگا شاید وہ اس ہانڈی سے آشنائی رکھتا تھا اور اس کے کرتب سے واقف تھا آخر وہ بھی اسی میدان کا پرانا پاپی تھا۔

ہانڈی زمین سے بلند ہو کر سادھو کوٹھاری کے قریب پہنچ فضا میں رک گئی۔ لیکن اپنے محور پر وتیزی تیزی گھومتی رہی۔ اب سادھو کوٹھاری خوف زدہ ہو گیا۔ کالی ہانڈی کے خطرے کو سر پر منڈلاتا دیکھ کر تپسیا کا دچار اڑنچھو ہو گیا اور وہ بھی سامری کی طرح گھٹنے زمین پر ٹیک کر ہانڈی کی طرف ہاتھ بلند کر کے جے کالی کا نعرہ لگا کر اشلوک پڑھنے لگا۔ اس عمل سے یہ فرق پڑا کہ ہانڈی اپنی جگہ سے آہستہ سے ہلنے لگی اور پیچھے کی جانب کھسکنے لگی۔ صورتحال کو بھانپ کر سامری کے چہرے پر خوف کے سائے منڈلانے لگے اور وہ پہلے سے بھی تیزی کے ساتھ جاپ جپنے لگا۔ جس کی بناء پر ہانڈی پھر کوٹھاری کے حصار کی طرف لپکنے لگی تو کوٹھاری کا جسم لرزنے لگا اور زبان لڑکھڑانے لگی۔ یوں محسوس ہو رہا تھا کہ موت اور زندگی کا آخری معرکہ ہے۔ یقیناً ہانڈی جس کی طرف جائے گی اس کی موت یقینی ہے اس لیے دونوں اپنے اپنے سارے تجربے بروئے کار لانے میں مصروف عمل رہے۔

اس وقت کالی دیوی کے نام کی کالی ہانڈی کوٹھاری کے قائم کردہ حصار سے نزدیک ہی فضا میں بلند کبھی آگے کبھی پیچھے سرکنا شروع ہو جاتی...... کالی کے دونوں پیروکار پورے شدومد سے ہانڈی پر نظریں گاڑھے باآواز بلند اشلوک پڑھنے اور وقفے وقفے سے جے کالی کا نعرہ بلند کر رہے تھے۔ اس کشمکش میں وقت گزرنے لگا۔ سامری کا کانا اُلو بھی کوٹھاری کے گرد تیزی سے چکر کاٹنے لگا۔ کالی طاقتوں کی مڈ بھیڑ سے کالی ہانڈی کے اندر چیخ وپکار اور شور شرابا شروع ہو گیا۔ جیسے بہت سی بدروحیں مل کر سینہ کوبی میں مصروف ہوں۔ تناؤ کی اس کیفیت کے لمحات طویل ہونے لگے۔ ہر طرف سے پر اسرار آوازوں کے شور شرابے سے ہاہا کار مچنے لگی۔ سادھو کوٹھاری اور سامری دونوں ہی پائے کے ساحر تھے۔ دونوں کے اعصاب چٹخنا شروع ہو چکے تھے۔ دونوں کے لباس پسینے سے شرابور تھے اب سامری پھونک پھونک کر کے اپنے تلے قدموں سے آگے بڑھنے لگا۔ اس کے اور ہانڈی کے درمیان فاصلہ کم ہونے لگا۔ کوٹھاری اس کو حرکت میں آتا دیکھ کر مضطرب ہو گیا اس کی آنکھوں میں خوف کے ساتھ الجھن کے سائے بھی لہرانے لگے۔ وہ سامری کی اس حرکت کا نہ صرف مطلب جاننے سے قاصر تھا بلکہ ابھی تک وہ یہ فیصلہ نہ کر پایا تھا کہ آیا جاپ منڈل سے باہر قدم رکھے یا نہ رکھے۔ کیوں کہ نامکمل جاپ چھوڑ کر حفاظتی حصار سے باہر آنا خطرے سے خالی نہ تھا۔ اس عمل سے بھی اس کی جان کو خطرہ ہو سکتا تھا سامری بڑھتے بڑھتے ہانڈی کے سر پر آ پہنچا اس کے دائیں ہاتھ میں چھری پکڑی تھی۔ قریب آتے ہی سامری نے سرعت کے ساتھ اپنی ران سے عبا ہٹائی لیکن اشلوک منتر مسلسل پڑھ رہا تھا۔ اور پھر پلک جھپکنے کے عرصے میں اس نے بجلی کی تیزی کے ساتھ ہی اپنی ران سے گوشت کا ایک اور ٹکڑا اتارا اور جے کالی کا نعرہ مارتے اچھل کر اپنے گوشت کا ایک ٹکڑا ہانڈی میں

ڈال دیا اور اپنی زبان کی حرکت کو جاری رکھ کر اپنی نگاہیں اپنے کانے اُلو کی طرف سکیڑ لیں تو الو منڈل کے گرد چکر کاٹتے کاٹتے پھر سے حفاظتی گھراؤ توڑتے ہوئے منڈل کے اندر داخل ہو کر کوٹھاری کے سر کا نشانہ لیتے ہوئے حملہ آور ہو گیا۔

کوٹھاری اس اچانک افتاد سے گھبرا کر اشلوک بھول گیا اور اپنا بچاؤ کرنے کے لیے ہاتھ آگے کر دیے لیکن اس کے ہاتھ بلند کرنے سے قبل ہی الو کو آگ لگ گئی۔ شاید حفاظتی حصار توڑنے کی پاداش میں اس کو جان کا نذرانہ پیش کرنا پڑ گیا اور دو شاید یہی منشا تھی سامری کی کہ کسی طرح کوٹھاری کا دھیان بٹ جائے ادھر سامری اپنے جسم کا مزید گوشت کالی کے حضور پیش کر چکا تھا اور ان دونوں عوامل کے ردعمل کے طور پر کالی ہانڈی کی شوں شوں بڑھ گئی اور وہ تیزی سے کوٹھاری کی جانب سرکنے لگی اور آتے آتے حصار کے عین اوپر آ کر گھومنا شروع ہو گئی۔ اب کوٹھاری کے پیر اکھڑ گئے اور وہ بوکھلا کر جان بچانے کی نیت سے ایک طرف کو بھاگ کھڑا ہوا اس کے بھاگتے ہی کالی ہانڈی اس کے تعاقب میں لپکی۔ اب حالت یہ تھی کہ کوٹھاری جدھر کو جاتا ہانڈی اس کے سر پر منڈلاتے ہوئے اس کے ساتھ ساتھ تھی۔ سامری اب اور زیادہ زور لگا کر اشلوک اور جنتر منتر دھرانے میں مشغول ہو گیا اور پھر جیسے بجلی کوندی ہو ...... ایسا ایک روشنی کا شعلہ لپکا جو سورج کی روشنی کو بھی ایک لمحے کو ماند کر گیا اور زبردست چٹاخ پیدا ہوئی اور کالی ہانڈی کوٹھاری کے سر سے ٹکرائی تو کوٹھاری کا پورا جسم ریزے ریزے ہو گیا جیسے کسی نے اس کا قیمہ بنا دیا ہو۔ ہر طرف دیکھتے ہی دیکھتے اندھیرا چھا گیا اور آندھیاں چلنے لگیں ...... چہار سو بدروحیں اور بھٹکتی آتمائیں بین کرنے کے انداز میں مل کر منحوس آوازوں میں رونے لگیں۔ ایسے بین کالی شکتیوں کے ٹکراؤ کے بعد ہوتے ہیں اور پھر سورج نکل آیا...... امن ہو گیا...... سامری زمین پر اوندھے منہ لیٹا لمبے لمبے سانس لے رہا تھا اور کوٹھاری کا جسم چھوٹے چھوٹے ذروں کی شکل میں جا بجا بکھرا پڑا تھا۔ سامری نے اٹھ کر اپنا تمام سامان سنبھالا اور فخریہ مسکراہٹ کے ساتھ اس طرف چل دیا جہاں اس نے شکنتلا کو چھوڑا تھا۔ وہاں پہنچ کر کیا دیکھتا ہے کہ تمام کنیزیں فضا میں معلق چیخ و پکار کر رہی ہیں اور ان کے جسموں کے مختلف حصوں سے خون دھاروں کی شکل میں زمین پر بنے ہوئے چھوٹے شفاف شیشے کے تالاب میں گر رہا ہے جہاں شکنتلا بیٹھی ایک مرو کی شہ رگ سے منہ لگائے اس کا خون پی رہی ہے اور کنیزوں کا خون اس کے مرمریں جسم پر گر رہا ہے یوں خونی ناگن اپنی پیاس بھی بجھا رہی تھی اور خون سے غسل بھی کر رہی تھی۔ سامری مسکرا کر رہ گیا۔

☆......☆......☆

''پریہ کی جگہ اب کس کو مقرر کرو گی......؟'' سامری شکنتلا کی لچکیلی کمر میں ہاتھ ڈالتے ہوئے بولا تو شکنتلا نے بالوں کو ادا سے جھٹکا اور فخریہ انداز سے بولی۔ اب مجھے کسی کو نائب مقرر کرنے کی ضرورت نہیں سامری۔ اب شکنتلا اس قدر شکتی مان ہو چکی ہے کہ کوئی عام آدمی شکنتلا کا سامنا کرنے کا تصور نہیں کر سکتا۔ ویسے بھی تابانہ کے باسی اب جان چکے ہیں اور محل کا ایک ایک شخص جانتا ہے کہ میں جادوگرنی بھی ہوں لہٰذا اب مجھے کوئی خوف یا ڈر نہیں۔ جب بھی محل میں آؤں گی سب میری عزت کرنے پر مجبور ہوں گے اور نہ میری خون پینے والی بات کسی سے ڈھکی چھپی ہے اور نہ مجھے اب کسی سے خوفزدہ ہونے کی ضرورت ہے اور نہ کسی کی مدد کی۔

''اور سامری کے بارے میں کیا خیال ہے......'' سامری نے معنی خیز انداز میں سوال کیا تو شکنتلا نے بانہیں اس کے گلے میں ڈالتے ہوئے کہا۔

''تم میرے ساتھی اور محسن ہو لیکن یہ بات بہرحال ایک حقیقت ہے کہ اب میں تم سے بھی زیادہ شکتی رکھتی ہوں۔'' شکنتلا فخریہ لہجے میں بولتی گئی۔

''یہ تمہاری بھول ہے شکنتو......'' ایسی باتیں نہ کیا کرو جس سے ہمارے درمیان بدگمانی پیدا ہو اور ابھی تو تم لشکران کے خوف سے کانپنے لگتی ہو۔

''ارے ہاں......'' شکنتلا مچھلی کی طرح سامری کی گرفت سے نکل کر اپنا لباس درست کرتے ہوئے بولی۔

''کوٹھاری تو ختم ہو چکا ہے اب تو حسکران آزاد ہو گیا ہوگا۔''

’’اسی لیے تو کہتا ہوں کہ سامری کو نہ للکارو...... بھولی صورت......’’تمہیں تو یہ بھی پتا نہیں کہ خسکران کہاں اور کس حالت میں ہے۔ سنو خسکران کوٹھاری کے سحر سے آزاد ہو چکا ہے پرنتو اس کو یہ علم نہیں ہوا...... بلکہ وہ اس وقت ہارا کاری کے جنگلوں میں آباد ایک وحشی قبیلے میں ہے۔ اس کے ساتھ ایک مسلمان نوجوان دلاور بھی ہے وہ بھی کوٹھاری کا قیدی ہے۔ اور تمہیں ابھی میرے ساتھ ہارا کاری چلنا ہوگا تا کہ وہاں سے انہیں اس قبیلے جس کا سردار تبریشیا ہے سے آزاد کروا کرلانے کی کوشش کی جاسکے۔‘‘

’’کوشش کیوں...... یقینی بات کیوں نہیں۔‘‘ شکنتلا اعتماد سے بولی۔

’’تبریشیا کی شکتی سے تم واقف نہیں۔‘‘ سامری سنجیدہ ہو گیا۔

’’تبریشیا عرصہ دراز سے زندہ چلا آرہا ہے۔ اس کے قبضے میں عنکبوت جن ہے اور اس کی اپنی جان ایک اچھیا دھاری ناگ کے اندر ہے جب تک وہ ناگ ختم نہیں کیا جاتا تبریشیا مر نہیں سکتا۔

’’بہت خوب۔‘‘ شکنتلا چہکی۔ یہ کام تو خاصا دلچسپ معلوم پڑتا ہے۔

’’دلچسپ ہونے کے ساتھ ساتھ خوفناک حد تک خطرناک بھی۔ اس میں جان کا خطرہ بھی ہے۔ تبریشیا اب تک کے تمام دشمنوں سے طاقتور ہے اور اس کے لیے ہمیں بھی خاص تیاری کرنا ہوگی۔‘‘

’’تو پھر کب چلیں ہم ہارا کاری کے جنگلوں میں...... خسکران کو لینے۔‘‘

’’کل شام کو چلیں گے۔ میں نے کچھ ضروری تیاریاں ابھی کرنی ہیں۔ اب میں چلتا ہوں تم بھی تب تک آرام کرو۔‘‘ یہ کہہ کر سامری غائب ہو گیا اور شکنتلا طویل سانس لے کر رہ گئی اور سکون سے لیٹ گئی۔

☆......☆......☆

سامری اور شکنتلا ایک ہیبت ناک گڑگڑاہٹ کے ساتھ بستی ہارا کاری کے اس میدان کی زمین پھاڑ کر نکلنا شروع ہوئے جہاں وحشی دلاور کو اس کا سر کاٹنے کے لیے اس جگہ لے جانے کے لیے کھینچ رہے تھے۔ جہاں دوسرے پانچ قیدیوں کے سر کاٹے جا چکے تھے۔ شق ہوتی زمین سے شکنتلا اور سامری اپنی جگہ پر کھڑے ہو گئے اور اس سے قبل کہ شکنتلا اور سامری زمین سے پوری طرح باہر آتے تبریشیا اور شیکارا دونوں نے بیک وقت ایک فلک شگاف چیخ مار کر ہاتھوں کی انگلیاں پھیلا کر شکنتلا اور سامری کی طرف کر کے چلانے لگے تو نارنجی رنگ کی شعاعیں برق رفتاری سے سامری اور شکنتلا کو گھیرے میں لے کر گھومنا شروع کر دیا تو سامری اور شکنتلا جو ابھی زمین سے کمر کمر تک باہر نکلے تھے وہیں جم کر رہ گئے۔

’’ہیالالہ...... ہیالالہ...... ہیالالہ......‘‘ شیکارا اور تبریشیا نعرے لگاتے ہوئے سامری اور شکنتلا کی طرف بڑھنے لگے۔ دلاور کو قابو کرنے والے جنگلی بھی یہ منظر دیکھ کر رک گئے۔ یوں موت کا آنا شاید ٹھہر سا گیا۔ خود دلاور اور خسکران بھی اس عجیب و غریب صورت حال میں مگن ہو کر اپنے اردگرد سے بے خبر ہو گئے۔ ادھر شکنتلا اور سامری کے چہرے پریشان نظر آرہے تھے۔ انہیں سر منڈاتے ہی یوں اولے پڑنے کی قطعاً اُمید نہ تھی۔ اسی اثناء میں تبریشیا اور شیکارا ان کے سروں پر پہنچ گئے۔ شیکارا نے قریب آتے ہی بایاں ہاتھ گھما کر شکنتلا کے گال پر جڑ دیا۔ شکنتلا کے لیے یہ دوسری غیر متوقع بات تھی۔ ادھر تبریشیا نے اسی طرح سامری کے منہ پر طمانچہ کھینچ مارا اور پھر دوسرا طمانچہ رسید کیا۔ دوسری طرف شیکارا بھی دوسری بار طمانچہ شکنتلا کے دوسرے گال پر جما چکا تھا۔ اور پھر دونوں شکنتلا اور سامری کے گال سرخ کرنے لگے۔ شکنتلا اور سامری کے ہاتھ ابھی زمین کے اندر ہی تھے۔ نتیجے کے طور پر دونوں بے بسی سے پٹنے لگے۔ طمانچے اتنے بھرپور، زوردار اور تسلسل سے تھے کہ دونوں جنتر منتر بھول گئے اور بے بسی سے منہ بچانے کے لیے اِدھر اُدھر کرنے لگے۔ لیکن تبریشیا اور شیکارا انہیں سنبھلنے کا کوئی موقع دینے پر رضامند نظر نہ آتے تھے۔

سامری اپنے حواس قائم رکھنے کی پوری سعی میں مصروف عمل تھا۔ تاہم شکنتلا لاکھ طاقتور ہونے کے باوجود لڑکی ہونے کے ناطے ان خوفناک تھپڑوں کی تاب نہ لا سکی اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے اور اس کی باچھوں سے خون کی لکیریں باہر نکلنے لگیں اور وہ بلبلانے لگی۔ اور پھر اس کے ذہن کے ہر گوشے میں تاریکی بیر جمانے میں کامیاب ہو گئی۔

شکنتلا بے ہوش ہو چکی تھی۔
ادھر تبریشیا سامری کے منہ پر مسلسل تھپڑ زنی کر کے اس کی زبان بندی میں مصروف عمل تھا لیکن سامری کے اعصاب شکنتلا کے مقابلے میں خاصے مضبوط ثابت ہوئے اور تھپڑ مارتے مارتے اچانک ہی تبریشیا کے ہاتھ ہوا میں لہرا کر رہ گئے۔ سامری غائب ہو چکا تھا۔ عین اسی وقت زوردار کڑک کے ساتھ بجلی چمکی اور موسلا دھار بارش ہونے لگی۔ بجلی چمکنے سے پورا پنڈال روشن ہو گیا تو وحشیوں میں بھگدڑ مچ گئی۔ اور وہ اِدھر اُدھر بھاگنے لگے۔ بجلی مسلسل چمکنے لگی۔ بجلی کے چمکنے سے وحشی سراسیمہ ہو جاتے اور چمک ختم ہونے کے بعد ہاؤ ہو کا شور مچنے لگتا۔ وحشی دھڑا دھڑ بھاگ رہے تھے۔ سوا سی افراتفری کی آڑ لے کر دلاور ناک کی سیدھ میں بھاگ نکلا۔ گہری اندھیری رات اور موسلا دھار بارش کے باعث جگہ جگہ کیچڑ بن رہا تھا۔ لیکن جان بچانے کے لیے وہ سرپٹ بھاگا چلا جا رہا تھا۔ بھاگتے بھاگتے وہ درختوں کے جھنڈ میں گھس گیا۔ یہ ایک گھنا جنگل تھا۔ ٹہنیاں اور کانٹے اس کے منہ اور جسم پر زخم بنانے لگے۔ آخر کار ایک جگہ کھڑا ہو کر ہانپنے لگا اور تیزی سے چاروں طرف نگاہیں دوڑا کر کسی پناہ گاہ کو تلاش کرنے لگا۔ بارش اور تیز ہواؤں کے جھکڑ اب بھی چل رہے تھے۔ اِدھر اُدھر تلاش کے بعد اسے ایک بڑی چٹان کی اوٹ مل گئی اور وہ وہاں بیٹھ گیا۔ کافی دیر کے بعد موسم کھل گیا۔ آسمان صاف ہو گیا اور چاند نے چہار سو پیلی روشنی سے دھرتی پر مدہم چاندنی کی چادر تان لی۔ ایسے میں دلاور کو دور کچھ فاصلے پر کچے پکے مکانات کا سلسلہ دکھائی دیا۔ یہ شاید وحشیوں کی بستی تھی۔ حکمران کا کچھ پتا نہ تھا۔ چٹان کی اوٹ میں بیٹھے بیٹھے دلاور اونگھنے لگا اور نیند کی گہری آغوش میں چلا گیا۔ پھر اسے یوں محسوس ہوا کہ اسے کوئی جگا رہا ہے۔ آنکھ کھلی تو بابا سائیں مرچو کو اپنے سامنے پایا، بابا سائیں دو زانو بیٹھے تھے۔ ہاتھ میں تسبیح تھام رکھی تھی۔ جس کے دانے مسلسل گر رہے تھے۔

''بابا جی ......آپ۔''

''ہاں میں دلاور۔''

''بابا جی مجھے اس مصیبت سے نکال لیں۔ میں حالات سے لڑتے لڑتے چور ہو گیا ہوں۔ میری مدد کریں بابا جی۔''

''اپنی مدد آپ کے تحت چلنا سیکھو۔ ایک بات میں تجھے بتا دوں کہ کوٹھاری مر چکا ہے اور تم اب آزاد ہو۔''

''سچ بابا جی...... یہ تو آپ نے بڑی خوشخبری سنائی۔''

''دوسری بات یہ ہے کہ......'' سائیں مرچو اپنی ہی دھن میں بول رہے تھے۔

''باوضو رہنے کی کوشش کرو نماز پڑھا کرو...... یہ جادوگروں کی بستی ہے۔ یہاں ابلیس کے پجاری رہتے ہیں۔ آیت الکرسی تیری حفاظت کرے گی۔ دن کی روشنی میں ابلیسی عام آدمی ہوتے ہیں جبکہ رات کو ان کی شیطانی قوتیں اُجاگر ہوتی ہیں ایسے میں اندھیرا ان کا مددگار اور چمکدار روشنی ان کی دشمن ہوتی ہے۔ چمکتی روشنی دیکھ کر یہ پاگل ہو جاتے ہیں۔ اسی لیے میں تمہارے لیے ایک تحفہ چھوڑے جا رہا ہوں۔ رات کے وقت اس کو اپنی مٹھی میں بند رکھنا اور یاد رکھو جو ڈر گیا وہ مر گیا...... دلاور ہو تو دل آور بھی بنو...... ورنہ۔ یہ بستی تمہارے لیے قبرستان بن جائے گی۔'' یہ کہہ کر سائیں مرچو نے اپنی عبا کے اندر ہاتھ ڈال کر ایک انڈہ نما شیشے کا بنا ہوا پتھر نکالا تو ساری جگہ اس کی چمک سے روشن ہو گئی۔ دلاور نے ہاتھ بڑھا کر اسے پکڑا تو اس کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ اسی لمحے اسے شدید چبھن کا احساس ابھرا تو اس کی آنکھ کھل گئی۔

''کیا دیکھتا ہے کہ صبح ہو چکی ہے سورج نکل رہا ہے جبکہ چند وحشی جنگلی اس کے گرد گھیرا ڈالے کھڑے ہیں۔ انہی میں سے شاید کسی نے نیزے کی انی چبھوئی تھی۔ دلاور کو پشت پر جلن کا احساس ہو رہا تھا۔ وہ تیزی سے اُٹھ کر کھڑا ہو گیا تو وحشی غوں غاں غاں کرنے لگے اور ایک نے آگے بڑھ کر اسے کچھ کہا اور اپنے ہتھیار سے ایک طرف اشارہ کر کے چلنے کا حکم دیا۔ دلاور چپ چاپ چل پڑا وہ سوچ رہا تھا کہ کاش سائیں مرچو حقیقت میں اسے کوئی تحفہ دے دیتے تو بڑی آسانی ہو جاتی۔ وحشی اسے گھیرے میں لے کر اس بستی کی طرف لے جا رہے تھے جسے رات کے اندھیرے میں وہ دیکھ چکا تھا۔ بستی کی گلیوں میں کافی دیر چلنے کے بعد وحشی اسے ایک بہت بڑی کالے پتھروں سے تعمیر کی گئی عمارت کے سامنے لے آئے۔ عمارت کی چار دیواری وسیع و عریض تھی۔ لیکن وہ جیسے ہی اس کے صحن میں پہنچا تو دیکھتا ہے کہ چار دیواری کے بیچوں

بیچ ایک بلند مینار ہے انسانی کھوپڑیوں سے بنا ہوا ہیبت ناک مینار۔ اتنا اونچا کہ اس کی چوٹی نظر نہ آتی تھی۔ مینار سے ذرا ہٹ کر ایک بہت بڑا تالاب تھا۔ جس میں سیاہ گدلا اور گندہ پانی تھا۔ گندگی بھرے تالاب سے سڑاند اُٹھ رہی تھی۔ دلاور نے فوراً ناک پر ہاتھ رکھ لیا۔ لیکن وہ دیکھ رہا تھا کہ بے شمار ننگ دھڑنگ عورتیں اور مرد اس میں اشنان کر رہے تھے اور ایک دوسرے پر کیچڑ اچھال رہے تھے۔ شاید ان ابلیسیوں کا یہ کوئی مقدس تالاب تھا۔ وحشی اسے ہانکتے ہوئے عمارت کے برآمدے میں لے گئے۔ برآمدے سے آگے بڑے بڑے کمرے تھے انہی میں سے ایک کمرے میں دلاور کو دھکا دے کر باہر سے دروازہ مقفل کر دیا گیا۔ دھکا لگنے سے دلاور منہ کے بل جا گرا تو اچانک اسے کسی گول نما چیز کے لڑھکنے کی آواز آئی اور آواز کے ساتھ ہی اندھیری کوٹھڑی روشن ہوگئی۔ تو دلاور کی آنکھیں ایک دفعہ پھر چندھیا گئیں۔ اور اس کے ساتھ ہی اسے حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔ جب اس نے دیکھا کہ لڑھکنے والی چیز وہی انڈہ نما بیضوی شیشے والا پتھر ہے جسے خواب میں اس نے سائیں مرچو سے لیا تھا۔ دلاور حیرانگی اور خوشگواریت سے اسے دیکھنے لگا۔ اور ہاتھ بڑھا کر اسے دائیں ہاتھ میں تھام لیا تو اس نے اسے بالکل ہلکا پھلکا محسوس کیا۔ تاہم شیشے کے اس بیضوی روشن انڈے کی چمک اتنی زیادہ تھی کہ اس پر دلاور کی نظریں نہ ٹھہر رہی تھیں۔

''شکریہ بابا جی...... شکریہ۔'' خوشی سے دلاور کا دل بلیوں اچھلنے لگا۔ فرطِ جذبات سے اس کے آنسو نکل آئے۔ وہ بابا سائیں مرچو کی روحانیت اور سچائی کا قائل ہوگیا۔ روشن روحانی انڈے کو پا کر دلاور اپنے آپ میں اعتماد محسوس کرنے لگا۔ اب اس نے انڈے کو اپنے کپڑوں کی ایک اندرونی جیب میں رکھ لیا اور زمین پر بیٹھ کر تیمم کر کے باوضو ہوگیا۔ اب اس کا دل مطمئن تھا مگر زوروں کی بھوک لگی ہوئی تھی۔ جانے کتنی دیر گزر گئی۔ دلاور کا بھوک سے برا حال تھا۔ لیکن سوائے صبر کے کوئی چارہ نہ تھا۔ وحشی اسے کمرے میں بند کر کے کمرہ کا دروازہ سختی کے ساتھ باہر سے بند کر گئے تھے۔ اچانک آہٹ پیدا ہوئی۔ دروازہ کھلا اور دو وحشی اندر آئے انہوں نے ایک پرات اُٹھا رکھی تھی جس میں عجیب وغریب سبزی پکی تھی اور ساتھ کسی عجیب سے آٹے کی بھوری رنگ کی تین روٹیاں رکھی تھیں پانی کا ایک برتن بھی لبالب تھا۔

دلاور کے آگے سامان رکھ کر وہ ایک طرف بیٹھ گئے۔ دلاور اللہ کا نام لے کر کھانے پر ٹوٹ پڑا اور منٹوں میں سب کچھ چٹ کر کے پانی بسم اللہ پڑھ کر پیا اور لمبی ڈکار مار کر شکرانے کی دعا کے لیے ہاتھ اُٹھا دیے۔ وحشی اس کی حرکات کو بغور دیکھ رہے تھے۔

☆......☆......☆

باہر شاید رات ہو چکی تھی۔ کیونکہ کوٹھڑی کی چھت کے واحد چھوٹے سے روشندان سے روشنی آنا بند ہوگئی تھی۔ دلاور پھسکڑا مارے بیٹھا حالات پر غور کر رہا تھا کہ نہ جانے حسکران کہاں چلا گیا ہے۔ اور وہ کون تھے جو عین اس کی موت کے وقت زمین پھاڑ کر نکلے تھے۔ جنہیں تبریشیا اور شیکارا نے تھپڑوں پر رکھ لیا تھا۔ دلاور زیادہ نہ جان سکا تھا کہ پھر تو افراتفری مچ گئی تھی اور دلاور اپنی جان بچا کر بھاگ نکلا تھا۔ تاہم اتنا اسے ضرور پتا چل گیا تھا کہ زمین شق کر کے آنے والوں میں کوئی عورت بھی تھی جو شیکارا کے مسلسل تھپڑ زنی سے چلانے لگی تھی۔ دلاور سوچوں میں غرقاب تھا کہ دھڑام سے کوٹھڑی کا دروازہ کھلا اور ایک لڑکی کو باہر سے دھکا دے کر کوٹھڑی کے اندر پھینک دیا گیا۔ گرنے سے لڑکی کی چیخ نکل گئی۔ اس کی چیخ دلاور کو آشنا لگی اور دلاور چونک پڑا۔

☆......☆......☆

شکنتلا جب ہوش کی وادیوں میں واپس پلٹی تو اس نے اپنے آپ کو ریت کے اندر دھنسے ہوئے پایا۔ صرف اس کی گردن باہر تھی۔ باقی سارا جسم ریت کے اندر دبا ہوا تھا۔ منہ کے اندر روئی ٹھنسی ہوئی اور منہ پر کپڑا بندھا تھا جسے سر کے پچھلی طرف لے جا کر سختی سے گرہ لگائی گئی تھی۔ ریت سخت گرم ہو رہی تھی۔ جس کی وجہ سے شکنتلا بڑی اذیت محسوس کر رہی تھی۔ اس نے پلکیں اُٹھا کر دیکھا تو ارد گرد چند وحشیوں کو پایا جو آلتی پالتی مارے اس کے مختلف اطراف بیٹھے تھے۔ یہ دراصل شیکارا، تبریشیا اور ان کے چند رفقائے کار تھے۔ انہیں پتا تھا کہ شکنتلا ناگن اور انتہائی شاطر جادوگرنی ہے۔ اسی

لیے اس وقت وہ اس پر ایک عمل خاص کرنے میں مصروف تھے۔ سب کے ہونٹ تیزی سے ہل رہے تھے۔ تبریشیا کے سامنے ایک چاندی کی طشتری رکھی تھی۔ جس میں سیاہ گاڑھا غلیظ کیچڑ تھا جس میں بے شمار چھوٹے چھوٹے حشرات الارض تیر رہے تھے۔ اور اس پانی سے بدبو کے بھبکے اُڑ رہے تھے۔ شیکارا کے ہاتھ میں سانپ نما عصا تھا جس کی مُٹھ والی جگہ پر ایسے سانپ کی تشبیہ تھی جس کے منہ کے اندر ایک چھوٹا سا سانپ پھنسا ہوا تھا جو آدھا منہ کے اندر اور آدھا باہر تکلیف سے تڑپنے کے انداز میں تھا۔ کافی دیر تک پڑھتے رہنے کے بعد تبریشیا اپنی جگہ سے اُٹھا اور شکنتلا کے چہرے کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔ شکنتلا جو کھلی آنکھوں سے ساری صورت حال دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں خوف اُترنے لگا۔ یہ تو وہ سمجھ چکی تھی کہ وہ ہاراکاری قبیلے کے چنگل میں پھنس چکی ہے رات ہاراکاری قبیلے میں نمودار ہوتے ہی اس کے ساتھ جو سلوک ہوا تھا وہ اس کو یاد آ رہا تھا اور اس وقت وہ جن حالات سے نبرد آزما تھی وہ اس کے لیے انتہائی مایوس کن تھے۔ وہ بالکل بے بس ہو چکی تھی۔ روئی سے بھرا منہ بری طرح کس کر بندھا ہوا تھا۔ وہ ناک کے راستے سانس لینے پر مجبور تھی۔ ریت اس کی آنکھوں میں پڑ رہی تھی۔ جس کی وجہ سے آنکھیں بھی کھلی رکھنا دشوار محسوس ہو رہا تھا۔ چمکتے سورج تلے ریت تپ رہی تھی۔ اسے اپنا دم گھٹتا محسوس ہو رہا تھا۔ اس کی زبان حرکت سے مکمل طور پر قاصر تھی۔ سامری کا دور دور تک نشان بھی نہ تھا۔ اور اس کے گرد وحشی جادوگر گھیرا ڈالے اس پر کوئی عمل کرنے میں مصروف تھے۔ اب کیا ہوگا۔ یہ سوچ سوچ کر اسے ہول اُٹھ رہے تھے۔

اب تبریشیا نے اپنی طشتری کے اندر ہاتھ ڈال کر باہر نکالا تو اس کے ہاتھ میں کیچڑ تھا جو اس نے شکنتلا کے چہرے کے کھلے حصے پر لگانا شروع کر دیا اور گال، آنکھیں، ماتھا، ٹھوڑی کا نچلا اور گردن کا اوپری حصہ کیچڑ سے بھر دیے۔ کیچڑ سے اُٹھنے والی دماغ پھاڑ بدبو سے شکنتلا کو ابکائیاں آنے لگیں لیکن منہ سختی سے بند ہونے کی وجہ سے ابکائیاں حلق کے اندر ہی دم توڑنے لگیں۔ چہرے پر گندے کیڑوں کے چلنے پھرنے کو شکنتلا صاف محسوس کر رہی تھی۔ اس نے دل ہی دل میں سامری کو یاد کیا کوئی منتر پڑھنے کی کوشش کی کئی دفعہ روپ بدلنے کا سوچا لیکن ندارد...... مایوسی کی اتھاہ گہرائیاں اسے ہر جانب دکھائی دینے لگیں۔ تبریشیا اپنے کام میں مصروف رہا اور اس کے سر کے بالوں کو کیچڑ سے لت پت کر دیا۔ اب شیکارا نے عصا لے کر شکنتلا کے گرد ایک حصار قائم کرنا شروع کر دیا۔ علامتی حصار مکمل کرنے کے بعد عصا کو جس پر سانپ کو کھانے والے سانپ کی شبیہ نمایاں تھی۔ اُلٹی طرف سے پکڑ کر دستہ شکنتلا کے سر پر مارنے لگا۔ حالانکہ وہ آہستہ آہستہ مار رہا تھا مگر شکنتلا کو یوں محسوس ہو رہا تھا کہ اس کے دماغ میں دھماکے ہو رہے ہوں اس کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیت مفقود ہو چکی تھی۔ اب شیکارا اور تبریشیا اور ان کے تمام رفقائے کار اٹھے اور شکنتلا کے سر کے گرداگرد کھڑے ہو گئے۔ اور دونوں ہاتھوں کی بند مٹھیاں اس کے سر کے عین اوپر لا کر نچوڑنے کے انداز میں دبانے لگے تو سبز رنگ کا سیاہ مادہ مٹھیوں سے نکل کر شکنتلا کے سر پر گرا تو شکنتلا ایک دفعہ چلانے کے انداز میں سر جھٹکنے لگی۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کے سر پر کسی نے انتہائی ٹھنڈی برفیلی چیز انڈیل دی ہو۔ اور اس کے بعد شکنتلا کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھانے لگا اور پھر وہ بے ہوش ہو گئی۔

دوبارہ جب آنکھ کھلی تو اس نے اپنے آپ کو صاف ستھرے کپڑوں میں پیال کے بستر پر لیٹے پایا۔ ہوش آنے پر اسے کھانے پینے کا سامان دیا گیا اور پھر دو وحشیوں نے اسے ہتھیاروں کے سائے تلے ابلیسی دیوتا کے کھوپڑی مندر میں لا کر اس کوٹھڑی میں دھکیل دیا جہاں دلاور صبح سے موجود تھا۔

☆......☆......☆

دلاور نے فوراً جانچ لیا کہ یہ وہی عورت ہے جو کل رات زمین پھاڑ کر نکلی تو تھی لیکن ہاراکاری کے کاہن اعظم اور سردار کے ہتھے چڑھ گئی تھی۔ شکنتلا نے بھی کوٹھڑی میں اپنے علاوہ ایک مرد کی موجودگی کو محسوس کیا اور سیدھی ہو کر بیٹھ گئی اور گرنے سے لگنے والی چوٹوں کو سہلانے لگی۔ دونوں کی آنکھیں چار ہوئیں تو دونوں ہی ایک دوسرے کو نظرانداز نہ کر سکے اور آنکھوں میں آنکھیں ڈالے مبہوت ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ شکنتلا کے دیکھنے کا سبب دلاور کی دلآویز مردانہ وجاہت

تھی۔ بھوری بھوری خوابیدہ آنکھیں، گھنگھریالے بال، ساڑھے چھ فٹ قد، گھنی مونچھیں، بازوؤں کی مچلتی مچھلیاں مضبوط جسم شکنتلا تو پہلے ہی آنکھیں نہ جھپکاتی تھی۔ دلاور کی شخصیت میں ایسی کھوئی کہ کبھی کبھار دانستہ جو پلکیں جھپکاتی تھی وہ بھی بھول گئی۔ اِدھر دلاور بھی شکنتلا کے حسن میں کھوسا گیا۔ گو اس وقت شکنتلا کے بکھرے اور ریت سے اٹے ہوئے بال تھے۔ لیکن بھی وحشیوں کے نرغے میں خوبصورت دوشیزہ دیکھ کر دلاور مبہوت ہو گیا۔ اس کے علاوہ دلاور کے لیے یہ بات بھی باعث دلچسپ تھی کہ یہ عورت کون ہے جو کل زمین کے اندر سے برآمد ہوئی تھی۔ دونوں کافی دیر خاموشی سے ایک دوسرے کو تکتے رہے۔ آخرکار شکنتلا سے نہ رہا گیا اور اس نے سکوت کا پیٹ چاک کر دیا۔

''کون ہو تم نوجوان؟'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔

''دلاور۔'' دلاور نے نپے تلے انداز میں جواب دیا۔ ''اور تم کون ہو؟''

''شکنتلا...... شکنتلا۔'' دلاور نے زیرلب دہرایا۔ اسے یوں محسوس ہوا کہ جیسے اس نام سے پہلے بھی کوئی آشنائی ہو۔ وہ سوچ میں پڑ گیا۔

''کس سوچ میں گم ہو خوبصورت نوجوان۔'' شکنتلا اس کے قریب آ کر بیٹھ گئی۔

''یہ نام میں نے پہلے بھی سنا ہے۔'' دلاور شکنتلا کو بغور دیکھتے ہوئے بولا۔

''ضرور سنا ہوگا۔'' شکنتلا مسکرائی۔ ''شکنتلا کو تو آدھی دنیا جانتی ہے۔''

''ارے ہاں۔'' دلاور یاد آ جانے کے انداز میں خود سے مخاطب ہوا۔ ''شکنتلا نام کی عورت کا ذکر تو خسکران بھائی نے بھی کیا تھا۔''

''تم...... تم...... خسکران کو جانتے ہو۔'' شکنتلا حیرانگی کے ساتھ پُرامید لہجے میں بولی۔

''ہاں...... کیوں نہیں...... وہ میرے ساتھ ہی تھا۔ البتہ کل شام سے لاپتا ہے۔''

''تم نے ضرور پھر میرے بارے میں خسکران سے ہی سنا ہوگا۔'' لیکن دلاور نے کچھ سوچا تو ڈر اور خوف کی ایک لہر اس کے چہرے پر آ کر گزر گئی۔

''تم ناگن ہو......'' دلاور کسی انجانے خوف سے لرز اٹھا۔

''ہاں۔'' شکنتلا مسکرا کر بولی۔

''لیکن تمہیں مجھ سے ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں دلاور...... کیونکہ تم خوبصورت اور جوان ہو اور مجھے ایسے مرد بہت اچھے لگتے ہیں۔''

''کیوں؟'' دلاور کے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔

''اس لیے کہ میں خود بھی خوبصورت اور جوان ہوں۔''

''کیا تم مجھے سانپ بن کر دکھا سکتی ہو؟'' دلاور کا دل شاید ابھی اس حقیقت کو تسلیم کرنے پر تیار نہ تھا۔

''پتا نہیں کوشش کرتی ہوں۔'' شکنتلا بے دلی سے بولی۔ اسے یقین تھا کہ تمام رات اور سارا دن اس پر جو جان لیوا تجربات کیے گئے ہیں اور اس کے بعد اس کوٹھڑی میں اس کو قید کر دیا گیا ہے تو یقیناً تبریشیا اور اس کے ساتھیوں نے اس کی صلاحیتیں سلب کر لی ہوں گی۔ یہ سوچ کر اس نے ہلکی سی پھنکار ماری اور سانپ بننے کا خیال من میں لائی تو اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جو اس نے اپنے آپ کو ناگن بنتے ہوئے پایا۔

دلاور یہ دیکھ کر دنگ رہ گیا اور ایک سنسناہٹ اس کی ریڑھ کی ہڈی میں سرایت کرتی چلی گئی۔ دوسرے ہی لمحے شکنتلا پھر انسان بن گئی لیکن اب وہ پہلے والی گرد وغبار اور ریت سے اٹی ہوئی میلی کچیلی شکنتلا نہ تھی۔ بلکہ سبز رنگ کی باریک ایک جالی دار ساڑھی میں ملبوس تھی۔ سیاہ لمبی ریشمی زلفیں شانوں پر بکھری ہوئی۔ مکمل بناؤ سنگھار اور ہیرے جواہرات اور سونے کے زیورات سے لدی پھندی۔

دلاور اس کا دیومالائی حسن دیکھ کر حیرت زدہ ہو گیا۔

"ڈر گئے؟" شکنتلا مسکرائی۔
"دلاور دل آور ہے اور دلاور نے اللہ کے سوا کسی سے ڈرنا نہیں سیکھا۔" دلاور نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مضبوط لہجے میں کہا تو شکنتلا کو اپنی توہین محسوس ہوئی۔ اس کے ہونٹ بھینچ گئے۔ اسی قسم کے الفاظ سے ایسے ایک دفعہ پہلے بھی واسطہ پڑا تھا۔ غصے سے اس کے چہرے کی رنگت سرخ ہونے لگی۔ کچھ دیر پہلے تک تو وہ یہ سمجھ رہی تھی کہ اس کی طاقتیں سلب ہو چکی ہیں۔ لیکن انسان سے سانپ اور پھر انسانی روپ میں آنے کی کامیابی کے بعد اپنی فطرت کے عین مطابق پھر اس کی آنکھوں اور دماغ پر غرور کی چربی چڑھ گئی۔
"یہ بات صحیح ہے کہ تم مجھے پہلی نظر میں ہی پسند آئے ہو۔ پرنتو تم شکنتلا کا اپمان کسی صورت نہیں کر سکتے۔ اپنے الفاظ واپس لو دلاور۔" شکنتلا گرجی، ایک لمحے کو دلاور اس کا بدلتا انداز و لہجہ دیکھ کر حیران بھی ہوا اور سراسیمہ بھی۔ پھر قوت ایمانی عود کر آئی۔ کیونکہ شکنتلا اللہ کا نام سن کر بھڑکی تھی اور دلاور جو مسلمان تھا اس کے لیے یہ بات کسی طور گوارہ نہ تھی۔
"ہوش میں آؤ شکنتلا۔ میں الحمدللہ مسلمان ہوں۔ اور تمہیں میرے اعتقادات میں دخل اندازی کا کوئی حق نہیں۔"
"ایسی تیسی تیرے مسلمان ہونے کی۔" شکنتلا اب شاہانہ جلال میں پوری طرح آ چکی تھی۔ "ایک لمحے میں میرے چرن چھو کر اعلان وفاداری کر دو ورنہ کتے کی موت مار دوں گی۔"
"تم جو چاہو میرے ساتھ سلوک کرنے کا سوچو شکنتلا کیونکہ مجھے جسکران سے پتا چل چکا ہے کہ تم ناگن بھی ہو اور زبردست جادوگرنی بھی۔ لیکن میں وحدانیت پر کوئی سودے بازی تیرے ساتھ کرنے پر تیار نہیں۔" دلاور کے لہجے میں بلا کا اعتماد دیکھ کر شکنتلا جھلا اٹھی اور کچھ پڑھ کر زور سے پھونک دلاور کی طرف اچھال دی۔ دلاور ہر قسم کے حالات کے لیے تیار ہو چکا تھا۔ لیکن کچھ نہ ہوا۔ شکنتلا بڑی حیران ہوئی اور پھر تیزی سے کچھ پڑھا اور اپنی انگلی کا اشارہ دلاور کی طرف کر دیا۔ لیکن پھر کچھ نہ ہوا۔ شکنتلا جان گئی کہ اس کی جادوئی شکتیاں تبریشیا نے سلب کر لی ہیں اب اس نے روپ بدل کر کسی درندے کے روپ میں آنے کا سوچا لیکن وہی ڈھاک کے تین پات۔ وہ درندہ بھی نہ بن سکی۔ اچانک شکنتلا کے ذہن میں جھپاکے کی طرح ایک خیال ابھرا کہ سانپ تو میں بن ہی سکتی ہوں۔ لہٰذا وہ بجلی کی سی تیزی سے پھنکار کر شیش ناگن بن گئی اور پھن اُٹھا کر برق رفتاری سے دلاور کے بازو کی طرف لپکی اور پلک جھپکنے سے پہلے اسے ڈس لیا۔ دلاور نے جان لیا کہ اب اس کا آخری وقت آن پہنچا ہے۔ لیکن شکنتلا دلاور کے بازو پر ڈسنے کے بعد خود دھک سے رہ گئی۔ اس نے محسوس کیا کہ اس سے ڈسا ہی نہیں گیا بلکہ اس کے منہ میں دانت ہی نہ تھے۔ یہ کیا ہوا۔ کیا میں صرف شکنتلا اور ناگن بننے تک رہ گئی ہوں۔ کیا میں بالکل بے ضرر ہو گئی ہوں۔ یہ سوچ کر وہ ایک دفعہ پھر پھن اُٹھا کر دلاور پر حملہ آور ہونے کے لیے پھن تولنے لگی اِدھر دلاور نے بھی بھانپ لیا۔ ناگن شکنتلا کو کوئی مسئلہ ضرور درپیش ہے جو یہ دوبارہ حملے کے لیے آئی ہے اور پھر بازو پر جس جگہ اس نے ڈسا تھا۔ وہاں نہ تو دلاور کو کوئی تکلیف ہوئی اور نہ زخم کا نشان نمایاں ہوا بلکہ اسے یوں لگا تھا جیسے کسی شیر خوار بچے نے جس کے دانت نہ ہوں اپنے پوپلے منہ سے اس کے بازو پر کاٹنے کی شرارت کی ہو۔
یہ سوچتے ہی دلاور کو یقین ہو گیا کہ فی الحال ناگن بے ضرر ہے بعد میں جو ہو گا دیکھا جائے گا۔ یہ تمام باتیں ایک لمحے سے بھی کم عرصے میں دلاور کے ذہن میں ابھری تھیں اور ناگن کو دوبارہ حملے کے لیے تیار دیکھ کر دلاور چوکنا ہو گیا اور اب جیسے ہی ناگن ڈسنے کے انداز میں اس کے پاؤں کی طرف لپکی دلاور نے کمال جرأت کا مظاہرہ کرتے ہوئے شیش ناگن کی گردن پر ہاتھ ڈال کر دوسرے ہاتھ سے اس کی دم قابو کر لی اور اپنی گرفت کو مضبوط کرنے لگا۔ یہ صورت دیکھ کر شکنتلا نہ صرف بوکھلا اُٹھی بلکہ اسے خوف پیدا ہو گیا کہ کہیں دلاور ایک ہی جھٹکے سے اس کے دو ٹکڑے نہ کر دے۔ اس نے پوری قوت صرف کر کے اپنے جسم کو سکیڑے رکھا تاکہ کہیں جسم تن جانے کی صورت میں ٹوٹنے کا خطرہ نہ پیدا ہو جائے۔
چند لمحے تک دونوں اپنے اپنے طور پر زور آزمائی کرتے رہے۔ پھر شکنتلا موقع پا کر زور سے پھنکاری اور انسانی روپ میں ظاہر ہو گئی۔ اب صورت حال یوں تھی کہ شکنتلا کی گردن دلاور کے ایک ہاتھ میں اور دونوں جڑے ہوئے پاؤں اس کے دوسرے ہاتھ میں تھے۔ شکنتلا کے اچانک انسان بننے سے دلاور ایک لمحے کو ٹھٹکا اور شکنتلا کو شاید اسی لمحے کا

انتظار تھا اور وہ چکنی مچھلی کی طرح پھسل کر دلاور کی گرفت سے نکلتی چلی گئی۔

"شکر کرو دلاور کہ تم اس وقت شکنتلا کے سامنے آئے ہو جب وقت کے منہ زور گھوڑے پر شکنتلا ایسی حالت میں سوار ہے کہ راسیں اس کے ہاتھ میں نہیں اور پاؤں رکاب میں نہیں۔" شکنتلا نے اسے خشمگیں نگاہوں سے دیکھتے ہوئے دونوں ہاتھ کولہوں پر رکھتے ہوئے کہا۔ تو دلاور جو، اب اعتماد کی دولت سے مالا مال ہو چکا تھا۔ ہنس پڑا اور پھر کہنے لگا۔

"سانپ کی اولاد کوئی ذی روح ایسا نہیں جس نے موت کا ذائقہ نہ چکھنا ہو۔ اگر ایسا ہوتا تو تمہارے آباؤ اجداد زندہ ہوتے اور اگر تو میری بات سے اتفاق کرتی ہے تو پھر اس عارضی زندگی کے لیے اتنا غرور و تکبر کیسا کہ تو اس مالک کا نام سن کر برہم ہو جاتی ہے جس نے یہ سب نظام پیدا کیا اور یاد رکھ کسی ایسی بدزبانی کی کوشش سے پہلے ہی میں تمہارا کوئی لحاظ کیے بغیر تیری زبان گدی سے کھینچ لوں گا۔"

شکنتلا دلاور کا جارحانہ رویہ دیکھ کر ایک لمحے کو ششدرہ رہ گئی تھی اور پھر آہستگی سے بولی۔ "میرے جیسا حسین تن بدن اور ہوشربا جوانی کے قریب آنے کے لیے خسکران سمیت سب حسرت کرتے ہیں۔ تیری خوش قسمتی یہ ہے کہ تو پہلی ہی نظر میں مجھے پسند آ گیا ہے۔"

"زیادہ چلتر دکھانے کی ضرورت نہیں ناگن...... تیرا ڈسا تو سنا ہے پانی بھی نہیں مانگتا اور میں یہاں عشق لڑانے نہیں اپنی بیوی کی تلاش میں آیا ہوں۔"

"بیوی؟" شکنتلا نے سوال کیا۔

"ہاں میری بیوی غزالہ جو تبریشیا نے عنکبوت جن کے ہاتھوں اغوا کرائی تھی۔ وہ ہاراکاری کے جنگلوں میں کہیں قید ہے اور میں بھی کوٹھاری کی قید میں بیٹھا تھا۔

کوٹھاری کا نام سن کر شکنتلا کی آنکھوں میں چمک پیدا ہوئی اور وہ مسکرا کر بولی۔ "آدم زادے تیرے لیے خوشخبری ہے کہ کوٹھاری کو ہم نے نرکھ واصل کر دیا ہے۔ وہ اب سنسار میں موجود نہیں۔"

"مجھے پتا ہے۔" دلاور بولا۔

"لیکن تجھے شاید یہ پتا نہیں کہ شکنتلا اور سامری نے اسے قتل کر دیا ہے۔ کیونکہ اس کے قبضے میں ہمارا ساتھی خسکران تھا۔ اب ہم اس کی تلاش میں ہاراکاری آئے ہیں۔"

"پھر تو ہم سب ایک ہی منزل کے مسافر ہیں۔" دلاور شکنتلا کو بھرپور نظروں سے ناپتے ہوئے بولا۔

"بالکل...... اسی لیے میں کہتی ہوں کہ عقل سے کام لے۔"

"لیکن ایک شرط ہے؟"

"وہ کیا؟"

"وہ یہ کہ اپنے مذہب کے خلاف سننا مسلمان کی شان کے خلاف ہے۔"

"منظور ہے۔" شکنتلا مسکرائی پر نتو ایک شرط میری بھی ہے۔

"وہ کیا؟"

"تو مجھے بہت پسند آیا ہے اور پسندیدہ مرد کو حاصل کرنا شکنتلا کی ضد ہوتی ہے۔ اگر سامری، میں اور خسکران اپنی شکتیوں کی مدد سے ہاراکاری قبیلے کی اینٹ سے اینٹ بجا کر اور تبریشیا کو قتل کر کے تیری بیوی کو آزاد کروا لیتے ہیں۔ تو پھر ...... تو مجھے سیراب کرے گا۔"

"لیکن ہمارے اسلام میں شادی کے بغیر عورت مرد کا ملنا حرام ہے۔" اسلام کا نام سن کر شکنتلا کے چہرے پر پھر غصے کی سرخی لہرائی لیکن ضبط کرتے ہوئے بولی۔

"شادی بھی کر لوں گی تم...... مجھے تم جیسے کڑیل اور خوبصورت وجیہہ جوان سے شادی کرنے میں کوئی عار نہیں۔"

دلاور اس کی بات سن کر خاموش ہو گیا۔ وہ بخوبی جانتا تھا کہ شادی کے لیے عورت کو مسلمان کرنا ضروری ہے لیکن

اسے یہ بھی پتا تھا کہ شکنتلا مسلمان ہونے کا سُن کر پھر بھڑک جائے گی۔ لہٰذا اس نے بہتری اسی میں سمجھی کہ فی الحال مزید پٹاری نہ کھولی جائے اور مناسب وقت کا انتظار کیا جائے۔ کیونکہ حسکران بھی مسلمان نہیں اور کوٹھاری کے مرنے کے بعد وہ بھی آزاد ہو گیا ہے۔ اگر وہ شکنتلا کے ساتھ چلا جاتا ہے تو اکیلا دلاور بے بس ہو جائے گا لہٰذا بہتر یہی ہے کہ ابھی شکنتلا کے ساتھ پیار کی پینگیں بڑھا کر اس کو قابو میں رکھا جائے۔ غزالہ کو تلاش کیا جائے، آئندہ دیکھا جائے گا۔

''کیا سوچ رہے ہو دلاور؟''

''ٹھیک ہے شکنتلا مجھے منظور ہے۔ شکنتلا کے چہرے پر فخریہ آثار نظر آنے لگے۔ وہ سمجھ گئی کہ دلاور ذہنی طور پر اس سے شکست کھا چکا ہے اور جسمانی طور پر بھرپور مرد ہے۔ بلگرام کے بعد وہ آج تک کسی بھرپور مرد سے محروم تھی۔ سامری بوڑھا اور حسکران بنیادی طور پر جن تھا۔ جبکہ شکنتلا کو اصلی انسان زیادہ پسند تھے۔ وہ اُٹھ کر دلاور کے قریب آ گئی اور اپنائیت سے اس کے شانوں پر ہاتھ رکھ دیے وہ کچھ کہنا ہی چاہتی تھی کہ کوٹھڑی کا دروازہ دھڑام سے کھلا۔ دونوں نے دروازے کی طرف دیکھا تو دلاور اچھل پڑا۔ مارے حیرت کے اس کا منہ کھلا رہ گیا۔

☆......☆......☆

اس کے گرد و نواح وحشی تیر کمانیں اُٹھائے مستعد کھڑے تھے اور غزالہ کے سر پر پھولوں کا بنا ہوا تاج ہاتھ میں ترشول تھا۔ سر پر پھولوں کا بنا ہوا تاج سجائے غزالہ صاف نظر آ رہی تھی کہ ان وحشیوں کے لیے قابلِ احترام تھی۔ دلاور مبہوت ہو کر اسے دیکھنے لگا لیکن اس کے لباس پر نظر پڑتے ہی دلاور پریشان ہو گیا۔ مختلف رنگوں کے پھولوں سے صرف ستر پوشی کا تکلف کیا گیا تھا۔ انتہائی شرمناک حالت میں وہ تقریباً مادر زاد عریاں ہی تھی۔ دلاور سے آنکھیں ملیں تو دلاور کو اس کی آنکھوں میں اجنبیت کے آثار نظر آئے۔ غزالہ...... دلاور اضطراری طور پر اس کی طرف لپکا۔ لیکن وحشیوں نے نیزے تان کر اسے غزالہ سے دور کر دیا اور غزالہ اس کی طرف متوجہ نہ تھی۔ بلکہ آتے ہی شکنتلا کی طرف بڑھی اور اس کے قریب ہو کر پانچوں انگلیاں اس کے منہ پر رکھ کر مقامی زبان میں اول فول کچھ پڑھنے لگی جو دلاور کے لیے قطعی اجنبی زبان تھی۔ جس کے مشکل الفاظ کی ادائیگی غزالہ کسی اہلِ زبان کی مانند ہی کر رہی تھی۔ شکنتلا چپ چاپ تکتی رہی۔ عمل مکمل کرنے کے بعد غزالہ نے اپنا ترشول کی پانچ نوکوں والا سرا شکنتلا کے منہ پر رکھ دیا اور ہاتھ میں پکڑے ہوئے دستے کو خفیف سا دباؤ دیا تو ترشول کے پانچوں کونوں سے نارنجی شعاعیں نکلیں۔ شکنتلا نے سرعت سے منہ پیچھے ہٹایا اور اس کے منہ سے کربناک چیخ نکلی اور اس نے اپنے ہاتھوں سے چہرے کو ڈھانپ لیا۔

''اب تم سانپ بھی نہیں بن سکتیں شکنتلا۔'' غزالہ نے کڑکدار آواز میں کہا۔ تو دلاور کا دل بھر آیا۔ سو فیصد غزالہ کی آواز تھی۔

''غزالہ...... مجھے پہچانو...... میں دلاور ہوں...... تمہارا خاوند۔'' دلاور نے غزالہ کو متوجہ کرنا چاہا لیکن غزالہ اس کا سوال سنے بغیر کمرے سے باہر کو چل دی۔

وحشیوں نے شکنتلا اور دلاور کو گھیرے میں لے کر نیزوں سے ٹھوکے دیے اور وہ دونوں خاموشی سے چل دیے۔

☆......☆......☆

شیطان مندر کے ابلیسی تالاب کے کنارے ایک رات کی سیاہی میں ابلیسی دیوتا کے حضور بلیدان کے لیے ہاراکاری قبیلے کے تمام مقدس افراد جمع تھے۔ سیاہ پتھروں سے بنی ہوئی نشستوں پر تبریشیا، شیکارا، شکولی اور غزالہ بیٹھے تھے۔ شکنتلا اور دلاور تالاب کے کنارے پر الگ الگ صلیبی نشان کی طرح لکڑی کے ستونوں کے ساتھ بندھے کھڑے تھے۔ گئی رات کو چونکہ انسانی قربانی کے وقت بدشگونی ہوئی تھی اور انسانی قربانی مکمل نہ ہو سکی تھی لہٰذا قبیلے کے رسم و رواج کے مطابق اگلی رات کو عین اسی وقت اس بدشگونی کا ازالہ کرنا ضروری تھا ورنہ شیطان دیوتا ناراض ہو کر اپنا قہر بھی نازل کر سکتا تھا۔ غزالہ شیطان مندر کی مہان پجارن اور تبریشیا کی بیوی تھی۔ تبریشیا کی پہلی بیوی کی موت کے بعد اس کے زیرِ قبضہ جن عنکبوت نے غزالہ کو اغواء کر کے تبریشیا کے حوالے اس آس پر کیا تھا کہ شاید تبریشیا اس کو آزاد کر دے۔ لیکن غزالہ کو حاصل کر کے تبریشیا

اپنے قول سے پھر گیا اور عنکبوت کو بھی آزاد نہ کیا۔ تبریشیا کی بیوی شیطانی مندر کی مہان پجارن ہوتی تھی لیکن روایت کے مطابق غزالہ بھی جس کی شادی تبریشیا سے ہوئی تھی کو مندر کی مہان پجارن مقرر کیا گیا تھا لیکن تبریشیا سے باقاعدہ شادی سے پہلے ضروری تھا کہ غزالہ بکرو وبکرو کی رسم نبھاتی۔ بکرو وبکرو کے اصول کے تحت دس غیر مقامی مہذب افراد کے جسم سے گوشت کے ٹکڑے ایک ایک کر کے اُتار کر ابلیسی تالاب میں ڈالے جاتے اور موقع پر موجود ہاراکاری باشندوں میں بطور تبرک تقسیم کردیے جاتے ہیں۔ جنہیں وہ چھینا جھپٹی کرتے ہوئے چٹ کر جاتے ہیں۔ غزالہ جس کا نیا نام کاہن اعظم شیکارا نے غزولی رکھا تھا اب تک سات زندہ انسانوں کے جسموں سے گوشت اُتار کر وحشیوں میں تقسیم کر چکی تھی۔ شکنتلا اور دلاور کے شیطانی بلیدان کے بعد صرف ایک آدمی کی ضرورت باقی رہ جاتی تھی۔ غزالہ اس وقت اپنے ہوش وحواس میں نہ تھی اس کو پورے پچاس دن اور پچاس راتیں ابلیسی تالاب میں اشنان کروا کر اور خوراک کے طور پر انسانی گوشت فراہم کر کے مکمل طور پر آدم خور بنا دیا گیا تھا۔ اس کو شیکارا نے تین دن اس کو ریت میں دھنسا کر اس کے ذہن کو جنتروں منتروں کی مدد سے صاف کردیا تھا۔ اب اس کو پچھلی زندگی کی کوئی بات یاد نہ تھی۔ اور وہ پوری آدم خور بن چکی تھی۔ یادداشت مٹ جانے کی یہی وجہ تھی کہ وہ دلاور کو اجنبیت کی نظروں سے دیکھتی رہی۔ اس کی نظر میں دلاور محض قربانی کے بکرے سے زیادہ وقعت نہ رکھتا تھا۔ اس وقت شیکارا اور تبریشیا دونوں ابلیسی تالاب کا منحوس کیچڑ دلاور اور شکنتلا کے منہ پر مل رہے تھے۔ شکنتلا اب سچ مچ دہشت زدہ ہو چکی تھی۔ کوٹھڑی میں جب قید تھی تو اسے سامری یا حسکران کے مل جانے کی اُمید تھی پھر اس کو اتنی جلدی اپنی موت کا بھی یقین نہ تھا بلکہ وہ مطمئن ہو چکی تھی کہ اس کو قید رکھا جائے گا اس دوران سامری یا حسکران اس کی مدد کو پہنچ جائیں گے لیکن اب وہ دیکھ رہی تھی یہ وحشی بلا تاخیر اس کی بوٹیاں کرنے کے درپے ہیں کیونکہ شکنتلا کو ان کی مقامی زبان بھی بآسانی سمجھ آ رہی تھی۔ اور وہ لوگ ان کے قتل کی باتیں کر رہے تھے۔ غزالہ جواب مقدس غزولی کے عہدے پر تھی اور تبریشیا کے پہلو والی نشست پر بیٹھی تھی۔ ایک ننگ دھڑنگ جنگلی نے لمبے اور چمکدار پھل والی چھری دونوں ہتھیلیوں پر رکھ کر جھکتے ہوئے اسے پیش کی تو غزولی اسے تھام کر اپنی نشست پر کھڑی ہوگئی۔ اس کے کھڑے ہوتے ہی اس کے سر کے بال یکدم آسمان کی طرف رُخ کر کے عمودی کھڑے ہوگئے۔ ہجوم کے اندر ڈھول پر تھاپ پڑی اور جنگلیوں نے وحشیانہ رقص شروع کردیا۔ غزولی کی آنکھیں سرخ ہونی شروع ہوگئیں۔ دلاور کی نظریں اس کے شرمناک برائے نام پھولوں کے لباس پر تھیں۔ جو محض ستر پوشی کے لیے بھی ناکافی تھا۔ غزولی چلتے چلتے شکنتلا اور دلاور کے قریب آ گئی۔ چہار سو تک اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ تارے بھی کہیں چھپ گئے تھے۔ صحن کی چھت کسی چیز سے ڈھکی تھی۔ کچھ سجھائی نہیں دیتا تھا۔ شیکارا اور تبریشیا ایک طرف ہٹ کر کھڑے ہوگئے۔ ان کی چمکتی شیطانی نظریں شکنتلا اور دلاور پر مرکوز تھیں۔ دلاور کی نظروں کا محور غزولی یعنی غزالہ کا چہرہ تھا۔ وہ اسے عادات واطوار اور لباس سے کسی طرح اپنی معصوم فرمانبردار اور محبت کرنے والی غزالہ نظر نہیں آ رہی تھی۔ وہ چمکتی آنکھیں، بھینچے ہوئے ہونٹ، کرخت چہرہ، بے شرم لبادے کے اندر لپٹی ایک وحشی اور جنگلی عورت دکھائی دے رہی تھی۔ جس کے لیے دلاور یکسر اجنبی تھا۔ اسی لمحے دلاور کو اپنی آنکھوں کے سامنے دھواں سا ہلتا نظر آیا اور پھر اس میں ایک شبیہہ نمایاں ہونے لگی۔ دلاور اسے پہچان گیا یہ بدشکل عنکبوت تھا جو اپنی گول آنکھوں اور بھجنگ شکل کے ساتھ اس وقت بھی دلاور کے سامنے آیا تھا۔ جب دلاور سرخ پہاڑیوں میں حسکران کے ساتھ سفر کر رہا تھا۔ اب عنکبوت بے ہنگم انداز میں منہ کھول کر ہنسنے لگا۔ جیسے بہت سے منہ پھٹے ڈھول ایک ساتھ بج اٹھیں۔

''دلاور تم نے میرے بچوں کو زخمی کیا تھا میں نے تیری بیوی کو بھی آقا تبریشیا کی داشتہ بنا دیا اور اب تو بھی بے موت مرنے کے لیے تیار ہوجا۔ آہاہاہاہا...... '' عنکبوت پھر ہنسنے لگا۔ آج عنکبوت کا انتقام پورا ہو جائے گا۔ یہ کہہ کر دھواں تحلیل ہونے لگا اور پھر عنکبوت غائب ہوگیا۔ سب وحشی اپنے اپنے کاموں میں مصروف تھے۔ دلاور نے محسوس کیا کہ عنکبوت صرف اسے ہی نظر آیا تھا۔ ادھر شکنتلا کی حالت غیر ہونے لگی۔ وہ دل ہی دل میں لاتعداد مرتبہ سامری کو آوازیں دے چکی تھی۔ حسکران کو یاد کر چکی تھی جنتر منتر جو اس کو یاد تھے پڑھ چکی تھی اب بے بسی کا ساتھ عورتوں کی طرح ہچکیاں لے رہی تھی۔ اسے یقین ہو چلا تھا کہ وہ عین عالم شباب میں آج چوہے دان میں پھنسے چوہے کی طرح ماری جائے گی۔ اب وہ

اپنی آواز میں رونے لگی تھی اور باقاعدہ تبریشیا اور شیکارا کی طرف منہ کرکے رحم کی بھیک مانگنا شروع ہوگئی تھی۔

اِدھر دلاور بھی دل ہی دل میں کلمہ طیبہ کا ورد کرنے لگا اور آیۃ الکرسی پڑھ پڑھ کر اپنے اوپر پھونکنے لگا۔ غزولی ان کے قریب آ کر رُکی اور اس نے اپنی چھری کی نوک شکنتلا کے ناک کے اوپر رکھ کر ہلکا سا دباؤ ڈالا۔ شکنتلا کی تیز سسکاری نکلی اور چھری کی نوک پر شکنتلا کے خون کے قطرے جھلملانے لگے۔ غزولی مسکرا اٹھی اور اس نے انگلی کے ساتھ چھری کی نوک صاف کی اور قطرے زبان پر صاف کیے اور پھر ہجوم کی طرف رُخ کر کے سر کچھ اس انداز سے ہلایا جیسے کہہ رہی ہو کہ خون کا ذائقہ بڑا مزیدار ہے۔

اس وقت شکنتلا کو وہ تمام نظارے یاد آ رہے تھے جب وہ خود اسی طرح مرنے والوں کو اذیت دیتی تھی اور خوش ہوتی تھی۔ اب شکنتلا کی موٹی آنکھیں خوف سے پھیلنے لگیں۔ دل اس زور سے دھڑک رہا تھا جیسے سینہ پھاڑ کر باہر آنے ہی والا ہو۔ سارا جسم پسینے میں بھیگ رہا تھا ایسے پتا چل رہا تھا کہ کسی بھی لمحے غزولی لمبے پھل کی چھری اس کے بدن میں پیوست کردے گی اور پھر بات ختم ہونی شروع ہو جائے گی۔ دلاور بھی اللہ سے اپنے گناہوں کی معافی مانگ رہا تھا۔ اِدھر غزولی نے کسی کو اشارہ کیا تو وہ جنگلی آگے بڑھا اور دلاور کے کپڑے خنجر کے ساتھ پھاڑ پھاڑ کر اُتارنے لگا۔ دلاور کے گریبان میں خنجر ڈال کر گریبان چاک کر دیا گیا اور پھر کھینچ کھانچ کر اس کی قمیض اُتارنے لگا کہ اسے قمیض کی جیب میں کسی چیز کا احساس ابھرا۔ وحشی نے ہاتھ ڈال کر وہ چیز باہر نکال لی تو ایک ثانیے میں ایسی چمک ابھری کہ پنڈال روشن ہوگیا۔ یہ وہی بیضوی روشن انڈا تھا جو گھور اندھیرے میں سورج کی مانند چمکنے لگا۔ اس کی چمک دیکھ کر وحشیوں میں کھلبلی مچ گئی اندھیرے کے پجاری شیطان کے پیروکار روشنی پھیلتے ہی آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر منہ اٹھائے بھاگنے لگے۔ غزولی بھی پلٹی اور قلانچیں بھرتی ہوئی تبریشیا سے جا چمٹی تو تبریشیا اپنا توازن قائم نہ رکھ سکا اور شیکارا پر جا پڑا ایک اودھم مچ گیا۔ جس کا جدھر منہ اُٹھا بھاگنے لگا۔ سامیں مرچو سچ کہتے تھے کہ عبادت کے وقت چمکتی روشنی ان کے لیے زہر قاتل ثابت ہوتی ہے۔ افراتفری دیکھ کر شکنتلا کی آنکھوں میں بھی اُمید کے چراغ روشن ہونے لگے۔ وہ اور دلاور جھٹکے مار مار کر اپنی رسیاں توڑنے کی کوشش کرنے لگے لیکن بے سود۔ وہ دونوں بری طرح کس کر بندھے تھے۔ اچانک آسمان کی طرف سے تیز سیٹی نما آواز ابھری اور پھر تیز سے تیز تر ہوتی چلی گئی۔ سیٹی کی گونجتی آواز کانوں کے پردے پھاڑنے لگی اور دلاور نے دیکھا کہ آسمان کی طرف سے بے شمار ہیولے سے زمین پر اُتر رہے ہیں جو لاتعداد تھے زمین پر اترتے ہی وہ تیزی سے منتشر ہونے لگے اور دوڑتے بھاگتے وحشیوں کو پکڑنے لگے۔ جو وحشی بھی ان کے ہاتھ لگتا تیزی سے وہ اس کی گردن مروڑ دیتے۔ ہاراکاریوں کے لیے یہ ایک نئی آسمانی افتاد تھی۔ پھر شکنتلا اور دلاور کو ایک خفیف جھٹکا لگا اور ستون کے ساتھ بندھی رسیاں ٹوٹ کر نیچے جا گریں۔

دلاور بے سوچے سمجھے پہلے بیضوی انڈے کی طرف لپکا اور اسے دائیں ہاتھ میں تھام لیا اور پھر ایک بھاگتے ہوئے وحشی کو ٹانگ کی اڑنگی دے کر گرایا اور اس کے ہاتھ میں پکڑا ہوا نیزا اپنے اُلٹے ہاتھ میں تھام لیا اور اسے گرتے ہوئے وحشی کے سینے میں پیوست کردیا۔ وحشی کی فلک شگاف چیخ اس ہاہا کاری میں دب کر رہ گئی تھی جبکہ دلاور اگلے شکار کی تلاش میں چل پڑا تھا۔ اسی دوران اس کی نظریں غزالہ پر پڑیں تو وہ لپک کر اس کے پاس پہنچا اور اسے بازو سے پکڑ کر گھسیٹنے لگا۔ غزالہ زوردار طریقے سے اس طرح مزاحمت کرنے لگی جیسے کوئی غیر مرد اس کو زبردستی لے جا رہا ہو۔ دلاور نے اس کی کنپٹی پر زوردار ہاتھ مارا تو وہ بے ہوش ہوگئی دلاور نے ہجوم سے دور محفوظ جگہ پر اسے لٹا دیا۔

اسے کسی کی تلاش تھی اور وہ یقیناً عنکبوت تھا۔ وہ اسے نظر بھی آ گیا جو ایک کونے میں دو سایوں سے دوبدو جنگ کرنے میں مصروف تھا۔ عنکبوت کو سامنے پا کر دلاور کا خون کھولنے لگا۔ وہ بچتا بچاتا اس کی طرف بڑھنے لگا۔ بیضوی روشن انڈہ اس نے کپڑوں میں چھپایا ہوا تھا۔ عنکبوت بڑا سخت جان دکھائی دے رہا تھا اور بے جگری سے لڑ رہا تھا۔ کئی سائے اس نے مار گرائے تھے۔

(حیرت کے نئے رنگوں سے آباد اس سلسلے وار ناول
کی اگلی قسط ماہ فروری میں ملاحظہ کیجیے)



قدم قدم پہ ستم

جاوید راہی

جرم کی ایک انوکھی داستان

ثمینہ سے میری پہلی ملاقات سپر اسٹور پر ہوئی تھی۔ جو وہاں پرفیوم کی ورائٹی کو شوکیس کے اوپر والے حصہ پر رکھے ہوئے برانڈ منتخب کرنے میں مصروف تھی۔ میں کاؤنٹر کی ایک سائیڈ پر کھڑا اسیلز مین کے فارغ ہونے کا انتظار کر رہا تھا، کہ کب وہ فارغ ہو اور مجھے ڈیل کرے۔ اُس نے پرفیوم منتخب کرتے ایک دو اور خواتین کے استعمال کی چیزیں لیتے بل ادا کرتے شاپر سنبھالتے کاؤنٹر پر جانے کی تیاری میں تھی کہ ایک لڑکا جو شکل و صورت سے لچر دکھائی پڑتا تھا۔ اسٹور کے اندر آیا ثمینہ ٹھٹھک کر رُک گئی۔ اس نے سٹور پر موجود لوگوں کی پروا کیے بغیر اس پر برسنا شروع کر دیا اور ایک بھرپور تھپڑ اس کے منہ پر جڑ دیا کام کرنے والے ملازم نے مداخلت کی تو اسے بھی تھپڑوں پر رکھ لیا میں آگے بڑھا تو مجھ پر بھی وہ برس پڑا۔ اس سے پہلے کہ بات آگے بڑھتی اسی اثنا میں پولیس آ گئی۔ جو شہر میں چاروں جانب موٹر سائیکلوں پر گشت کر رہی ہوتی ہے۔ اسٹور کے اندر ہوتے جھگڑے کو دیکھتے وہ گزرتے ہوئے رُک گئے تھے۔ جھگڑا کرنے کی وجہ دریافت کی تو میں نے سب کچھ جو میرے روبرو ہوا تھا دہرایا۔ پولیس لڑکی جس کا نام ثمینہ اور اُس لڑکے کو جس نے اپنا نام وسیم بتایا تھا اور اسٹور کے ملازم جس کو وسیم نے زدوکوب کیا تھا۔ ساتھ لے کر تھانہ اے ڈویژن چل پڑے۔ مجھے بھی آنے کا کہا میں نے باہر آ کر اپنی گاڑی اسٹارٹ کی تو انہوں نے ان تینوں کو پیچھے بٹھاتے ایک ملازم آگے بیٹھاتے چلنے کو کہا۔ میرے لیے یہ مداخلت بھاری پڑی۔ وسیم ملازم کے سامنے بھی ثمینہ پر برس رہا تھا۔ کتنی ہونا آخر میری موجودگی میں دوسروں سے تعلق رکھتی ہو۔ اس کی بکواس پر ملازم نے اُسے ڈانٹا تو وہ چپ ہو گیا۔ انسپکٹر عزیز چیمہ اپنے آفس میں موجود تھے۔ ہم چاروں کو ان کے سامنے پیش کرتے ہوئے ملازمین نے ساری روداد ان کے گوش گزار کر دی۔

''کیا ہوا تھا'' انسپکٹر نے ثمینہ کی جانب گھومتے پوچھا؟

جی میں سپر اسٹور پر شاپنگ کر رہی تھی کہ یہ آیا اور گالی گلوچ کرتے مجھے تھپڑوں سے مار پیٹ کرنے لگا، میری طرف اور اسٹور کے ملازم لڑکے کی طرف دیکھتے کہا۔ انہوں نے مداخلت کی تو انہیں بھی گالی گلوچ کرتے مارنے لگا بتا کر وہ خاموش ہو گئی۔

''کیا نام ہے آپ کا؟'' انسپکٹر چیمہ نے پوچھا۔

''جی ثمینہ!'' اس نے اپنی چادر سر پر درست کرتے جواب دیا۔

یہ تمہیں جانتا ہے؟
''جی ہمارے گھر سے تھوڑی دور رہتا ہے اور اکثر آتے جاتے فحش کلامی کرنا اس کے روزمرہ کی عادت میں شامل ہے۔'' اس نے وسیم کی طرف دیکھتے انسپکٹر چیمہ کو بتایا۔
آپ وہاں موجود تھے؟ جی سر!
''میں خریداری کے لیے سٹور میں تھا۔'' میں نے جواب دیا۔
پھر وہ وسیم نامی غنڈے کی طرف متوجہ ہوئے۔'' تم کیسے جانتے ہو ان محترمہ کو؟''
''جی ہمارے محلّہ میں رہتی ہے کئی لوگ اس نے اپنے پیچھے لگا رکھے ہیں۔'' اس نے تنک کر جواب دیا اور قہر آلود آنکھوں سے ثمینہ کی طرف دیکھا۔
''کیا رشتہ ہے تمہارا ان سے جو تمہیں ان پر اتنا غصہ آ گیا؟''
''سر ہماری محلے دار ہے اور ہم ایسی ویسی بے حیائی نہیں چلنے دیں گے جو یہ کرتی پھرتی ہے۔'' اس بار وسیم کی آواز میں خاصا دبدبہ تھا اور اسی جوش میں وہ آپے سے باہر ہو گیا تھا۔
انسپکٹر عزیز چیمہ برق رفتاری سے اُٹھا اور اس غنڈہ عناصر آپے خان کو بالوں سے پکڑ کر زمین پر گراتے اس پر پل پڑا پھر ملازمین کو اس کی اچھی طرح سے دھلائی کرنے کا کہا۔ تھانہ کے گیٹ کو اندر سے بند کرتے۔ ملازمین نے اسے زمین پر گراتے چھتر پریڈ شروع کر دی۔ ہر چھتر پہ ہائے باجی جان معاف کرنے کے فلک شگاف نعرے گونجنے لگے تھے تھانہ اے ڈویژن کے اندر باہر اس کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ اس کی مار پیٹ دیکھ کر میرا اور ثمینہ سمیت اس سیلز مین کا برا حال تھا۔ جب اس کی خوب مرمت ہو چکی تو اسے دوبارہ انسپکٹر چیمہ کے سامنے پیش کیا گیا۔ مارے درد کے وہ کراہ رہا تھا۔ آپ کاغذ قلم لے کر ساری صورت حال درخواست میں لکھیں اور



ساتھ میں بطور گواہ ان دونوں اصحاب کا بھی ذکر کردیں۔

سر مجھے معاف کر دیں۔ وسیم نے انسپکٹر کے آگے ہاتھ جوڑتے استدعا کی۔

بکواس بند کرو تم جیسے بے غیرت لوگوں نے شریفوں کا جینا محال کر رکھا ہے۔

پھر اس نے پولیس ملازمین سے اسے حوالات میں بند کرنے کا کہا۔

کانسٹیبل نے اس کی جامہ تلاشی کے دوران اس کا موبائل گھڑی اور پرس نکال کر انسپکٹر صاحب کے سامنے رکھ دیا۔ پرس سے نکلنے والی تین ہزار چار سو روپے کی رقم اس کے موبائل اور گھڑی کی فہرست کاغذ پر بناتے محرر کے سپرد کرتے اسے حوالات میں بند کرنے کا کہا۔ ثمینہ نے ساری کاروائی اور کب سے وہ اسے تنگ کر رہا تھا۔ سب کچھ تحریر کر کے میرے اور اسٹور کیپر کے دستخط کرواتے اپنا نام ولدیت ایڈریس فون نمبر وغیرہ لکھ کر انسپکٹر صاحب کے آگے رکھ دی۔

انسپکٹر صاحب نے درخواست سب انسپکٹر سرور کو فارورڈ کرتے ہمیں جانے کی اجازت دیدی کہ جب ضرورت پڑے گی تمہیں فون کر کے بلالیں گے۔ میرا نمبر اور اس لڑکے کا نمبر منشی محرر نے اپنے پاس لکھ لیا اور ہم تھانے سے باہر آگئے۔

ثمینہ اور وہ سیلز مین جس کا نام وحید تھا میری گاڑی میں یوں آن بیٹھے جیسے میں ان کا ڈرائیور تھا۔

جی آپ نے کہاں جانا ہے میں نے پیچھے گھوم کر ثمینہ سے پوچھا؟

آپ پہلے ان کو اسٹور پر اُتاریں میں بتاتی ہوں ثمینہ نے دھیمی آواز میں میرے سوال کا جواب دیا!

اس لڑکے کو جس کا نام وحید تھا لالہ زار والی سڑک پر چھوڑتے میں نے سامنے دھیان رکھتے پھر اس سے پوچھا کہ آپ کو کہاں اُترنا ہے؟

فی الحال تو کسی ایسی جگہ رُکیں جہاں ہمیں ایک دوسرے کے بارے میں مکمل تعارف ہو جائے!

میں نے گاڑی ریسٹورنٹ کی جانب موڑتے ثمینہ سے سوال کیا ’’آپ کے ابو کیا کرتے ہیں؟‘‘

’’وہ اس دنیا میں نہیں ہیں دو بھائی اور ہم تین بہنیں ہیں۔ دونوں بھائی گاڑیوں کا کام کرتے ہیں مجھ سے بڑی اسکول ٹیچر ہے۔ چھوٹی فرسٹ ایئر میں ہے میں پرائیویٹ فرم میں کمپیوٹر آپریٹر کی پوسٹ پر کام کرتی ہوں۔ گھر ہمارا اپنا ہے اور والدہ فالج کی مریضہ ہونے کے باعث چل پھر نہیں سکتی۔ سب سے بڑے بھائی کی شادی ہو چکی ہے۔ جو اپنے بیوی بچوں کے ہمراہ اپنے گھر میں ہوتا ہے عابد ہم سب سے چھوٹا ہے اور بھائی کے پاس ہی ہوتا ہے شوروم پر، چھٹی کر کے سیدھا گھر آ جاتا ہے میٹرک کی تیاری گھر پر کر رہا ہے۔ پرائیویٹ داخلہ بھیجے گا۔ میں نے سمپل بی۔اے کیا ہے۔ ایل ایل۔بی کرنے کا ارادہ ہے۔‘‘ ثمینہ نے ایک ہی سانس میں اپنے بارے میں سب کچھ بتاتے مجھ سے میرے بارے میں سوال کیا ’’آپ کیا کرتے ہیں میرا مطلب کس شعبہ میں ہیں آپ؟‘‘

چھوٹا سا بزنس مین ہوں غلہ منڈی میں اجناس کے علاوہ کھاد اور زرعی ادویات کا بھی کاروبار ہے۔ میرا بتاتے میں نے گاڑی کلب ریسٹورنٹ کے پارکنگ ایریا میں روک لی اور ثمینہ کو لے کر ریسٹورنٹ کے اندر آ گیا۔ ایک ٹیبل کی طرف ویٹر نے اشارہ کیا ہم اس پر آ گئے ہمارے بیٹھنے پر ویٹر نے مینو کارڈ ہمارے سامنے رکھے اور خود تھوڑا ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ ’’جی کیا چلے گا میں نے کارڈ پر سرسری سی نظر ڈالتے اس سے پوچھا؟‘‘

’’بریانی اور کولڈ ڈرنک مجھے بھوک لگی ہے۔‘‘ ثمینہ نے بغیر کسی تکلف کے جواباً کہا۔

میں نے آرڈر کیا اور اس کا جائزہ لینے لگا۔ ثمینہ ایک مکمل اور خوبرو لڑکی تھی اور خوبصورت لوگوں کی میں دل و جان سے قدر کرتا تھا۔ میں خود چاہتا تھا کہ ثمینہ میرے ساتھ کچھ وقت گزارے میرے غیر شناسا رویہ کی پروا کیے بغیر سب کچھ وہ خود ہی کرتی جا رہی تھی۔ مجھے اپنی طرف بھرپور نظروں سے دیکھتے پا کر اس نے سکوت توڑا میرے نام کا اسے پتہ پولیس اسٹیشن میں ہی چل گیا تھا۔ اس لیے اس نے میرا نام لے کر مجھے ’’بلایا فاروق صاحب اب پولیس والے کیا کریں گے؟‘‘

اس کا لہجہ پریشان کن تھا۔ ’’کچھ نہیں بس ہم تینوں میرا مطلب اس سیلز مین کو بار بار تھانے آنا جانا پڑے گا اور سب انسپکٹر سرور جو آپ کی درخواست پر اس سارے

واقعہ کی چھان بین کرے گا اور آپ کے گھر بھی جائے گا۔''

''اور اُس اسٹور پر جا کر اس بات کی تصدیق کرے گا کہ آپ کا بیان جو آپ نے تحریری طور پر درخواست میں لکھا ہے وہ درست ہے۔ اس کے بعد اس لڑکے پر فرد جرم عائد کرتے مقدمہ درج ہو جائے گا۔ اگر لڑکے کے لواحقین نے آپ کے گھر والوں کو راضی کر لیا تو آپ کی ہی تحریری درخواست پر لڑکے کو رہا کر دیا جائے گا۔'' میں نے اسے سارے حالات سے آگاہ کیا۔

''فاروق صاحب پولیس والے ہمارے گھر آئیں گے کیا؟''

''بالکل آئیں گے'' میں نے اس کے چہرے پر آئی پریشانی کی پرچھائیں محسوس کرتے جواب دیا۔

''پورا محلہ ہمارے بارے میں کیا سوچے گا۔'' ثمینہ کے چہرے پر اب پریشانی اور بھی گہری ہو چکی تھی۔ ''اچھا آپ ریلیکس ہو جائیں میں کوشش کرونگا کہ پولیس آپ کے گھر تک نہ آئے ہو سکتا ہے اس لڑکے کے لواحقین آپ کے گھر آ جائیں اور معاملہ رفع دفع کروانے کی استدعا کریں۔ میرا مشورہ ہے کہ آپ اپنے محلہ داروں پر احسان چڑھاتے پولیس اسٹیشن فون کر کے اپنی درخواست واپس لینے بارے انسپکٹر صاحب سے رکوایسٹ کر لیں۔ اگر وہ انسان ہوا تو آئندہ کبھی آپ کے راستے میں نہیں آئے گا۔'' میری بات پر اس نے اتفاق کرتے اپنے بڑے بھائی کو فون کر کے سارے حالات سے آگاہ کر دیا اور پولیس اسٹیشن میں دی گئی درخواست کے علاوہ میرے بارے میں بھی ساری تفصیل بتا دی، کہ کس طرح میں بھی اس درخواست میں موجود تھا۔

''چلیں۔'' میں نے اُٹھتے ہوئے پوچھا؟۔ بیرا بل اور اپنی ٹپ لے کر جا چکا تھا۔ ہاں ثمینہ نے اپنا پرس اُٹھاتے جواب دیا؟

''اب آپ کو کہاں ڈراپ کرنا ہے؟''

پہلے وہ سامان لینا ہے جو میں اس ساری بک بک میں نہیں لے پائی۔ آپ مجھے گول چوک میں کہیں ڈراپ کر دیں۔ ثمینہ نے میرے ساتھ چلتے چلتے جواباً بتایا۔

ٹھیک ہے کیوں نا ہم دونوں اکٹھے اپنا اپنا سامان مل کر ایک ساتھ لے لیں میں نے گاڑی کا دروازہ کھولتے اس کی طرف دیکھا او کے کہتی ثمینہ پیچھے بیٹھ گئی۔

میں نے گاڑی تحصیل روڈ کی جانب گھماتے آگے بڑھا دی۔

ایک بات پوچھوں فاروق صاحب؟

''جی ضرور۔'' میں نے شیشے کا رُخ پچھلی سیٹ کی جانب کرتے اس کے چہرے کی طرف دیکھتے اس کے سوال کا جواب دیا۔

آپ کی شادی ہوگئی ہے؟

اتنی جلدی نہیں ابھی تو مجھے اپنے بزنس سے ہی فرصت نہیں جب فرصت ہوئی تو گھر والوں خصوصاً اپنی بڑی بہن سے کہہ دوں گا کیونکہ والدہ کی وفات کے بعد وہی ہمارے سب بہن بھائیوں کے نظام سنبھالتی آ رہی ہیں۔ میں نے ثمینہ کی بات کا تفصیل سے جواب دیا۔

والد صاحب تو حیات ہیں نا؟

نہیں وہ تو والدہ صاحب سے پہلے ہی چل بسے تھے۔ میں نے گاڑی ہوم مارٹ کے باہر پارک کرتے اس کو چلنے کا اشارہ کیا۔

میں نے اپنا ضروری سامان اکٹھا کیا اور کاؤنٹر پر آ گیا۔ وہ بھی اپنی چیزیں سنبھالتی میرے قریب آ گئی۔ اس نے اپنا سامان بھی میرے سامان کے ساتھ رکھ دیا تھا بل بنا اس نے پرس سے پیسے نکالے مگر میں نے منع کر دیا اور یوں ریسٹورنٹ سے بعد دوسرا بل بھی مجھے ادا کرنا پڑا۔

گاڑی میں بیٹھتے ثمینہ نے میرا شکریہ ادا کیا۔ مجھے اپنا نمبر لکھواتے بولی مجھے آپ کے فون کا انتظار رہے گا۔ اس کے انداز سے مجھے یہ احساس ہونے لگا کہ وہ لفظ جو وسیم نے اسے تھپڑوں کے دوران اسٹور میں کہے تھے کہیں وہ سب سچ تو نہیں مگر میں کوئی فیصلہ نہ کر پایا۔

''اب کہاں ڈراپ کروں؟'' اس بار میرے اندر کا وسوسہ مجھے ترغیب دے رہا تھا کہ میں اسے ٹٹول کر دیکھوں گا۔ مگر میری ہمت نا پڑی اور میں نے اس خیال کو اپنے اندر ہی جذب کر لیا۔ بس یہاں روک لیں۔ کینال ویو کے پہلے بلاک کے کارنر پر اس نے گاڑی روکنے کا کہتے ایک بار پھر مجھے احساس دلایا کہ مجھے آپ کے فون کا انتظار رہے گا۔

جی میں ضرور رابطہ رکھوں گا آپ سے۔ جب تک

آپ کی درخواست کا کوئی فیصلہ نہیں ہوتا۔ وہ تیکھی نظروں سے دیکھتی اپنا پرس اور شاپر سنبھالتی گاڑی سے نیچے اُتر گئی۔ اور میں اس کی نگاہوں کا مفہوم نکالتا آگے بڑھ گیا۔

شام کو گھر واپس آکر جب میں فارغ ہو کے اپنے کمرے میں آیا تو مجھے ثمینہ کے ساتھ گزارے تمام لمحات یاد آتے گئے۔ جاتے ہوئے اس کی آنکھوں کی ذومعنی وار فتگی نے مجھے فون کرنے پر مجبور کر دیا۔ دوسری طرف سے برجستہ فقرے نے ثمینہ کے بے ساختہ پن کو اُجاگر کرتے کہا۔ بہت دیر کر دی مہرباں آتے آتے اس کی آواز کے خمار نے میرے کانوں میں ٹھنڈی پھوار پھیلا دی۔ جواباً میں صرف یہی کہہ پایا کہ سارا دن کام کی بھاگ دوڑ میں اپنا ہوش نہیں رہتا دوسری طرف سے ثمینہ نے اُسی لہجے میں جواباً کہا۔

تو پھر کسی اور کے ہوش اُڑانے کی کیا ضرورت تھی۔

میں سمجھا نہیں میرے اندر انجان پن نے کروٹ لی۔

آپ اتنے بھولے مت بنیے۔ کسی بیچاری پر آپ کو کئی گھنٹے انتظار کی سولی پر لٹکائے رحم تک نہیں آیا۔ کہتے ثمینہ نے فون کاٹ دیا۔ چند پل میں ثمینہ کے اس انداز کا لطف لیتا رہا اسی دوران اس کی طرف سے میسج آیا۔

آپ ناراض ہو گئے کیا؟

میں نے کال کی جو جھٹ اس نے ریسو کرتے کہا جناب اتنا غصہ؟

”بند آپ نے کیا تھا غصہ تو آپ کی طرف سے دکھایا گیا نا۔“

”اچھا جناب آپ کان کھول کر سن لیں مجھ میں انتظار کرنے کی سکت نہیں ہے۔ اس لیے دن میں دو چار بار ہیلو ہائے ضروری ہے۔“

صرف ہیلو ہائے میں نے فقرہ اُچک لیا؟

”ابھی تو ہم نے ایک دوسرے کی مزاج آشنائی سے روشناس ہونا ہے۔“ ثمینہ نے شوخی سے جواب دیا۔

”اچھا وہ وسیم کی طرف سے کوئی بات چیت سامنے آئی؟“

”نہیں ابھی تک تو کوئی نہیں مگر میں نے گھر آکر آپ کا دیا مشورہ بھائی کو بتایا تو انہوں نے بھی اس بات پر اتفاق کیا تھا۔“

مجھے سمجھ نہیں آرہی تھی کہ مطلب کی بات کہاں سے شروع کروں اگر وسیم کی بات صحیح تھی تو بھی مجھ میں اتنی بے باکی کا عنصر موجود نہ تھا کہ میں ثمینہ کو کوئی ایسا ویسا فقرہ کہہ دیتا۔ رات دیر تک میں اس سے باتیں کرتا رہا۔ پھر گڈ مارننگ کے میسج سے دن کا آغاز ہوا۔ جواب میں میں نے بھی ایک رومینٹک میسج اس کو سینڈ کر دیا۔ دن میں ہماری دو تین بار بات ہوئی وسیم کے والد نے دو محلہ کے معززین اکٹھے کیے۔ اور اس کے بھائی کے شوروم پر وسیم کے رویہ کی معافی مانگنے پہنچ گیا۔ تھوڑی دیر تک باتیں ہوئیں اور آخر کار تھانہ کے معاملے کو سنبھالنے کی بات پر بھائی نے درخواست واپس لینے کی بات قبول کر لی۔ بنا کر ثمینہ نے سنڈے کو سیر کرنے کے لیے میرے ساتھ چلنے کی فرمائش کر دی جو میں نے بغیر کسی عذر کے قبول کر لی۔ پروگرام یہ بنا کر دوپہر کے بعد میں اسے یونیورسٹی روڈ سے لوں گا۔

میں نے ملازم سے جلد آنے کا کہا اور خود ثمینہ کو لینے یونیورسٹی روڈ کی طرف چل پڑا۔ ثمینہ یونیورسٹی والی سڑک پر کھڑی میرا انتظار کر رہی تھی۔ میں نے گاڑی اس کے قریب روک دی اور وہ پچھلا دروازہ کھولتی اندر بیٹھ گئی۔

کدھر؟

”آپ کو ہی پتہ ہوگا۔“ اس نے لاپرواہی سے جواب دیا۔

میں نے گاڑی کا رُخ کینال ریسٹورنٹ جو اپنی مثال آپ تھا۔ شہر سے باہر نہر کے کنارے خوبصورت ماحول کے لیے۔ سنڈے کو یہاں خاصی رونق ہوتی تھی لنچ ٹائم کی وجہ سے ہال بھرا ہوا تھا۔ اس لیے ہم دونوں ریسٹورنٹ کے وسیع لان میں آ گئے یہاں بھی خاصا رش تھا۔ ایک کونے میں ہمیں جگہ مل گئی۔ کینال ریسٹورنٹ بار بی کیو کے لیے بھی مشہور تھا ثمینہ نے بار بی کیو ہی لینے کا کہا میں نے آڈر بک کروا کے توجہ ثمینہ کی طرف کر لی۔ سفید سوٹ اور ہلکا میک اپ اس پر قیامت ڈھا رہا تھا۔ وہ مجھے اپنی طرف دیکھتے پا کر شرما کر سمٹ گئی۔

آرڈر ٹیبل پر لگ چکا تھا۔ میں نے پلیٹ اس کے آگے سرکاتے شروع کرنے کا کہا۔

"جی آپ لیں اس نے میری پلیٹ میں تیخ کباب اور تکہ بوٹی رکھتے ہوئے کہا۔"

شکریہ، کہتے میں نے پلیٹ اپنے آگے کرلی دوران کھانا کوئی بھی خاص بات نہ ہو پائی۔ بل آیا تو اس نے اپنے پرس سے پیسے نکالتے بل ادا کر دیا۔ میں نے روکا تو اس نے یہ کہتے میری بات کاٹ دی کہ سنڈے کی میر کا پروگرام میرا تھا لہٰذا آج کا سارا خرچ میرے ذمہ ہوگا۔ یہ کہتے ہوئے اس نے بے تکلفی سے میرے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام لیے۔ میرے سارے وجود میں برقی لہر دوڑ گئی۔ میں اس کی آنکھوں کی گہرائی میں ڈوب رہا تھا۔ مگر وہ اتنی تیز تھی کہ یکدم اُٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ اور ہم چلتے ہوئے گاڑی کی طرف آ گئے۔ اس نے اگلا دروازہ کھولا اور فرنٹ سیٹ پر بیٹھ گئی۔ میں نے گاڑی آگے بڑھا دی ثمینہ اور میں دن میں کئی بار ایک دوسرے کو فون کرتے تھے یہ سب کچھ بڑی سُست روی سے آگے بڑھ رہا تھا۔ جو بکواس وسیم نے میرا اسٹور میں دوران بدتمیزی ثمینہ سے کی تھی اس کا عملی طور پر کوئی بھی پہلو میرے سامنے نہ آسکا تھا۔ ابھی تک میں نے اپنے طور پر ثمینہ کے بارے میں جو معلومات اکٹھی کی تھی اس میں یہی بات سامنے آئی کہ وہ دو جگہوں پر پہلے بھی نوکری کر چکی تھی۔ جو تھوڑا تھوڑا عرصہ چلی جس کی وجہ اس کا کریکٹر تھا۔ جس آفس میں وہ کام کرتی تھی اس کے ایک ملازم کو میں نے تھوڑا بہت خرچہ دے کر اس کے بارے میں کافی کچھ پوچھ لیا تھا۔ وہ صرف اپنے کام کی حد تک محدود تھی۔ وسیم نامی اس لڑکے کے بارے میں بھی انفارمیشن مجھے اس کے آس پاس سے مل گئی کہ وہ ثمینہ کے پیچھے کافی دیر سے لگا ہوا تھا اپنے طور پر ثمینہ نے اس کی کئی بار بے عزتی کی مگر وہ اپنے اوچھے ہتھکنڈوں سے باز نہیں آ رہا تھا اور یوں اس نے اسے اسٹور میں جالیا۔ میں کام کے سلسلہ میں شہر سے باہر جا رہا تھا مجھے دو تین دن وہاں رہنا تھا وہاں ثمینہ کا فون آیا تو میں نے یہ بات اس سے کی وہ یکدم خاموش ہوگئی جیسے میرے منہ سے دو تین دن کا سن کر اسے صدمہ پہنچا ہو۔

کیا ہوا چپ کر گئی ہو؟

دوسری طرف سے ثمینہ نے غیر یقینی انداز سے پوچھا

رات

اگر چہ رات ہے بے حد حسیں
فلک کا خوش نما آنچل
سجا ہے چاند تاروں سے
ہوا کے نرم و نازک پَر
فضا میں دھیرے دھیرے سرسراتے ہیں
میرے آنگن کی کیاری
رات کی رانی کی خوشبو سے
مہکتی ہے
کسی کی زلف اُلجھتی جا رہی ہے
اور کوئی خوابوں کے مہرباں جزیروں میں
ستاروں کو لیے سنگ
گیت گاتا ہے
یقیناً رات ہے بے حد حسیں
مگر اے خوبصورت شب بتا
کیا تیرے دامن میں
ہمارے واسطے
اتنا ہی کافی ہے؟
مسلسل بے قراری، بے کلی
اور جاگتی آنکھیں؟

شاعرہ: زرین احسان

فاروق آپ سچ کہہ رہے ہو؟

ہاں مگر تم کو کیا ہوا میں نے حیرت سے پوچھا؟

بس یہی تو فرق ہے آپ کے اور میرے احساسات کے درمیان وہ بھرائی ہوئی آواز میں جواباً بولی۔

فاروق آپ سے ملنے کے بعد مجھے صرف اتنا یاد ہے کہ مجھے تمہارے اور اپنے پن کے سوا کچھ بھی دکھائی نہیں دیتا۔ اچانک دو تین دن مجھ سے دور رہو گے میں کیسے رہ پاؤں گی، کہتے وہ بری طرح رو دی۔ میں اس صورتحال سے گھبرا گیا بڑی مشکل سے اسے کنٹرول کیا اور بتایا کہ میرا جانا بڑا ضروری ہے۔ اگر میں پارٹی کو مطمئن نہ کر پایا تو اپنا لاکھوں کا نقصان ہو جائے گا۔ آپ کو میرا کوئی بھی احساس نہیں لاکھوں کے نقصان کی فکر ہے کہتے

اس نے کال کاٹ دی۔
میں اس صورتِ حال کے لیے تیار نہیں تھا کہ ثمینہ مجھے کون سی دنیا کی طرف گھسیٹ رہی تھی۔ اسے روتے سن کر میرے اپنے اندر کچھ ادھر اُدھر ہوتا محسوس ہوا۔ اس کا حتمی فیصلہ تو وہ خود جانتی ہوگی مگر مجھے اپنے بارے میں یہ پتہ چل گیا کہ میں ثمینہ کو چاہنے لگا تھا۔ اسی اودھڑ بن میں اس کا میسج آ گیا، جس میں اس نے لکھا تھا کہ آپ کو صرف ایک دن کی اجازت مل سکتی ہے۔ وہ بھی اس شرط پر کہ آپ مجھ سے مسلسل رابطے میں رہیں گے ورنہ آپ نہیں جا سکتے۔ اس کے اس حکم پر میں مسکرائے بغیر نہ رہ پایا اور میں نے فون کیا دوسری طرف سے اس کی بھرائی ہوئی آواز آئی۔ ''آپ نے میرا میسج پڑھ لیا ہے؟'' ہاں بابا ٹھیک ہے ایک دن جاؤں گا اور دوسرے دن شام تک واپسی ہو جائے گی۔ میرے اس جواب پر وہ برجستہ تھینک یو سو مچ فاروق کہتے ہنس پڑی۔
اچھا جانے سے پہلے مجھے مل کر جانا!
''ٹھیک ہے میں آفس سے نکلتے آپ کو فون کرتی ہوں'' کہتے اس نے فون بند کر دیا۔
اتنے دنوں کی رفاقت میں آج پہلی بار یہ محسوس ہوا تھا کہ میں خود اس کی طرف کھچا جا رہا تھا۔
چار بجے اس کا فون آیا کہ ''میں آفس سے نکل رہی ہوں۔''
آج پہلی بار میں نے اسے اپنے آفس آنے کی دعوت دے دی۔
ٹھیک ہے آپ قاسم سے کہہ دو کہ مجھے کبابش والے روڈ سے آ کر لے جائے میں وہاں رُک کر انتظار کرتی ہوں کہتے اس نے فون بند کر دیا۔
میں نے اپنے ڈرائیور کو کہا کہ اپنی باجی ثمینہ کو کبابش والے روڈ پر سے بیٹھا کر آفس لے آئے۔ وہ بڑا اچھا انسان تھا دو سال سے میرے پاس کام کرتا آ رہا تھا۔ ایماندار ہونے کے ساتھ ساتھ وفادار بھی تھا۔ دو چار بار میں اسے اپنے ساتھ ہی لے آیا تھا اور وہ ثمینہ کو باجی کہہ کر مخاطب کرتا تھا۔
اس کے جاتے ہی میں نے ملازم کو دہلی سویٹ سے پیزہ وغیرہ لانے کو کہا اور خود ثمینہ کا انتظار کرنے لگا۔

قاسم کو واپس آتے زیادہ دیر نہ لگی تھی ثمینہ اس کے ہمراہ اوپر آفس میں آ گئی۔ میرا آفس میرے ذوق کی عکاسی کرتا تھا۔ میں نے اسے ہر طرح کی سہولت سے مزین کر رکھا تھا۔ ثمینہ چاروں جانب کا جائزہ لیتے صوفہ پر بیٹھ گئی۔ میں نے اس کی روتی آنکھوں کو غور سے دیکھا جن کی سرخی اس بات کی غماز دکھائی دی کہ وہ روتی رہی تھی۔ قاسم اُسے چھوڑ کر نیچے چلا گیا تھا میں اپنی چیئر سے اُٹھ کر اس کے پاس دوسرے صوفہ پر آن بیٹھا۔ وہ بے اختیار ہوتے میرے قریب کھسک آئی۔
''فاروق ایک بات کروں۔'' اس نے یونہی میرے ساتھ لگے لگے دھیمی آواز میں کہا۔
''ہاں کہو میں سن رہا ہوں۔'' میں نے پیار سے اُسے سمیٹتے جواب دیا۔
آپ کا انتخاب میں نے بڑا سوچ سمجھ کر کیا ہے۔ ابھی ہم دونوں بڑے اچھے دوستوں کی طرح ایک دوسرے سے ملتے آ رہے ہیں۔ اور جس طرف ہم چل رہے ہیں۔ یہ راستہ بہت سارے معاشرتی تقاضوں کی طرف جاتا ہے۔ میں آپ کو یہ بتا دوں کہ کہیں آپ یہ نہ سوچ لیجیے گا کہ میں آپ کے اتنے بڑے بزنس سے متاثر ہو کر آپ کی طرف دیوانہ وار بھاگی چلی آ رہی ہوں۔ ہر لڑکی کا خواب ہوتا ہے کہ اس کا ساتھی معاشرہ میں اس کا بھرم اپنے مضبوط کندھوں پر اُٹھا کر قدم قدم اس کے ساتھ چلے۔ ابھی تو میں سنبھل سکتی ہوں۔ کیونکہ میں نے گھر کی دہلیز سے باہر قدم رکھتے آج تک اپنی عزت کی ہر طرح سے حفاظت کی ہے، اور اپنے خاندان کے وقار کو ملحوظِ خاطر رکھا ہے۔ لوگوں کے درمیان رہتے مجھے دو سال کا عرصہ بیت رہا ہے اتنا تو ادراک ہو چکا ہے کہ صحیح اور غلط کے کیا معنی ہوتے ہیں۔ میرے آگے پیچھے بہت سے ایسے لوگوں کو جستجو رہی ہے میری، جو مجھے اپنی چمک دمک اور طرح طرح کے خوابوں میں اُلجھا کر اپنے مقاصد کا مداوا چاہتے تھے۔ مگر ہر قدم پر اللہ تعالیٰ نے میری حفاظت کی ہے۔ آپ سے پہلی ملاقات میں مجھے یہ لگا کہ آپ میری ثابت قدمی کا انعام ہیں۔ آپ کی حوصلہ افزائی اور آپ کی شرافت نے مجھے اپنے حصار میں لے لیا۔ جس کی میں دل سے قدر کرتی ہوں۔ یہ مجھے پتہ

ہی نہیں چلا کہ میں کس طرح یوں بے باکی سے آپ کی طرف بھاگی چلی آرہی ہوں۔ بہر حال میں آپ پر واضح کردوں کہ میری زندگی میں آپ کی اہمیت انتہائی نازک موڑ پر آرہی ہے، کہہ کر وہ الگ ہٹ کر بیٹھ گئی میں صوفہ سے اُٹھ کر دوبارہ اپنی آفس چیئر پر جا بیٹھا۔ ہم دونوں اپنی اپنی جگہ پر خاموش بیٹھے تھے۔ آفس میں صرف اے سی چلنے کی ہلکی آواز میں میرا دل ثمینہ کی باتیں سن کر عجب کیفیت میں دھڑک رہا تھا۔ ملازم نے پیزا وغیرہ اور کولڈ ڈرنک رکھتے چائے کا پوچھا تو ثمینہ نے منع کر دیا۔

''اچھا جناب مجھے پتہ ہے آپ کو بھوک لگی ہوگی پہلے آپ یہ لیں، اور ہاں آپ نے میرا انتخاب کیا میں شکر گزار ہوں۔ میں نے پیزا اُس کی طرف بڑھاتے ہنس کر اس کے سنجیدگی میں گھرے چہرے پر مسکراہٹ لانے کی کوشش کی۔ اُس نے ایک ٹکڑا اُٹھاتے میری پلیٹ میں رکھتے میری آنکھوں میں دیکھا اور نظریں نیچی کرلیں۔

''اچھا اس معاملہ پر بعد میں غور کریں گے پہلے آپ اس کو کھائیں، میں نے اس کی توجہ ہٹاتے چکن پیس اس کی طرف کرتے کہا۔'' آپ کو پتہ ہے نا میں زندہ رہنے کے لیے کھاتی ہوں۔'' کہتے اس نے تھوڑا سا ٹکڑا لیا اور پلیٹ میری جانب موڑ دی۔

جب تک وہ میرے آفس میں بیٹھی رہی اسی طرح کی باتیں زیرِ غور رہیں پھر اس نے جانے کے لیے کہا تو میں نے اپنے ڈرائیور سے اُسے گھر ڈراپ کرنے کا کہتے پٹرول ڈلوانے کی بھی یاددہانی کروائی۔

ثمینہ کے جانے کے بعد پہلی بار میں نے اس کے بارے میں سوچنا شروع کیا۔ شادی تو بہر صورت مجھے کرنا تھی۔

باجی صاحبہ بھی کئی بار مجھے اس بارے میں سنجیدگی سے کہہ چکی تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ اب میں ان کو یہ بات بتا ہی دوں سو میں نے ایک دن ثمینہ کے بارے میں اپنی پسند کا اظہار ان سے کر دیا۔ میرے منہ سے یہ سن کر وہ بہت خوش ہوئیں اور اس کے بارے میں معلومات لینے لگی۔ اس کی نوکری کا سن کر انہوں نے نوکری کی نفی کی جواباً میں نے ان کو مطمئن کر دیا کہ شادی کے بعد وہ بھلا نوکری کرے گی کیا؟ انہوں نے ثمینہ کے گھر میرا رشتہ لے کر جانے کی حامی بھرلی۔ میں نے اس کا تذکرہ ثمینہ سے کیا تو وہ بھی میرے منہ سے یہ بات سن کر شرما گئی۔ ثمینہ نے گھر جا کر اپنی والدہ سے میرا ذکر کیا اور بتایا کہ وہ لوگ ہمارے گھر آئیں گے۔ اس بات کو دو ہفتے گزر گئے مگر باجی نے کوئی بات نہ کی ثمینہ کے گھر جانے کی۔ میں نے باتوں باتوں میں انہیں یاد کرایا تو انہوں نے جواباً بتایا کہ تمہارے بھائی آئیں گے تو میں ان سے مشورہ کر کے پھر جاؤں گی۔ باجی جان وہ تو دو ہفتہ بعد پاکستان آئیں گے تب تک آپ بھابھی کو ساتھ لے کر کم از کم لڑکی اور اس کے گھر والوں کو تو دیکھ لیں۔ کچھ سوچ کر باجی نے جانے کی حامی بھرلی۔ میں نے ثمینہ کو فون کر کے بتا دیا کہ شاید کل میری بہن اور بھابھی آپ کے گھر آئیں۔ ثمینہ اپنے اندر کی خوشی دباتے بولی۔

واقعی فاروق جی؟

ہاں میں نے اسے یقین دلاتے جواب دیا۔

دوسرے دن بڑے بھائی امجد کی بیگم نازیہ اور باجی کو میں ان کے گھر کے سامنے اُتار کر واپس چلا گیا۔ سارے راستے میں اُلجھن میں بتلا رہا کہ دیکھیں دونوں کو ثمینہ کیسی لگتی ہے۔ تقریباً دو گھنٹے بعد فون آیا کہ ڈرائیور کے ہاتھ گاڑی بھجوا دو۔

میں نے ان کو لانے کے لیے گاڑی بھجوا دی۔ باجی نے گھر آکر ثمینہ کو پسند کرنے کی تائید کر دی اور اس کے گھر والوں کے بارے میں بھی انہوں نے پسندیدگی کا اظہار کیا۔ ساتھ میں ثمینہ کی والدہ کے بارے میں بتایا کہ وہ اپنی بیٹی کی شادی جلد کرنے کی بات کر رہی تھی۔

تو پھر میں نے اپنی بہن کا اندیہ لیا؟

تمہارے بھائی جان آجائیں تو کوئی فیصلہ ہوگا کہہ کر وہ خاموش ہوگئی۔ رات آکر میں نے ثمینہ کو خوشخبری سنائی تو وہ بے حد خوش ہوئی اور اس نے اپنے گھر والوں کی رپورٹ پیش کرتے مجھے بتایا کہ بھابھی لوگ بھی آپ کے گھر جلد آنے والے ہیں۔ اس لیے آپ بھی تیار رہیں کیونکہ آپ کو بھی پسند کر ہی لیں گے میرے گھر والے۔ ثمینہ نے کہا۔

اچھا چھوڑو اب یہ بتاؤ کہ شادی میں کتنے دن ڈالوگی؟

میں نے اسے چھیڑا؟

واہ جی بڑی جلدی ہے کہتے اس نے سلسلہ کاٹ دیا۔

باجی کے میاں ہفتہ پہلے ہی گھر واپس آ گئے۔ اس دوران آ کر وہ لوگ مجھے اور ہمارا رہن سہن گھر بار دیکھ کر پسند کر گئے۔ جاتے ہوئے جلد شادی کرنے کی بات بھی ہمارے کان میں ڈال گئے تھے۔ دونوں طرف سے ہماری شادی کی بات چل رہی تھی۔ آخر کار تاریخ طے پا گئی۔ میں نے دل کھول کر اپنی شادی کی تیاری شروع کر دی۔ سٹی کالونی والا گھر جو کرایہ پر اٹھا رکھا تھا اس خالی کردا کرا سے ٹھیک کروایا جا رہا تھا۔ سب گھر والوں کا خیال تھا کہ میری رہائش مکمل طور پر اُس گھر میں ہی رہے گی۔ گھر کے لیے ہر چیز نئی خریدی جا رہی تھی۔ بڑی دھوم دھام سے ثمینہ میری بیوی بن کر میرے گھر آ گئی۔

شادی کو کئی ماہ بیت گئے تھے اُس نے نوکری کو خیر باد کہہ دیا تھا۔ گھر داری اور وفا داری کی مثال ثابت ہوئی ثمینہ۔ جو بکواس اس کے بارے میں اُس بدبخت وسیم نے کی تھی اس کا شبہ تک نہ تھا اس کے آس پاس۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو ماں اور مجھے باپ کا مقام عطا کر دیا۔ میرے گھر والے اس کا جی جان سے خیال رکھ رہے تھے۔ باجی ثمینہ کو ہفتہ میں ایک بار ضروری لیڈی ڈاکٹر کے پاس لے کر جاتی۔ گھر میں کام کرنے کے لیے ایک ملازمہ اور مستقل طور پر جو شروع سے ہمارے پاس ملازمہ کام کرتی آ رہی تھی کہ اس کی چھوٹی بیٹی شبانہ کو ثمینہ کے پاس رکھ لیا تھا۔

جب سے ثمینہ کی شادی مجھ سے ہوئی تھی اللہ پاک نے میرے نصیب کو دن دوگنی رات چوگنی ترقی عطا کر دی تھی۔ ڈلیوری میں دو روز رہ گئے تھے۔ اس لیے میں نے ہسپتال میں کمرہ لے لیا تھا۔ اور میں زیادہ وقت اُس کے پاس ہی رہ رہا تھا۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت ہوئی اور ہمیں بیٹی مل گئی۔ دونوں گھروں میں بے انتہا خوشی کی فضا نمایاں تھی۔ تین دن بعد ہم لوگ اپنے گھر آ گئے۔ میں زیادہ وقت گھر پر ہی رہ کر ثمینہ اور اپنی بیٹی جس کا نام مریم رکھا تھا۔ کی دیکھ بھال میں لگا رہتا۔ چالیس یوم بعد ثمینہ مریم کو اُٹھائے گھر سے باہر ہم مریم کو ملانے ثمینہ کی والدہ کے پاس جا رہے تھے۔ گاڑی میں بیٹھی ثمینہ میری طرف تشکر آمیز نظروں سے دیکھتی مریم کو سہلا رہی تھی۔ مکان سے پچھلی گلی کے کارنر والے اسٹور کے باہر وسیم دو لڑکوں کے ساتھ کھڑا باتیں کر رہا تھا۔ ہم پر نظریں پڑتے ہی اس نے حقارت سے زمین پر تھوکا۔ غصہ تو مجھے بہت آیا مگر وہ پرلے درجے کا گھٹیا انسان تھا۔ اس لیے میں اس کے منہ نہیں لگنا چاہتا تھا۔ ثمینہ کے چہرے پر بھی ناگواری کے آثار تھے۔

ثمینہ کے گھر والے باہر گیٹ پر ہی ملے جو ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ پھر میں ثمینہ سے مریم کو لیتے اندر آ گیا بڑا اہتمام کیا تھا انہوں نے، مریم کو سارا گھر اُٹھائے پھر رہا تھا۔ رات گئے تک ہم ادھر رُکے رہے، بہت روکا انہوں نے کہ صبح چلے جانا مگر تقدیر کے لکھے کو کون مٹا سکتا تھا۔ میں مریم کو گود میں اُٹھائے ثمینہ کے آگے آگے گھر سے نکلا اور گاڑی میں آ بیٹھا ثمینہ سب سے مل کر باہر نکلی ابھی گاڑی کا دروازہ کھول کر اندر بیٹھنے ہی لگی تھی کہ یکدم وسیم سامنے آ گیا اس کے ہاتھ میں تھامے پستول نے یکے بعد دیگر آگ اُگلنا شروع کر دی میرے سامنے ثمینہ کے سر کے پرخچے اُڑ گئے۔ پھر اس نے مجھ پر گولیاں برسانا شروع کر دیں۔ اسی دوران مریم میرے پیروں میں آن گری اور وہ فائرنگ کرتا فرار ہو گیا۔ آس پاس کے سارے لوگ باہر نکل آئے۔ ثمینہ تو گرتے ہی ٹھنڈی ہو چکی تھی۔ ایک گولی میرے کندھے پر اور دوسری ٹانگ میں لگی تھی مریم نیچے گرنے کی وجہ سے محفوظ رہی۔ مجھے ہسپتال لے جایا گیا اپریشن کے بعد میں تو بچ گیا اور ثمینہ ہمیشہ کی گہری نیند سو گئی۔ اُس بدبخت نے خود ہی گرفتاری دے دی تھی۔ وہ جیل میں ہے۔

مریم دوسرے سال میں لگ چکی ہے میں ثمینہ کی یادوں کے سہارے دن کاٹ رہا ہوں۔ انشاء اللہ میں وسیم کو سزائے موت دلوا کر رہوں گا۔

میرے سسرال والے میری سب سے چھوٹی سالی کے ساتھ میرا رشتہ کرنے کے بارے میں سوچ رہے ہیں۔ کیونکہ مریم کو جو محبت اُس کی حقیقی خالہ دے سکتی ہے وہ شائد اُسے کوئی دوسری عورت نہ دے پائے۔

☆☆......☆☆

موت العالم.. موت العالم

ایم کاشف

عالم کی موت یعنی علم کی موت



ڈاکٹر محمد شکیل اوج شہید گو اب ہمارے درمیان نہیں رہے پر ان کی یادیں ہمیشہ جگنو کی مانند ہمارے دل دماغ کو روشن رکھے ہوئے ہیں۔ اور انہیں یادوں کو روشن کرتے ہوئے ان کی مختصر سوانح آپ کی پیش خدمت ہے۔

قیام پاکستان کے وقت یوسف زئی قبیلے سے تعلق رکھنے والے عبدالعزیز ہندوستان کے صوبے یوپی سے اپنے بیٹوں اور پانچ بیٹیوں کے ساتھ ہجرت کر کے پاکستان منتقل ہو گئے تھے۔ ان کے تیسرے بیٹے عبدالحمید خان کے یکم جنوری 1960 کو بیٹے کی پیدائش ہوئی۔ جس کا نام شکیل رکھا گیا۔ 26 سال کی عمر میں شادی کر دی گئی۔ اللہ نے اس جوڑے کو 4 بچوں سے نوازا۔ جن میں سے ایک بیٹا ہمارا بیماری میں مبتلا ہو کر وفات پا گیا۔

ان کے سب سے بڑے بیٹے ڈاکٹر محمد حسان خان نے ایم بی بی ایس کیا۔ چھوٹے دو بیٹے محمد سلیمان اور محمد یمان خان زیر تعلیم ہیں محمد حسان نے گفتگو کرتے ہوئے بتایا کہ ان کے والد محمد شکیل اوج اصول پسند، نرم مزاج، خوش گفتار انسان تھے۔ وہ گھر یا گھر سے باہر کے فیصلے کرنے سے پہلے اپنے تمام بچوں سے مشورہ کر لیا کرتے تھے۔ گھر والوں کے ساتھ دوستوں کی طرح رہتے تھے۔ وہ شاعری کا اعلیٰ ذوق رکھتے تھے خود بھی شعر کہتے اور اچھے اشعار کو ازبر کر لیا کرتے تھے۔ شاعری کی وجہ سے اوج کا تخلص اختیار کیا۔

☆......☆......☆

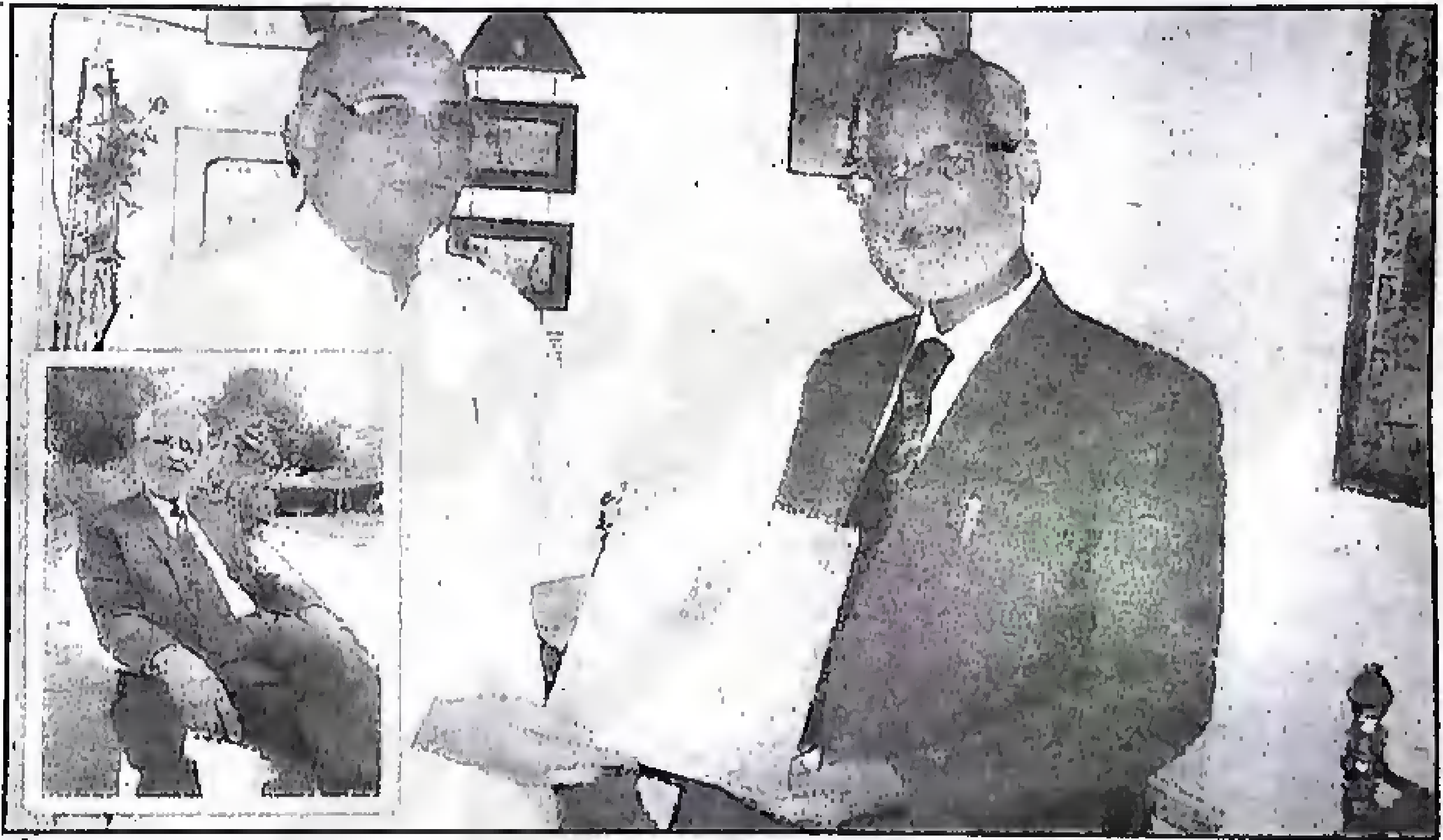
صدر پاکستان ممنون حسین سے بھی ان کی دوستی تھی اور صدر پاکستان جب بھی کراچی آیا کرتے تھے۔ تو ان کی اکثر ملاقات ہوتی تھی۔ انہوں نے ابتدائی تعلیم شاہ فیصل کالونی میں حاصل کی۔ بچپن ہی سے ذہین اور ہونہار تھے۔ انہوں نے مدرسہ قادریہ سبحانیہ سے قرآن حفظ کیا اور 17 سال کی عمر میں کراچی بورڈ سے میٹرک اور 1979ء میں انٹر بورڈ سے سے بارھویں کا امتحان پاس کر لیا۔ وہ نائٹ شفٹ میں علامہ اقبال کالج میں پڑھا کرتے تھے۔ انہوں نے 1983ء میں کراچی یونیورسٹی سے گریجویشن کیا۔ 1986ء میں اسلامک اسٹڈیز میں فرسٹ کلاس فرسٹ ماسٹر ڈگری حاصل کی۔ پروفیسر حافظ محمود الحسن صدیقی اور ڈاکٹر بشارت احمدان کے استادوں میں سے تھے۔

وہ اپنے حلقہ احباب میں محمد شکیل اوج کے نام سے مشہور ہوئے۔ انہوں نے عملی زندگی کا آغاز 1987ء میں وفاقی اردو کالج سے کیا ان کا وہاں گریڈ 17 میں لیکچرار کی حیثیت سے تقرر ہوا۔ ملازمت کے ساتھ ساتھ تعلیم بھی جاری رکھی۔ اور 1990ء میں صحافت میں دوسری ماسٹرز ڈگری حاصل کی 1992ء میں کراچی

یونیورسٹی سے ایل ایل بی کیا۔1995ء میں ان کا تبادلہ کراچی یونیورسٹی اسلامک لرننگ ڈپارٹمنٹ میں بحیثیت لیکچرار کردیا گیا۔کراچی یونیورسٹی انتظامیہ نے ان کی محنت اور لگن کو مدنظر رکھتے ہوئے انہیں 1997ء میں اسسٹنٹ اسٹوڈنٹس ایڈوائزر کی اضافی ذمہ داری سونپ دی۔

کراچی یونیورسٹی سے 2000ء میں اسلامک اسٹڈیز میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کرلی۔2003 میں انہوں نے انتظامی بنیادوں پر اسٹوڈنٹس مقرر کیا گیا۔اور کچھ عرصہ بعد ہی اسٹوڈنٹس ایڈوائزر کمیٹی میں بحیثیت رکن شامل کرلیا گیا۔2005ء میں اسلامک

پیپر، 69 آرٹیکل بھی لکھے۔32 نیشنل اور انٹرنیشنل کانفرسوں میں شرکت کی۔ ان کی مشہور کتابوں میں قرآنیات، حدیث فقہ، اسلام اور عہد حاضر، خودکش حملے اور (خواتین اور اسلام) کے موضوعات شامل ہیں۔ان کی زیر نگرانی 12 طالب علموں نے پی ایچ ڈی کی ڈگری لی جب کہ ایک طالب علم کو اعزازی ایم فل کی ڈگری دی گئی۔انہوں نے متعدد ایوارڈز، شیلڈز اور گولڈ میڈلز حاصل کیے۔مختلف ٹی وی چینلز پر اسلامی معلومات کے پروگرام بھی کرتے رہے۔وہ انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی اسلام آباد کے بورڈ آب ٹرسٹی کے رکن اور ملائشیا سے نکلنے والے معروف



لرننگ ڈپارٹمنٹ میں گریڈ 20 میں ترقی پا کر پروفیسر ہوگئے۔جب کہ دو سال بعد ہی ان کو گریڈ 21 میں ترقی دے دی گئی۔انہیں 2011ء میں ڈپارٹمنٹ کا چیئرمین مقرر کیا گیا۔ایک سال بعد ہی ڈائیریکٹر ڈپارٹمنٹ کی ذمہ داری سونپ دی گئی۔یکم فروری 2012ء کو انہیں شعبہ اسلامک اسٹڈیز سائنس کا سربراہ بنادیا گیا۔انہوں نے ایل ایل ایم کے لیے انٹرنیشنل یونیورسٹی اسلام آباد، بہاالدین ذکریا یونیورسٹی ملتان، پنجاب یونیورسٹی اور اوکسفورڈ یونیورسٹی کے لیے مقالے لکھے۔

☆......☆......☆

19 سال کے دوران انہوں نے قرآن کا ترجمہ اور سہ ماہی (تفسیر) کے ساتھ 15 کتابیں، 77 ریسرچ

ریسرچ IIUHAR کے ایڈیٹوریل بورڈ کے ممبر بھی تھے۔

ان کی کتاب 2012 میں انٹرنیشنل کانفرنس میں کی گئی۔تقریر موضوع بحث بنی اور توہین رسالت کا الزام عائد کیا گیا اس دوران ان کے خلاف فتوے بھی جاری کیے گئے جو بعد میں جعلی ثابت ہوئے۔ان کی شخصیت کو جامعہ میں بعض عناصر نے متنازع بنادیا۔انہیں فون پر اور ایس ایم ایس کے ذریعے قتل کی دھمکیاں بھی موصول ہوئیں۔انہوں نے جامعہ کراچی کے وائس چانسلر کو خط کے ذریعے مطلع کیا۔انہیں دھمکی آمیز ایس ایم مطلع کیا انہیں ایک دھمکی آمیز ایس ایم ایس موصول ہوا جس میں لکھا تھا رسول ﷺ کی سزا سرتن سے جدا۔ایس ایم ایس موصول ہونے کے بعد انہوں نے اپنے چار ساتھوں

سابقہ ڈین پروفیسر عبدالرشید، پروفیسر شمیم الزمان، پروفیسر عبید خان اور پروفیسر نعیم احمد کے خلاف مبینہ ٹاؤن تھانے میں مقدمہ 460/12 تعزیزات پاکستان کی دفعہ 506/b درج کرایا۔ انہوں نے زور دیا کہ انہیں جان سے مارنے کی دھمکیاں دی جارہی ہیں، اگر جانی نقصان ہوا تو مذکورہ چاروں پروفیسر اس کے ذمہ دار ہوں گے مذکورہ کیس عدالت میں زیر سماعت ہے۔

☆......☆......☆

محمد شکیل اور دارالعلوم حنفیہ سعود آباد، ڈاؤ میڈیکل کالج، ڈاؤ یونیورسٹی آف ہیلتھ اینڈ سائنسز، جامعہ امامیہ مرکز اہل تشیع ناظم آباد، بزنیک انسٹیوٹ آف انفارمیشن ٹیکنالوجی سٹی کیمپس شارع فیصل، پاکستان انسٹیوٹ آف ٹیکنالوجی، پاکستان اسٹیل مل، جامعہ اسلامیہ کورے وال ٹرسٹ ٹونیشیا جیکب لائنز، جامعہ علمیہ اسلامیہ المرکز الاسلامی نارتھ ناظم آباد، جامعہ منہاج القرآن شاہ لطیف ٹاؤن، دارالعلوم نعیمیہ فیڈرل بی ایریا، نیشنل یونیورسٹی آف کیمپس اینڈ ایمر جنگ سائنس شاہ لطیف ٹاؤن جامعہ سیفیہ مرکز سیدنا برہان حیدری، سرسید یونیورسٹی انجینیر نگ اینڈ ٹیکنالوجی، اقراء یونیورسٹی ڈیفنس ویو شہید ملت روڈ اور دارالعلوم امرالاسلام سلیمانیہ پنجاب کراچی میں اپنے لیکچر دیا کرتے تھے۔

☆......☆......☆

18 ستمبر کو ڈاکٹر محمد شکیل اوج اپنے دوست بندھانی کی کار AWP-207 میں اپنے دوساتھوں ڈاکٹر طاہر مسعود، طالبہ آمنہ اور بھتیجی اسراء کے ساتھ اپنے اعزاز میں دی گئی ڈی لٹ کی ڈگری اور 14 اگست کو ہلال امتیاز ملنے پر خانہ فرہنگ ایران کے ڈائیریکٹر جنرل مہدی خطیب کی جانب سے دی جانے والی تقریب تحسین میں شرکت کے لیے جارہے تھے۔ جمیل بندھانی کا ڈرائیور کار چلا رہا تھا۔ جب کہ جمیل بندھانی اردو یونیورسٹی گلشن کیمپس کے قریب ان کا انتظار کر رہے تھے۔ صبح 10:45 پر جب ان کی کار نیپا پل اتر کر اردو کیمپس کے قریب پہنچی تو دو موٹر سائیکل سوار افراد نے چلتی کار پر فائرنگ کر دی۔ جس کے نتیجے میں ڈاکٹر شکیل اوج کو سر اور گردن میں دو گولیاں لگیں۔ ایک گولی ان کو لگ کر ساتھ بیٹھی طالبہ آمنہ کے کاندھے پر لگی بھتیجی اسراء معجزانہ طور پر محفوظ رہی۔ پروفیسر طاہر مسعود کے مطابق فائر کی آواز سنائی نہیں دی۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ حملہ آوروں نے سائلینسر والی گن سے فائر کیا۔ ڈاکٹر شکیل اور طالبہ کو فوری طور پر طبی امداد کے لیے اسپتال منتقل کیا گیا جہاں ڈاکٹروں نے پروفیسر محمد شکیل اوج کی موت کی تصدیق کردی۔

عزیز بھٹی تھانے میں پولیس نے مقتول کے بھائی احسان کی مدعیت میں مقدمہ 478/14 تعزیزات پاکستان کی دفعہ 324/302/34 اور انسداد دہشت گردی ایکٹ کی دفاع 7-AT-A کے تحت نا معلوم ملزمان کے خلاف درج کر لیا۔ پولیس نے جائے واردات سے 9MM پستول کے دو خالی خول تحویل میں لے لیے۔ جب کہ ساتھ بیٹھی طالبہ آمنہ اور پروفیسر طاہر مسعود کے بھی بیانات قلم بند کیے گئے۔ پولیس نے ابتدائی تفتیش کا آغاز مقتول کی جانب مبینہ ٹاؤن تھانے میں درج مقدمے میں نام زد ساتھی پروفیسر عبدالرشید ،عبید خان،، پروفیسر شمیم زمان، پروفیسر نعیم، پروفیسر نصیر اور پروفیسر عبدالسمیع سے کیا۔ اوران کے بیانات قلم بند کیے گئے۔ جائے واردات سے ملنے والی گولیوں کے خولوں کو فرانزک لیبارٹری میں ٹیسٹ کیا گیا۔ رپورٹ کے مطابق فائر کیے جانے والے پستول اس سے قبل کسی بھی قتل میں استعمال نہیں ہوا۔ ابتدائی طور پر سی ٹی وی کیمروں میں سے بھی مدد لی گئی۔ تاہم یونیورسٹی روڈ پر کسی بھی جگہ کیمرے نصب نہیں تھے۔ یونیورسٹی میں داخلی اور خارجی دروازوں پر لگائے جانے والے کیمروں میں سے اکثر خراب نکلے اور جو ٹھیک تھے ان سے نقل حمل کی فوٹیج حاصل کرنے کے لیے کنٹرول روم قائم نہیں تھا جس کی وجہ سے واردات کی فوٹیج حاصل نہیں ہوسکی۔

گورنر عشرت العباد خان نے کہا کہ حکومت کا یہ عزم ہے کہ پروفیسر شہید محمد شکیل اوج کے قاتلوں کی گرفتاری میں کوئی کسر اور کوتاہی نہ برتی جائے۔ جامعہ کراچی کے اندر اور اطراف میں نگہبان کیمروں کی تنصیب اور سکیورٹی کے انتظامات کو مربوط کیا جائے۔ انہوں نے پروفیسر شہید محمد شکیل اوج کے اہل خانہ کے لیے مالی معاونت اور اساتذہ کو آپریٹو سوسائٹی کو زمین کی فراہمی

کے حوالے سے حکومت کی جانب سے یقین دہانی کرائی ہے اور پولیس حکام کو ہدایت کی تفتیش کی رفتار کو مزید تیز کر کے گھناؤنے جرم میں ملوث عناصر کو گرفتار کیا جائے۔

☆......☆......☆

ایڈیشنل آئی جی نے پروفیسر ڈاکٹر شکیل اوج کے قتل کی تحقیقات سے متعلق میڈیا کو آگاہی دیتے ہوئے کہا کہ این ای ڈی یونیورسٹی کے ایک ملازم کو حراست میں لے لیا گیا ہے۔ جب کہ کراچی کے ایک پروفیسر سمیع الزمان نے دوران تفتیش تسلی بخش جواب نہیں دے سکے ہیں۔ جس کی وجہ سے انہیں بھی حراست میں لے لیا گیا ہے۔

حکومت نے ڈاکٹر شکیل اوج کا قتل بھی ہائی پروفائل کیسوں میں شامل کرلیا جس کے بعد حساس اداروں نے تحقیقات شروع کردی۔ ذرائع کے مطابق ابتدائی طور پر ڈاکٹر محمد شکیل اوج کے موبائل فون کا ڈیٹا جمع کیا گیا اور اس فون نمبر پر آنے والی تمام کالوں کی جانچ شروع کر دی۔ اس جانچ کے دوران اس بات کو بھی مدنظر رکھا گیا کہ اس پر فون کرنے والے افراد کا تعلق کس سے ہے اور ان کے نمبروں پر کن افراد کے فون آتے ہیں۔ اور اس بات کی بھی تحقیق کی جارہی ہے کہ ان کے ساتھ کام کرنے والے سینئر اور جونیئر اساتذہ میں کن افراد کا ان سے اختلاف تھا اور ان کی سیاسی وابستگی کس جماعت سے ہے۔ اس بات کی بھی تحقیق کی جارہی تھی کہ ڈاکٹر محمد شکیل اوج کے قتل سے سب سے زیادہ فائدہ کس کو پہنچ سکتا ہے۔ حساس ادارے ہر پہلو سے تحقیقت کر رہے ہیں جب کہ 25 جنوری اور 26 اپریل کو سی آئی ڈی اور ایس آئی یو کے ہاتھوں گرفتار ہونے والے کالعدم سپاہ محمد کے ہائی پروفائل ملزمان سے بھی تفتیش کی جارہی ہے۔ 14 فروری کو سی آئی ڈی نے القاعدہ سے تعلق رکھنے پر جامعہ کراچی کے تین رکنی گروہ کو گرفتار کیا جو آئی ٹی ڈپارٹمنٹ میں نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کو القاعدہ سے رابطوں کی ترغیب دیتا تھا اس گروہ کی بھی نئے سرے سے تحقیقات شروع کر دی گئی۔ حساس اداروں نے ایک رپورٹ میں اس بات کا خدشہ ظاہر کیا ہے کہ ملک دشمن قوتیں محب وطن پاکستانیوں کو اور خاص طور پر اتحاد بین المسلمین کی قائل شخصیات کو قتل کروا کر ملک میں افراتفری پھیلانا چاہتی ہیں۔ ملک دشمن عناصر کی پوری کوشش ہے کہ لوگ اپنے ایجنٹوں کے ذریعے پاکستان میں اندرونی طور پر عوام کو آپس میں لڑوادیں اور خارجی طور پر دشمن ممالک سے جنگ چھیڑ کر اپنے مذموم مقاصد میں کامیاب ہوں۔

پولیس نے جیل میں موجود سپاہ محمد، لشکر جھنگوی اور سپاہ صحابہ کے گرفتار ملزمان کا ریکارڈ جمع کر کے تفتیش کا آغاز کر دیا ہے۔ تاہم ان تمام کوششوں کے باوجود اب تک قانون نافذ کرنے والے ادارے کسی حتمی نتیجے پر نہیں پہنچ سکے ہیں۔ تفتیشی آفیسر کا کہنا ہے کہ ڈاکٹر شکیل اوج کے قتل میں ان کا بہت ہی قریبی ساتھی ملوث ہے جسے ان کی نقل و حرکت کا علم تھا اور اس بات کا بھی امکان ہے کہ وہ ایک بڑی علمی شخصیت تھے جس کی وجہ ان کا قتل دشمن ممالک کی جانب سے جاری کی ہوئی فرقہ ورانہ ٹارگٹ کلنگ کا شاخسانہ ہو۔

جامعہ کراچی کی انتظامیہ نے پروفیسر محمد شکیل اوج کے قتل پر سندھ بھر میں تمام یونیورسٹیوں میں تین دن کے لیے تدریسی عمل معطل کر دیا تھا۔ انجمن اساتذہ جامعہ کراچی کے صدر ڈاکٹر جمیل کاظمی نے نمائندہ جسارت سے گفتگو کرتے ہوئے بتایا کہ جامعہ کراچی اور سندھ کی تمام یونیورسٹیوں میں اساتذہ اس وقت تدریسی عمل کو معطل رکھیں گے جب تک پروفیسر محمد شکیل کے قاتلوں کو گرفتار نہیں کیا جاتا۔

یہ بہت بڑا سانحہ ہے حکومت سندھ اساتذہ کو تحفظ فراہم کرے اور شکیل اوج کے خاندان کو دو کروڑ روپے معاوضہ ادا کیا جائے۔ ہم اس سانحے پر کسی بھی طرح کی سودے بازی نہیں کریں گے۔ اور ان کا خون رائیگاں نہیں جائے گا۔ تفتیش کا رخ اگر اساتذہ کی طرف موڑا گیا تو ہم اصل مجرموں تک نہیں پہنچ سکیں گے۔ علاوہ ازیں ایڈیشنل آئی جی کراچی غلام قادر تھیبو کی جانب سے پروفیسر محمد شکیل اوج کے قاتلوں کی نشاندہی کرنے والے شخص کو 20 لاکھ نقد انعام دینے کا اعلان کیا گیا اور اس شخص کا نام صغیہ راز رکھنے کا وعدہ کیا ہے۔ دعا ہے کہ ربّ العزت سے جلد پروفیسر محمد شکیل اوج کے قاتل جلد کیفر کردار کو پہنچے گے آمین۔

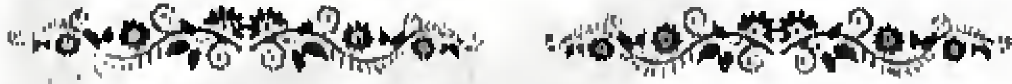
☆☆......☆☆



حسد کی آگ

عمران منظہر

حسد کی دہکتی آگ میں جھلسنے والی عورت کی کہانی / بلوچستان سے



ساجدہ بیگم بڑے چاؤ سے اسے دلہن بنا کر گھر لائی تھیں۔

جن کے ماں باپ نہیں ہوتے غم انہیں نہیں چھوڑتا کیوں نہیں؟ وہ اکثر خود سے یہ سوال کرتی اور جب کوئی جواب نہ ملتا وہ مایوس ہو کر خود کو دوبارہ غموں کے حوالے کر دیتی۔ باپ اس کا فوت ہو چکا تھا۔ اور اپنی ماں کے ساتھ وہ لامحدود غموں کے نشیب و فراز کاٹ رہی تھی۔ غم کے ان رستوں پر آس اور شفقت کا جو ایک دیا تھا وہ ساجدہ بیگم ہی تھیں اس کی پھوپھی اس کے باپ کی سگی بہن۔ پھوپھی بھی تو اماں ہی ہوتی ہے۔ وہ اکثر سوچتی۔

اپنے بھائی کے گزر جانے کے بعد ساجدہ بیگم نے ان دونوں ماں بیٹی کا بڑا خیال رکھا اور گاہے بگاہے ان کی مدد بھی کر دیا کرتی تھیں۔ شوہر تو ساجدہ بیگم کے حیات نہیں تھے۔ لیکن ان میں عام عورتوں کے برعکس، زمانے سے لڑنے کی قوت موجود تھی۔ بھائی کی موت کے بعد اپنی ان پڑھ بھاوج زلیخا اور بھتیجی فاطمہ میں ہی انہیں بھائی کا عکس نظر آتا۔ ساجدہ بیگم ان پر صدقے واری جاتیں۔ بڑی چاہ تھی ساجدہ بیگم کو ان ماں بیٹی سے اور زلیخا اور فاطمہ بھی یہ اچھی طرح سمجھتی تھیں۔ ان کے نزدیک ساجدہ بیگم کسی فرشتے سے کم نہیں تھیں۔ باپ کی موت کے بعد لاکھ غم سہی لیکن کسی اپنے کے ہونے کا احساس بھی اندھیرے میں امید کی ننھی سی کرن کی طرح تھا۔ ایک دنیا ساجدہ بیگم کے اپنے بھائی کے گھرانے پر التفات سے واقف تھی بھائی کی روح بھی بہن کو دعا دیتی ہوگی۔

ساجدہ بیگم کا ایک ہی بیٹا تھا احمد۔ نیک، شریف، فرمابردار، لائق اور اپنی ماں کا پرتو وہ بھی اپنی ماں کی طرح زلیخا اور فاطمہ کی دلجوئی کرتا رہتا تھا۔

وقت پھر سے اڑ گیا تھا اور ساجدہ بیگم کو احمد کے سر پر سہرا سجانے کی فکر ہوئی۔ لڑکی کے لیے کوئی تگ و دو نہیں کی گئی کیوں کہ جب گھر میں بیری موجود تھی تو باہر کیوں پتھر پھینکنا تھے۔ ساجدہ بیگم نے احمد کے لیے فاطمہ کو مانگ لیا۔ زلیخا کو کیا اعتراض ہو سکتا تھا سو فاطمہ احمد کا مقدر ٹھہری۔

☆......☆......☆

مجھے اِک نظم لکھنی ہے

کسی بھی خوبصورت شام میں ملنے چلے آؤ
مجھے اِک نظم لکھنی ہے
سنہری دھوپ کے جیسا تیرا رنگ روپ اُجلا سا
دُھلے بارش سے دیکھو تو حسیں پیارے نظارے ہیں
فلک کے استعارے ہیں
یہ تیری آنکھ جیسے ہیں
مجھے اِک نظم لکھنی ہے
تیری زلفیں ہیں گہری جھومتی پھرتی گھٹاؤں جیسی
نشیلی آنکھ میں تیری شرابوں کی سی مستی ہے
تمہاری نرم پلکوں پر جو روشن سے ستارے ہیں
مجھے اُن کو بھی چھونا ہے
ترے اِن بند ہونٹوں میں چھپی جو مسکراہٹ ہے
یہی تو شاعری ہے بس
مجھے اِک نظم لکھنی ہے
تری آنکھیں بہت کچھ بولتی ہیں
تیری باتیں شہد سا گھولتی ہیں
یہ پھولوں پر گری شبنم ترے گالوں کے جیسی ہے
چمکتی چاندنی جیسی تری روشن جبیں پر بھی
مجھے اِک نظم لکھنی ہے
گھنی شاخوں کے پتوں میں چھپا وہ چاند پیارا سا
ترے چہرے کے جیسا ہے
ترے اس چاند چہرے پر
مجھے اِک نظم لکھنی ہے
کسی بھی خوبصورت شام میں ملنے چلے آؤ

ارشد ملک کے شعری مجموعہ
(دل درد کا ٹکڑا ہے) سے انتخاب

شادی والے دن شہر کا بچہ بچہ ساجدہ بیگم کے احسان کا شکریہ کر رہا تھا۔ زلیخا کو کوئی شرمندگی نہ تھی کیوں کہ ساجدہ ان کی اپنی تھی۔ پتھر پر بوند بوند پانی پڑے تو اسے بھی گھاؤ لگ ہی جاتے ہیں ساجدہ بیگم کی گردن میں اس دن ایک اکڑ تھی، آنکھوں میں غرور تھا، سر یوں اٹھا ہوا تھا جیسے وہ زلیخا اور فاطمہ کو جتانا چاہ رہی ہوں۔ کہ دیکھو میں نے کتنا بڑا احسان کیا ہے تم پر۔

یہ فطرت کا تقاضا تھا یا ماحول کی گزارش کے ساجدہ بیگم اس لمحے اپنے بھائی کو یکسر بھلا بیٹھی تھیں۔ وہ بیٹے کو بیاہنے کے بعد کسی اور دنیا کی مخلوق لگتی تھیں انسانیت کے جذبات آہستہ آہستہ ختم ہوتے جا رہے تھے یہ سب کیا؟ اور کیوں ہو رہا تھا۔ یہ وہی ساجدہ بیگم تو تھیں مگر صرف ایک ہی دن میں جذبات کا اتنا بڑا بدلاؤ کیسے آنے لگا تھا۔

☆......☆......☆

فاطمہ سسرال آ کر خوش تھی۔ زلیخہ بھی خدا کا شکر بجا لاتی کہ اس نے فاطمہ کو بے سائبان نہیں کیا تھا۔ ساجدہ بیگم فاطمہ کے ناز اٹھاتیں پر دل میں کہیں ایک چور دبکا بیٹھا تھا جو حسد، بغض، رقابت، غصے، نفرت اور بیٹا چھن جانے کی حسرت بھری ہانڈی کو سینچ رہا تھا۔ پر ساجدہ بیگم نے اپنا بھرم قائم رکھا ہوا تھا۔ اتنا انہیں علم تھا کہ اگر انہوں نے اپنا بیٹا واپس پانے کی کوئی بھی کوشش کی تو اُن کے زلیخا اور فاطمہ پر سالوں کیے گئے احسانات پل بھر میں زمین بوس ہو جائیں گے پر بیٹا بھی تو واپس پانا تھا ناں۔

کہاں احمد پہلے ہر شام ان کے پاس بیٹھتا تھا اور کہاں اب فاطمہ کے پلو سے بندھا رہتا کہاں ہر مہینے تنخواہ ماں کے ہاتھ پر رکھتا رکھتا تو اب بھی تھا۔ لیکن اب وہ گرم جوشی ساجدہ بیگم کو نظر نہ آتی تھی۔ کہاں چوبیس گھنٹے اماں اماں کی رٹ لگتی اور کہاں اب ساجدہ بیگم کے کان اماں سننے کو بھی ترس گئے تھے سو فاطمہ کی پھوپی ماں کہیں جذبات کی مردہ وادیوں میں سو گئی تھی اور ساس جاگ اٹھی تھی۔

احمد کا فاطمہ سے پہلا جھگڑا اس بات پر ہوا تھا کہ اماں نے آج باورچی خانے میں قدم کیوں رکھا۔ حالانکہ فاطمہ نے ساجدہ بیگم کو بالکل کچن میں کچھ کرنے کو نہیں کہا تھا لیکن اب شام کو پتا نہیں کیوں احمد جلا بھنا بیٹھا تھا۔ ساجدہ بیگم احمد کے سامنے فاطمہ کی طرف داریاں کرتی رہیں لیکن احمد کا فرمانبردار مرد مشتعل تھا۔ فاطمہ آنکھوں میں آنسو لیے ان ماں بیٹے کے سامنے سے ہٹی تھی ساجدہ بیگم کے دل میں تسکین کا میٹھا میٹھا احساس تھا۔ پھر احمد اور فاطمہ کے جھگڑے بڑھنے لگے فاطمہ چپ کر کے اپنی نہ کی گئی غلطی تسلیم کر لیتی تھی۔ وہ سمجھنے سے قاصر تھی کہ اچانک احمد کا پیار بھرا دل سیلن زدہ کیوں ہو گیا ہے۔ ساجدہ بیگم نے احمد کے سامنے فاطمہ کی طرف داری کرتیں فاطمہ کی دلجوئی کرتیں لیکن اکیلا دیکھ کر اسے بیٹے کی برائیاں کرتی لیکن جب خود تنہا بیٹھتی تھیں تو انہیں اپنا آپ بے حد پرسکون لگتا تھا ان کا چہرہ فتح سے منور ہوتا ان کا بیٹا آہستہ آہستہ انہیں واپس مل رہا تھا۔ فاطمہ میں سادگی تھی اور یہی سادگی اسے ساجدہ بیگم کے سامنے آنسو بہانے پر مجبور کر دیتی۔

اماں احمد کو کیا ہو گیا ہے وہ ایسے تو نہ تھے۔

یہی رٹ فاطمہ ساجدہ بیگم کے سامنے لگائے رکھتی اور وہ جواباً ٹھنڈی آہ بھر کے کہتی۔

بیٹی مرد ذات ازل سے ہی جذبوں کی تجارت میں گھناؤنی رہی ہے۔ اور فاطمہ روتے ہوئے اپنا سر ساجدہ بیگم کی گود میں رکھ دیتی۔ ساجدہ بیگم اس کی بے بسی پر جھوم اٹھتیں۔

مرد صرف ضرورت تک رہتا ہے سو احمد بھی فاطمہ کے پاس لوٹ آیا۔ جب اسے لگا کہ اُس کی ازلی تنہائیاں ماں کی ممتا نہیں بلکہ فاطمہ کا احساس ہی مٹا سکتا ہے تو وہ لڑائی جھگڑے بھول کر ''ماں'' بھول کر فاطمہ کی طرف لوٹ آیا دو دن کی چاندنی سے فاطمہ خوش ہو اٹھی ساجدہ بیگم تلملا کر رہ گئیں۔ دو دن کی یہ چاندنی بھی ان کے نزدیک انکے بیٹے کو چھیننے کے لیے کافی تھی۔ عورت کو کون سمجھ پایا ہے؟ اپنی ہی صف کی سب سے بڑی دشمن عورت خود ہی تو ہے مرد کے کاندھے پر بندوق چلا کر عورت ہی عورت کا گھر اجاڑتی ہے۔

وہ دو دن کی چاندنی ساجدہ بیگم کو گوارہ نہیں ہوئی تو وہ اپنی اچھائیوں کے حساب کتاب بھول کر کھلم کھلا میدان میں آ گئیں۔ زخمی ناگن کی طرح کی اسکی پھنکار نے

فاطمہ کو بوکھلا کر رکھ دیا فاطمہ حیران ہوئی کہ پھوپی ماں کو اچانک کیا ہوگیا ہے؟ اب ساجدہ بیگم فاطمہ کو راہ کا کانٹا سمجھ بیٹھی تھی اور ضد میں آ گئی تھیں۔ ساجدہ بیگم بھی روایتی ساس بن بیٹھی۔

فاطمہ کے ہر کام میں کیڑے نکالنا، اس کے ہر کام میں مذاق اڑانا، طعنے، کوسنے، ملامتیں، بددعائیں دہائیاں اور احمد کے کان بھرنا یہی سب اب ساجدہ بیگم کا مشغلہ بن کر رہ گیا تھا انسان جب تک نیک ہوتا تھا خدا بھی انسان سے روٹھ جائے تو انسان سے خدا بھی بھول جاتا ہے۔

نمازی پرہیزگار اور انسانیت سوز ساجدہ بیگم کو یہ سب بھول گیا تھا وہ خود کو فاطمہ کی تقدیر کا کرتا دھرتا سمجھ بیٹھی تھی۔ فاطمہ پہ کیے گئے احسانات جتانا ان کا وطیرہ بن گیا تھا۔

احمد کا بھی وہی حال تھا وہ پیار کی تقسیم میں ماں بیوی کا ششل کاک بنا ہوا تھا۔ کبھی ماں کا پیار حاوی ہوجاتا اور کبھی فاطمہ کی چاہت کا پلڑا بھاری زور پکڑتا اور جب فاطمہ کی چاہت کا پلڑا زور پکڑتا اسی لمحے ساجدہ بیگم کے مظالم بھی انتہا پر ہوتے۔

☆......☆......☆

لاحاصل جذبوں اور رشتوں کا یہ کھیل جاری تھا۔ ایسے میں فاطمہ کو اپنے قدموں تلے جنت کے ہونے کا یقین ہوا تھا فاطمہ مطمئن ہوگئی احمد بھی فاطمہ کے پلو میں آ گیا تھا ساجدہ بیگم کی دنیا البتہ اندھیر ہوگئی۔ ان کی سوچ کے مطابق اب وہ بیٹا ہمیشہ کے لیے کھوچکی تھیں اب وہ گویا زخمی شیرنی بن گئی تھیں انہیں اپنا بیٹا ہر حال میں واپس حاصل کرنا تھا۔

☆......☆......☆

ساجدہ بیگم نے انتہا کردی نہ جانے فاطمہ کو دودھ میں کیا دیا کہ اس کا بچہ دنیا میں آنے سے پہلے ہی آسمانوں میں کھوگیا فاطمہ پتھرا گئی ایک ماں نے ہی ایک ماں کی گود اجاڑ دی ساس ہونے کے احساس نے ''ماں'' کو روند ڈالا۔

فاطمہ کو چپ لگ گئی تھی۔ ساجدہ بیگم نے احمد کے کان بھرے کہ فاطمہ کو بچہ چاہیے ہی نہیں تھا۔ احمد ماں کے بدلے کی آگ میں فاطمہ کو ڈستا رہا۔

ساجدہ بیگم کو قرار آ گیا تھا۔ احمد اب ان کی دسترس میں تھا۔ فاطمہ ایک بے جان وجود بن کر رہ گئی تھی اُسے اپنے حالات پہ رونا بھی نہ آتا نصیب واقعی بھی کبھی بہت ظالم نکلتا ہے بیٹا تو مل گیا واپس پھر کیا چیز تھی جو ساجدہ بیگم کا سکون غارت کیے تھی وہ تھی فاطمہ کی چپ۔ فاطمہ کی چپ جو اس کے ہونے کا احساس دیتی تھی۔ اور ساجدہ بیگم کو فاطمہ کے وجود سے نفرت ہوگئی تھی ساجدہ بیگم نے پرانی چالیں بدلیں اور کچھ نیا سوچنے کے لیے ذہن کو مصروف کرلیا۔ فاطمہ کے شب وروز ویسے ہی بے رنگ گزر رہے تھے۔ ایک دن جب ساجدہ بیگم کے لڑنے کے موڈ پر فاطمہ نے خالی خالی نگاہوں سے انہیں گھورنا شروع کیا تو یہ ساجدہ بیگم سے برداشت نہ ہوا انہوں نے فاطمہ کو چوٹی سے کھینچا اور دیوار پہ دے مارا فاطمہ کا چہرہ خون سے لال ہوگیا فاطمہ پھر بھی نہیں روئی چپ چاپ دیوار کا سہارا لے کر بیٹھ گئی خون بہتا رہا۔ عین اسی لمحے احمد گھر میں داخل ہوا ساجدہ بیگم پہلے تو بوکھلائی اور پھر کمال ہوشیاری سے آنکھوں میں آنسو بھر کے احمد سے کہنے لگی۔

دیکھو احمد بیٹے بچے کے غم میں فاطمہ پاگل ہوگئی ہے اپنا سر دیوار پر دے مارا ہے جواب میں احمد نے نخوت سے کہا تھا۔

''میری بلا سے بھاڑ میں جائے'' اور کمرے میں چلا گیا۔ ساجدہ بیگم نے فاتحانہ نظروں سے فاطمہ کی طرف دیکھا جبکہ فاطمہ کی نگاہیں آسمان پر اٹھی ہوئی تھیں۔

اور پھر کچھ ہی دیر میں محلہ ساجدہ بیگم کے گھر میں بھر گیا تھا ماتھے پر لہو رنگ لیے فاطمہ رشتے ناطے اور رویوں کی اس آلودہ دنیا سے بہت دور جا چکی تھی۔ ساجدہ بیگم کچھ ہی دیر بعد ہسٹریائی انداز میں قہقہے لگا رہی تھیں۔

وقت نے بہت جلدی کی تھی انھیں سب کچھ ساتھ لوٹانے کی۔

فاطمہ کو قبرستان لے جانے کے بعد کچھ ہی دیر میں ہال سے بے حال ہوتی ساجدہ بیگم کو پاگل خانے لیجانے کے لیے ایمبولینس کا سائرن زور وشور سے پورے محلے میں گونج رہا تھا۔ ساجدہ بیگم بھی اپنے انجام کو پہنچ چکی تھیں اور احمد افسوس کرتا رہ گیا۔

☆☆......☆☆



شرم کی چادر

بابر نایاب

انسانیت کا درس لیے ایک معلم کا بیان / ساہیوال سے




سر حامد جیسے ہی کلاس میں داخل ہوئے، نوشی کا چہرہ خوشی سے کھل اُٹھا اور نوشی کی آنکھیں بڑی بے باکی سے نوجوان لیکچرار سر حامد کا طواف کرنے لگیں۔ سر حامد نے اپنے مخصوص انداز میں سب کو سلام کیا اور ہمیشہ کی طرح سب کی خیریت دریافت کی اور پھر اپنا سبجیکٹ پڑھانا شروع کیا، سب ہی اسٹوڈنٹس ہمہ تن گوش ہوکر سر حامد کا لیکچر سننے لگے۔ لیکچر ختم ہونے کے بعد سر حامد نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"میں بھی آپ لوگوں کی عمر سے گزرا ہوں اور مجھے علم ہے لیکچر سننے سے بڑھ کر دنیا کا کوئی مشکل کام نہیں۔ اب دیکھو تو سہی ایک بندہ بولے جائے اور سب کو سننا پڑے اور پھر پوچھنے پر دہرانا بھی پڑے کتنا مشکل کام ہے نا؟"

"سر آپ کا لیکچر ہم خوشی اور مسرت سے سنتے ہیں اور یقین مانیے آپ کا لفظ لفظ ہمارے دماغ میں بیٹھ جاتا ہے۔"

عاطف نے کھڑے ہوکر سر حامد سے کہا۔

"سر جی آپ کی باتوں میں سحر ہے، جو ہمیں جکڑ لیتا ہے۔ آپ کی باتیں تو مجھے ذرا بھی بور نہیں ہونے دیتی۔ نوشی نے اپنے لبوں پر خوبصورت سی مسکراہٹ لاتے ہوئے سر حامد سے کہا اور کچھ اسٹوڈنٹس نے معنی خیز انداز میں نوشی کو دیکھا۔ سب جانتے تھے کہ نوشی یونیورسٹی کی سب سے بے باک اور ماڈرن لڑکی ہے جس کے دل میں جو کچھ ہوتا ہے وہ کھلے عام بیان کر دیتی ہے۔ "کرن تم کبھی بھی نہیں بولیں کلاس میں کیا میرا لیکچر آپ کو سمجھ نہیں آتا؟" سر حامد نے کرن سے پوچھا جو خاموشی سے سر جھکائے بیٹھی تھی۔ بلیک گاؤن نے مکمل طور پر کرن کو ڈھانپ رکھا تھا۔ کرن کی صرف آنکھیں نظر آتی تھیں، سر مجھے جو سمجھ آتا ہے وہ میں ہمیشہ پیپرز میں آشکار کرتی ہوں اور مجھے آپ کا ہی نہیں بلکہ ہر ایک کا لیکچر سمجھ آتا ہے۔ کیونکہ میں یہاں صرف سمجھنے کے لیے آتی ہوں اور سمجھ خاموشی سے بھی آ جاتی ہے، وہ بتانے کی محتاج نہیں ہوتی۔ کرن کا جواب سن کر سر حامد کے چہرے پر تحسین کے تاثرات اُبھر آئے۔

"مگر سوال کرنے سے بھی آدھا علم حاصل ہو جاتا ہے آپ تو کبھی سوال ہی نہیں کرتیں، سر حامد نے کرن سے پوچھا۔

"سر جی اُس کی نوبت ہی نہیں آتی آپ کا پڑھانے کا انداز ہم لوگوں کے ذہن میں سوال کو جنم نہیں دیتا۔ نوشی نے دھیمے لہجے میں کہا، سر حامد مسکرائے اور پھر

سب کو خدا حافظ کہہ کر چلے گئے۔
لو جی گونگے بہرے اور ہینڈولوگوں کو بھی سمجھ آتی ہے سر حامد کی تو پھر ہمیں کیسے نہیں آئے گی نوشی نے کرن پر طنز کرتے ہوئے اپنی فرینڈ صبا سے کہا۔ یہ سن کر اُس کی فرینڈ صبا ہنس پڑی۔ نوشی کے اس طنز پر کرن نے کوئی جواب نہیں دیا کرن جانتی تھی ایسے لوگوں کو جواب نہ دینا ہی ایک طرح کا جواب ہے۔ نوشی اکثر و بیشتر کرن پر اور اُس کے لباس پر طنز کرتی رہتی تھی مگر کبھی یہ نہیں ہوا کہ کرن نے پلٹ کر جواب دیا ہو بلکہ کرن ایسے ظاہر کرتی تھی جیسے اُس نے نوشی کی کوئی بھی بات سنی ہی نہ ہو۔ ویسے بھی کرن کا زیادہ وقت اپنی کتابوں اور لائبریری میں گزرتا تھا اور کرن ہمیشہ کوشش کرتی تھی کہ اس کا نوشی سے ٹکراؤ کم ہو مگر پھر بھی ٹکراؤ ہو جاتا تھا۔
کرن پہلی بار جب یونیورسٹی آئی تو وہ بہت حیران ہوئی کیونکہ ایک چھوٹے پسماندہ سے شہر کے کالج سے پڑھی ہوئی کرن کو نہیں پتا تھا کہ یونیورسٹی کی دنیا بہت بڑی ہوتی ہے۔ یہاں علم کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر بھی ملتا ہے۔ وہ شعور کی باریکیاں بھی ملتی ہیں جو زندگی کے نشیب و فراز میں بہت اہمیت رکھتی ہیں اور جدیدیت کا لبادہ اُوڑھے اور پیسے کی ریل پیل میں پلے بڑھے وہ لوگ بھی ملتے ہیں جن کا کام صرف اپنا جھوٹا امیج بنانا ہوتا ہے۔ جو اپنے دین اور ثقافت کو محض ایک مذاق سمجھتے ہیں اور اُن صدیوں سے چلی آئی اقدار اور روایات کو بڑی بے رحمی سے روندتے ہیں اور اُن کو بھی روندتے ہیں جو ان اقدار کی لاج رکھتے ہیں۔ یہی کاغذی لوگ سادگی سے بھرپور اور نمود و نمائش سے کوسوں دور رہنے والے لوگوں کو حقیر سمجھتے ہیں اور اپنی جھوٹی انا، گھمنڈ میں مبتلا یہ لوگ بھول جاتے ہیں کہ زندگی کی سچائی تو سادگی میں ہے اور سادہ



لوگ حقیر نہیں بلکہ دنیا کے وہ عظیم لوگ ہوتے ہیں جو تاریخ رقم کرتے ہیں۔اور دین کو اپنا سب سے پہلا فریضہ سمجھنے والی کرن کو معلوم ہوا کہ یہاں اُسے کافی کچھ برداشت کرنا پڑے گا کیونکہ وہ ایسے مذہبی گھرانے سے تعلق رکھتی تھی جس کے ماحول نے اُسے صرف اپنے دین سے قربت سکھائی تھی۔وہ تو یہ جان کر حیران ہوگئی تھی جب اُس کے ابا نے اُسے پڑھنے کے لیے اس یونیورسٹی میں بھیجا تھا اور کرن سے صرف اتنا کہا تھا کہ میری بیٹی بس میری تم سے ایک گزارش ہے اور وہ گزارش یہ ہے کہ شرم کی چادر کو اپنے سر پر ہر حال میں قائم رکھنا اور اپنے تشخص کو کبھی فراموش مت کرنا۔ ہماری تہذیب ہماری اسلامی ثقافت ہمارا وجود ہے بے پردگی زہر قاتل ہے حیا تیرا آنچل ہونا چاہیے۔کرن نے اپنے ابا کو کہا، ابا آپ نے اپنی بیٹی پر جو اعتماد کیا ہے وہ میں کبھی مجروح نہیں کروں گی۔

کرن اپنے کلاس میں واحد لڑکی تھی جو پورے پردے میں آتی تھی اور اسی وجہ سے سب سے مختلف بھی لگتی تھی مگر اپنے اخلاق اور شائستگی سے کرن نے سب کلاس والوں کو اپنا گرویدہ بنا لیا۔کلاس میں سب اُسے بڑے احترام اور عزت کی نظر سے دیکھتے تھے۔مگر نوشی جو پوری یونیورسٹی میں سب سے ماڈرن ہونے کی وجہ سے مشہور تھی کرن اُسے ایک آنکھ بھی نہیں بھاتی تھی۔اسی لیے کبھی وہ کرن کو مولون کبھی پینڈو تو کبھی کیا کہتی تھی اور کرن سے اس وجہ سے بھی حسد کرتی تھی کہ کرن کلاس کی سب سے ذہین لڑکی تھی۔آج کل سر حامد نئے لیکچرار بن کر ان کی کلاس میں آئے تھے وہ جب سے یہاں آئے تھے تب سے نوشی اُن سے ایسے انداز میں بات کرتی تھی جیسے وہ اُستاد نہیں بلکہ نوشی کے کوئی دوست ہوں۔مگر سر حامد کبھی بھی نوشی کے اس انداز بیاں پر نہیں چونکے تھے بلکہ اُن کا یہ سب سے ایک جیسا ہوتا تھا۔

یار تجھے کیا بتاؤں سر حامد تو قیامت ہیں قیامت جب سے اُنھیں دیکھا ہے نا سچ جانو میں اپنے ہوش و حواس ہی کھونے لگی ہوں۔نوشی نے خوابناک لہجے میں صبا سے کہا۔دیکھ نوشی تجھے پتا ہے نا کہ سر حامد میرے ہیڈ ہیں تیرا اس طرح اُن سے بات کرنا اور اُن پر مرنا ذرا بھی اچھا نہیں اور ویسے بھی وہ بہت با اصول ہیں اور کافی شریف بھی اگر اُنھیں تیری اس بات کا علم ہو گیا نا تو تیری خیر نہیں، صبا نے سنجیدگی سے نوشی کو سمجھایا۔یار تو کیا ہر وقت مجھے ڈراتی رہتی ہے اُنھیں پتا کیا چلے گا میں خود جلد ہی اُنھیں اپنے دل میں چھپے احساسات سے آگاہ کر دوں گی اور ویسے بھی نوشی جیسی خوبصورت لڑکی کسی سے اظہار الفت کرے اور کوئی اُسے رسپانس نہ دے یہ ہو سکتا ہے کیا۔خیر میں کیا کہہ سکتی ہوں جیسے تیری مرضی تو نے تو کبھی اپنے ڈیڈ مام کی بات نہیں مانی میری کیا مانے گی، صبا نے نوشی کے آگے ہتھیار پھینکتے ہوئے کہا۔دیکھو صبا میں نے زندگی میں جو کچھ چاہا ہے وہ مجھے پلک جھپکنے سے پہلے مل جاتا ہے اور تو دیکھتی رہ جائے گی جب سر حامد میرے پیچھے پیچھے ہوں گے دوسرے لڑکوں کی طرح، نوشی نے انتہائی مغروری سے کہا۔

سر جی، نوشی نے اسٹاف روم سے باہر آتے ہوئے سر حامد کو مخاطب کیا، سر حامد نوشی کی آواز سن کر رک گئے اور سوالیہ نظروں سے نوشی کی طرف دیکھنے لگ گئے۔سر جی آپ سے کچھ کہنا چاہتی ہوں اگر آپ مائنڈ نہ کریں تو، آپ کو جو بھی کہنا ہے کھل کر کہیں، سر حامد نے نوشی کو جواب دیا۔وہ سر جی آپ مجھے بہت اچھے لگتے ہیں اور میں آپ سے پیار۔۔۔۔۔۔اس سے پہلے کہ نوشی اپنا نقرہ مکمل کرتی سر حامد کی گونج دار آواز سنائی دی۔خاموش، سر حامد کا چہرہ غصے سے لال ہو رہا تھا، اگر مجھے پتا ہوتا آپ مجھ سے یہ کہنا چاہتی ہیں تو میں کبھی نہیں رُکتا۔آپ کو علم نہیں کہ میرا آپ سے کیا رشتہ ہے وہ رشتہ جو ایک باپ کا اپنی بیٹی سے ہوتا ہے اور آپ مجھے اس نظروں سے دیکھتی رہیں افسوس ہے آپ پر اور آپ کے خیالات پر جس نے تمام اخلاقی حدود کو پامال کر ڈالا، یہ کہہ کر سر حامد تیزی سے قدم بڑھاتے چلے گئے۔نوشی بالکل ساکت کھڑی سنتی رہی نوشی کو اپنی قوت سماعت پر یقین نہیں آ رہا تھا کہ اُس کے ساتھ ایسا ہو سکتا ہے۔

تجھے میں نے کہا تھا نا کہ سر حامد کتنے با اصول ہیں مگر تو میرے کہنے پر نہیں رکی اب حشر دیکھ لیا نا اپنا، صبا نے نوشی کو کہا، نوشی نے صبا کو سر حامد کی ساری باتیں بتا دیں جو سر حامد نے اُسے کہیں تھیں۔ہاں تو سچ کہتی ہے صبا میں نے تیری بات نہیں مانی مگر سر حامد کو میری یوں انسلٹ نہیں کرنی چاہیے تھی، نوشی نے غصے سے کہا۔دیکھو

بات انسلٹ کی نہیں بلکہ تجھے علم ہونا چاہیے سب ایک جیسے نہیں ہوتے سر حامد کالج کا کوئی کھلنڈرا لڑکا نہیں بلکہ وہ ہمارا اُستاد، ہے اور اُستاد اُستاد ہی ہوتا ہے نوشی۔

کلاس روم میں کافی شور ہو رہا تھا، آج ایک پیریڈ خالی تھا۔ کرن تمہیں پتا چلا ہے کہ سر حامد نے نوشی کو اچھا خاصا جھاڑا ہے کرن کے ساتھ بیٹھی فوزیہ نے کرن کو بتایا۔ مجھے تو نہیں پتا مگر یہ سب تجھے کس نے بتایا ہے کرن نے فوزیہ سے پوچھا۔ مجھے تو نازش نے بتایا وہ وہاں سے گزر رہی تھی جب سر حامد نوشی کو غصے میں کچھ کہہ رہے تھے۔ ہم سب لوگوں نے یہی اندازہ لگایا ہے کہ اس نے سر حامد کے ساتھ کوئی غیر اخلاقی بات کی ہے جسکی وجہ سے سر حامد نے اُسے ڈانٹا ہے۔ انسان ہمیشہ اپنے عمل کی سزا بھگتتا ہے نوشی حد سے زیادہ آزاد خیال اور بے باک ہے اور ایسی بے باکی مشرقی لڑکی کو زیب نہیں دیتی، کرن نے فوزیہ سے کہا۔ ابھی باتیں جاری تھی کہ سر حامد کلاس میں داخل ہوتے ہیں اور اچانک شور تھم جاتا ہے۔

آج سر حامد بہت سنجیدہ نظر آ رہے ہوتے ہیں ،آج آپ لوگوں کو میں کچھ اور پڑھاؤں گا۔ مجھے پتا ہے میرے بارے میں آجکل یہاں کچھ چہ مگوئیاں ہو رہی ہیں سر حامد ایک پل کے لیے یہ کہہ کر خاموش ہوتے ہیں اور پھر سب پر ایک نظر ڈال کر کہتے ہیں۔ آپ لوگوں کا اور میرا رشتہ کیا ہے کوئی یہ بتائے گا ایک خاموشی چھا جاتی ہے اور حیدر کھڑا ہو کر کہتا ہے۔ سر آپ ہمارے معزز اُستاد ہیں اور ہم آپ کے شاگرد ہیں، وہ تو ٹھیک ہے مگر ایک اور بھی رشتہ ہے۔ کرن کھڑی ہوتی ہے اور کہتی ہے، سر وہ رشتہ روحانی باپ کا ہے جو آپ کا ہمارے ساتھ ہے۔ ہاں بالکل ٹھیک کہا آپ نے مگر آج ہم کس رُخ پر کھڑے ہیں آج ہم یہ رشتوں کو بھول چکے ہیں۔ آج ہماری آنکھوں میں نہ شرم ہے نہ حیا ہے آج ہوا کی بیٹی نے اپنا آنچل گرایا ہوا ہے آج تنگ بدن کو ہم فیشن کہتے ہیں۔ وہ بیٹیاں وہ بہنیں جو ہماری غیرتیں ہوتی تھی آج وہ ہماری آنکھوں کے سامنے بے شرمی کے اُس وجود میں نظر آتی ہیں جن کو دیکھ کر آنکھیں پھٹ جاتیں اور ذہن ماؤف ہو جاتا ہے۔ مگر ہم اور ہمارا ضمیر پھر بھی ہمیں کچھ نہیں کہتا وہ ہماری تہذیب جس کی دنیا میں مثالیں دی جاتیں تھیں آج وہ تہذیب سسکیاں لے رہی ہے اور آج اُس تہذیب کو سفاکی سے روندا جا رہا ہے۔ ہم دوسروں کی تہذیب اور ثقافت کو اپنا کر اتنے اندھے ہو چکے ہیں کہ ہمیں اپنا مذہب تنگ نظر آتا ہے۔ ہم اس مذہب پر ٹھیک چلنے والے کو تنقید کا نشانہ بناتے ہیں اُنھیں تنگ نظر کہتے ہیں مگر آج کیا ہو رہا ہے ہم اندر سے کھوکھلے ہو چکے ہیں جدیدت اور ماڈرن بننے کے لیے اپنی شرم عزت غیرت کو دفن کر بیٹھے ہیں۔ مگر یاد رکھو آپ سب یہ شرم یہ حیا ہماری بہنوں ماؤں کی میراث ہے اور یہ صرف کتابی باتیں نہیں زندگی کی وہ کھلی حقیقتیں ہیں جن سے ہم بھاگ رہے ہیں۔ میں اس کلاس میں بیٹھی بچی کرن کو شاباش دیتا ہوں کہ اُس نے ہزاروں کی بھیڑ میں اپنے وجود کو قائم رکھا ہے میں خراجِ تحسین پیش کرتا ہوں۔ اس کے والدین کو جس نے اپنی بچی کو حیا کے آنچل میں چلنے کی تربیت سکھائی ہے اور اپنے دین سے اُنسیت کا سبق سکھایا۔ اور میں یقین سے کہتا ہوں کہ اس بچی کو سب احترام کی نگاہ سے دیکھتے ہوں گے آپ سب مجھ سے نہیں مگر اس بچی سے ضرور سبق سیکھنا۔ شاید میری باتوں نے کسی کی دل آزادی بھی کی ہوگی مگر آپ سب کو جب تک میں یہ نہ بتاتا تب تک مجھے چین نہیں آنا تھا کیونکہ میرے ساتھ جو واقعہ پیش آیا ہے میں اُسے کبھی نہیں بھولوں گا۔ سر حامد کی بات ختم ہوئی تو ایسا لگا کہ سر حامد کی باتوں نے جیسے کلاس میں سب کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا ہو۔ نوشی کو زندگی میں پہلی بار اپنے آپ سے گھن آئی کلاس میں بیٹھی ہر لڑکی کے ذہن میں سر حامد کی باتیں گونجنے لگیں سب کو سچائی کی وہ جھلک نظر آئی جن سے وہ کوسوں دور ہو چکی تھیں۔ سبھی نے اپنے ذہن میں اپنی تہذیب کو دوبارہ اُجاگر کرنے کا اعادہ کیا اور کرن کی آنکھوں میں آنسو آ چکے تھے وہ سمجھتی تھی شاید اُس کو کوئی بھی نہ سمجھ سکے شاید وہ اس کلاس کی سب سے گمنام اسٹوڈنٹ میں شامل ہو گی۔ مگر آج یوں اپنی تعریف اور اپنی اصلی تہذیب اپنانے پر اسے سب کے لیے ایک مثال کے طور پر پیش کیا گیا اس کا کرن تصور بھی نہیں کر سکتی تھی اور آج اسے یہ عزت اور اعلیٰ مقام صرف اپنے سر پر شرم کی چادر کو سلامت رکھنے پر دیا گیا تھا۔

☆☆......☆☆

لرزش

شازیہ گل

محبت اور دوستی کی بے اعتنائی لیے ایک کہانی / محلہ سواتیاں سے

میرا نام کرن ہے ہم چھ بہنیں اور ایک بھائی تھے۔ پانچ بہنیں میری پیدائش سے پہلے ہی مر چکی تھیں میرا اب ایک ہی بھائی ہے 5 بہنوں کے مر جانے کے بعد بڑی منتوں مرادوں سے میں اس دنیا میں آئی تو میری امی ابو نے بہت خوشیاں منائی۔ وہ مجھ سے بہت پیار کرتے تھے میں 7 سال کی تھی جب ایک دن ابو ہمیں اس دنیا میں تنہا چھوڑ کر اس جہاں سے رخصت ہو گئے۔ میرے بھائی پر بہت چھوٹی سی عمر میں ذمہ داریوں کا بوجھ آن پڑا میرے بھائی نے بہت ہمت اور حوصلے سے اپنی ذمہ داریوں کو نبھایا۔ مجھے کبھی باپ کی کمی محسوس نہ ہونے دی میری امی اور میرا بھائی دونوں ہی مجھ سے بے پناہ پیار کرتے تھے۔ میری خواہش پوری کرتے تھے جب میں 6th کلاس میں تھی ابھی نادانی کی عمر کا آغاز تھا مجھے فلمیں دیکھنے کا بہت خوش تھا۔ اور تب میں فلمی کہانیوں کو حقیقت سمجھتی تھی میری ایک بچپن کی دوست تھی ماہین میں اس سے بہت زیادہ پیار کرتی تھی وہ ان دنوں اپنے ایک کزن سے محبت کرتی تھی ساحل میری پھپھو کی نند کا بیٹا تھا۔ ایک دوسرے کے گھروں میں آنا جانا بھی تھا میرا بھائی اسے چھوٹا بھائی سمجھتا تھا میری امی اپنے بیٹے جیسا پیار کرتی تھیں۔ مگر انہیں کیا پتا ساحل کتنا کم ظرف انسان ہے وہ مجھے دیکھ کر ٹیپ ریکارڈ پر یہ گانا لگا دیتا تھا۔

تو ہے میری کرن تو ہے میری کرن۔

میں انجان بنی رہی اسی طرح دو سال کا عرصہ بیت گیا مگر اس نے کبھی مجھ سے اظہار محبت نہیں کیا تھا گانوں یا شعر و شاعری میں جتاتا رہتا۔

☆......☆......☆

ایک دن اس نے اچانک میرے بھائی کے نام کے خط میں ایک چھوٹا سا رقعہ میرے نام بھی لکھ ڈالا۔ وہ پڑھائی کے سلسلے میں اپنے پاپا کے ساتھ دوسرے شہر گیا ہوا تھا جس کی وجہ سے وہ بھائی کو اکثر خطوط لکھتا تھا۔ بھائی چونکہ پڑھا لکھا نہیں تھا سو وہ سارے خط مجھ سے پڑھواتا تھا۔ اس دن جب بھائی نے خط لا کر مجھے دیا تو میں نے اس میں ایک الگ رقعہ دیکھا تو دل بہت زور سے دھڑکنے لگا اس ڈر سے کے بھائی یہ کسی اور سے پڑھوا لیتے تو نہ جانے کیا ہوتا بس میں نے بھائی کو خط پڑھ کے سنایا کہ وہ 29 رمضان کو آئے گا۔ بھائی نے دوسرے رقعے کا پوچھا کہ اس میں کیا لکھا ہے میں نے کہہ دیا کہ اس میں شعر لکھے ہیں چونکہ وہ ہر خط میں شعر لکھتا تھا اس لیے بھائی کو شک نہیں گزرا



بھائی نے کہا چلو رہنے دو مجھے نہیں سننی شاعری رکھ دو۔

☆......☆......☆

بھائی کے جانے کے بعد جب میں نے وہ رقعہ کھولا تو لکھا تھا بہت کچھ جھوٹے دعوے لکھے تھے۔ مختصر یہ کے ڈیر کرن میں گذشتہ 2 سال سے تم سے محبت کرتا ہوں مگر کہہ نہ پایا آج میں اس خط کے ذریعے تم سے اپنی محبت کا اظہار کر رہا ہوں میری زندگی اور موت تمہارے ہاتھ میں ہے۔ اگر تم نے میرے پیار کا جواب پیار سے دیا تو ٹھیک ہے ورنہ میں مر جاؤں گا وغیرہ وغیرہ مجھے اس وقت اس سے کوئی دلچسپی نہیں تھی اس لیے مجھے برا لگا۔

میں نے وہ خط ماہین کو دکھایا دیکھو ماہین تمہارے کزن کی اتنی ہمت ہوگی ہے کہ اس نے مجھے لیٹر لکھ ڈالا ہے اگر بھائی کسی اور سے پڑھوا لیتا تو وہ مجھے بھی قصور وار سمجھتا جبکہ تم اچھی طرح جانتی ہو مجھے بالکل اچھا نہیں لگتا۔ ماہین کہنے لگی کیوں پریشان ہو رہی ہو میں ہوں نا آ جانے دو میں خود بات کرلوں گی تم ٹینشن نہ لو۔ 29 رمضان کو جب وہ آیا تو بہت خوش تھا لیکن جب ماہین سے اسے پتا چلا کہ مجھے اس کا لیٹر اچھا نہیں لگا اور یہ کے مجھے اس میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ تو پریشان چہرہ بنا لیا مگر میں نے کوئی نوٹس نہیں لیا۔ کیوں کہ میں جانتی تھی کہ مجھ سے پہلے بھی وہ ناھید اور ناعمہ کو بے وقوف بنا چکا ہے سو مجھے اس کا اعتبار نہیں تھا۔

☆......☆......☆

مگر ماہین نے مجھے قائل کرنا شروع کر دیا یہ کہہ کر کہ ”ہم جہاں رہیں گے اکھٹے رہیں گے ساحل کا بڑا بھائی مجھ سے محبت کرتا ہے اور ساحل تم سے بے شک اس نے ناھید اور ناعمہ کو بے وقوف بنایا مگر تمہارے ساتھ وہ مخلص ہے اس نے خود میرے سامنے قرآن پاک پر ہاتھ رکھ کر قسم کھا کر کہا ہے کہ وہ تم سے سچی محبت کرتا ہے۔ مگر ماہین میرا دل نہیں مانتا۔“

دیکھو کرن تم مجھ سے سچی دوستی کرتی ہو نا پھر میری بات کا یقین کرو اور میری خاطر اس کی محبت کو قبول کر لو۔ مگر میرے دل میں ابھی اس کے لیے ایسا کوئی

جذبہ نہیں ہے۔
تو کیا ہوا اس کی محبت سچی ہوئی تو دل میں خود ہی جگہ بن جائے گی۔ شاید وہ 12 جنوری 2000ء کی بات ہے جب میں نے اس کی محبت قبول کی تھی۔ اور ہاں میری ایک بات کان کھول کے سن لو پھر کہا ساحل نا تو میں بے وفا ہوں نا بے وفائی برداشت کرتی ہوں میں بہت ضدی ہوں اور انا پرست ہوں اگر کبھی تم نے مجھے دھوکہ دیا تو پھر مجھ سے وفا کی توقع نہ کرنا۔
وہ اس دن بہت خوش تھا اور مجھے یقین دلانے کے لیے چھوٹی چھوٹی باتوں پر قرآن پاک کو بیچ میں لے آتا میں بے وجہ روٹھ جاتی تو مجھے منانے کے لیے قرآن پاک لے آتا اور مجھے قرآن کا واسطہ دے کر کہتا کہ میں اس سے راضی ہو جاؤں کیوں کہ وہ میری ایک پل ناراضگی بھی برداشت نہیں کر سکتا تھا میں اس کے آنسوؤں پر اعتبار کر گئی تھی۔
پھر ایک دن ماہین کے ذریعے ہی امی کو پتا چلا کہ میں اور ساحل ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں جب میری امی نے مجھ سے پوچھا تو میں نے سچ بتا دیا۔ جس پر امی بہت ناراض ہوئیں میری امی نے مجھے بہت سمجھایا کہ ابھی تم ناسمجھ ہو اپنی پڑھائی پر توجہ دو اور ویسے بھی تمہارا رشتہ تمہارے تایازاد کے ساتھ طے ہے۔ مگر میری آنکھوں پر تو محبت کی پٹی بندھی تھی ماں تو ماں ہوتی ہے وہ میری ضد کے آگے مجبور ہو گئیں مگر امی نے کہا اگر ساحل کے گھر والے رشتہ لے کر آئے تو میں ہاں کہہ دوں گی۔ مگر قسمت کو کچھ اور ہی منظور تھا اس بات کے 2 ہفتے بعد میری امی بھی ہمیں اس جہاں میں چھوڑ کر چل بسی۔

☆......☆......☆

میری امی مجھ سے بہت محبت کرتی تھیں۔ اس لیے امی کی موت کا صدمہ اتنا شدید تھا کہ میں بیمار پڑ گئی 2 ماہ بیمار رہی جس کی وجہ سے میرا اسکول چھوٹ گیا۔ اس دوران ماہین اور ساحل مجھے حوصلہ دیتے رہے کہ خدا کو یہی منظور تھا امی کے مرنے کے بعد کچھ عرصے میں ہی میرے رشتے آنا شروع ہو گئے مگر میں ہر بار رو رو کر رشتے کے لیے انکار کر دیتی۔

اسی دوران میری تایا امی بھی آئی کہ میں اپنی امانت لینے آئی ہوں مگر میرے بھائی نے جب مجھ سے پوچھا تو میں نے انکار کر دیا میرے بھائی نے تائی کو بھی انکار کر دیا جس کی وجہ سے تائی اماں ہم سے ناراض ہو گئی۔ ساحل کی امی کی بھی خواہش تھی اس لیے ساحل کے والدین بھی میرے رشتے کے لیے آئے۔ بھائی نے جب مجھ سے پوچھا تو میں نے کچھ نہیں کہا بلکہ خاموش رہی جس کی وجہ سے بھائی نے انہیں ہاں کر دی۔ امی کے مرنے کے دو سال بعد بھائی کی شادی ہو گئی ماہین کی شادی ہو گئی اور ماہین نے مجھے کہا کہ میں وہاں جاتے ہی تمہیں بھی لے جاؤں گی مگ۔ رماہین وہاں جا کر بدل گئی اور پھر ساحل میں بھی تبدیلی آنے لگی۔
اسی دوران ساحل کو ایک اور لڑکی سے محبت ہو گئی۔ جو مجھ سے زیادہ امیر بھی تھی اور خوبصورت بھی ماہین نے ساحل کا وہاں بھی ساتھ دیا اب ساحل اور ماہین نے ایک پلان تیار کیا جو مجھ سے جان چھڑوانے کا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ میں ضدی ہوں اور انا پرست ہوں میں نے بھی اپنی انا کو قائم رکھا سو ان کا پلان کامیاب رہا۔ ساحل نے اپنی کزنز کو ساتھ ملا کر بہت سی باتیں پھیلائیں جب بھی میں اس کی کزن سے ملتی تو وہ مجھے کہتی ساحل نے تو آج کل بہت سی لڑکیوں سے دوستیاں کر لی ہیں سارا سارا دن ان سے فون پہ بات کرتا ہے۔

☆......☆......☆

ایک دن اس کی ایک کزن نے مجھ سے کہا کہ وہ تمہیں جلاتا ہے تو کبھی تم بھی اسے جلاؤ۔ کسی سے بھی بات کر کے میں نہیں سمجھی کہ یہ بھی ان کی گیم کا حصہ ہے میں نے اپنے کزن کے بیٹے کو کال ملائی تو اس کی دوسری کزن اس کے پاس گئی کہ دیکھو وہ کسی لڑکے سے بات کر رہی ہے بس اُس نے اس بات کو اشیو بنا لیا۔ اور مجھ پر بہتان بازی شروع کر دی کیوں کہ وہ مجھ سے جان چھڑانا چاہتا تھا۔ اس نے سب سے کہنا شروع کر دیا کہ کرن کی بہت سے لڑکوں سے دوستی ہے اور اپنی ایک کزن آمنہ سے کہنے لگا کہ میں تو آسمان تک لے جا کر نیچے گراتا ہوں تا کہ چوٹ لگے

تو اتنی تکلیف تو ہو گر ان بہت مغرور بھی نا دیکھو نا اب تو ہر 2 بندے چھوڑ کر تیسرا اسکا دوست ہے۔

مجھے جب ان باتوں کا پتا چلا تو بہت دکھ ہوا اور پھر آخری بار بڑی عید کا دوسرا دن تھا 2007ء میں جب میری آخری بار اس سے بات ہوئی تھی اس کی فیملی والے بھی تھے ان دنوں اس کا نیا عشق شروع ہوا تھا میں نے پوچھا تو کہنے لگا۔ ''میری زندگی میں اس وقت 6 لڑکیاں ہیں میں انہیں چھوڑ نہیں سکتا۔'' مجھے غصہ آ گیا میں نے اسے کہا کہ میں تو تمہیں چھوڑ سکتی ہوں نا آج سے تمہاری میری راہیں جدا ہیں۔

میرے اسے چھوڑنے کے ایک ماہ کے اندر ہی اس نے منگنی کر لی اور پھر کچھ ماہ بعد ہی اس کی شادی کی میرے گھر والے بھی اس کی شادی اٹینڈ کرنے گئے ہوئے تھے اور خوش بھی تھے۔ کیوں کہ میرے بھائی کو وہ رشتہ میرے لیے منظور نہیں تھا نہ بھابی چاہتی تھی سو جب اس کی شادی کہیں اور ہو رہی تھی تو وہ بہت خوش تھے۔

اس کی منگنی کے بعد مجھے رانگ نمبر پہ ایک اچھا دوست مل گیا۔ جو اب میرا شوہر بھی ہے اور بہت اچھا دوست بھی یوں سمجھ لیں کے اب وہ میری خوشیوں کا محور ہے۔ میرے دوست نے میرے زخموں پر مرہم رکھا بے شک خدا نیتیں جانتا ہے مجھ میں کوئی کھوٹ نہیں تھی اس لیے تحفے میں خدا نے ایسا شوہر دیا کہ میں اپنے رب کا جتنا شکر ادا کروں وہ کم ہے۔

☆......☆......☆

میری شادی اس کی شادی کے ڈیڑھ سال بعد ہوئی اور بہت عرصے کے بعد اس کی بیوی نے مجھ سے کہا ''ساحل نے کبھی تم سے محبت نہیں کی تھی وہ تمہیں دھوکہ دیتا رہا ہے۔'' اور میری وہ دوست جو آستین کا سانپ نکلی وہ بھی اس کی بیوی کے ساتھ کھڑی تھی میں نے ماہین سے کہا تم ساری باتوں کی گواہ ہو ساری قسمیں سارے وعدے تم جانتی ہو اور یہ بھی کہ اسے صرف میں نے تم، ہاری کا طرا اپنا سمجھا تھا تو ماہین مکر گئی کہ میں تو کچھ بھی نہیں جانتی۔

مجھے بہت دکھ ہوا کہ میری دوست یعنی ماہین نے مجھے خود جس راستے پر ڈالا پھر مکر بھی گئی میں نے غصے

کیا آپ کو پتا ہے؟

باب القرآن سورۃ فاتحہ کہلاتی ہے۔
روح القرآن سورۃ یٰسین کہلاتی ہے۔
سورۃ بقرہ، سب سے بڑی سورۃ ہے۔
روح القدس، قرآن مجید میں حضرت جبرئیلؑ کا خطاب ہے۔
سورۃ الکوثر، قرآن مجید کی سب سے چھوٹی سورۃ ہے۔
قرآن مجید میں نماز کی تاکید سات سو مقامات پر کی گئی ہے۔
قرآن مجید میں حضرت موسیٰؑ کا ذکر سب سے زیادہ آیا ہے۔
قرآن مجید میں سجدہ تلاوت چودہ ہیں۔

مرسلہ نگار: ایم کاشف۔ کراچی

میں ماہین سے کہا کہ ''اچھا تو تم بھی ساحل کے پلان میں برابر کی شریک تھی'' تو کہنے لگی ''یونہی سمجھ لو'' تب میرے اندر اعتماد کی اتنی کرچیاں ہوئیں کہ مجھے محبت اور دوستی کے نام سے بھی اتنی نفرت ہوگئی۔ کسی پر اندھا اعتماد نہیں کرنا چاہیے۔

ماہین کے پاس سب کچھ ہے مگر اولاد کی نعمت سے 9 سال سے محروم ہے۔ یہی مکافات عمل ہے پھر میں داد دیتی ہوں دھوکے باز ساحل کو جس نے 6 سالوں میں مجھے ایک بھی شبہ نہیں ہونے دیا کہ وہ سچا ہے یا جھوٹا۔

اب آخر میں میری گزارش ہے اُن بچیوں اور بہنوں سے جو اپنی آنکھوں میں یہ خواب سجاتی ہیں۔ خُدارا کبھی کسی سے شادی سے پہلے محبت مت کرنا محبت اپنے ماں باپ سے بہن بھائیوں سے اور اس کے بعد صرف اپنے شوہر اور سسرال سے جہاں آپ نے ساری زندگی گزارنی ہے۔ خُدا نبی ﷺ اور قرآن پاک سے بڑھ کر کچھ بھی نہیں ہے جہاں لوگ ان کو ڈھال بنا کر فریب کر سکتے ہیں تو پھر سچائی اور کون سی قسم رہ جاتی ہے۔

☆☆......☆☆

خدا نہ کرے

ڈاکٹر طارق محمود آکاش

ایک شاطر عورت کے مکر و فریب کا شکار نوجوان کی کہانی / سیالکوٹ سے




اُس کو میں نے جب بھی دیکھا انگلیوں پر کچھ گنتا رہتا۔ گرمی ہو یا سردی دھوپ ہو یا چھاؤں بارش ہو یا آندھی ہو طوفان وہ ہر طرح کے موسم سے بے نیاز سڑکوں پہ پھرتا رہتا۔ اگر کوئی روٹی ہاتھ میں رکھتا تو کھا لیتا اگر کوئی چائے کا کپ ہاتھ میں دیتا تو آرام سے بیٹھ کے پی لیتا چائے پی کر کپ کو واپس سلیقے سے دے کر مسکرا کر آگے بڑھ جاتا۔ کوئی بھکاری سمجھ کر روپیہ پیسہ دینے کی کوشش کرتا تو کبھی نا لیتا بلکہ وہیں گرا کر آگے روانہ ہو جاتا۔



لوگ اس کو پاگل، سائیں، مست اور نہ جانے کیا کیا کہتے تھے۔ مگر میرا دل نہیں مانتا تھا کہ یہ آدمی پاگل ہے کیوں کہ میں اکثر دیکھتا تھا کہ اگر کوئی دکان دار اسے پیسے دے کر کہتا کہ جاؤ فلاں دوکان سے سگریٹ، بوتل یا پان لے آؤ تو وہ جاتا اور لے آتا اور بقایا پیسے اس کو واپس کر دیتا اب اس طرح کے آدمی کو پاگل یا دیوانہ کہنا کہاں کی عقلمندی کہیں گے۔ میرا دل کہتا کہ اگر اس کو اعتماد میں لیا جائے اور احتیاط کی جائے تو یہ دوبارہ سے دنیا میں واپس آ سکتا ہے۔ جب کہ اس وقت وہ اس دنیا میں چلنے پھرنے کے باوجود دنیا سے بے خبر ہے۔

جب میں بھی وہاں سے گزرتا تو میں نے اسے مختلف جھکوں پہ بیٹھے وہاں سگریٹ سلگائے چہرے پہ مسکراہٹ سجائے انگلیوں پہ کچھ گنتے یا کسی کے لیے چائے وغیرہ لاتے ہی دیکھا پھر ایک روز میں اپنے مقررہ ٹائم پہ گزرا تو مجھے وہ نظر نہ آیا۔ میں نے ادھر اُدھر دیکھا تو ضرور وہ مجھے کہیں بھی نظر نہیں آیا میں اپنی ڈیوٹی پر چلا گیا۔ واپسی پر میں نے دیکھا کہ وہ وہیں بس اسٹاپ پر ہی ایک طرف دیوار کے پاس کھڑا ہے اپنے مخصوص انداز میں سگریٹ کے کش لگا رہا ہے۔ مجھے کافی اطمینان سا محسوس ہوا اور میں نے دل میں یہ سوچا کہ کاش میرے وسائل اتنے ہوتے کہ میں اس کو کسی اچھے ڈاکٹر کو دکھاتا تو شاید یہ ٹھیک ہو جائے۔

اگلے روز جمعۃ المبارک کا دن تھا اور مجھے آفس کی چھٹی تھی۔ چھٹی کا دن اکثر گھر کے کاموں میں گزرتا تھا اور اس دن ڈیوٹی کے دنوں سے بھی زیادہ مصروفیات لگتی ہوتی تھی موسم گرد آلود تھا۔ جھکڑ چل رہا تھا اور مجھے ایسے موسم سے بہت کوفت محسوس ہوتی ہے۔ یا تو ہلکی ہلکی بارش بھی ساتھ ہو جائے تو آندھی طوفان پہ غصہ نہیں آتا کیوں کہ پھر گرد نہیں اڑتی مگر

جب خالی گرد اڑتی ہے تو مجھے بہت غصہ آتا ہے۔ میں آج ارادتاً گھر سے نکلا اور اسٹاپ کی طرف چلا گیا اور جا کر ایک چائے کی دکان پر بیٹھ گیا اور چائے کا آرڈر دیا ساتھ میں پکوڑے منگوا لیے۔

☆......☆......☆

ٹی اسٹال والے نے بینچ کو اچھی طرح صاف کرنے کے بعد بہت گرمجوشی کے ساتھ بیٹھنے کو کہا چونکہ میں روزانہ وہاں سے گزرتا تھا۔مگر کبھی چائے وغیرہ پینے کی زحمت نہیں کی تھی اور آج خلاف معمول وہاں بیٹھا گیا تھا اس لیے شاید وہ دکان والا بھی حیران اور خوش تھا۔

بہر حال مجھے تو اپنا مدعا حل کرنا تھا جس سلسلے میں وہاں بیٹھا تھا اتنے میں ہلکی ہلکی رم جھم شروع ہو چکی تھی۔اور ایسے موسم میں چائے اور پکوڑوں سے بہتر شاید ہی کوئی چیز ہو۔

جیسے ہی چائے والا میری چائے رکھنے آیا میں نے بہت مؤدب انداز میں کہا بھائی جی اگر آپ کے پاس ٹائم ہو تو مجھے آپ سے کچھ پوچھنا ہے۔

جی بابو جی پوچھیے......

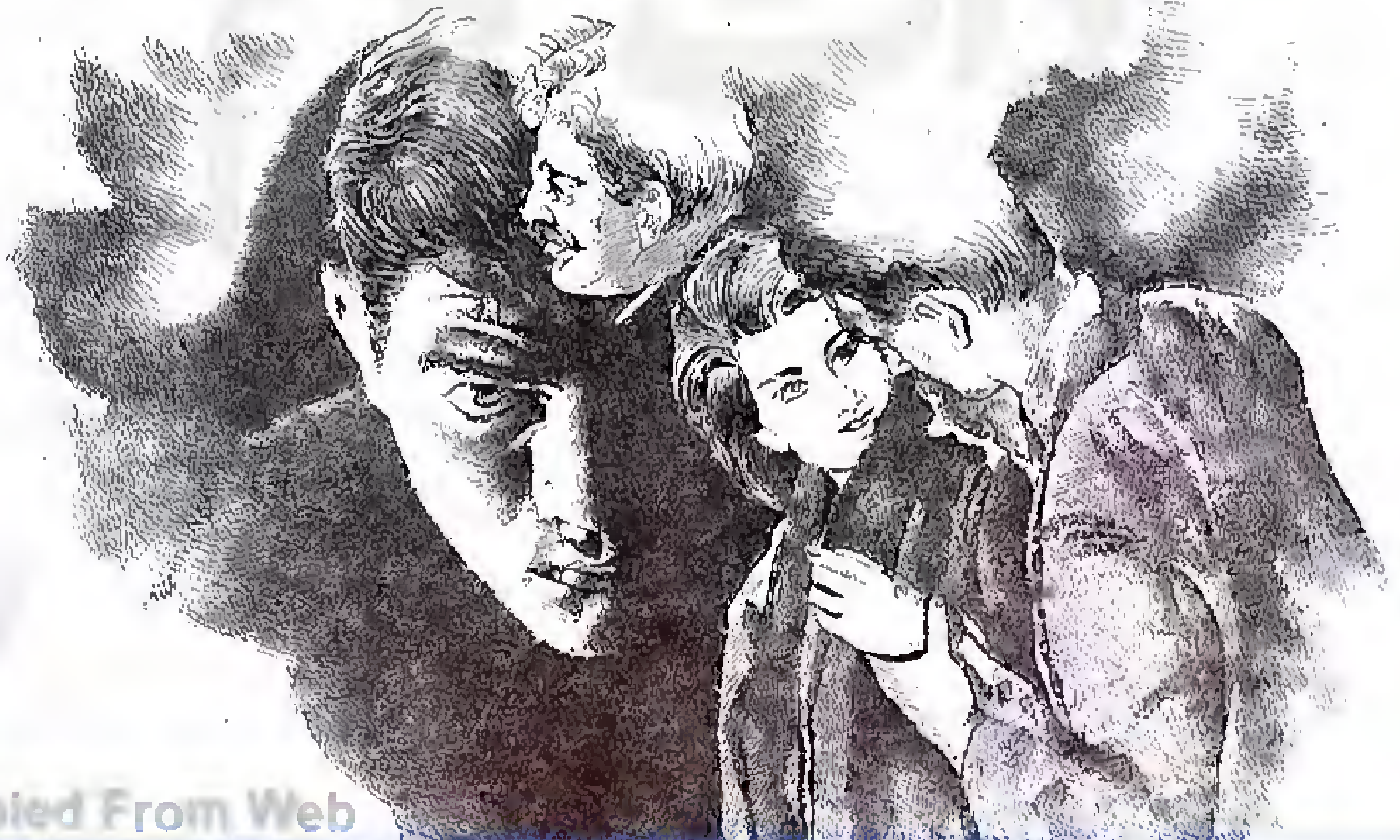
اس نے بہت پیار سے جواب دیا...... وہ دراصل مجھے دیوار کے ساتھ لگے ......اس مجنوں حالت آدمی کے بارے میں پوچھنا تھا۔

آہ ہا...... بابو جی......ان کے بارے میں کیا پوچھتے ہو جی۔

السلام وعلیکم......وعلیکم السلام ......کیا حال ہے بیٹا......ٹھیک ہونا ......ارے بھئی جلدی سے چائے پلاؤ اور آج کا اخبار تو دینا ذرا......ابھی چائے والا مجھے کچھ بتانے ہی والا تھا کہ انتہائی معمر بزرگ ایک ہاتھ میں چھتری اور ایک ہاتھ میں عصا تھامے اندر داخل ہوئے اور آتے ہی چائے اور اخبار طلب کی۔

چائے والے نے بہت احترام کے ساتھ بابا جی کو کرسی پیش کی اور ساتھ ہی مجھ سے مخاطب ہوا''یہ ہمارے بزرگ ریٹائرڈ ٹیچر اللہ بخش صاحب ہیں یہ آپ کو اس مجنوں کے بارے میں بتائیں گے۔''

میں نے بھی نہایت ادب کے ساتھ ماسٹر صاحب اللہ بخش کو سلام کیا انہوں نے بہت پیار سے مجھے اپنے پاس والی کرسی پر بٹھالیا۔یہ قدرتی بات ہے کہ انسان جب جوان ہوتا ہے تو اس کے پاس سنانے کا ٹائم نہیں ہوتا مگر جب وبوڑھا ہو جاتا ہے تو اسکے پاس سنانے کا اتنا ٹائم ہوتا ہے کہ وہ چاہتا ہے کہ میں دن رات سناتا رہوں بولتا رہوں مگر کوئی لمحہ بھر اس کے پاس بیٹھ کر سنتا نہیں کیوں کہ تب دوسروں کے



پاس ٹائم نہیں ہوتا۔
ماسٹر اللہ بخش کا بھی یہ روزانہ کا معمول تھا کہ وہ ٹی اسٹال پر آ کر بیٹھتے چائے پیتے اخبار پڑھتے اور آدھا دن یہاں بیٹھا گزر جاتا پھر نماز ظہر کا ٹائم ہوتا تو وہ مسجد کی طرف چل نکلتے۔ مجھے اپنی پریشانی حل کرنا تھی اور ماسٹر صاحب کو اپنی باتیں سنانے کے لیے ایک مطلوبہ آدمی مل گیا تھا اس لیے وہ خوش ہو گئے کہ ''خوب گزرے گی جو مل کر بیٹھیں گے دیوانے دو'' پھر اس مجنوں شخص کی جو روئیداد ماسٹر صاحب نے سنائی وہ کچھ اس طرح تھی۔

☆......☆......☆

حاکم پور گاؤں کا چوہدری حاکم لاکھ برا سہی مگر اس کی ایک بات سب کو پسند تھی کہ وہ اپنے گاؤں میں تعلیم کے حق میں تھا وہ یہ چاہتا تھا کہ اس کے گاؤں کے لوگ پڑھ لکھ کر اعلیٰ عہدوں پہ فائز ہوں اس کا گاؤں ترقی کرے گاؤں مین اسکول کالج اسپتال ہر طرح کی سہولت ہو۔ دوسری طرف چوہدری حاکم کو شراب اور شباب دونوں کی لت تھی اس کی اکثر راتیں شہر میں گزرتیں جس میں اس کا کوئی کمین اسکے ساتھ نہ ہوتا تھا بلکہ وہ جب بھی باہر نکلتا اکیلا ہی ہوتا تھا چوہدری حاکم کی بیوی مسرت بی بی ایک اچھی عورت تھی۔ پورا گاؤں اس کی عزت کرتا تھا غریب مزارعوں کی عورتوں کا وہ خیال رکھتی اس کسی بھی ضرورت کے وقت وہ فوراً مدد کرتی۔ ارسلان جس کو سب پیار شانی کہتے تھے بہت پیارا بچہ تھا چودہری کا اکلوتا لخت جگر چوہدری اس پر جان چھڑکتا تھا اور کہا کرتا تھا میرا بیٹا بڑا ہو کر اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے اس گاؤں کا نام روشن کرے گا۔
پھر یہاں نہ صرف اسکول بلکہ کالج بنے گا پکی سڑکیں ہوں گی ہسپتال ہو گا جس میں 24 گھنٹے ڈاکٹر کی حاضری یقینی ہو گی اور چوہدری کی باتیں سن کر دل کو ایک اطمینان سا ملتا کہ کاش وہ وقت جلد آ جائے۔
چوہدری حاکم کی کوششوں سے گاؤں میں پرائمری اسکول کا سنگ بنیاد رکھا گیا تھا۔ اور ابتدائی طور پر اللہ بخش جس نے میٹرک کیا ہوا تھا وہ ماسٹر بن کر اسکول چلانے لگا۔ ماسٹر بخش روزانہ گھر گھر جا کر لوگوں کو تعلیم کے لیے آگاہی دیتا اور سب محبتوں کے ساتھ بچوں کو دینی اور دنیاوی تعلیم دینے لگے۔ اسکول کی ابھی کوئی عمارت نہ تھی شیشم کے پرانے درخت کی چھاؤں میں بیٹھ کر ایک پرانے سے لکڑی کے تختے کو بلیک بورڈ بنا کر کام لیا جا رہا تھا۔ چوہدری حاکم کا بیٹا شانی شہر میں پڑھ رہا تھا اور وہیں ہوسٹل میں رہتا تھا۔

☆......☆......☆

وقت کا کام ہے چلتے رہنا اور یہ چلتا ہی رہتا ہے کسی کے ہونے یا نا ہونے سے۔ رہنے یا نہ رہنے سے اس کو کوئی فرق نہیں پڑتا یہ اپنی رفتار سے چلتا رہتا ہے شانی اعلیٰ تعلیم کے حصول کے بعد گاؤں آیا پورا گاؤں اسے دیکھ کر بہت خوش ہو رہا تھا اور دعائیں کر رہا تھا کہ جو اُمیدیں چھوٹے چوہدری سے وابسطہ ہیں کاش وہ پوری ہوں۔ چوہدری حاکم نے حسب وعدہ تمام پورے کرنے کی یقین دہانی کروائی تھی۔
شانی باہر گاؤں میں کھیتوں میں کھڑا ہسپتال اور کالج بنانے کے منصوبے پہ غور کر رہا تھا کہ ایک ٹیکسی گاؤں کی جانب آتی نظر آئی۔ شانی نے ٹیکسی سے توجہ ہٹا کر ذہن اپنے منصوبے کی طرف کر دیا مگر جب گاڑی اس کے پاس آ کر رکی تو اسے مجبوراً اپنا دھیان ان کی جانب کرنا پڑا گاڑی میں تین نوجوان لڑکے اور ایک ماڈرن قسم کی عورت بیٹھی تھی اور ٹیکسی کی چھت پر تین بڑے بڑے بریف کیس رکھے ہوئے تھے۔ یا تو وہ لوگ گاؤں میں کسی فنکشن کی غرض سے آ رہے تھے یا وہ لوگ کسی رشتے دار کے ہاں چھٹیاں گزارنے آ رہے تھے اور ان کا کافی دن رہنے کا پلان لگ رہا تھا۔۔
چوہدری حاکم کا ڈیرہ یا بنگلہ کس طرف ہے نوجوان؟ گاڑی کے آگے کی سیٹ پہ بیٹھی آنکھوں پہ چشمہ سجائے عورت نے سوال کیا۔
شانی حیران ہو گیا یہ تو ہمارے گھر کا ہی پتہ پوچھ رہیں ہیں۔ مگر یہ لوگ ہیں کون آخر عورت کو ایک مرتبہ پھر پوچھنا پڑا تو شانی نے ہڑبڑاتے ہوئے رستہ بتایا اور خود بت بنا سوچتا رہا کہ کون ہو سکتے ہیں یہ لوگ؟

☆......☆......☆

چوہدری حاکم گھر پہ ہی موجود تھا جب گیٹ کھلا اور ٹیکسی اندر داخل ہوئی تو اسکے وہم وگمان میں بھی نہ تھا کہ یہ لوگ گھر بھی آسکتے ہیں۔

''ناصرہ بیگم تم اور یہاں......؟''

چوہدری حاکم کے پاس بیٹھے گاؤں کے کچھ لوگ اور پاس کھڑے ملازم بھی چوہدری صاحب کی طرف متوجہ ہوئے اور تجسس میں تھے کہ آخر اصل معاملہ کیا ہے۔''ہاں چوہدری صاحب میں ہی ہوں......میں نے سوچا آپ کو بہت دفعہ کہہ کر دیکھ لیا شاید آپ کے پاس واقعی ٹائم نہیں تھا کہ ہمیں لینے آتے اور یہاں آکر مجھے یقین آگیا کہ آپ واقعی میں مصروف تھے'' اس لیے ہم خود ہی چلے آتے ہیں۔ مجھے امید ہے کے آپ کو بالکل برا نہیں لگا ہوگا۔ ناصرہ بیگم بے باکانہ انداز میں محو گفتگو تھی۔

چوہدری حاکم نے اس کو ٹوکا اور آہستہ آواز میں اور اکیلے میں بات کرنے کے لیے کہا مگر یقیناً ناصرہ بیگم واپس پلٹ کر جانے کے لیے تو آئی ہی نہیں تھیں۔اس لیے انھوں نے کہا فی الحال ہم تو اندر آرام کرنے جارہے ہیں باقی باتیں کھانے کے بعد ہوں گی آپ ذرا ملازم کو کھانے کا کہہ دیں پلیز۔

چوہدری صاحب کے تو جیسے اوسان خطا ہو چکے تھے وہ اس اچانک حملے کے لیے ذرا بھی تیار نہ تھے۔ ناصرہ بیگم اپنے بیٹوں کے ہمراہ مکمل تیاری کے ساتھ رہنے کے لیے آئی تھی۔ چوہدری کے پاس انکار کی گنجائش نہ بچی تھی اسی اثناء میں شانی بھی گھر میں داخل ہوا اس کے ذہن میں تو یہی تھا کہ بابا کے جاننے والے ہیں اور گاؤں کی سیر کے لیے آئے ہوں گے۔ مگر جب اسکو حقیقت کا علم ہوا تو غصے اور حیرانگی کے ملے جلے تاثرات سے اس کی زبان گنگ رہ گئی کسی نوکرانی سے جب اس تماشے کی خبر مسرت بی بی تک پہنچی تو وہ بھاگتے ہوئے باہر آئی تو ناصرہ بیگم مڈھ بھیڑ ہوگئی۔

اچھا تو یہ ہیں اس حویلی کی بیگم صاحبہ......ناصرہ نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

ہاں میں ہوں......مگر تم کون ہو جو ہمارے گھر میں بلا اجازت گھسی چلی جارہی ہو اگر کوئی حاجت مند ہو تو باہر کھڑی ہو کر سوال کرو......تمہاری التجاء پوری کی جائے گی اور اگر کوئی پریشانی ہے تو بھی باہر بیٹھو......اندر آنے کی جرات کیسے کی تم نے ......مسرت بولی۔

زیادہ چلانے کی ضرورت نہیں ......میں اس گھر کی مالکن چوہدری حاکم کی بیوی ہوں اور یہ تینوں چوہدری حاکم کے بیٹے ہیں ہم قانونی اور شرعی طور پر اس وراثت کے حقدار ہیں کسی میں ہمیں روکنے یا ٹوکنے کی جرات یا ہمت ہے تو سامنے آئے۔

اتنی بڑی بات سننے کے بعد تمام نوکر نوکرانیاں حیران اور شانی غصے کے عالم میں پاگل ہوا جارہا تھا۔ جبکہ مسرت بی بی جو تھوڑی دیر پہلے غصے سے گرج رہی تھیں اس کو اچانک اٹیک ہو گیا اور وہ بے ہوش ہو کر پڑیں۔

شانی نے فوراً ماں کو اٹھایا اور ہسپتال لے جانے لگا چوہدری حاکم اب تک بت بنا کھڑا ہوا تھا وہ اس مرحلے پر کیا کرے۔

☆......☆......☆

شانی ڈرائیور کے ہمراہ ماں کو لے کر تیزی سے شہر کی جانب جارہا تھا۔مگر شاید قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا راستے میں ہی مسرت بی بی نے دم توڑ دیا۔

چوہدری حاکم کے ہوش ٹھکانے آئے تو ناصرہ بیگم کے پاس ان کے کمرے میں آیا اور برس پڑا ''تمھیں کس چیز کی کمی تھی شہر میں اور آخر جلدی ہی کیا تھی جو تم یہاں بھاگ آئی جب تمھیں شہر میں ہر طرح کی سہولت تھی اور ہفتے میں دو دفعہ چکر بھی لگا تا تھا تو تم کیوں آئی ہو یہاں۔ کیوں تماشہ بنایا مجھے پورے گاؤں کے سامنے اب کیا عزت رہ گئی میری یہاں وہ لوگ جو میرے تلوے چاٹا کرتے تھے اب وہی باتیں کریں گے۔''

ابھی باتیں جاری تھیں کے شانی کی گاڑی حویلی میں داخل ہوئی چوہدری باہر نکلا کہ دیکھا جائے کہ کیا صورت حال ہے مگر آگے سے شانی کی چیخیں اس کے کانوں میں پڑیں چوہدری حاکم کے وہم وگمان

ہیں بھی نہیں تھا کہ اتنی جلدی اس کا گھر اجڑ جائے گا۔
مسرت بی بی اس دنیا میں اُڑن رہی تھی۔ شانی کی دنیا اندھیر ہوگئی تھی اس کوٹھی کے دور سے پڑ رہے۔ تھے غریب مزار ہے گاؤں کے کے دوسرے لوگ نوکر چاکر نوکرانیاں سب ہی اس ناگہانی موت سے ٹوٹ کر رہ گئے سب کا خیال رکھنے والی مسرت بی بی ان کو چھوڑ کر ہمیشہ کے لیے چلی گئی تھی ہر کوئی شانی کو سنبھال رہا تھا مگر وہ اپنی ماں سے لپٹا ہوا تھا۔
ناصرہ بیگم بڑی چالاک عورت تھی اس نے اپنے بچوں کو سمجھایا کہ یہی وقت ہے ہمدردی حاصل کرنے کا اور ان کے رستے سے ایک بڑی رکاوٹ خود بخود ختم ہوگئی ہے اور دوسری رکاوٹ شانی کو قابو کرنا اتنا مشکل نہ ہوگا۔ اس لیے سب باہر نکلو اور اس نازک موقع پر لوگوں اور چوہدری کی ہمدردیاں سمیٹو۔
تینوں بچے ناصرہ خود فوراً باہر نکلے اور زور زور سے رونے کا ناٹک کرنے لگے۔ راشد، ناصر اور امجد تینوں نے شانی کو سنبھالنا چاہا مگر شانی نے تینوں کو جھٹک دیا اور اپنی ماں کا قاتل کہہ کے پیچھے ہٹنے کا حکم دیا جبکہ ناصرہ بیگم رو رو کر گاؤں کی عورتوں کو اکھٹا دیکھ کر مزید ناٹک میں انجوائے کر رہی تھی اس کی نگاہیں آنے والے وقت پہ تھیں جس میں وہ خود چوہدرانی کے روپ میں دیکھ رہی تھی۔

☆☆......☆☆......☆☆

آج مسرت کو گزرے ساتواں دن تھا شانی ان چاروں کو دیکھ کر ان کے چہروں پہ اپنی ماں کا خون دکھائی دیتا۔ ناصرہ بیگم نے اپنی چالاکیوں کی بدولت بہت سی عورتوں کو اپنا گرویدہ کر لیا تھا ویسے بھی ہمارے معاشرے میں صرف چمکتے سورج کی پوجا کی جاتی ہے جو لو مسرت کے قدموں میں بیٹھا کرتے تھے آج وہی ناصرہ کے تلوے چاٹ رہے تھے چوہدری حاکم نے بھی حقیقت کو تسلیم کر لیا تھا۔
ناصرہ بیگم کو بھی اس سے محبت نہ تھی۔ وہ تو ایک گیسٹ ہاؤس کے Reception پہ کام کرتی تھی اور چوہدری حاکم وہاں اکثر راتیں گزارنے جایا کرتا تھا اور پھر واپسی پر کمرے کے مطلوبہ کرائے سے زائد ادا کر دیا کرتا تھا۔ تو ناصرہ نے بیان لیا کہ یہ کافی موٹی اسامی ہے۔ پھر ایک رات وہ خود چوہدری کے کمرے میں پہنچ گئی اور چوہدری کو سہانے سپنے دکھا کر ایک جھلک دکھا کر واپس پلٹ آئی اور پھر جب چوہدری تڑپتا ہوا اس کی جانب لپکا تو اس نے نکاح سے پہلے اپنے مرمریں بدن کو چھونے کی ہرگز اجازت نہ دی۔
اور پھر چوہدری نے اسے ایک الگ کوارٹر لے کر دیا ناصرہ کے گھر میں صرف اس کے بوڑھے ماں باپ تھے بہن کی وجہ سے اُسے نوکری کرنا پڑتی تھی عالم کو بھانسنے اور نکاح کے بعد اس کی ساری پریشانیاں ختم ہوگئیں۔ پھر جب ناصرہ کے ہاں پہلا بیٹا راشد پیدا ہوا تو اس نے چوہدری کو بولا کہ اس کو گاؤں لے چلے کیوں کہ اپنے بچے کی پرورش یہاں چھپ کر نہیں بلکہ شہزادوں کی طرح کرنا چاہتی ہے۔ مگر چوہدری نے اسے سمجھایا کہ وہ ابھی اسے ساتھ نہیں لے جا سکتا اسے کچھ انتظار کرنا ہوگا۔ پھر دوسرا اور تیسرا بچہ ہونے پر بھی ناصرہ بیگم کو یہی جواب ملا تو اس نے بہت ضد کی مگر چوہدری ٹال مٹول سے کام لیتا رہا۔

☆☆......☆☆......☆☆

اب بچے جوان ہو چکے تھے تو ناصرہ بیگم نے ایک روز بنا بتائے گاؤں چلی آئی اور اس کے آتے ہی مسرت اس دنیا سے رخصت ہوگئی اور اس کا رستہ کافی حد تک صاف ہو چکا تھا۔ اور اسے وہ جگہ مل گئی تھی جس میں اس کا کوئی بھی حصے دار نہ تھا۔ کافی زیادہ عورتیں تو اس کے قدموں میں بیٹھی رہتیں مگر بہت سے نوکر چاکر اور گاؤں کے مرد تو اس کی جھلک دیکھنے کے خواہش مند رہتے۔ کیوں کہ وہ تین جوان بچوں کی ماں ہونے کے باوجود ایک کنواری دوشیزہ لگتی تھی اور ہمہ وقت تیز میک اپ اور نت نئے ڈیزائن اور اسٹائل کے کپڑے زیب تن کیے تھے۔
شانی کو وہ زہر لگتی تھی۔ ناصرہ بیگم اکثر و بیشتر کوشش کرتی تھی کہ شانی کو اپنے ہاتھ میں کر سکے وہ اکثر اس کے کمرے میں آ جاتی اور اس سے پوچھتی بیٹا کیا تم نے کھانا کھا لیا بیٹا تم ٹھیک تو ہونا...... مگر شانی بہت سمجھدار تھا اسے ایسے چونچلوں سے شدید نفرت

تھی۔ راشد اور چھوٹا امجد بھی اکثر شانی سے بات کرنے کی کوشش کرتے مگر ناصر کچھ زیادہ ہی اکڑ میں رہتا اور شانی ان دونوں کو بھی بات کرنے کا موقع نہ دیتا۔

ناصرہ بیگم نے منشی عزیز کو بھی مٹھی میں کر لیا تھا اور اسے یہ لالچ دے رکھا تھا وہ ایک بڑی رقم اسے دے گی۔ ابھی بھی اس نے کچھ روپے دے دیے کہ وہ دل کھول کر خرچ کرے اور آئندہ چوہدری حاکم کی زمین کا حساب کتاب اسے بتایا کرے کہ رقم کہاں کہاں سے اور کتنی آتی ہے سب اس نے چند دنوں میں حساب لکھ لیا تھا۔

☆......☆......☆

سورج غروب ہونے کو تھا دور افق پر مدھم سی روشنی نظر آ رہی تھی اپنی زمینوں پر آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ارسلان کسی گہری سوچ میں تھا۔ اور انگلیوں میں کچھ حساب لگانے میں مصروف تھا اس کے دل اور دماغ میں بہت سے خیالات تھے مگر آج دو ماہ ہو گئے تھے اس کی ماں کو گزرے ہوئے وہ سوچ رہا تھا کہ اسکول کا کام بھی شروع کروایا جائے اور ہسپتال کا سنگ بنیاد بھی رکھ دینا چاہیے۔

منشی عزیز کی بیٹی زرینہ کافی دیر سے چھت پہ کھڑی کھیتوں کی طرف دیکھ رہی تھی وہ شانی سے بہت عرصے سے محبت کرتی تھی۔ غریب ہونے کے ناطے کبھی اظہار کرنے کی جرات نہ کر سکی مگر وہ آج شانی سے کسی اور مسئلے پہ گفتگو کرنے کے لیے ملنا چاہتی تھی مگر شانی اتنی آہستہ آ رہا تھا کہ شاید اس طرح تو اس کو ایک گھنٹہ لگ جاتا وہاں تک پہنچنے میں اور زرینہ کو ڈر تھا اندھیرا ہونے کو ہے کہیں اب اہی نا آ جائیں زرینہ چھت سے نیچے آ گئی اور دروازے کی اوٹ میں کھڑی ہو کر راہ تکنے لگی کہ شانی ادھر سے ہی گزرے اور ساتھ ساتھ یہ بھی سوچ رہی تھی کہ ابا اور اماں ہی نہ گھر آ جائیں کیوں کہ وہ دونوں حویلی گئے ہوئے تھے اور دونوں اس وقت ناصرہ بیگم کے خاص کارندے کے طور پر کام کر رہے تھے۔

☆......☆......☆

شام کا دھندلکے ظاہر ہوا تو چوہدری ارسلان خاموشی سے راہ گیر کی طرح گلی سے گزرے تو زرینہ نے ہلکی سی آواز لگائی......

چھوٹے چوہدری صاحب......!

شانی نے قدم روک لیے اور بولا جی......

''چھوٹے چوہدری جی میں منشی عزیز کی بیٹی زرینہ ہوں مجھے آپ سے بہت ضروری بات کرنی ہے۔

جی کہیے...... کیا کہنا ہے آپ کو......؟

جی وہ...... چوہدری صاحب...... وہ میں یہ کہنا چاہتی تھی کہ ابا اور اماں آج کل نئی چوہدرانی صاحبہ کے پاس کچھ زیادہ ہی بیٹھنے لگ گئے ہیں۔ اور آج کل گھر میں پیسہ بھی کچھ زیادہ ہی آ رہا ہے اور چھوٹا منہ بڑی بات ...... میرے منہ میں خاک...... مجھے ایسا محسوس ہوا کہ جیسے چوہدرانی صاحبہ کچھ غلط کرنا چاہ رہی ہیں تو میں آپ سے کہنا چاہتی تھی کہ آپ ذرا سب پر نظر رکھیں۔ کہیں آپ کو یا حویلی کو کوئی نقصان نہ پہنچ جائے۔ یہ کہہ کر زرینہ اندر کی طرف چلی گئی۔ اور چوہدری ارسلان کے چہرے پہ ہوائیاں اڑنے لگی اور بہت سے سوال آنکھوں میں لیے اپنی حویلی کی طرف چل دیا۔ جب وہ حویلی میں داخل ہوا تو رات کا اندھیرا پھیل چکا تھا جبکہ چوہدری حاکم دو دن سے شہر گیا ہوا تھا۔

☆......☆......☆

جب شانی حویلی میں داخل ہوا تب منشی عزیز اور اس کی بیوی حویلی سے باہر نکل رہے تھے۔ اسے زرینہ کی کہی باتیں کسی حد تک سچ معلوم ہونے کو آئیں۔ باہر جاتے وقت منشی نے نظر جھکا کر چھوٹے چوہدری کو سلام کیا تو شانی تحکمیہ لہجے میں کہا کہ ''صبح مجھے پچھلے تین ماہ کا مکمل حساب چاہیے ٹھیک 8 بجے حویلی آ جانا'' اور منشی عزیز کے پاؤں تلے جیسے زمین نکل گئی اور اس نے جی سرکار کہہ کر باہر نکل جانے میں ہی عافیت جانی۔

ارسلان اپنے کمرے میں جا کر کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا حسب عادت ناصرہ بیگم نے آ کر اس سے دریافت کیا کہ بیٹا کھانا لگوا دوں ہم سب تو کھا چکے ہیں...... بس تمہارا کھانا ہی باقی ہے اور تمہارے ابا

تو نہ جانے کیوں آج بھی نہیں آ ئے۔ مگر شانی نے ہمیشہ کی طرح آج بھی اسے مایوس کن لہجے میں واپس بھجوا دیا ۔ناصرہ بیگم کا انداز تو بظاہر ٹھیک تھا مگر اندر ہی وہ پیچ کھا رہی تھی۔ اُس کے ارادے کچھ ٹھیک نہیں لگ رہے تھے۔

☆......☆......☆

پیسے کی لالچ میں انسان کیا کچھ کر جاتا ہے منشی سے لے کر گیٹ کے چوکیدار تک اور کھانا پکانے والی ماسی سے لے کر ڈرائیور تک سب ناصرہ نے مٹھی میں کر رکھے تھے۔ اور یہ سب پیسے کی چمک تھی کہ جب منشی کو چوہدری ارسلان کی طرف سے حکم ملا کہ صبح حساب دینا مجھے آ کر تو وہ اپنے گھر واپس جانے کے بجائے پہلے ناصرہ بیگم سے ملا اور اسے یہ بات بتائی ناصرہ کو اپنا کھیل خراب ہوتا نظر آیا...... تو اس نے اب اپنے پلان کو تیز کر دیا۔ اس نے اپنے آدمی راستے میں چھوڑ رکھے تھے۔ جو پیسے کی لالچ میں ہر کام کرنے کو رضا مند تھے تین دن اور تین راتوں سے چوہدری حاکم شہر کی رنگینیوں میں نہ جانے کہاں کہاں گم تھا وہ اپنی عادت سے مجبور آج بھی شہر میں ضرور ہفتہ دس دن میں چکر لگا تا تھا۔

☆......☆......☆

گاؤں کی ایک خوش گوار صبح تھی۔ لوگ اپنے ڈیروں پہ اپنے مویشیوں کا دودھ دھو رہے تھے۔ کوئی مویشیوں کو چارہ ڈال رہا تھا۔ کوئی کھیتوں میں پانی لگا رہا تھا چوہدری حاکم اپنی جیپ میں صبح صبح شہر سے واپس آ رہا تھا۔ رستے مین شاید رفع حاجت یا پھر کسی اور کام کے لیے رکا ہوگا تو ناصرہ بیگم کے کارندوں نے اپنا کام دکھلایا۔

تھوڑی دیر بعد گاؤں میں شور مچ گیا کہ چوہدری حاکم کی جیپ الٹ گئی ہے وہ موقع پر ہی دم توڑ گئے ہیں۔ شانی جو صبح کی سیر کے لیے نکلا تھا فوراً جائے حادثہ پر پہنچا اور اپنا سب کچھ لٹ جانے پر بے ہوش ہو گیا گاؤں کے سب لوگ جو مخلص تھے ان کو چوہدری کے مرنے کا بے حد غم و افسوس تھا۔ لوگوں کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ یہ سب اتنی جلدی ہو جائے گا ۔لوگوں کو جو امیدیں تھی وہ ختم ہوتی نظر آنے لگی۔

حویلی میں میں کہرام مچ گیا ہر طرف چیخ و پکار شروع ہو گئی ناصرہ بیگم بین کرنے میں لگی ہوئی تھی جبکہ ارسلان کو گاؤں کا ایک معمولی سا ڈاکٹر صدمے سے نکالنے کی کوششوں میں لگا ہوا تھا۔ ایسے میں ناصر تیزی سے شہر کی جانب جانے کی تیاری میں تھا اور جب تقریباً دو گھنٹے بعد وہ واپس آیا تو اس کے ساتھ ایک ڈاکٹر نما آدمی تھا سب لوگ متاثر ہوئے کہ ناصر چوہدری...... چھوٹے چوہدری کی خاطر شہر سے بڑے ڈاکٹر کو لے کر آیا ہے...... مگر یہ بھی ناصرہ بیگم کی ایک چال تھی۔ اور یہ اس کی کامیابی کا بہترین طریقہ تھا۔ شہر سے آنے والا آدمی بالکل ڈاکٹر نہیں تھا بلکہ وہ ناصرہ بیگم کا ایک جاننے والا تھا۔ جو ایک میڈیکل اسٹور پہ کام کرتا تھا اور جس سے وہ اکثر و بیشتر اپنی ضروریات کی دوائیاں وغیرہ لیا کرتی تھی۔ ناصرہ بیگم کے حکم پہ شانی کو راشد اور ناصر کی مدد سے اندر لے جایا گیا اور اس کا علاج شروع کر دیا گیا۔ عصر تک چوہدری صاحب کو آہوں اور سسکیوں کے ساتھ دفن کر دیا گیا مگر افسوس کے چوہدری ارسلان اپنے باپ کی میت کو کاندھا نہ دے سکا۔ بلکہ اس کو کوئی ہوش نہ تھا اور ہوش آنا بھی کہاں تھا اسے مسلسل نیند کے انجیکشن دیے جا رہے تھے۔ اور لوگوں کو بتلایا جا رہا تھا کہ ڈاکٹر صاحب کہہ رہے ہیں کہ وہ گہرے صدمے میں ہے دو دن تک ہوش میں آئے گا۔

☆......☆......☆

راشد اور ناصر لوگوں کی ہمدردیاں سمیٹنے میں لگے ہوئے تھے اور ناصرہ بیگم لوگوں کو تسلی دے رہی تھی آپ لوگوں کو کسی بھی قسم کی تکلیف ہو اور ضرورت ہو آپ بلا جھجک آ سکتے ہیں یہاں تک کہ 24 گھنٹے جب بھی کوئی کام ہو آپ منشی صاحب سے رابطہ کر سکتے ہیں۔ کچھ لوگ تو جو چڑھتے سورج کے پجاری تھے وہ اس کا دم بھر رہے تھے۔ مگر کچھ سمجھدار لوگ جیسے کے ماسٹر صاحب تھے ان کی نگاہ آنے والے وقت پر پڑ چکی تھی اور انہیں آنے والا وقت کچھ اچھا نظر نہیں آ رہا تھا۔ انہیں اپنے گاؤں کی ترقی والی بات چواب نظر آ رہی تھی کیوں کہ چھوٹا چوہدری ٹھیک نہیں تھا۔ لوگ

اس کی خیریت دریافت کرنے آتے تو راشد اور ناصر لوگوں کو یہ کہہ کر ٹال دیتے کہ وہ بالکل ٹھیک ہے اور آرام کر رہے ہیں گہرے صدمے کی وجہ سے ڈاکٹر نے نیند کا انجیکشن دے رکھا ہے اس لیے آپ لوگ تسلی رکھیں وہ بہت جلد اپنے باپ کی گدی سنبھال لے گا۔

زرینہ چوہدری ارسلان کو دیکھنے آئی تو بضد ہوگئی کہ وہ چوہدری صاحب کے کمرے میں جا کر دیکھے گی۔ مگر راشد اور ناصر اس کے رستے کی رکاوٹ بن گئے جب میں نے زبردستی اندر جانے کی کوشش کی تو ناصر نے اس کے ساتھ دست درازی کی کوشش کی تو زرینہ واپس اپنے گھر لوٹ آئی۔

☆......☆......☆

چوہدری ارسلان کو کمرے میں بند ایک ماہ سے اوپر ہوگیا ہے ناصرہ بیگم منگوائے ہوئے ڈاکٹر سے اسے نشہ آور انجیکشن لگا کر نیم پاگل کر دیا تھا وہ جب بھی ہوش میں آتا اٹھنے کی کوشش کرتا مگر اسے دوبارہ بے ہوش کر دیا جاتا۔ لوگ اپنے کاموں میں مشغول ہو چکے تھے اب تو کبھی کبھار ہی کوئی پوچھتا تھا ورنہ سب ہی چوہدری حاکم اور ارسلان کو بھولنے لگ گئے تھے۔ راشد اور ناصر کو جب بے شمار اور بے انتہا زمینوں جائیداد کا علم ہوا تو ان کے ہوش ہی غائب ہوگئے اُن کی نظر میں تمام گاؤں اور گاؤں کے مکین اب ان کی ملکیت تھے اس لیے ان کی نظر زیادہ تر گاؤں کی لڑکیوں پر تھی۔

ماسٹر اللہ بخش حسب معمول بچوں کو تعلیم دینے میں مصروف تھے مگر اب وہ اپنے دل سے اسکول اور کالج کا خیال دل سے نکال چکے تھے۔ ہم ہر وقت دعا کرتے ہیں کہ کاش لوگ جاگ جائیں اور اپنے گاؤں کی بدلتی تقدیر کو سیدھے رستے پر ڈال سکیں اور ان ظالموں سے چھٹکارا مل جائے۔ موسم بدلے، رنگ بدلے، سردی کی آمد آمد تھی بجلی کی شدید گرج چمک تھی لوگ اپنے اپنے گھروں میں سمٹے بیٹھے ہوئے تھے۔ جبکہ منشی عزیز چوہدری ارسلان کے کمرے سے شور شرابے کی آوازیں بلند ہوئیں اور برتن گرنے کی آواز آئی ساتھ میں قہقہے لگاتا ہوا شانی بلند آواز میں بول رہا تھا۔ سب لوگوں نے اس کے کمرے کی جانب دوڑ لگائی تو شانی کو ایسا پایا کہ جیسے ایک پاگل آدمی ہو......

ناصر اور راشد نے اسے قابو کرنے کی کوشش کی مگر وہ قابو نہیں آیا ناصر نے فوراً سے نشے کا انجیکشن تیار کیا اور لگا دیا اب وہ اکثر خود ہی انجیکشن لگایا کرتے ہیں۔ ڈاکٹر کو انہوں نے واپس بھجوا دیا انجیکشن لگتے ہی شانی بیڈ پر ڈھیر ہوگیا منشی عزیز نے مشورہ دیا کہ ”چوہدری صاحب اگر میری مانیں تو اسے پاگل خانے میں داخل کروا دیں۔“ ناصر کو یہ تجویز پسند آئی مگر ناصرہ بیگم نے اس کو بالکل پسند نہیں کیا اور منشی کو باہر بھیج کر اپنے بچوں کو سمجھایا کہ اس طرح لوگوں کی ہمدردیاں سمیٹ لی جائیں۔ ہم لوگوں کی نظر میں آجائیں گے پاگل تو یہ ہو چکا ہے اسے اسی طرح اذیت دے دے کر اتنا پاگل کر دو کے یہ ساری زندگی کے لیے پاگل ہی رہے۔

☆......☆......☆

اور پھر ایسا ہوا تین سال کی مسلسل اذیت کے بعد چوہدری ارسلان مکمل طور پر پاگل ہوگیا۔ حواس کھو بیٹھا اور گلیوں میں مارا مارا پھرتا رہتا۔ اور انگلیوں میں نہ جانے کیا گنتا رہتا زرینہ جو اسے پاگل پن میں بھی والہانہ چاہتی تھی اس نے ایک دو دفعہ پکڑ کر اسے بٹھانے کی کوشش کی مگر بے سود آخر ایک دن اس نے جب منشی اور ماں کو اس کی شادی کی بات کرتے سنا تو وہ یہ کہہ رہے تھے کہ اگر ہماری بیٹی چوہدریوں کی گھر کی بہو بن جائے تو ہم آدھے حصے دار بن سکتے ہیں تو زرینہ کے سامنے ناصر اور راشد کے وحشیانہ چہرے گھوم گئے تو اس نے خودکشی کر لی۔

آج اس واقعے کو 5 سال بیت گئے ہیں گاؤں میں مکمل طور پر ناصرہ بیگم کا سکہ چل رہا ہے۔ اس کے بیٹے عیاشیوں میں مشغول جبکہ چوہدری ارسلان بے چارہ تمہارے سامنے ہے جب ماسٹر اللہ بخش نے اپنی کہانی مکمل کی تو میں نے دیکھا کہ شانی ایک چائے کے کپ سے لطف اندوز ہو رہا ہے۔ خدا نہ کرے کسی دشمن کے ساتھ بھی ایسا ہو۔

☆☆......☆☆

فیس بک

شائستہ جمال

فیس بک سے نقصان اٹھاتی ایک سچ بیانی / کراچی سے




"فیس بک" دورِ جدید کی ایک بیماری فیس بک جو وائرل انفیکشن کی طرح ہر گھر میں پھیلتی جا رہی ہے موڈرن دوستی کا ایک نیا انداز جس میں بچے تو بچے بڑے بھی بخوبی اپنا کردار نبھا رہے ہیں۔

یہ کہانی میری ایک جاننے والی کے بیٹے کی ہے یا شاید یہ کہانی ہر دوسرے گھر کی ہو جب وہ نوجوان اپنی ماں کے ساتھ میرے پاس آیا تو وہ اپنی زندگی سے بیزار تھا حالانکہ بظاہر اسے کوئی بیماری نہیں تھی اس کی رپورٹس صحیح تھیں مگر وہ برسوں کا بیمار لگ رہا تھا اس کی ماں نے جو باتیں بتائیں وہ حیران کن تھیں۔

☆......☆......☆

علی بہت سمجھدار اور ذہین لڑکا تھا کلاس میں ہمیشہ اول آتا اپنے ماں باپ کا فرمانبردار اور اپنے بہن بھائیوں اور دوستوں کے ساتھ اس کا رویہ بہت مخلصانہ ہوتا تھا وہ بہت ہنس مکھ اور باتونی تھا اس کے اساتذہ بھی اس سے بہت خوش تھے علی صاحب نے جب میٹرک A-one گریڈ سے پاس کیا تو اس کے ماں باپ نے اس کو کمپیوٹر دلایا اور ساتھ ہی نیٹ بھی لگوایا کیوں کہ سب نے یہی کہا آئندہ پڑھائی کے لیے یہ بہت ضروری ہے بس یہیں سے Face book کے وائرس نے اپنا کام شروع کر دیا۔

☆......☆......☆

علی کا زیادہ تر وقت "فیس بک" پر ہی گزرنے لگا آہستہ آہستہ وہ صرف کمپیوٹر کا ہی ہو گیا اور سب سے دور ہوتا چلا گیا اپنے کمرے میں وہ سارا سارا دن پڑھائی کے بہانے فیس بک پر Chat کرتا۔ علی کی دوستی فیس بک پر ایک لڑکی سے ہو گئی سارا سارا دن علی اس لڑکی سے باتیں کرتا رہتا اس دوران اگر اس کی امی کھانے کے لیے آواز دیتی تو وہ پڑھائی کا بہانہ بنا دیتا مجبوراً ماں اس کے کمرے میں کھانا دے دیتی۔

☆......☆......☆

سب یہی سوچتے کہ پڑھائی مشکل ہو گئی اس لیے وہ اپنا ٹائم پڑھائی پر دے رہا ہے Hello Hi سے دوستی آگے بڑھی علی کو اس لڑکی نے اپنی تصویریں بھیجیں علی کو وہ بہت اچھی لگنے لگی آہستہ آہستہ علی کو محسوس ہونے لگا وہ اس کے بغیر نہیں رہ پائے گا علی نے اس سے اس کا نمبر مانگا جو اس نے دے دیا پھر تو کبھی کمپیوٹر تو کبھی فون پر باتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

اس سال علی کا رزلٹ بھی بس So So رہا لیکن علی کو ان باتوں میں کوئی دلچسپی نہیں تھی اسے تو صرف ایک ہی چیز میں دلچسپی تھی وہ تھی فیس بک والی "زویہ" زویہ بھی علی کو اپنی محبت کا یقین دلاتی رہتی کہ وہ صرف اسی سے محبت کرتی ہے اور اسی سے شادی کرے گی علی بھی اس کی

محبت میں گرفتار تھا جب اس کا FSc کا رزلٹ آیا تو وہ بری طرح فیل تھا جس پر اس کے والدین نے اس پر سختی کر دی اس کا کمپیوٹر بند کروا دیا۔

☆......☆......☆

علی نے سب سے بات چیت بند کر دی چھوٹی چھوٹی باتوں پر علی بھڑک اٹھتا اس کی ماں نے ایک دن پیار سے اس سے ان سب باتوں کا پوچھا تو علی نے کہا امی! میں زدیہ کو بہت پسند کرتا ہوں وہ بھی مجھے بہت پسند کرتی ہے۔"

"پر بیٹا ابھی تو آپ کی عمر چھوٹی ہے ابھی آپ اپنی پڑھائی پر توجہ دو کچھ پڑھ لکھ لو گے تو ہم اس لڑکی کو بھی دیکھ لیں گے۔"

"نہیں امی زدیہ کے گھر والے اس کی شادی کہیں اور طے کر دیں گے آپ کم از کم بات تو کریں۔"

اچھا بیٹا آپ اس کا ایڈریس ہمیں دو ہم اس کے والدین سے بات کرتے ہیں۔

☆......☆......☆

علی بہت ہی خوش تھا وہ دن اسے بہت ہی خوشگوار لگا اس نے فوراً کمپیوٹر آن کیا زدیہ آن لائن تھی Hello علی نے لکھا جواب آیا Hi۔

تمہیں پتا ہے زدیہ امی کو میں نے سب کچھ تمہارے بارے میں بتا دیا وہ تمہارے گھر آنا چاہتے ہیں۔

"تھوڑی دیر تک کوئی جواب نہیں آیا پھر کافی دیر کے بعد جو Reply آیا اس نے علی کو پاگل کر دیا۔

"علی! میں تم سے شادی نہیں کر سکتی تم انٹر میں فیل ہو چکے ہو تمہارا کوئی مستقبل نہیں ہے ویسے بھی میرا کزن دبئی سے آ رہا ہے میری منگنی دو سال پہلے اس سے ہوئی تھی آج سے میں Face book بند کر رہی ہوں T.c

☆......☆......☆

علی کی حالت تو پاگلوں جیسی ہو گئی تھی وہ اس کے Messages پڑھتا اور روتا رہتا جب اس کی امی کھانا لے کر آئیں تو وہ بے ہوش تھا ڈاکٹر نے کہا کسی صدمے کا اثر ہے۔ وہ دن اور آج کا دن ہے علی کو ایسی چپ لگ گئی کہ وہ نہ سکون سے سو پاتا اور نہ ہی بات کر پاتا صرف یہی بڑبڑاتا ہے تم تو صرف مجھ سے محبت کرتی تھیں تم میرے ساتھ ایسا کیسے کر سکتی ہو۔

علی کو کوئی بیماری نہیں مگر یہ دکھ اسے گھن کی طرح کھائے جا رہا ہے۔

"خدارا میری ان تمام لڑکے اور لڑکیوں سے گزارش ہے کہ وہ ایسی دوستی سے باز رہیں اور ماں باپ کو یہی کہوں گی کہ اپنے بچوں کی نقل و حرکت پر نظر رکھیں بہترین پڑھائی کے ساتھ بہترین تربیت بھی ضروری ہے۔

☆☆......☆☆



کنوارا دل

عثمان غنی

ایک فیشن زدہ نوجوان کا قصہ/ پشاور سے تحفہ خاص




خالد کی پیدائش 24 اپریل 1990ء کو ہوئی تھی، اس طرح اس نے 24 اپریل 2014ء کو چوبیس سال کا ہوجانا تھا۔ اپنے قد کے لحاظ سے اونچا لمبا خالد، اپنے آپ کو خوب بنا سنوار کر رکھتا تھا، لیکن پھر بھی اہل محلہ کا التفات حاصل نہ کرپاتا تھا۔ یہ پورے محلے میں لوفر کے نام سے مشہور تھا، کیوں کہ اسے اپنے آپ کو سنوارنے، بنانے کے علاوہ کسی دوسرے کام میں زیادہ دلچسپی نہ تھی۔ چوں کہ آج کل تنگ پائنچوں والی جینز کا رواج عام تھا، اس لیے خالد نے بھی اپنے لیے تین چار تنگ پائنچوں والی جینز لے رکھی تھیں اور زیادہ تر اس کے زیر استعمال یہی جینز رہتی تھیں۔ یوں تو آج کل سرخ، نارنجی، بنفشی اور قرمزی جیسے خالصتاً زنانہ رنگوں میں بھی جینز بازار میں دستیاب تھیں، لیکن سلجھے ہوئے لڑکے ایسے شوخ رنگوں والی جینز لینے سے اجتناب برتتے تھے اور چوں کہ خالد بنے سنورے رہنے کی حد تک سلجھا ہوا تھا، اسی لیے اس کی جینز سرخ، نارنجی اور اس جیسے رنگوں کی ہی تھیں۔

کوئی پندرہ منٹ پیدل کی مسافت پر ایک حجام کی دکان تھی۔ یہ حجام فرنچ کٹ کا ماہر تھا۔ خالد اسی سے فرنچ کٹ بنواتا اور اپنے دوستوں سے خوب داد پاتا تھا۔ گرمیوں کی لمبی دوپہریں اور سردیوں کی لمبی راتوں کا ابتدائی حصہ وہ اور اس کے دوست محلے کے تھڑے پر ہی فضول گفتگو کرتے گزارتے تھے۔

موبائل فون کو بھی خالد کی زندگی میں خوب اہمیت حاصل تھی۔ یوں تو اس کی کئی لڑکیوں سے ٹیلی فونک گپ شپ ہوتی تھی، لیکن صابرہ سے وہ کافی عرصے سے ٹیلی فونک رابطے میں تھا۔ فون پر وہ لڑکیوں سے ہر قسم کی گفتگو کرلیتا تھا اور اس سے خوب لطف اٹھاتا تھا۔ صابرہ تو خالد سے محبت کر بیٹھی تھی اور وہ خالد سے شادی کرنے کی شدت سے خواہش مند تھی۔ وہ رو رو کر، منتیں کر کر کے، خودکشی کی دھمکیاں دے دے کر خالد کو اپنے گھر رشتہ بھیجنے کے لیے آمادہ کرتی رہتی تھی اور خالد اسے بس بہلاتا اور ٹالتا رہتا تھا۔

یہ فلموں کا بھی بہت شوقین تھا اور ہر نئی فلم خاص اہتمام سے دیکھتا تھا۔ ویسے بھی پچھلے کچھ سالوں سے انڈین فلمیں فیملی موویز نہ رہی تھیں۔ آج کل تو قمیص کے بغیر ہیرو کو دکھانے کا رواج تھا۔ فلم میں بغیر قمیص کے ہیرو کے آٹھ دس مناظر نہ ہوں تو سمجھو جیسے فلم ہی ادھوری ہے۔ انہی شرٹ لیس ہیروز کے بغیر بالوں والے مسلز دیکھ کر خالد کو بھی شوق چرایا اور اس نے صبح شام ڈنٹر پیل

کر بائی سپ ،ٹرائی سپ کو خوب صورتی بخشی اور دو تین بار محلے کے چوراہے پر دوستوں کے ساتھ ہنسی مذاق کرتے کرتے چڑھے دن میں شرٹ اتار دی۔ دوست یاروں نے تو اس کی باڈی کو خوب سراہا، لیکن محلے کے معمر حضرات جی بھر کر خفا ہوئے اور دو صاحبان تو خالد کے والد کو شکایت لگا آئے کہ بیٹے کو تھوڑی تہذیب ہی سکھا دو۔

خالد کے والد دین محمد صوم صلوٰۃ کے پابند تھے اور وہ اپنے بیٹے کی غیر اخلاقی حرکتوں سے سخت نالاں تھے۔ خود تو ان کی چلتی ہوئی کریانے کی دکان تھی اور کتنی ہی بار انہوں نے خالد کو کہا تھا کہ وہ دکان میں ان کا ہاتھ بٹائے، لیکن اس نے ان کی بات پر دھیان ہی نہ دیا تھا۔ بیٹے کے بدمعاش لوفروں جیسے چھن انہیں سخت ناگوار تھے، سمجھا سمجھا کر تھک گئے تھے۔ مار پیٹ کر بھی دیکھ لیا تھا، لیکن دھاک کے وہی تین پات، خالد ویسا کا ویسا رہا۔

دن چڑھے تک سوتا رہتا۔ اذانوں کے وقت بھی گانے سنتا، آخری بار مسجد پچھلے سال رمضان کے آخری جمعہ گیا تھا اور امام صاحب کے سلام پھیرتے ہی گھر آ گیا تھا۔ اس سال کے رمضان میں ڈائٹنگ کی نیت سے تین چار روزے رکھ لیے تھے، لیکن گرمیوں کے روزے میں اس قدر پیاس لگتی ہے کہ الامان، اس لیے مزید روزے رکھنے کی سکت نہ ہوئی تھی اسے۔

اس دن خالد تھڑے پر اکیلا ہی بیٹھا کسی فلمی گانے کی دھن گا رہا تھا۔ تازہ بنائی گئی فرنچ کٹ، شرٹ کا کھلا گریبان اور نارنجی جینز اس نے پہنی ہوئی تھی۔ ''خالد'' کسی نے اسے نام لے کر پکارا تھا۔ خالد نے مڑ کر دیکھا تو صابرہ تھی۔ شومئی قسمت گلی میں اس وقت ان دونوں ل کے سوا کوئی نہ تھا۔ گھبرائی ہوئی صابری تیزی سے خالد کے پاس آئی تی۔

''صابرہ تو کیوں ادھر رکی ہے، جاؤ کسی نے دیکھ لیا



تو میری خیر ہے، لیکن تیری تو شامت ہی آ جائے گی۔"
"تم نے میرا فون اٹھانا جو بند کر دیا ہے، تو اس طرح بھرے چوراہے پر بات کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ دیکھ خالد میں بس یہی کہنے آئی ہوں کہ اگر تو نے پندرہ دنوں کے اندر میرے لیے رشتہ نہ بھیجا تو میں خودکشی کرلوں گی۔ بازار سے بلیڈ فقط دو روپے میں ملتی ہے۔"

یہ کہہ کر صابرہ تو چلی گئی اور خالد دوبارہ سے گانے کی دھن گانے لگا۔ صابرہ خودکشی کرتی ہے تو کرے، اسے کیا پروا، لیکن پندرہ دن تو کیا مہینے گزر گئے، صابرہ نے خودکشی نہ کی۔

دن رات ایسے ہی خوش کن گزر رہے تھے۔ خالد جی بھر کر سوتا تھا۔ اگر کوئی ناراض ہوتا ہے تو ہوتا رہے، لیکن پھر زندگی میں ایک ایسا حادثہ رونما ہوا کہ کنوارہ دل رکھنے والا بدمست خالد ویسا نہ رہا۔

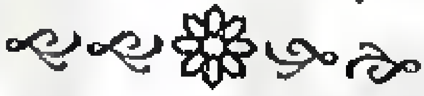
عام سا دن عام سی شام لے کر آیا تھا اور پھر عام سی شام، عام سی رات میں بدل گئی تھی اور پھر اسی رات کے دوسرے پہر میں گھبرائی ہوئی حسنہ نے بیٹے کو بدحواسی سے جگایا تھا۔ دین محمد کے سینے میں دل والی جگہ رپ رات کے اس پہر اچانک ناقابلِ برداشت درد شروع ہوا تھا۔ خالد جلدی سے باپ کو اسپتال لے جانے کا بندوبست کرنے لگا، لیکن ایمبولینس آنے سے پہلے دین محمد اپنے رب سے جا ملا۔ دین محمد کو منوں مٹی تلے دفن کر دیا گیا اور تین دن سوگ منانے کے بعد تمام لوگ اپنے اپنے کاموں کو لوٹ گئے۔ حسنہ بھی عدت کے دن گزارنے لگی اور خالد!!

خالد نے اب دن چڑھے تک سونا ترک کر دیا تھا اور اس نے آوارہ تھڑے پر بیٹھنا بھی چھوڑ دیا تھا اور اس نے اپنی سم بھی بدل لی تھی اور دل میں خوب مسلز بنا کر بغیر بالوں والے سینے کی نمائش کی خواہش بھی دبالی تھی اور اب وہ باپ کی جگہ کریانے کی دکان سنبھالنے لگا تھا، کیوں کہ اب وہ اس گھر کا بڑا مرد تھا، جسے سربراہ کے فرائض سرانجام دینے تھے۔ بہن کو رخصت کرنا تھا، بیوہ ماں کا سہارا بننا تھا اور گھر کو حفاظت دینا تھی۔ ان سب کے لیے بُری عادتوں، باتوں اور تمام بُری خواہشوں کو چھوڑنا ضروری تھا۔

☆☆......☆☆

نیا پکاسو

کل شب اک سنسان سڑک کے ساتھ
اسکول کے گیٹ کے پاس
میں نے اک لڑکے کو دیکھا
اس کے ننھے ہاتھوں میں
بُرش اور رنگ کا ڈبہ تھا



مجھ کو دیکھ کر چپکے سے وہ چلا گیا
لیکن اس کی کچی سوچ
الفاظ میں ڈھل کر چیخ رہی تھی
ٹیڑھے میڑھے بھدے خط میں
گیٹ پہ اس نے لکھا تھا
"نوراحمد کو رہا کرو"

معیار

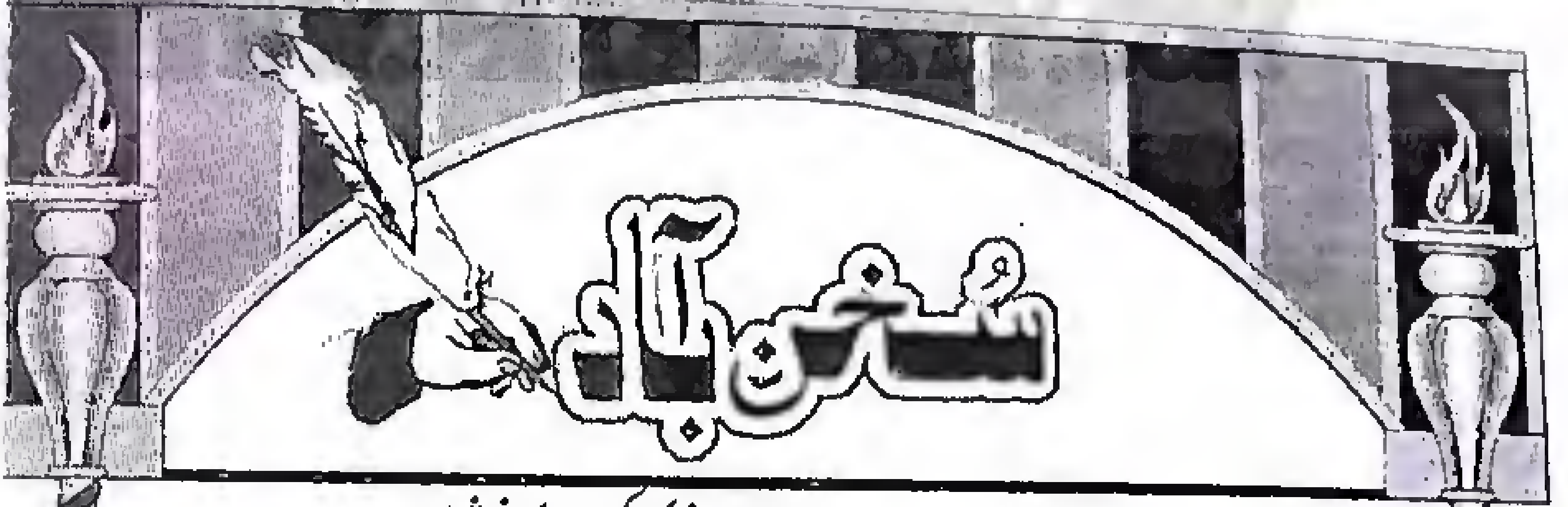
انجم آپا!
ٹھیک تھا آپ کا اندازہ
"دولی کریپ" اور اتنا سستا
......کل ہی واپس کر آؤں گی

تم کہتے تھے "فارن" کا ہے
دیکھو! اس پر کیا لکھا ہے
"میڈ ان پاکستان"

حفظ ماتقدم

چور تھا اُس کے دل میں
جبھی تو
نقی بھائی کہہ کر بہت مطمئن ہے
اُسے کیا خبر!
میری بیوی بھی میری
چچیری بہن ہے!

محسن بھوپالی



نعت

بس اپنے دل میں مدینے کی آرزو رکھنا
پھر ان کا کام ہے جذبے کی آبرو رکھنا
بہت ضروری ہے دیدار مصطفیٰ کے لیے
جگر کے خون سے آنکھوں کو باوضو رکھنا
وہیں پہ جانا جہاں سے جہاں کو ملتا ہے
تم اپنے دل کے تقاضوں کو روبرو رکھنا
نقوش پائے محمدؐ کی جستجو میں رہوں
میرے خدا مری چاہت کی آبرو رکھنا
اجالے دین محمدؐ کے ساتھ لے لینا
خدا کی راہ میں جو پائے جستجو رکھنا
شاعر: معاویہ عنبر وٹو۔ ہڑپہ سٹی

"تم"

تمہاری یاد میں
میں اکثر کھو جاتا ہوں
اکثر تجھ کو سوچتے سوچتے
میری جاناں!
میں تو میں نہیں رہا ہوں
بس تم ہو جاتا ہوں
شاعر: محمد علی۔ ہانگ کانگ

نئے سال کی پہلی دعا
نئے سال کی پہلی صبح
رب کی بارگاہ میں
دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے تو
لب پہ میرے آئی ہے دعا
نئے سال میں میرے ہمدم
زمانے بھر کی ساری خوشیاں
تیری جھولی میں آن گریں
اور تیرے حصے کے سبھی دکھ
سب ہی رنج و غم
میری جھولی میں سما جائیں!
شاعرہ یاسمین اقبال۔ سنگھ پورہ لاہور

"مہک"

ابر باراں کے ارادے بھی پراسرار سے ہیں
آج برسے گی گھٹا کھل کے یہ آثار سے ہیں
لوگ آتے ہیں، ٹھہرتے ہیں، چلے جاتے ہیں
اپنے حالات بھی اجڑے ہوئے بازار سے ہیں
تو اگر چاہے تو دے شرف ملاقات مجھے
سب امیدیں مری وابستہ تری ذات سے ہیں
یہ ضروری تو نہیں جیت مسرت بخشے
ایسی خوشیاں بھی ہیں ملتی جو صرف ہار سے ہیں
شاعرہ: مہوش۔ گلستان جوہر کراچی

نقش

دسمبر کی اداس راتوں میں
دھند سے بننے والا
ہر نقش
تمہارا ہی
کیوں ہوتا ہے؟
شاعرہ: عائشہ نور عاشا۔ شادیوال۔ گجرات

"آس"

ان کی آنکھوں میں دیکھ کر نفرت



ہم نے ان سے محبت کی قسم کھائی ہے
ہمارے بنا نہ جی سکیں گے وہ شاہ
دل میں یہ خوش فہمی در آئی ہے
کیا پتا کب وہ لوٹ آئیں
اس کی شمع ہم نے جلائی ہے
شاعرہ شمائلہ شہزاد۔ کوئٹہ

یادیں!!

بھلانے سے جو بھولے نہ وہ کہانی چھوڑ جاؤں گا
زمانے میں تری آنکھوں میں پانی چھوڑ جاؤں گا
لپٹ کر دیر تک در و دیوار سے لوگ روئیں گے
میں ایسے سوگ میں لپٹی جوانی چھوڑ جاؤں گا
مٹاؤ گے کہاں تک تم مری یادیں، مری باتیں
میں ہر موڑ پر اپنی نشانی چھوڑ جاؤں گا
مرے یہ لفظ مر کر بھی مجھے مرنے نہیں دیں گے
میں چپ ہو کے بھی لہجے کی روانی چھوڑ جاؤں
شاعر: شہزاد علی۔ گلستان جوہر کراچی

دوست میرے!
وہ مجھ کو احباب میں رسوا کریں گے
وہ چاہیں گے مجھے اور شہر میں چرچا کریں گے
یہ منصوبہ بنایا ہے میرے یاروں نے مل کر
بنا کر دوست میری ذات پر حملہ کریں گے
ان کو ڈر لگتا زمانے سے بہت
وہ میرے خواب میں آیا کریں گے
وہ سب سامنے کہہ دیں گے مجھے بے صبر
خدا کے سامنے اس گناہ کی توبہ کریں گے
شاعرہ: ارم ناز۔ کراچی

''قرار''

اس سوچ میں ہوں کہ تم کیا ہو؟
اک آوارہ بادل یا
ہوا کا نرم جھونکا
درد کا مسیحا
یا آخر شب کا ہم سفر
بس اتنا یقین ہے مجھ کو
تم درد ہی ہو
تم ہی اضطراب ہو
تم ہی قرار ہو!
شاعرہ: کیتھرین۔ کراچی

انتظار

وہ کہہ کر گیا مجھے
کہ میری جان
اب کی بار جدائی کی
تلخیاں طویل نہ ہوں گی
تنہائی کی یہ زنجیریں
آخر کٹ ہی جائیں گی
اندھیری رات کی سیاہی
چھٹ ہی جائے گی آخر
بس! تم میری وفا کا دیا جلائے رکھنا
اور میرا، انتظار کرنا
شاعرہ: سدرہ انور علی۔ جھنگ

غزل

اب جانا کیوں فاصلے بڑھے ہمارے درمیاں
کوئی تو آیا ہے تمہارے اور میرے درمیاں
یہ اکھڑا لہجہ یہ روکھا مزاج بے سبب نہیں
کوئی تو وجہ بنے ترک تعلقات کی ہمارے درمیاں
میری سرد مہری کو غنیمت جانو ورنہ
کئی شکوے ہیں خاموش اور لفظوں کے درمیاں
کوئی تو بات ہے دل کے تہہ خانے میں
بتا رہی ہے نمی آنکھ اور آنسو کے درمیاں
شاعرہ: عنبرین نعیم۔ کراچی

''مری زندگی ہو تم''

جب سے تم کو دیکھا ہے
تب سے تم کو چاہا ہے

مجھ کو یہ احساس ہوا
اتنا میں نے جان لیا
تم بن جینا مشکل ہے
کہ سانسیں چل نہیں سکتیں
کہ دھڑکن تھم ہی جائے گی
تم تو مجھ میں شامل ہو
رگوں میں خون بن کر دوڑنے لگے ہو تم
تم سے اگر بچھڑ جاؤں تو جدائی کے درد سے
رگیں ٹوٹ جائیں گی
کیوں کہ اب تو
میری زندگی ہو تم
شاعرہ: سیّدہ نورالعین زہرہ۔ لاہور

غزل

کیوں دیا پیار مجھے، اس کی ضرورت کیا تھی؟
میری بربادی میں شامل تیری حکمت کیا تھی؟
میری راہوں میں تو خوشبو کا سفر رہتا تھا
دل میں آباد گلابوں کا نگر رہتا تھا
زندگی خار بھری راہ میں لائی کیوں ہے؟
اے خدا تو نے محبت یہ بنائی کیوں ہے؟
شاعر: پیرنوید ہاشمی۔ ٹنڈو جام، سندھ

غزل

کس طرح مجھ کو آزمایا گیا
کبھی ہنسایا گیا تو کبھی رلایا گیا
جب سنبھلے تو ایک چوٹ لگی
جب گرے تو ہمیں پھر اٹھایا گیا
دل ٹوٹا تو یوں آواز آئی
جیسے شیشے کو پتھر سے ٹکرایا گیا
سن لیتے فریاد تو کوئی بات بھی تھی
مجھے تو بس یونہی ٹھکرایا گیا
یوں بھی ہوا تمسخر آوارگی اپنا
رکے تو بلایا گیا، چلے تو ستایا گیا

شاعر: محمد امجد حسین۔ لڈن وہاڑی
اک اور سنہرا سال گیا
منظر بدل گئے پس منظر بدل گئے
حالات اپنے شہر کے یکسر بدل گئے
پہلے سا خیال نہ، پہلے سے ہیں خیال
ہم کتنا ایک سال کے اندر بدل گئے
شاعر: کاشف عبید۔ بٹہ موری، بٹگرام

آزاد نظم

آخری بار جب اُس کو دیکھا تھا
کہ اب تک وہی منتظر ہے
مری آنکھوں کے دریچے میں
ترا مڑ کر چلے جانا
ترا بندھن کو توڑ دینا
اور مجھے تنہا چھوڑ دینا
کہاں تم کھو گئی ہو
ہاں
میں اکثر کھویا رہتا ہوں
ترے ہی خیالوں میں
اب تنہا جی نہیں سکتا
اب تو آ جاؤ
کہ اک سال جو پورا ہو گیا
شاعر: فیصل ندیم بھٹی، فیصل آباد

غزل

تمہیں بخشی ہے دل کی حکمرانی اور کیا دیتے
یہی تھی بس ہماری محبت کی نشانی اور کیا دیتے
ستاروں سے کسی کی مانگ بھرنا اک فسانہ ہے
تمہارے نام لکھ دی زندگانی اور کیا دیتے
وہ ہم سے مانگتے تھے اک دلنشیں حصہ نہ دیتے
اس کو ہم اپنی جوانی اور کیا دیتے
بچھڑتے وقت اک نا اک تحفہ تو دینا تھا
ہمارے پاس تھا آنکھوں میں پانی اور کیا دیتے
شاعر: شاہد رفیق سہو۔ کبیر والا

رزق

رزق کی اور بھی توشکلیں ہیں
رزق بس پیٹ ہی نہیں بھرتا
کان کا رزق تحسن داددی
آنکھ کا رزق ہے حسیں منظر
عقل کا رزق، بات حکمت کی
سارے مرزوق،ایک رازق ہے
اپنے رازق کو آؤ پہچانیں
اس کے محبوب کا کہا مانیں
ہے سبب رزق، وہ مسبب ہے
اپنا رازق ہی اس لیے رب ہے
چوہدری قمر جہاں علی پوری۔ملتان

ایک قطعہ

کڑی دھوپ میں کوئی بادل نام چیز نا تھی
دعامانگتا ہوں کیوں مری چھو عزیز نا تھی
وہ طوطا چشم اور بیچاری ہوس کا بھی تھا
اسے پیار، عشق اور چاہ میں تمیز نا تھی
شاعر: طالب خاکستری۔سیالکوٹ

نیا سال

میں آج نیا سال
تمہارے بغیر
کس طرح مناؤں!!
تم نے ہی تو کہا تھا کہ
نیا سال آتے ہی
تم لوٹ آؤ گی
دیکھو جاناں! نیا سال تو آ گیا
مگر تم نہ آئیں!
پھر بھی دیکھو
میں اب بھی
تمہارے لوٹ آنے کا
منتظر ہوں......!!
شاعر: زیب ملک۔گھوٹکی

غزل

حقیر جو تھے کھلے، آسمان تلے جھول گئے
رہا ہوئے تو پرندے اڑان بھول گئے
ہوا نے ایسی توڑی ہیں درختوں کی ٹہنیاں
پرندے اپنے گھونسلوں کے نشان بھول گئے
عمر بھر نفرتوں سے ہی واسطہ رہا
آج اک خوشی کے لیے جہان بھول گئے
شاعر: ایم حسن نظامی قبولہ شریف (ضلع پاک پتن)

آہ

کرنی تھی تم سے باتیں کہی ان کہی
کتابوں سے ہٹ کہ زمانے سے چھپ کر
پر کیا کروں میرا ملک جل رہا ہے
یہ زار زار روتی زمیں
اپنی چاہتوں کا محل بناؤں کیسے
میرا ملک جل رہا ہے
ٹوٹے ہیں کئی سپنے آنکھوں کے
میں اک نیا سپنا بناؤں کیسے
میرا ملک جل رہا ہے
شاعر: محمد کاشف۔کراچی

اس جہاں میں

محبتیں تو وہم ہیں یہ چاہتیں سراب ہیں
نہ کسی کو مل سکیں کبھی نہ آرزو نہ خواب ہیں
یہ زندگی کے راستے عجیب رونما ہوئے
نہ قہقہوں کا شمار ہے نہ آنسوؤں کا حساب ہیں
میں کس سے کہوں یہاں منصفی، یہاں ہر قدم دھوکہ دہی
یہاں ہر طرف ہے دشمنی یہاں ہر طرف عذاب ہیں
یہاں سچ کو ڈھونڈنا محال یہاں جھوٹ کا غبار ہے
بڑی مشکلوں میں جان ہے ہر چہرے پہ نقاب ہے
وہ گئی صدی کی بات ہے جہاں پائیدار تھا پیار بھی
اب عہد و پیماں بھی جھوٹ ہیں اور آخرت بھی خراب ہے
شاعرہ: شازیہ گل۔مانسہرہ گاؤں بھیر کنڈ

مسئلہ یہ ہے

خلقِ خُدا کی بھلائی کے لیے مفید و معلوماتی سلسلہ

محترم قارئین! ''مسئلہ یہ ہے'' کا سلسلہ خلقِ خُدا کی بھلائی اور رُوحانی معاملات میں اُن کی رہنمائی کے جذبے کے تحت ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' کے اوّلین شمارے سے شاملِ اشاعت ہے۔ گزشتہ برسوں میں ان صفحات پر تحریر و تجویز کردہ وظائف اور دُعاؤں سے بلاشبہ لاکھوں افراد نے نہ صرف استفادہ کیا بلکہ اس مادّی دنیا میں آیاتِ قرآنی اور ان کی رُوحانی طاقت کے حیران کر دینے والے معجزے دیکھے۔ جیسے جیسے لوگوں کو اِن وظائف سے فائدہ ہوتا رہا، اُسی تناسب سے ہر ماہ موصول ہونے والے خطوط کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا، پھر صورتِ حال یہ ہوگئی کہ اگر ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' میں خطوط کے جوابات دینے پر اکتفا کیا جاتا تو قارئین کو اپنے جوابات کے لیے کئی کئی ماہ انتظار کرنا پڑتا، کیوں کہ پرچے میں صفحات کی تعداد بہرحال محدود ہے۔ اِن ہی حقائق کو دیکھتے ہوئے فوری نوعیت کے مسائل کے جوابات براہِ راست ارسال کرنے کا سلسلہ شروع کیا گیا، لیکن اتنے زیادہ خطوط کو سنبھالنا، اُن کا ریکارڈ مرتب کرنا اور انہیں سپردِ ڈاک کرنا خاصا وقت طلب کام ہے جو مجھ ایسے آدمی کے لیے کسی طور ممکن نہیں۔ اِن صفحات کی ترتیب و تدوین اور براہِ راست جوابات کے لیے میرا معاوضہ پاکستان کی سلامتی، قومی یکجہتی کی دُعا اور مسلمین و مسلمات (خواہ وہ زندہ ہوں یا مُردہ) کے لیے دُعائے خیر ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ دُعائے خیر سے بڑا معاوضہ اور قیمتی تحفہ کوئی کسی کو کیا دے سکتا ہے؟ قارئین کے خطوط کی بڑھتی ہوئی تعداد کے پیشِ نظر ادارے کو باقاعدہ اسٹاف رکھنا پڑا ہے جو خطوط کا ریکارڈ مرتب کرنے اور انہیں سپردِ ڈاک کرنے کا ذمے دار ہے۔ اگر آپ اپنے مسئلے کا فوری جواب چاہتے ہیں تو ازراہِ کرم جوابی لفافے کے ساتھ =/300 روپے کا منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' کے نام ارسال کردیں۔ یہ رقم اُن افراد کی تنخواہ کی مد میں آپ کی امداد ہوگی جو اِس شعبے سے متعلق ہیں۔ منی آرڈر کی رسید اور ڈرافٹ بھیجنے کے علاوہ خط میں منی آرڈر کی رسید اور بینک ڈرافٹ نمبر ضرور تحریر کریں۔ صاحبِ استطاعت حضرات تو کُن منی =/300 روپے کو آخری حد نہ سمجھیں، وہ حسبِ استطاعت اِس رقم میں اضافہ کر سکتے ہیں۔ یہ رقم اُن خواتین کے کام آئے گی جو ملک کے دور دراز علاقوں میں رہتی ہیں اور جن کے لیے منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ بھیجنا ممکن نہیں ہے۔ خطوط بھیجنے سے پہلے درج ذیل باتوں کا خیال رکھیں۔

(1)..... مسئلے کے ساتھ اپنا اور اپنی والدہ کا نام ضرور تحریر کریں۔ اصل نام کی اشاعت مقصود نہ ہو تو خط فرضی نام سے شائع کیا جائے گا۔ فرضی ناموں سے جھوٹے خطوط نہ بھیجیں ورنہ فائدے کے بجائے نقصان کا احتمال ہے۔

(2)..... منی آرڈر، بینک ڈرافٹ ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' کے نام ارسال کریں۔

(3)..... اپنا مسئلہ صاف اور واضح الفاظ میں کاغذ کے ایک طرف تحریر کریں۔

II C-88۔ خیابانِ جامی۔ ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی۔ فیز-7، کراچی

☐ خالدہ۔ کراچی

○ بابا جی السلام وعلیکم! اُمید ہے آپ خیریت سے ہوں گے۔ آپ نے مجھے کہا تھا کہ ایک ماہ بعد حالات سے آگاہ کرنا۔ مدثر چھوٹا والا کافی بہتر ہے۔ اسکول بھی جاتا ہے اور ٹیوشن بھی۔ اُس کے بعد میڈیکل اسٹور میں بھی کام کرتا ہے۔ رویہ بھی اُس کا بہتر ہے۔ بابا جی شانزہ فاطمہ کا رشتہ آیا ہے۔ دو سال پہلے بھی اُن لوگوں نے کہا تھا مگر میں نے منع کر دیا تھا۔ اب دوبارہ کہہ رہے ہیں۔ لڑکے کا نام لکھ دیا ہے۔ بابا جی اُن لوگوں کا تعلق پنجاب سے ہے اور سرائیکی ہیں اور سب لوگ فوج اور پولیس میں کام کرتے ہیں۔ بڑے بیٹے مزمل کا دوست ہے۔ وہ رشتے کے لیے بہت اصرار کر رہے ہیں۔ اب جو آپ کہیں۔ میں نے استخارہ کیا ہے جواب تو کوئی نہیں آیا مگر دل ٹھک رہا ہے۔ آپ استخارہ کریں تو بہتر ہے۔ مزمل بہت بے سکون اور پریشان رہتا ہے۔ اللہ اس کو سکون دے۔ اللہ آپ کو صحت دے۔ جنوری کے رسالے میں جواب دے دیں۔ مہربانی ہوگی۔

☆ بیٹی خالدہ! استخارہ حق میں نہیں ہے۔ جو پڑھ رہی ہو جاری رکھو۔ حسب استطاعت صدقہ خیرات ضرور نکالا کرو۔ کرم ہوگا۔

☐ شاہین اختر۔ کراچی

☆ بیٹی تمہاری خواہش کے مطابق تمہارا مسئلہ شائع نہیں کیا جا رہا۔ تمہاری کل کائنات تمہاری اولاد ہے۔ صرف اس کے بارے میں سوچو۔ جن کے دلوں اور دماغوں پر قفل پڑے ہیں، ان پر وقت برباد مت کرو۔ اللہ سے مدد کی طلب گار رہو کہ وہ تمہیں کبھی کسی انسان کا محتاج نہ کرے۔ نمازِ فجر کے بعد ایک بار سورۂ رحمٰن ضرور پڑھا کرو۔ روز چڑیوں کو دانہ پانی دو۔ تم اُن کے رزق کا بندوبست کرو۔ اللہ تمہارے رزق کا بندوبست کرے گا۔

☐ نزہت۔ کراچی

○ محترم بزرگ! گزارش ہے کہ تین سال قبل میرا نکاح ہوا تھا۔ میرے شوہر پہلے سے شادی شدہ اور اُن کے دو بچے تھے۔ انہوں نے کہا تھا کہ وہ مجھے اپنے گھر لے جائیں گے۔ لیکن اب وہ میری کوئی ذمہ داری نہیں لیتے اور نہ اپنے گھر لے جا رہے ہیں۔ بابا جی مہربانی فرما کر مجھے کوئی ایسا وظیفہ بتائیں کہ میرے شوہر میری ذمہ داری لے لیں اور اپنے ساتھ اپنے گھر لے جائیں اور گھر والوں سے ملوائیں۔

☆ بیٹی نزہت! مسئلہ غیر معمولی نوعیت کا ہے۔ میں تمہیں نصیحت کروں گا کہ مجھ سے تعویذ منگوالو تا کہ نقصان سے محفوظ رہو۔

☐ ایمان خان۔ D.G.K

☆ بیٹی ایمان! بہن کو عدالت سے خلع لینی ہوگی یا طلاق کا پکا کاغذ، ورنہ وہ شخص انکاری ہو جائے گا اور مسئلہ شدید بن جائے گا۔ میں تمہاری بہن کو اور بھائی کو تعویذ کا مشورہ دوں گا۔ تفصیل سچی کہانیاں کے نئے نمبر پر فون کر کے معلوم کرو۔ نیا پتا اور فون نمبر انہی صفحات پر موجود ہیں۔

☐ حیا شوکت۔ لاہور

○ پیارے بابا جی! السلام علیکم السلام کے بعد عرض یہ ہے کہ اس سے پہلے بھی آپ سے کئی بار رابطہ کیا مگر پتا نہیں، کیوں آپ جواب نہیں دیتے؟ بابا جی! مسئلہ یہ ہے کہ میرے سر میں ایک عجیب سی تکلیف ہے۔ میرا تمام سر کسی عجیب سی قوت میں جکڑا ہوا ہے جس کی وجہ سے نہ صرف میرا دماغ جکڑا ہوا ہے بلکہ سننے اور سمجھنے کی قوت بھی کم ہے۔ اس بیماری کا بہت علاج کروایا مگر کوئی افاقہ

اطلاع عام

قارئین بھائی، بہنوں سے گزارش ہے کہ مسئلہ بھیجنے کے لیے ہمارا نیا پتا نوٹ فرمالیں اور آئندہ اپنا مسئلہ دیے گئے نئے ایڈریس پر روانہ کیجیے۔

مسئلے سے متعلق معلومات کے لیے رابطہ کیجیے 35893122 - 35893121

فوری رابطے کے لیے 0346-2089348

نہیں ہوا تو کسی عالم سے استخارہ کروایا تو اس نے بتایا کہ میں جب بالکل چھوٹی تھی تو ایک دن میرے اوپر سے جن اور پریوں کا گزر ہوا تھا اور اس وقت ایک پری کے پروں کی مٹی ٹائپ کوئی چیز میرے سر پہ آ گری تھی، جس کی وجہ سے یہ تکلیف ہوئی ہے۔ باباجی! بات کچھ بھی ہو پر میرے ساتھ بہت بڑا مسئلہ ہے۔ میں یونیورسٹی میں پڑھتی ہوں' یہاں تک میں کیسے پہنچی' یہ تو مجھے ہی پتا ہے۔ میں بہت پڑھنا چاہتی ہوں لیکن اس تکلیف نے میرا سارا کیریئر ہی تباہ کر دیا ہے۔ میں دو سالوں سے مسلسل دُرود شریف پڑھتی آ رہی ہوں۔ اس سے بس اتنا افاقہ ہوا ہے کہ میری نظر کی کمزوری کچھ دور ہوئی ہے اور کچھ سمجھنے میں بھی افاقہ ہوا ہے لیکن اب تو دن بہ دن پڑھائی بڑھتی جا رہی ہے۔ میں اگر کلاس میں دُرود شریف کی طرف دھیان دیتی ہوں تو لیکچر سمجھ میں نہیں آتا اور اگر دُرود شریف چھوڑ دیتی ہوں تو تکلیف ویسی کی ویسی رہتی ہے۔ کبھی کبھی تو میرا دل کرتا ہے' خودکشی کر لوں لیکن اللہ تعالیٰ پہ یقین کر کے آگے بڑھتی ہوں کہ شاید کسی دن وہ مجھ پہ رحم کرے اور مجھے اس عجیب وغریب بیماری سے چھٹکارا حاصل ہو جائے۔ باباجی! خدا کے لیے مجھے اس تکلیف سے چھٹکارا دلائیں۔ میں دن رات روتی رہتی ہوں۔ میں اپنی تعلیم میں بہت آگے جانا چاہتی ہوں۔ باباجی! اپریل میں میرے امتحان ہیں اور میں سخت پریشان ہوں۔ آپ جو کہیں' میں کرنے کو تیار ہوں۔ میرے لیے اجتماعی دُعا بھی کرائیں۔ میں کسی بھی مشکل وظیفے یا تعویذ تجویز کے لیے تیار ہوں۔ خدا کے لیے میرے لیے کوئی راستہ نکالیں۔

☆ بٹی حیا! تمہیں میں نصیحت کروں گا کہ جلد از جلد مجھ سے تعویذ منگوا لو۔ تعویذ کے لیے مجھے جوابی لفافے کے ہمراہ خط لکھو۔ اللہ حامی و ناصر ہو۔

□ راحیلہ پروین۔ صادق آباد

☆ بٹی راحیلہ! اللہ تمہیں بیٹا مبارک کرے۔ نام بہت اچھا ہے۔ بچے کی تربیت اِسلامی طریقے سے کرنا تاکہ دونوں جہانوں میں والدین کے لیے باعثِ سکون ہو۔ تعویذ پانی میں بہا دو۔ تم دونوں میاں بیوی کا فیصلہ مناسب ہے۔ سفر ہی میں بہتری ہے۔ وظیفہ ابھی نی الحال 3 ماہ کوئی مت کرو۔ 3 ماہ بعد مجھ سے پھر رابطہ کرو۔

□ شہزین۔ میانوالی

o محترم باباجان! السلامُ علیکم! باباجان! میں نے آپ کے دیے ہوئے وِرد کو پڑھنا شروع کر دیا ہے۔ آپ یقین کریں' مجھے کافی سکون ملا ہے۔ باباجان! میں نے کچھ عرصے پہلے آپ سے بچی کے رشتے کے لیے تعویذ اور بال لمبے کرنے کے لیے دوا منگوائی تھی مگر آپ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ پیارے باباجان! برائے کرم بچی کے رشتے کے لیے کوئی تعویذ اِرسال کر دیں اور یہ بھی بتائیں کہ بالوں کے لیے کون سی خاص غذا یا تیل استعمال کریں؟ باباجان! میرے شوہر کی ترقی کے لیے دُعا فرما دیں' اور یہ دُعا بھی فرمائیں کہ وہ نمازی بن جائیں۔ میں نماز کے لیے کافی زور دیتی ہوں' لیکن وہ میری بات سنتے ہی نہیں۔ میرے بچے بھی نماز پڑھتے ہیں مگر اُن پر اَثر نہیں ہوتا' اِس وجہ سے بھی میں کافی پریشان ہوں۔ ایک اور مسئلہ یہ ہے کہ میرے بہن بھائی آپس میں ناراض رہتے ہیں' اِس کے لیے بھی کوئی وِرد بتا دیں۔ باباجی! میری ایک بہن جس سے مجھے بہت محبت ہے' وہ مجھ سے نہیں ملتی۔ میں اُس کے گھر جاتی ہوں تو غصہ کرتی ہے۔ فون کرتی ہوں تو جواب نہیں دیتی۔ پیارے باباجی! دُعا فرمائیے کہ اُس کی رنجشیں دور ہوں اور وہ مجھ سے ملنے لگے۔ (آمین!)

☆ بٹی شہزین! صلۂ رحمی بہت اچھی بات ہے' تم اپنی بہن کو سمجھاؤ کہ قطع رحمی اللہ کو پسند نہیں۔ سر دھونے کے بعد جڑوں میں ناریل کا تیل لگاؤ' فائدہ ہوگا۔ بچوں پر الحمد شریف اور چاروں قل پڑھ کر دَم کرتی رہا کرو۔ ہر نماز کے بعد 3 تسبیح "اَللّٰھُمَّ ھُدیٰ' میری بہن" پڑھو اور دُعا کرو۔ مدت 41 دن ہے۔

□ فرناز۔ کراچی

o قابلِ احترام باباجی! السلامُ علیکم! اُمید کرتی ہوں' آپ خیریت سے ہوں گے۔ باباجی! آج میں دو مسائل لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوئی ہوں۔ اُمید ہے' آپ جواب ضرور دیں گے۔ پہلا مسئلہ تو یہ ہے کہ مجھے ڈپریشن ہے۔ میں سوچتی بہت ہوں' چاہے خوشی ہو یا غم' میری نیند کے ساتھ بہت مسئلہ ہے۔ کئی کئی دن گزر جاتے

ہیں اور نہ دن کو نہ رات کو نیند آتی ہے۔ پہلے مجھے بہت اچھی نیند آتی تھی۔ اَب پتا نہیں' کیا ہوگیا ہے؟ روزمرہ معمولاتِ زندگی میرے بہت متاثر ہو رہے ہیں۔ میرا کوئی بچہ بھی نہیں ہے۔ نیند کی میڈیسن بھی لینی پڑتی ہے جس کی وجہ سے میں پریگنینسی بھی نہیں کر سکتی ہوں۔ آپ ایسا وِرد بتا دیں کہ میں ٹینشن بالکل بھی نہ لوں اور مجھے بغیر میڈیسن کے نیند آنے لگے۔ تعویذ میں نہیں لے سکتی ہوں کہ منی آرڈر کون کرے' بس میں یہ چاہتی ہوں کہ میری نیند بالکل صحیح ہو جائے اور اپنے شوہر کی خدمت اچھے طریقے سے کر سکوں۔ زندگی کے ساتھ مسئلے مسائل تو چلتے رہتے ہیں' لیکن ابھی میں ہر بات کو سر پر سوار کر لیتی ہوں جو ٹھیک نہیں ہے۔ دوسرا مسئلہ میرے شوہر کا ہے جو لڑکیوں سے موبائل پر بات کرتے ہیں۔ آپ کچھ ایسا پڑھنے کے لیے بتا دیں کہ وہ لڑکیوں سے فرینڈ شپ ختم کر دیں۔ وہ میرا خیال بالکل نہیں رکھتے ہیں۔ میرا خیال رکھیں اور میری عزت کریں اور مجھے اہمیت دیں۔ اپنے موبائل کو تو بالکل بھی ہاتھ نہیں لگانے دیتے ہیں۔ جب وہ سو جاتے ہیں تو میں اُن کے SMS پڑھ لیتی ہوں۔ اَب بالکل بھی برداشت نہیں ہوتا ہے۔ جھگڑا تو نہیں کرتی لیکن لگتا ہے' کُڑھ کُڑھ کر میں مر جاؤں گی۔ میری عمر چھبیس سال ہے۔ پلیز' اِن مسائل کا حل بتا دیں' مسائل مختصراً لکھ رہی ہوں۔ جواب ضرور دیں۔

☆ بیٹی فرناز! تمہیں بہت ہمت سے کام لینا ہوگا۔ میں جانتا ہوں' یہ موبائل تو زندگیوں کے لیے عذاب بن گیا ہے۔ کتنے گھر اس کی وجہ سے اجڑ چکے ہیں۔ تمہیں نصیحت کروں گا کہ اپنے ذہن پر بہت بوجھ مت لو۔ صحت مند اور ہنستے ہوئے لوگ سب کو اچھے لگتے ہیں۔ شوہر کے SMS مت پڑھا کرو سوائے دکھ کے' اور کچھ نہیں ملے گا۔ بیٹی! زندگی ایک بار ہی ملی ہے' ہنسی خوشی گزار دو یا روتے ہوئے' یہ تمہارے ہاتھ میں۔ نماز پڑھو' قرآنِ کریم پڑھو اور اپنے آپ پر توجہ دو۔ رات کو ایک گلاس گرم دُودھ ضرور پیا کرو۔ چلتے پھرتے یَا جَامِعُ کا وِرد بہت کرو۔ اللہ سب خیر کرے گا۔ مجھے ایک ماہ بعد حالات سے مطلع کرو۔

☐ بنت عرفان۔ لاہور

○ السلامُ علیکم! بابا جی! میں پہلی دفعہ آپ کو خط لکھ رہی ہوں اور یقین ہے کہ آپ اس کا جواب ضرور دیں گے۔ مسئلہ یہ ہے کہ میری بہن جس کا نام خولہ ہے' وہ کچھ عجیب و غریب حرکتیں کرتی ہے۔ اس کے دونوں علاج کروائے بلکہ ڈاکٹری علاج تو ابھی بھی چل رہا ہے۔ رُوحانی بھی ہوا تھا مگر اس پر کوئی خاص فرق نہیں پڑا۔ وہ اکثر رات کو اٹھ کر بیٹھ جاتی ہے۔ دیوار پر زور زور سے لاتیں اور گھونسے مارتی ہے اور بہت غلیظ قسم کی گالیاں دیتی ہے۔ ہر وقت ہر کسی سے اسے بدبو آتی محسوس ہوتی ہے۔ دن میں بھی یہی صورتِ حال رہتی ہے۔ میری والدہ اس کی وجہ سے بہت ٹینشن میں رہتی ہیں۔ پلیز' آپ کی بڑی مہربانی ہوگی اگر بتا دیں کہ اس کو کیا پرابلم ہے؟ یہ بیماری 5.4 سال سے ہے۔ پلیز' علاج بتا دیں۔

☆ بیٹی! اللہ تمہاری بہن کو مکمل شفاء عطا فرمائے۔ والدہ سے کہو' بعد نمازِ فجر اور عشاء 11-11 بار سورۃ النّاس پڑھیں اور پانی پر دَم کر کے بیٹی کو پلا دیں۔ بہن سے کہو' وہ خود بھی بکثرت سورۃ النّاس پڑھا کرے۔ یہ عمل ایک ماہ کرو پھر مجھے حالات سے آگاہ کرو۔

☐ نمرہ بتول۔ پتوکی

○ بابا جی! اللہ آپ کو اچھا رکھے۔ میں اپنے چھوٹے بیٹے کی طرف سے بہت پریشان ہوں۔ اس کو ضد ہے کہ وہ پاکستان میں کچھ نہیں کرے گا بلکہ باہر جا کر نوکری کرے گا۔ کئی دفعہ لندن اور امریکا کے لیے اپلائی کیا مگر کچھ نہ ہوا۔ بہت پیسے بھی برباد ہوئے۔ اَب منہ لٹکائے بیٹھا ہے کہ سعودی عرب جاؤں گا۔ بابا جی! کہیں بھیجنا کیا آسان ہے؟ پھر سعودی عرب میں تو نوکریاں بھی نہیں ملتیں' وہاں کا تو قانون ہی بہت سخت ہے۔ آپ کوئی ایسا عمل بتائیں جس کی برکت سے اُسے عقل آ جائے اور وہ ہمیں پریشان کرنا چھوڑ دے۔ اُس کے رویے کی وجہ سے گھر کا ماحول بہت خراب رہتا ہے۔ والد تو اُس کی شکل ہی نہیں دیکھنا چاہتے۔ میرے لیے یہ بڑی مشکل صورتِ حال ہے۔ وظیفہ میں کروں گی۔ اگر تعویذ دینا چاہیں تو وہ بھی منگوا لوں گی۔

☆ بیٹی نمرہ! مجھے تمہاری پریشانی کا اندازہ ہے مگر بیٹی! اِس معاملے کو سمجھ داری سے حل کرو۔ بے شک بیٹے کا رویہ غلط ہے مگر ہے تو وہ بچہ ہی' اُس کو محبت اور نرمی سے

سمجھاؤ۔ والد صاحب سے بھی کہو' اس طرح اولاد کو نہیں چھوڑا جاتا۔ بہت بڑی نعمت ہے اللہ کی اور اَمانت بھی ہے۔ پھر ماں باپ کا فرض ہے' ہر لمحے اولاد کی تربیت کرنا۔ اس کا بے جا ضد کرنا ہی ثابت کرتا ہے کہ وہ بے عقل ہے پھر تم لوگوں نے بھی کسی حد تک اس کا ساتھ دیا لہٰذا اب اس کو سمجھنے میں کچھ وقت لگے گا۔ بیٹے کا سب سے اچھا دوست اُس کا باپ ہوتا ہے لہٰذا وہی اُس کو نرمی اور محبت سے سمجھائیں۔ تم حسبِ استطاعت صدقہ خیرات ضرور کیا کرو۔ نماز فجر یا عشاء کے بعد سورۃ المعارج تین بار پابندی سے پڑھو۔ وظیفے کی مدت ایک ماہ دس دن ہے۔

□ زمرد خان۔ لاہور

○ بابا جی! میں ''سچی کہانیاں'' صرف آپ کے کالم کی وجہ سے خریدتی ہوں۔ میرا تعلق بازارِ حسن سے ہے اور میں تائب ہونا چاہتی ہوں۔ میں اپنے والدین کے بارے میں کچھ نہیں جانتی' آنکھ کھولی تو یہ سب کچھ ہی دیکھا۔ جس عورت نے مجھے پالا' اس نے مجھے پڑھایا بھی۔ میں نے انٹر کیا ہے۔ بابا جی! ہم لوگ شرفاء کے بھیس میں اچھے علاقوں میں رہتے ہیں۔ آج کل کے دور میں شریف اور کمین کا فرق کرنا بہت مشکل ہو گیا ہے لہٰذا ہم لوگوں کو بھی لوگ شریف ہی سمجھتے ہیں۔ بابا جی! شاید میں کسی اچھے خاندان سے تعلق رکھتی ہوں اسی لیے مجھے یہ زندگی پسند نہیں حالانکہ اس میں پیسا ہے۔ میں بہت گناہ گار ہوں۔ بس دعا ہے کہ اللہ مجھے معاف کردے اور آئندہ سیدھے سچے راستے پر چلائے۔ (آمین!) آپ میری رہنمائی کیجیے۔

☆ بیٹی زمرد! یقیناً نیکی کا راستہ خوش نصیبوں کو ہی ملتا ہے۔ تم سچے دل سے اپنے گناہوں پر شرمندہ ہو اور عہد کر لو کہ آئندہ صراطِ مستقیم پر ہی چلوگی اور اپنی پچھلی زندگی کو مکمل طور پر بھول کر ایک صاف اور اچھی زندگی گزاروگی۔ نماز کی پابندی رکھنا اور ہر وقت یَاقَھَّارُ کا وِرد اپنی زبان سے جاری رکھنا۔ اللہ تمہیں ثابت قدم رہنے کی توفیق عطا فرمائے۔

□ بادشاہ خان۔ مانسہرہ

○ بابا جی! میری اُردو اچھی نہیں۔ کوشش کروں گا کہ مسئلہ بیان کردوں۔ ہم سات بھائی تھے۔ خاندانی دشمنی کی وجہ سے اب تک ہمارے تین بھائی اور والد قتل ہو چکے ہیں' دوسری طرف کے لوگ بھی مارے گئے۔ یہ سلسلہ بہت عرصے سے چل رہا ہے۔ بابا جی! میں پڑھا لکھا انسان ہوں' ان باتوں کو بہت برا سمجھتا ہوں۔ میری ماں مجھے طعنے دیتی ہیں کہ میں ڈرپوک ہوں۔ میں نوکری کے سلسلے میں بہت عرصے سے اپنے شہر سے دور ہوں۔ شادی بھی غیروں میں کی ہے۔ اب تک اپنی بیوی اور بچے کو گھر لے کر نہیں گیا کہ کہیں وہ دشمنی کا شکار نہ ہو جائیں۔ میں جانتا ہوں' ہمارا مذہب بھی لڑائی جھگڑے سے دور رہنے کا حکم دیتا ہے۔ بابا جی! میری ماں مجھے بددعائیں دیتی ہے۔ میں اکثر بہت پریشان ہو جاتا ہوں۔ ایک دوست نے مشورہ دیا کہ آپ کو سب بتا دوں کیونکہ میرا اپنا تو کوئی بڑا مجھے اچھا نہیں سمجھتا۔ اب بتایئے' میں کیا کروں؟

☆ بیٹے بادشاہ! اللہ تمہیں اپنے بیوی بچوں کے ساتھ خوش رکھے۔ جب تک انسان میں اچھائی اور برائی کا فرق باقی رہتا ہے' تب تک وہ انسان رہتا ہے' اس کے بعد وہ وحشی درندہ ہے۔ والدین کی فرماں برداری اولاد کا فرض ہے لیکن اگر والدین غلط راہ پر چلنے کا کہیں تو وہ غلط ہیں اور اولاد صحیح۔ تم دُعا کیا کرو کہ اللہ تمہاری والدہ کو ہدایت دے۔ ان کا رویہ ہی دراصل اولاد کی موت کا باعث ہے۔ وہ اولاد جو اُن کے پاس اللہ کی امانت تھی' اس کا جواب تو اُن کو روزِ حشر اللہ کو دینا ہی ہوگا۔ بیٹے! تم اللہ کی رسی کو تھامے رہو۔ خون خرابے سے دور رہو۔ جب تک گھر والوں کو اپنی غلط روش کا احساس نہیں ہوتا' تم صرف فون کے ذریعے رابطہ رکھو۔ والدین سے ترکِ تعلق بھی درست نہیں اور احتیاط بھی لازم ہے۔ بیوی سے کہو' بکثرت الحمد شریف پڑھا کرے اور تم بھی دن میں تین بار آیت الکرسی پڑھ کر تصور میں بیوی' بچے اور اپنے اوپر دَم کر دیا کرو۔ مجھے ہر ماہ خط لکھ کر حالات سے آگاہی دو۔ میں تم تینوں کو ہر وقت حصار میں رکھوں گا۔ اللہ حامی و ناصر ہو۔

□ ثریا شفقت۔ سا کرو

○ بابا جی! میں ہمیشہ اپنے ہر مسئلے کا حل آپ سے پوچھتی ہوں اور اللہ کا بڑا احسان ہے' ہمیشہ کامیاب بھی رہی۔ دو سال قبل آپ سے اپنی شادی کے لیے وظیفہ لیا تھا' آج اپنے سُسرال میں بہت خوش ہوں۔ سب لوگ

بہت پیار کرتے ہیں۔ شوہر بھی بہت اچھے ہیں، وہ لندن میں ہوتے ہیں۔ باباجی! کچھ عرصے میں، میں بھی انہی کے پاس چلی جاؤں گی مگر چاہتی ہوں، جانے سے قبل آپ سے اولاد اور خوشگوار، کامیاب زندگی کے تعویذ لیتی جاؤں۔ بابا! میں یہ بھی چاہتی ہوں کہ وہاں جاکر بھی آپ سے رابطے میں رہوں۔ جوابی لفافہ ساتھ ہے، وہاں سے رابطے کا طریقۂ کار و دیگر تفصیلات لکھ دیں گے۔ مجھے ہمیشہ اپنی دُعاؤں میں یاد رکھیے گا۔

☆ بیٹی ثریا! اللہ تمہیں خوش اور آباد رکھے۔ تم مجھ سے رابطہ رکھ سکتی ہو۔ تعویذ میں تیار کر دوں گا مگر کچھ تفصیل درکار ہے لہٰذا براہِ راست خط لکھ دیا ہے۔ اللہ حامی وناصر ہو۔

□ رخسار۔ منڈی بہاؤالدین

o باباجی! اللہ آپ کو ہمیشہ ہمارے سروں پر قائم رکھے۔ اس کو میری مجبوری سمجھیں کہ میں اپنا اصل نام اور شہر ظاہر نہیں کرسکتی۔ باباجی! میں بہت بدقسمت عورت ہوں، زندگی بھر الٹے سیدھے فیصلے کرتی رہی جن کا خمیازہ آج بھگت رہی ہوں۔ باباجی! میں پیدا پاکستان میں ہوئی مگر پرورش لندن میں ہوئی۔ والدین کی نافرمان اولاد تھی لہٰذا انہوں نے کہنا سننا چھوڑ دیا۔ اپنی مرضی سے زندگی گزارتی رہی۔ تین شادیاں کیں، پہلی سے تین بچے ہیں۔ اپنی تعلیم اور پیسے پر بہت غرور رہا لہٰذا کسی شوہر کے ساتھ بھی بس نہ سکی۔ مجھے کسی لمحے پشیمانی کا احساس نہیں ہوا۔ پہلے بڑا بیٹا چھوڑ گیا پھر دوسرا بیٹا بھی۔ وہ دونوں انگریز عورتوں کے ساتھ رہتے ہیں۔ باباجی! میں نے یہ صدمہ بھی برداشت کرلیا مگر اب میری 16 سال کی بیٹی بھی گھر چھوڑ کر چلی گئی ہے۔ وہ مجھے بہت برا کہتی ہے مگر بالکل میرے نقشِ قدم پر ہے۔ باباجی! آپ کے بارے میں بہت سنا، صرف یہ چاہتی ہوں کہ اللہ مجھے معاف کردے۔ جانتی ہوں، جب اللہ مجھے معاف کردے گا، تب مجھے اولاد سے سکھ ملے گا۔ باباجی! پلیز، میں اپنی غلطیوں پر بہت شرمندہ ہوں۔ اب تو میں نے حجاب بھی لینا شروع کردیا ہے۔ بس چاہتی ہوں کہ اچھی ماں کی طرح اپنے تینوں بچوں کے درمیان رہوں۔ میری مدد کریں۔

☆ بیٹی رخسار! انسان جو بوتا ہے، وہی کاٹتا ہے۔ کیا تم نے اپنے والدین کو سکھ دیا جو تمہیں تمہاری اولاد سکھ دے گی؟ اسی لیے کہتے ہیں کہ برائی سے بچو، زیادتی اور ظلم سے گریز کرو۔ ہمیں لگتا ہے کہ زندگی کا راستہ بہت طویل ہے مگر بیٹی! یاد رکھو، تھوڑا سا چلنے کے بعد ہی وہ موڑ آجاتا ہے جہاں زندگی آپ سے اپنا حساب مانگ لیتی ہے۔ ہر غلطی اور ہر زیادتی کا جواب یہیں دینا پڑتا ہے۔ بیٹی! زندگی بہت طویل بھی ہے اور بہت مختصر بھی۔ تم بہت خوش قسمت ہو کہ تمہیں احساس ہوگیا لہٰذا اب سارا وقت توبہ استغفار میں گزار دو اور دُعا کرو، تم اس تکلیف سے نہ گزرو جس سے تمہارے والدین گزر رہے تھے۔

□ حسنین۔ ٹنڈو جام

o محترم باباجان! السلامُ علیکم! امید ہے، آپ خیریت سے ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو لمبی عمر عطا فرمائے۔ (آمین!) باباجی! میں اپنا ایک مسئلہ لے کر حاضر ہوا ہوں، وہ یہ کہ میرے گھر والوں نے میری منگنی زبردستی کہیں کردی ہے جبکہ میں کہیں اور شادی کرنا چاہتا ہوں۔ باباجی! مجھے کوئی ایسا عمل بتائیں کہ یہ منگنی ختم ہوجائے اور میں اپنی مرضی سے کہیں اور شادی کرسکوں۔ آپ کا یہ مجھ پر بہت بڑا احسان ہوگا۔ باباجی! میرے اس سوال کا جواب جنوری کے شمارے میں ضرور دیجیے گا۔ باباجی! پلیز، میرا یہ کام ضرور کرنا۔ میں ساری زندگی آپ کو دُعائیں دوں گا۔ باباجی! جنوری کے شمارے میں جواب ضرور دینا، شکریہ۔

☆ بیٹے حسنین! اللہ تمہیں مطمئن زندگی عطا فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور دُرود شریف بہت پڑھو۔ بیٹے! یہ مسئلہ ایسا ہے کہ اس میں تمہیں اپنے بڑوں کو صاف اور واضح الفاظ میں اپنی پسند اور ناپسند کے بارے میں بتا دینا چاہیے۔ اگر تم ابھی اپنی زندگی کا فیصلہ نہیں کرو گے تو آئندہ بھی کوئی فیصلہ نہیں کر پاؤ گے اور یہ نہایت ہیبت ناک صورتِ حال ہوگی۔ تم کوئی غلط بات نہیں کررہے ہو لہٰذا والدین کا ادب ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے بات کرو۔ بکثرت بار بار ارحم الراحمین کا وِرد ضرور کرو۔ مدت 21 روز ہے۔

□ فوزیہ۔ ملیر، کراچی

☆ بیٹی فوزیہ! اللہ پر بھروسہ رکھو۔ میں جانتا ہوں، لوگوں کی باتیں بہت دکھ دیتی ہیں مگر بیٹی! صبر اور ہمت!

اللہ تمہیں بہت نوازے گا' بس ہمت رکھو اور دُعا کرتی رہو۔ مجھے حالات سے آگاہ رکھو۔

□ صبیحہ۔ کورنگی، کراچی

☆ بیٹی صبیحہ! اللہ پر بھروسہ رکھو۔ انسان بہت جلد باز واقع ہوا ہے۔ خدا کی راہ میں جو کچھ دیتا ہے' اس کا بہت حساب کتاب رکھتا ہے اسی لیے ناپا تلا ہی پاتا ہے۔ میں تمہیں بھی نصیحت کروں گا' مستقل مزاجی اور صبر سے وِرد جاری رکھو۔ اللہ ضرور اپنا کرم فرمائے گا۔

□ عبداللہ۔ کراچی

o بابا جی! میں آپ کا کالم ایک عرصے سے پڑھ رہا ہوں مگر خط پہلی دفعہ لکھا ہے۔ امید ہے کہ ضرور جواب دیں گے۔ بابا جی! میں ایک پڑھا لکھا انسان ہوں۔ شریف گھرانے سے تعلق ہے۔ والد نے ساری عمر محنت سے کمائی کی۔ اَب وہ اِس دنیا میں نہیں۔ والدہ' دو بہنیں اور ایک چھوٹا معذور بھائی میری ذمے داری ہیں۔ میں بہت محنت کے باوجود اِس حد تک نہیں کما پاتا، جس کی مجھے اور میرے گھر والوں کو ضرورت ہے۔ والدہ اور بہنیں کبھی کچھ نہیں کہتیں مگر میں خود سمجھتا ہوں' اِس لیے چاہتا ہوں کہ کسی طرح باہر نکل جاؤں۔ آپ مجھے وظیفہ دیجیے تاکہ میری خواہش پوری ہو سکے۔

☆ بیٹے عبداللہ! اللہ تمہیں کامیابی عطا فرمائے۔ یقیناً پیسا بہت اہم ہے مگر سب کچھ نہیں۔ انسان کو انسان کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔ اگر تم باہر چلے جاؤ گے تو تمہارے گھر والوں کو کون سنبھالے گا؟ والدہ ہیں' بہنیں ہیں' معذور بھائی ہے۔ بیٹے! آج کل کے دور میں لوگ صحت مند لوگوں کی ذمے داری نہیں لیتے پھر بھائی معذور ہے۔ سوچو' تمہارے گھر کو تمہاری بہت ضرورت ہے۔ مایوس مت ہو۔ اللہ تمہیں اپنے ملک ہی میں وافر رِزق عطا کرے گا۔ مانگو تو سہی۔ نمازِ فجر یا نمازِ عشاء کے بعد ایک بار سورۂ رحمٰن ترجمے کے ساتھ پڑھو اور دُعا کرو۔ مدت ایک ماہ ہے۔

□ شیبا احمد۔ کوہاٹ

o بابا جی! میں بہت ہمت کر کے آپ کو اپنا مسئلہ بتا رہی ہوں۔ آپ یقین کیجیے' میں نے یہ بات آج تک کسی کو نہیں بتائی۔ میں اپنے چچازاد بھائی کو بہت پسند کرتی ہوں اور وہ بھی مجھے بہت پسند کرتا ہے۔ ہمارے گھر والے اس رشتے پر راضی نہ تھے لہٰذا ہم دونوں نے بہت مجبوری میں انتہائی قدم اٹھایا اور کراچی جا کر کورٹ میرج کر لی۔ وہ کراچی ہی میں جاب کرتا ہے اور میں اپنے گھر والوں کے ساتھ بہن کے گھر کراچی گئی تھی۔ بابا جی! میں جانتی ہوں کہ آپ کو یہ بات پسند نہیں آئے گی مگر میں مانتی ہوں کہ مجھ سے غلطی ہوئی۔ شادی کے بعد میں واپس آ گئی۔ ہم انتظار کر رہے تھے کہ حالات ٹھیک ہوں تو گھر والوں کو راضی کرنے کی کوشش کریں۔ بابا جی! اب حالات یکدم تبدیل ہو گئے۔ میں امید سے ہوں' وہ ڈاکٹر کے پاس جانے سے منع کرتا ہے۔ کہتا ہے کہ یہ قتل ہے مگر بابا جی! آج نہیں تو کل گھر والوں کو پتا چل جائے گا پھر کیا ہوگا؟ میرے بھائی مجھے قتل کر دیں گے۔ خدا کے لیے' مجھے بچا لیں۔ یہ آپ کا ہم تینوں پر احسان ہوگا۔

☆ بیٹی شیبا! تم پڑھی لکھی سمجھ دار لڑکی ہو پھر ایسی حرکت کیوں کی؟ گھر والوں کو دھوکا دیا' اپنے آپ کو مشکل میں ڈالا اور اب قتل جیسا گناہ کرنے جا رہی ہو؟ کتنی غلطیاں کرو گی؟ میں سمجھتا ہوں کہ حالات بہت نازک ہیں مگر ایک حل ہے بیٹی! مزید غلطیاں کرنے کے بجائے اب سچائی اپنی والدہ کو بتا دو۔ مجھے یقین ہے کہ وہ حالات سنبھال لیں گی۔ تمہیں ضرور برا بھلا کہیں گی' وہ ان کا حق ہے۔ کام بھی تم نے انتہائی جاہلانہ کیا ہے مگر بہرحال ماں ہیں' تمہاری اور خاندان کی عزت بچا لیں گی۔ جس قدر جلدی ممکن ہو' مجھ سے تعویذ منگوالو اور پھر والدہ سے بات کر لو۔ بکثرت توبہ استغفار پڑھا کرو۔ مجھے جلدی جلدی حالات سے آگاہ کرو۔

□ امبر۔ کوریکی۔ سیالکوٹ

o بابا جی! السلامُ علیکم! اللہ تعالیٰ سے دُعا ہے کہ وہ آپ کو ہمیشہ خوش اور خیریت سے رکھے اور آپ ہمیشہ لوگوں کی مدد کرتے رہیں۔ بابا جی! جس طرح آپ دوسروں کی مدد کرتے ہیں' اس طرح میرا بھی ایک مسئلہ حل کر دیں۔ میری اس وقت عمر 24 سال ہو گئی ہے لیکن ابھی تک میرے لیے کوئی اچھا رشتہ نہیں آیا ہے۔ بابا جی! میں مڈل کلاس سے تعلق رکھتی ہوں۔ میں چاہتی ہوں کہ جس سے بھی میری شادی ہو وہ پڑھا لکھا' شریف انسان

ہو۔ میں چاہتی ہوں کہ میرا رشتہ گاؤں سے باہر ہو جائے۔

☆ بیٹی امبر! اللہ تمہیں ڈھیروں خوشیاں دکھائے۔ تمہاری خواہش بہت جائز ہے۔ اللہ سے دُعا کرو' انشاء اللہ' ضرور کرم ہوگا۔ نمازِ فجر اور عشاء کے بعد 41-41 بار سورۃ فاتحہ پڑھو اور دُعا کرو۔ مدت ایک ماہ ہے۔

□ عندلیب رانی۔ پشاور

○ بابا جی! میں نے اس سے پہلے بھی آپ کو کئی خط لکھے مگر جواب نہیں ملے۔ شاید خط آپ تک پہنچے ہی نہیں۔ میں بہت اذیت سے گزر رہی ہوں۔ میری شادی گھر والوں اور میرے شوہر کی مرضی سے ہوئی۔ شادی کے کچھ دن تو سکون سے گزرے مگر پھر لڑائی جھگڑے شروع ہو گئے۔ بابا جی! پہلے تو میں بھی جواب دیتی تھی مگر اب نہیں دیتی۔ میرے شوہر حد سے زیادہ گندی زبان استعمال کرتے ہیں۔ وہ میرے کردار پر بھی کیچڑ اچھالتے ہیں' گالیاں دیتے ہیں اور مارنے سے بھی باز نہیں آتے۔ بالکل عورتوں کی طرح طعنے دیتے ہیں' جو چیز میں سوچ بھی نہیں رہی ہوتی' اس کا الزام لگا دیتے ہیں۔ بابا جی! میرا ایک بیٹا ہے' اس کی وجہ سے بھی مجھے بہت تنگ کرتے ہیں کہ میں بچے کا خیال نہیں رکھتی حالانکہ بابا جی! انہیں خود بچے کی ضروریات کا ہوش نہیں رہتا۔ مجھے بار بار کہنا پڑتا ہے کہ دودھ چاہیے یا کپڑے بنا دیں۔ اس پر بھی منہ بناتے ہیں۔ بابا جی! آپ کو یہ سب لکھنے کا مقصد صرف یہ ہے کہ میرے لیے اب ایسی زندگی گزارنا بہت مشکل ہے۔ آخر میری بھی کوئی عزت ہے' عورت ہونا یا بیوی ہونا باعثِ ذلت تو نہیں؟ آپ مجھے مشورہ دیں کہ میں کیا کروں؟

☆ بیٹی عندلیب! تمہارا مسئلہ آج کل ہر دوسرے گھر کا ہے۔ مردوں کی زبان بہت خراب ہو گئی ہے۔ اصل میں باہر کی ناکامیوں کا بدلہ وہ اس طرح لیتے ہیں۔ عورتیں تو گھر میں ہوتی ہیں' انہیں باہر کے حالات کا اندازہ نہیں ہوتا۔ لوگ جس آدمی سے جیسا سلوک روا رکھتے ہیں' وہی وہ اپنے گھر والوں کے ساتھ رکھتا ہے لہٰذا سمجھ جاؤ کہ جس کو باہر عزت نہیں ملتی' وہ گھر میں بے ہودہ رویہ رکھتا ہے۔ جس شخص کی لوگ عزت کرتے ہیں' وہ اپنے اردگرد موجود لوگوں کو بھی عزت دیتا ہے۔ یہ سادہ سا اصول ہے۔ تم وہی چیز سامنے والے کو لوٹاؤ گی جو تمہارے پاس ہوگی لہٰذا بیٹی! تم مستقل مزاجی اور صبر سے اس مشکل کا سامنا کرو۔ ہر شخص اچھا نہیں ہوتا اور ضروری نہیں کہ بروں سے تعلق توڑ لیا جائے۔ انہیں سدھارنے کی کوشش ضرور کرنی چاہیے۔ تم زبان درازی مت کیا کرو، چاہے بات کتنی ہی تکلیف دہ کیوں نہ ہو۔ چپ ہو جایا کرو۔ نمازِ فجر کے بعد ایک بار سورۃ یٰسین پڑھو اور دُعا کرو۔ بیٹی! مجھے یقین ہے کہ اللہ تمہارے شوہر کو ضرور عقل دے گا۔ مجھے ایک ماہ بعد مطلع کرو۔

□ عامر۔ اٹک

○ بابا سائیں! اللہ آپ جیسے نیک بندوں کو ہمیشہ ہم جیسے گناہ گار بندوں کے سروں پر قائم رکھے۔ میں ایک شدید مسئلے میں گرفتار ہو گیا ہوں۔ کاروبار میں نقصان کی وجہ سے بہت دل برداشتہ ہو گیا تھا۔ اچھا خاصا چلتا ہوا کاروبار ٹھپ ہو گیا لہٰذا گھبرا کر اور کچھ دوستوں کے غلط مشورے میں آ کر سود پر پیسا اٹھا لیا۔ بابا سائیں! وہ دن ہے اور آج کا دن' کاروبار تو بڑھ نہ سکا مگر اب آئے دن گھر میں پریشانیاں کھڑی رہتی ہیں۔ کبھی بیوی بیمار تو کبھی بچے بیمار۔ وقت بے وقت لڑائیاں' جھگڑے ہیں۔ ہر طرف بے سکونی اور بے اطمینانی ہے۔

☆ بیٹے عامر! تم جانتے ہو کہ تم سے کیا غلطی ہوئی۔ سود اللہ کا عذاب ہے' لینے اور دینے والے دونوں جہنمی ہیں۔ تم اپنے عمل پر شرمندہ ہو' خوب معافی مانگو۔ بعد نمازِ عشاء 41 بار سورۃ توبہ پڑھو۔ مدت 41 دن ہے۔

□ فواد خان۔ ملتان

○ بابا جان! آپ سے پوسٹنگ کے سلسلے میں تعویذ لیا تھا۔ اللہ کا شکر ہے کہ میرے آرڈرز آ گئے ہیں۔ میں اگلے ماہ تک لاہور چلا جاؤں گا۔ بابا جان! شاید آپ کو اندازہ نہیں کہ آپ کی رہنمائی سے میرا کتنا بڑا مسئلہ حل ہو گیا۔ میرے ساتھ ساتھ میرے گھر والے بھی آپ کے بہت مشکور ہیں اور میری بیوی آپ سے مستقل رابطے میں رہنے کی اجازت مانگ رہی ہے۔ اللہ آپ کو ہمیشہ ہمارے سروں پر سلامت رکھے۔ میرے لائق کوئی خدمت ہو تو ضرور بتائیں۔

☆ بیٹے فواد! اللہ تمہیں خوش رکھے۔ ہر لمحہ اللہ کا شکر

ادا کیا کرو۔ اپنی بیگم سے کہو کہ بیٹیاں باپ سے رابطے میں آنے کے لیے اجازت نہیں لیا کرتیں۔ جب چاہے خط لکھ لیا کرے۔ تم میرے لیے ایک کام کرو جیسے اللہ نے تم پر کرم فرمایا تم بھی اس کے بندوں پر رحم کرنا اور ہمیشہ خلقِ خدا کی مدد کرتے رہنا۔ یہ شکرانے کا سب سے بہترین طریقہ ہے۔

☐ احمد علی۔ سعودی عرب

○ بابا سائیں! میں ساری زندگی بھی آپ کا شکریہ ادا کروں تو حق ادا نہ ہوگا۔ آپ کو خط لکھنے کے بعد میں نے دوبارہ اپنے ٹیسٹ کرائے تو وہ سب کلیئر ہو گئے ہیں۔ میں بال بال بچا ہوں۔ یہ سب یقیناً آپ کی دعاؤں کا نتیجہ ہے۔ میں آپ سے ملنے کا خواہاں ہوں مجھے موقع عنایت کیجیے۔

☆ بیٹے احمد! اللہ تمہیں ہمیشہ اچھا رکھے۔ اللہ نے تمہیں ایک اور موقع دیا ہے لہٰذا صرف اس پاک ذات کا شکر ادا کرو اور اپنے وعدے پر قائم رہو۔ بری چیزوں سے بچو اور اپنی حق حلال کی کمائی اپنے بیوی بچوں پر خرچ کرو۔ اللہ بہت وافر رزق دے گا۔ مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ تم نے مجھے مطلع کیا۔ خوش رہو اور نماز قضا مت ہونے دینا۔ زندگی دوسرا موقع بہت کم لوگوں کو دیتی ہے۔

☐ نورو سائی۔ بھٹ شاہ۔

○ پیارے بابا جی! السلامُ علیکم ورحمتہ اللہ و برکاتہ! اللہ تعالیٰ سے امید ہے آپ خیریت سے ہوں گے۔ اللہ آپ جیسے نیک لوگوں کا سایہ ہمارے سروں پر ہمیشہ قائم رکھے۔ بابا جی! معافی چاہتی ہوں کہ ایک سال بعد آپ کو خط لکھ رہی ہوں۔ آپ کو تو معلوم ہے مجھے بھائی سے بہت ڈر لگتا ہے اور مجھ اکیلی کو ہی سارے گھر کا کام کرنا پڑتا ہے اس لیے بھی ٹائم نہ ملا۔ بابا جی! آپ کی مہربانی اور دعاؤں سے ایک سال پہلے فریحہ کی شادی چچا کے بیٹے سے ہوگئی۔ بابا جی! دعا کیجیے گا فریحہ خوش رہے لیکن مجھ بدنصیب کے ہاتھوں میں شادی کی لکیر نہ تھی اس لیے ہر آنے والے رشتے کو بھائی نے انکار کر دیا۔ بابا جی! میرے لیے دعا کریں کہ میں اب قرآن شریف پڑھ لوں پھر میں گاؤں کے بچوں کو ترجمے تفسیر کے ساتھ قرآن پڑھانا چاہتی ہوں۔ ہمارے گاؤں میں دینی علم

کی شدید کمی ہے۔ بابا جی! ارجمند کے شوہر کی روزی میں کوئی برکت نہیں ہوئی اس پر تین چار لاکھ قرض ہو گیا ہے جس کی وجہ سے ارجمند بہت پریشان ہے اور اللہ وسائی بھی پریشان ہے۔ وہ شوہر ساس اور نندوں کے ظلم سے تنگ آ گئی ہے۔ اب تو بھائی نے اللہ وسائی سے کہہ دیا ہے کہ وہ ہم سے ملنے نہ آئے ہم چاروں بہنوں کو بھائی نے بہت تنگ کیا ہوا ہے۔ آپ ہمارے لیے دعا کریں اور یہ بتائیں کہ آپ نے جو تعویذ بھیجا تھا اس کا اب کیا کروں؟ تعویذ رکھنا ہے یا ٹھنڈا کر دیں؟ بابا جی! ہم سب بہنوں کی طبیعت بھی بہت خراب رہتی ہے۔ استخارہ کر کے بتایئے کہ یہ مسائل ہمارے ساتھ ہی کیوں ہیں؟ بابا جی! مجھ بدنصیب کے لیے خصوصی دعا کریں کہ باقاعدہ نماز اور قرآن پڑھوں۔ ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' کے ذریعے جواب کی منتظر رہوں گی۔ بڑی مہربانی ہوگی۔

☆ بیٹی نور! اللہ تمہارے حق میں بہتر فیصلہ فرمائے۔ تعویذ رکھا رہنے دو۔ بیٹی! میں تمہیں بھی نصیحت کروں گا جس قدر ممکن ہو یَاوَاحِدُ کا وِرد کیا کرو اور قرآن پاک پڑھنا شروع کر دو۔ قرآن پاک کو ترجمے کے ساتھ پڑھنا اور روزمرہ زندگی میں اس سے فائدہ اٹھانا صرف خوش نصیبوں کو ہی نصیب ہوتا ہے لہٰذا تم بھی خوش نصیبوں میں شامل ہونے کی جستجو کرو۔ مجھے 41 دن بعد مطلع کرو۔

☐ بصیرت۔ جلال پور جٹاں

○ محترم جناب بابا جی! السلامُ علیکم! اللہ آپ کو صحت تندرستی دے۔ (آمین!) میں ایک اہم مسئلہ لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوں۔ محترم! میرا ایک ہی بھائی ہے جو پانچ سال سے شادی شدہ ہے۔ اس کی بیوی نے پہلے دن سے ہی میرے والدین کو کچھ نہیں سمجھا۔ بھائی والدین کا بہت فرماں بردار ہے۔ اُن کا بہت خیال رکھتا ہے لیکن اُس کی بیوی زیادہ وقت میرے والدین کے ساتھ معمولی باتوں پر لڑتی رہتی ہے۔ وہ لڑائی دیکھتا بھی ہے لیکن بیوی کو کچھ نہیں کہتا نہ ہی اسے منع کرتا ہے اور اس کی طرف داری بھی کرتا ہے۔ میری آپ سے گزارش ہے کہ میری والدہ صاحبہ کو ایسا کچھ پڑھنے کو دیں کہ بھائی کی بیوی لڑائی کرنا چھوڑ دے اور اُن کی عزت کرے اور بھائی والدین کا فرماں بردار رہے اور بیوی

کی بے جا حمایت نہ کرے۔ آپ یہ بھی بتائیں کہ اُس نے بھائی پر کچھ عمل وغیرہ تو نہیں کروایا ہے؟ کیوں وہ ہر وقت بڑبڑاتی رہتی ہے۔ مجھے امید ہے کہ آپ میرا خط ضرور شائع کریں گے اور اس کا جواب جلد دیں گے۔ میں بہت زیادہ پریشان ہوں۔ والدہ کا' بھائی کا اور بھابی کا نام لکھ رہی ہوں۔

☆ بیٹی بصیرت! اللہ تمہارے گھر سب اطمینان و سکون رکھے۔ تمہاری بھاوج کوئی عمل نہیں کر رہی ہے۔ یہ ہر گھر کی اپنی تربیت ہوتی ہے کہ کچھ لوگ بڑوں کی عزت کرتے ہیں اور کچھ نہیں۔ تم یہی سوچ لو جس عورت کو اُس کے گھر سے اچھی تربیت نہیں ملی' تمہارا بھائی اُس کو کیسے درست کر دے گا؟ بہر حال معاملات درگزر کرو کو اگر بھائی سے محبت ہے۔ اُس کی صحت وسلامتی کے لیے دُعا کرو۔ ہر نماز کے بعد ایک تسبیح سورۃ الکوثر پڑھو۔ اول و آخر دُرود شریف پھر دُعا کرو۔ معاملات میں بالکل خاموشی رکھو۔ مدت 41 دن ہے۔

□ ماہم۔ سرگودھا

o باباجی! میں آپ کے توسط سے اپنے محسنوں کا شکریہ اَدا کرنا چاہتی ہوں۔ اللہ انہیں دنیا کی تمام نعمتیں عطا فرمائے اور آخرت میں بھی بلند درجہ دے۔ جس کڑے وقت میں عزت اور بھرم کے ساتھ میری مدد کی' میں اور میرے بچے ہمیشہ ان کے مقروض رہیں گے۔ آپ ہمارے سروں پر سلامت رہیں' آپ کی موجودگی میں بھی کچھ لوگ براہِ راست مدد کرنا چاہتے ہیں۔ میں ایسے لوگوں سے معذرت کرتی ہوں' غریب ضرور ہوں مگر عزت دار ہوں۔ باباجی! اب مجھے یقین ہوگیا کہ میری ماں سچ کہتی تھیں کہ اللہ کی دنیا میں اچھے لوگ باقی ہیں۔ اللہ آپ کو بہت سکھ دیں اور اُن کو بھی جن کی وجہ سے میرے کچھ آنسو پونچھ گئے۔

☆ بیٹی ماہم! بس اللہ پر بھروسا رکھو۔ بے شک دنیا میں ابھی اچھے لوگ ہیں جو صلے کی پرواہ نہیں کرتے کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ انسان کسی کو کچھ نہیں دے سکتا۔ صلہ تو اللہ ہی دیتا ہے۔ ایسے لوگ یقیناً اللہ کے نیک بندے ہیں اور جنت میں گھر بناتے ہیں۔

☆☆......☆☆

سلسلۂ خاص

فیضِ عشق



امجد جاوید

عشق کے متوالوں کے لیے عشق میں ڈوبی ایک خاص الخاص کہانی کا آخری حصہ




اپنے کمرے میں آتے ہی وہ سیدھے آئینے کے سامنے گئی۔اس نے مزار سے لی ہوئی چادر کو دیکھا،سبز رنگ کی رنگ برنگی چمکیلی کڑھائی اور لیس سے آراستہ ،اسے خود کو آئینے میں دیکھ کر یوں لگا جیسے وہ کسی دوسری دنیا کی مخلوق ہو۔وہ دنیا،جس میں وہ خود کو دیکھنا پسند کرتی ہے۔ایک نوری ہالہ اس کے اردگرد پھیل گیا تھا۔وہ چند لمحے خود کو دیکھتی رہی،پھر وہ چادر اتار کر اونچی جگہ پر رکھ دی۔ایسے میں تاجاں مائی اس کے لیے کھانا لے کر آ گئی۔اس نے ذرا سا چکھا اور پھر اپنے ہی خیالوں میں کھو گئی۔وہ چونکی اس وقت جب عشاء کی اذان نے اسے اپنی طرف متوجہ کیا۔وہ اٹھی اور اپنے رب کے حضور پیش ہونے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔

رات کا نجانے کون سا پہر تھا،اچانک اس کی آنکھ کھل گئی۔کتنی دیر تک وہ اس خواب کے حصار میں رہی جس کے ٹوٹ جانے سے وہ بیدار ہوئی تھی۔عام طور پر ہوتا یوں ہے کہ کوئی بھی دیکھا گیا خواب پوری طرح یاد نہیں رہتا۔اس کا کچھ حصہ شعور سے محو ہو جاتا ہے کچھ دھندلا رہ جاتا ہے اور تھوڑا بہت یاد رہتا ہے۔مگر وہ خواب اسے پوری طرح یاد تھا۔اس کی ایک ایک جزئیات اس کے ذہن میں پوری طرح عیاں تھی۔وہ عشاء کی نماز پڑھنے کے بعد بیڈ پر لیٹی تو پتہ نہیں کب اس کی آنکھ لگی تھی۔سوتے ہوئے اس کے ذہن میں درگاہ اور اس کا ماحول تھا۔سنگ مرمر کی جالیوں پر دھاگوں سے پڑی ہوئی گرہیں خواہشوں کی۔درخت پر بندھیں خواہشیں۔مزار کے اندر کا ماحول،والدین کی قبر اور وہاں جو اسے سکون ملا،سب کو وہ محسوس کرتے ہوئے سوگئی تھی۔پھر اسے یوں محسوس ہوا کہ وہ سمندر کے کنارے کھڑی ہے۔حالانکہ اس نے پوری زندگی میں کبھی سمندر نہیں دیکھا تھا۔بس قصے کہانیوں میں پڑھا تھا۔یا پھر تصویریں دیکھی تھیں۔مگر وہاں کا ماحول ہی کچھ دوسرا تھا۔وہ کنارے پر کھڑی ہے اور دور افق پر سورج طلوع ہو رہا ہے۔،جس کی نارنجی روشنی میں وہ سمندر کا نیلگوں پانی دیکھ رہی ہے۔تواتر سے اور ایک دورانیے میں لہریں آ رہی ہیں اور اس کے قدموں کے پاس آ کر بنا چھوئے واپس پلٹ رہی ہیں۔تبھی وہ آگے بڑھتی ہے اور ایک لہر پر سوار ہو جاتی ہے۔وہ لہر اسے لے کر چل پڑتی ہے۔ہر طرف پانی ہی پانی تھا،نیلگوں پانی،زمین نجانے کہاں چلی گئی تھی اور وہ سمندر پر کھڑی تھی،لہر اسے خود پر سوار کیئے بڑھتی ہی چلی جا رہی تھی۔اس نے گہرے سبز رنگ کا لباس پہنا ہوا تھا اور اس کے لمبے گھنیرے بال ہوا سے

پھڑ پھڑا رہے تھے۔ اچانک اسے دور ایک جزیرہ دکھائی دیا، جس میں ایک محل کے برج دکھائی دینے لگے۔ سفید محل لمحہ بہ لمحہ اس کے نزدیک ہونے لگا۔ یہاں تک کہ وہ جزیرے کے کنارے تک آ پہنچی۔ گہرے سبز درختوں اور رنگ برنگے پھولوں کی بہار، ہلکی ہلکی باد نسیم اور پرندوں کی مختلف آوازیں۔ ایک عجیب فرحت آگہیں منظر تھا۔ جس میں خوشبو رچی ہوئی تھی۔ جہاں سمندر ختم ہو رہا تھا وہیں سے جزیرے کے کنارے سے، ایک خوبصورت روش دور محل تک جا رہی تھی۔ اس نے اس روش پر قدم رکھ دیا۔ پھر وہ یہیں راستہ چلنے لگی۔ جس طرح لہر اسے یہاں تک لے آئی تھی۔ بالکل ویسے ہی وہ روش اسے محل تک لے گئی۔ وہاں کوئی ذی روح دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ محل میں داخل ہو گئی۔ وہاں ہر شے سفید تھی، جیسے ہی دروازے سے اندر گئی ایک بہت بڑے کمرے کے درمیان میں سفید چاندنی پر ایک بزرگ بیٹھے ہوئے تھے۔ سفید ریش، سفید لباس۔ ان کے قریب ہی ایک جواں سال جوڑا بھی تھا۔ انہوں نے بھی سفید لباس پہنا ہوا تھا۔ مرد نے سفید پگڑی اور خاتون نے سفید چادر اوڑھی ہوئی تھی۔ وہ تینوں اسی کی طرف دیکھ رہے تھے۔ وہ دھیرے دھیرے چلتی ہوئی ان کے قریب پہنچ گئی اور اس سفید چاندنی پر ان کے قریب بیٹھ گئی۔

''خوش آمدید بیٹی۔! ہم شاید تجھے ابھی نہ بلاتے مگر تو نے جس شدت سے ہمیں یاد کیا ہے۔ ہمیں خود چل کر تمہارے پاس آنا پڑا۔ پہچانتی ہو میں کون ہوں؟'' اس سفید ریش بزرگ نے بڑی محبت سے پوچھا۔

''نہیں۔! میں نے آپ کو نہیں دیکھا پہلے۔۔ کون ہیں آپ۔۔؟'' اس نے ہولے سے کہا۔

''میں تمہارا پڑدادا ہوں بیٹے۔! آج تم میرے پاس آئی ہو تو مجھے اچھا لگا۔ تمہارا خلوص اور تمہارے اندر اپنی تلاش، یہی ضرورت تھی۔۔۔ اور انہیں دیکھو، یہ کون ہیں؟'' اس بزرگ نے کہا تو نادیہ نے تب ان کی جانب دیکھا، وہ حیرت میں کھو گئی۔ وہ بالکل اس کے ماں باپ جیسے تھے۔ جن کی تصویر اس نے کمرے میں رکھی ہوئی تھی۔ اس نے ان کی طرف دیکھ کر لرزتے ہوئے لہجے میں کہا۔

''یہ میرے والدین ہیں۔۔''

''ہاں۔! یہ تمہارے والدین ہیں۔ یہ تم سے بات نہیں کر پائیں گے۔۔۔ بس تمہیں اتنی اجازت ہے کہ تم انہیں دیکھ سکو اور یہ اطمینان کر لو کہ یہ بہت اچھی جگہ پر ہیں۔ ہاں اگر تم ان سے ہمکلام ہونا چاہو، ان سے باتیں کرنا چاہو یہ مرحلہ ابھی دور کا ہے۔ اس سے تمہیں گزر کر آنا ہوگا۔''

''بتایئے۔! میں وہ مرحلہ طے کر کے اپنے والدین سے ضرور باتیں کروں گی۔ وہ کیسا مرحلہ ہو۔۔۔ میں اسے ضرور پار کروں گی۔۔''

''وہ کوئی نیا مرحلہ نہیں ہے۔ ایک ہی ہے۔۔ سیدھا راستہ۔۔ اس پر چلتی چلی جاؤ گی تو یہ مرحلہ بھی طے ہوتا چلا جائے گا۔ بس تم میرے پاس آتی رہا کرو۔۔۔ سارے مرحلے خود بخود طے ہوتے چلے جائیں گے۔'' انہوں نے کہا تو اسے کچھ ڈھارس بندھی۔ ایک ملال جو اس کے من میں بگولے کی طرح اٹھا تھا۔ وہ ایک دم ختم ہو کر رہ گیا وہ دونوں اس کی جانب ایک ٹک دیکھے چلے جا رہے تھے۔ ان کے چہروں پر کسی قسم کے کوئی جذبات نہیں تھے۔ نادیہ ان کی طرف دیکھتی رہی۔ لیکن دل میں یہ خواہش نہیں ابھری کہ وہ آگے بڑھ کر انہیں چھو لے۔ وہ یوں ہو گئی تھی کہ جیسے اس کے اندر سے ساری توانائی کشید کر لی گئی ہو اور وہ بے جان سی ان کے ساتھ بیٹھی ہوئی ہو۔

''میں آپ کے پاس آتی رہا کروں گی۔۔ میری رہنمائی کرتے رہیے گا۔'' اس نے آہستگی سے کہا۔

''ایک بات ہمیشہ یاد رکھنا۔ کسی انسان سے کچھ مت مانگنا۔۔۔ مانگنا تمہاری سرشت ہی سے خارج ہو جانا چاہیے۔ جو کچھ بھی لینا ہے۔ وہ صرف ایک ہی ہستی سے، بس عرض کر دینا ہے، تمہارے لیے بہتر ہوگا تو مل جائے گا نہیں بہتر ہو گا تو نہیں ملے گا۔ اب تم جاؤ'' سفید ریش بزرگ نے کہا اور اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ اس کے ساتھ ہی اس کے والدین نے بھی آنکھیں بند کر لیں۔ کچھ دیر مزید بیٹھنے کی اسے چاہت ہی نہیں ہوئی، وہ اٹھی اور محل سے نکلتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ روش اسے جزیرے کے کنارے تک لے آئی۔ وہاں لہر اس کے انتظار میں تھی۔ اس نے سمندر میں اپنا پاؤں ڈالا تو وہ پھر لہروں کے دوش پر تھی۔ یہاں تک کہ وہ ساحل تک آ

پہنچی۔ یہیں اس کی آنکھ کھل گئی تھی۔ تب وہ یہ محسوس کر رہی تھی کہ جزیرے پر جو خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ وہ یہاں اس کے کمرے میں بھی ہے۔ وہ آنکھیں بند کر کے اس خواب کو کئی بار اپنے ذہن میں دہرا چکی تھی۔ ہر بار انہی جزئیات کے ساتھ وہ اسے پوری طرح یاد تھا۔ خوشبو بھی کہ اس کے کمرے میں اس خواب کو ماورائی بنا دینے کا بھرپور احساس دے رہی تھی۔ کافی دیر تک یونہی بے خیالی میں بیٹھی رہی۔

''یہ کیسا خواب تھا؟'' اس نے خود سے سوال کیا۔

''جو بھی تھا تم خود جانتی ہو۔ میں تو صرف اتنا جانتی ہوں کہ خوابوں میں اشارے ہوتے ہیں۔ تمہیں خواب پوری طرح یاد ہے تو ان جزئیات کو سمجھنے کی کوشش کرو۔''

''کون سمجھائے گا مجھے۔''

''تم سمجھنے کی کوشش تو کرو جس طرح یہ خواب تمہیں خود بخود آ گیا ہے۔ ویسے ہی سمجھنے سمجھانے کے سارے مرحلے طے ہو جائیں گے۔''

''اور وہ سیدھا راستہ۔''

''ایک ہی تو ہے۔۔ صراطِ مستقیم۔ جو ہر ایک کے لیے ہے۔۔ الو اہی پیغام۔۔ پڑھنا ہے تو اسے پڑھو۔۔ سب سنور جائے گا۔''

''ہاں۔! پڑھنا بھی ہے ۔۔۔ مجھے سمجھنا بھی ہے۔۔ خواب کی ایک ایک رمز کو جاننا ہے۔ میں سمجھ لوں گی۔۔'' اس نے عزم سے سوچا۔ پھر اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس نے دیوار پر لگے کلاک کو بھی دیکھنے کی زحمت نہیں کی۔ وہ اٹھی اور وضو کرنے کے لیے بڑھ گئی۔ وہ ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اسے اچھی طرح سمجھ آ گئی تھی کہ اسے اگر کچھ لینا ہے تو ایک ہی ہستی ہے۔۔ باتیں کرنی ہیں اپنے بارے میں کچھ کہنا ہے تو فقط اسی ایک ہستی سے جس نے اسے پیدا کیا ہے۔ انسانوں کے ساتھ سارے معاملات میں کہیں نہ کہیں مانگنے کا عنصر پیدا ہو جاتا ہے۔ زندگی کے گہرے راز کیا ہیں۔ اسے یہ سمجھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ یہ راز سمجھائے، سمجھ میں نہیں آتے جس پر رحمت نازل ہو جائے تو پھر کائنات کے راز بھی عیاں ہونے لگتے ہیں۔ یہ اس کی عنایت ہے جس پر ہو جائے۔ جب بات ٹھہری ہی اس کی رحمت پر تو پھر اس کی خوشنودی کیوں نہ حاصل کی جائے۔ یہ نکتہ اسے الہام ہو گیا تو سارے تفکرات اس کے ذہن سے دور ہو گئے۔ وہ پورے سکون سے جائے نماز پر آن کھڑی ہوئی۔ خوشبو کا احساس تیز ہو گیا تھا تو اسی قدر سکون اس کے اندر اتر گیا۔

☆......☆......☆

مغرب کا وقت ختم ہو چکا تھا اور حویلی جگمگا اٹھی تھی۔ رات بے تابی سے چھائی تو پھر بڑھتے ہی چلے جانے کو بے تاب ہو گئی۔ ایسے میں پیر سائیں کھانے کی میز پر آ بیٹھے۔ بہت دنوں بعد وہ حویلی میں یوں کھانے کے لیے آئے تھے۔ ورنہ یہ وقت ان کا مردان خانے میں گذرتا اور دستر خوان وہیں لگایا جاتا تھا۔ آج خاص طور پر کھانا حویلی میں کھانے کے لیے کہا تو خاصا اہتمام کر لیا گیا۔ اماں بی اور زہرہ بی وہاں موجود تھیں یا پھر حویلی کی خادمائیں جوان سے ذرا فاصلے پر موجود تھیں۔

''نادیہ بیٹی نہیں آئی۔؟''

''نہیں۔ اس نے آنے سے منع کر دیا تھا۔'' اماں بی نے ہولے سے کہا۔

''کیا اسے بتایا نہیں گیا تھا کہ آج۔۔۔'' پیر سائیں نے کہتے ہوئے جان بوجھ کر فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''بتایا تھا مگر اس نے اپنا کھانا کمرے ہی میں منگوا لیا۔'' انہوں نے دوبارہ کہا۔ تو پھر وہ نہیں بولا۔ خاموشی سے کھانا کھاتا رہا۔ سیر ہو گیا تو ڈرائنگ روم میں صوفے پر جا بیٹھا۔ چائے اسے وہیں دے دی گئی۔ تبھی اس نے اماں بی سے کہا۔

''نادیہ بیٹی کو ذرا بلوائیں۔ کئی دن ہو گئے میں نے اسے دیکھا نہیں ہے۔''

اس کے یوں کہنے پر اماں بی نے اپنی ملازمہ کو اشارہ کیا تو وہ چلی گئی۔ وہ خاموشی سے چائے پیتے رہے لاشعوری طور پر نادیہ کے انتظار کرتے رہے۔ کچھ دیر بعد وہ بڑی ساری سیاہ چادر میں لپٹی وہیں آ گئی۔ اور ایک طرف کھڑی ہو کر پیر سائیں سے بولی۔

''جی پیر سائیں، حکم۔''

''آؤ بیٹھو بیٹا۔! میں نے تم سے کچھ باتیں کرنا ہیں۔'' پیر سائیں بولا تو وہ ایک طرف پڑے صوفے پر بیٹھ گئی۔ اور خاموش رہی۔ کتنے ہی لمحے خاموشی کی نذر ہو

گئے تو وہ بولا۔ ''نادیہ بیٹی۔ میں نہیں جانتا کہ تمہارے ذہن میں کیا ہے۔ لیکن اتنا ضرور جانتا ہوں بہت کچھ مثبت نہیں ہے۔ جس کا اظہار تم نہیں کر پاتی ہو مگر اپنے رویے سے اظہار بھی کر دیتی ہو۔ میں جاننا چاہتا ہوں کہ آخر ایسی کیا بات ہے، جو تم کہنا چاہتی ہو مگر کہہ نہیں پاتی۔''

''ایسی کوئی بات نہیں ہے۔'' وہ آہستگی سے بولی۔

''نہ دلاور شاہ تمہیں کیا احساس ہے کہ ایسا سوچا تم نے۔'' اماں بی نے آہستگی سے پوچھا۔

''دیکھیں اماں بی، کل نادیہ بیٹی نے دربار شریف پر جانے کی اجازت چاہی، جو میں نے دے دی، میں نے یہ اہتمام کر دیا کہ جب تک یہ وہاں پر ہے، کوئی مرد دربار کے احاطے میں داخل نہیں ہوگا۔ لیکن اس نے وہاں کی ایک ایسی روایت کو توڑ دیا، جو وہاں نہیں ہوتی تھی۔'' آخری لفظ کہتے ہوئے وہ گڑبڑا گیا۔

''میں مزار کے اندر چلی گئی تھی جہاں بڑے پیر صاحب دفن ہیں۔'' نادیہ نے آہستگی سے کہا۔

''کیوں۔'' پیر سائیں نے تحمل سے پوچھا۔

''بس۔ میرا دل کیا اور میں چلی گئی۔'' وہ تیزی سے مگر دھیمی آواز میں بولی۔

''بیٹا! اگر ہم ہی اپنی روایات کی پاسبانی نہیں کریں گے تو پھر دوسرا کون کرے گا۔ یہ اور بات ہے، اصول وضوابط اس لیے بنائے گئے ہیں کہ لوگ اپنی جگہ حصار میں رہیں۔ ان کی ایک حد مقرر کر دی گئی ہے کہ وہ جہاں ہیں، وہیں تک محدود ہو جائیں۔

انہیں یہ احساس ہو کہ ہم میں اور ان میں ایک فاصلہ ہے۔''

''مگر میں تو کسی سے نہ فاصلے کے بارے میں سوچتی ہوں اور نہ قربت کے بارے میں۔ مجھے ان باتوں سے کیا لینا دینا۔ میں نے اب یہ سوچا ہے کہ میں ہفتے میں ایک دن ضرور درگاہ پر جایا کروں۔''

اس نے کہا تو پیر سائیں نے چونک کر اسے دیکھا۔ وہ بجائے اس کی بات کو سمجھ کر اس پر آئندہ عمل کرنے کا وعدہ کرتی۔ وہ تو اپنا ارادہ ظاہر کرنے لگی تھی۔ اسے ایک دم سے غصہ تو بہت آیا لیکن خود پر قابو پا کر بولا۔

''دیکھو بیٹی۔! میں جو تمہیں سمجھا رہا ہوں۔ اسے سمجھنے کی کوشش کرو۔ ان روایات کی حفاظت ہمی نے کرنی ہے۔ اور یہ ہم پر کسی فرض کی مانند لاگو ہیں۔''

''پیر سائیں۔! آپ میرے ایک سوال کا جواب دیں۔ کیا سارے فرائض کی ادائیگی ہم عورتوں کے لیے ہی ہے۔ ان کا حق کوئی نہیں۔ یا پھر ہم عورتوں کی مخلوق حقوق کے لیے بنی نہیں، ان پر صرف فرائض ہی لاد دیے جاتے ہیں۔''

''نادیہ۔!'' پیر سائیں نے ایک دم سے اسے جھڑک دیا۔ ''میں اگر تم سے انتہائی تحمل سے بات کر رہا ہوں تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ میں تم سے اپنی بات نہیں منوا سکتا۔ تمہیں وہی کرنا پڑے گا، جو میں کہتا ہوں۔''

''لیکن مجھے اپنی زندگی گذارنے کا پورا پورا حق حاصل ہے اور میں اپنے حق کو پوری طرح استعمال کروں گی۔ یا پھر آپ مجھ سے میری زندگی کا حق چھین لیں۔'' اس نے آنکھیں نیچی کیئے بے خوف انداز میں کہہ دیا۔ جس پر پیر سائیں نے شدید حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ اس کے منہ پر ہی اس کا حکم ماننے سے انکار کر رہی تھی۔ وہ کتنی ہی دیر تک خاموش بیٹھا رہا، پھر اٹھتے ہوئے بولا۔

''اگر یہ کرنا پڑے گا تو میں کر لوں گا۔ لیکن یہ اچھا ہے کہ تم سنبھل جاؤ۔''

''مجھے معلوم ہے پیر سائیں۔ میں نے کیا کرنا ہے۔ میں اسی دن مر گئی تھی، جب میں نے حویلی سے قدم باہر نکالا تھا۔ یہ آپ ہی کی ضد ہے کہ میری زندہ لاش کو اس حویلی کے در و دیوار میں قید کر لیا ہے۔ لاشوں پر حکم نہیں چلایا جاتا، انہیں دفن کر دیا جاتا ہے یا پھر میری طرح در گور۔۔۔''

پیر سائیں نے حیرت سے سنا اور پھر ایک لفظ کہے بغیر باہر نکل گیا۔ وہاں رہ گئی تو ان تینوں خواتین کے درمیان خاموشی ٹھہر گئی۔ جس میں حیرت کے ساتھ خوف بھی سانس لے رہا تھا۔ تبھی اماں بی نے کہا۔

''یہ تم نے کیا کیا بیٹی۔! دلاور شاہ کا عتاب اگر تم پر آ گیا تو بہت برا ہوگا۔''

''اب اس سے بڑا عتاب کیا آئے گا اماں بی۔ یہ

جانتے بوجھتے بھی آپ مجھے ڈرا رہی ہیں۔" نادیہ نے کہا اور بنا اجازت کے اٹھ کر اپنے کمرے کی طرف چل پڑی۔ اسے اب کسی کی پرواہ نہیں رہی تھی۔

پیر سائیں اپنے خاص کمرے میں بیٹھا، اپنے غصے اور حیرت پر قابو پا رہا تھا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ نادیہ اس کے لیے اتنی مشکل پیدا کر دے گی۔ وہ جس قدر اسے اپنی راہ پر چلانا چاہتا، اس قدر ناکامی ہو جاتی۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ نادیہ کا ایسا رویہ کیوں ہے؟ ظہیر شاہ نے بھی تو اس کا دل جیتنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ بلکہ اس کے ساتھ ہتک آمیز رویہ اپنا کر پہلی رات اسے چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ اب نادیہ کا یہ رویہ عین فطری تھا۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ بس ایک ہی راہ ہے اور وہ یہ کہ ظہیر شاہ لوٹ کر حویلی میں آ جائے۔ وہی اسے محبت اور پیار سے اپنی ڈگر پر لے آئے ورنہ نادیہ کا رویہ ایسا ہو جائے گا کہ سنبھالے نہیں سنبھلے گا۔ وہ کتنی ہی دیر تک اسی ایک نکتے پر سوچتا رہا۔ پھر اس نے ارادہ کر لیا کہ ظہیر شاہ کو واپس بلوائے گا۔ اب اس کی تعلیم سے زیادہ یہاں پر ضرورت تھی، وہ تو پھر بھی مکمل ہو جائے گی۔ اس نے فون اٹھایا اور ظہیر شاہ کے نمبر ملا دیے۔

"جی بابا سائیں۔!" تمہیدی باتوں کے بعد اس نے پوچھا۔

"تم ایسا کرو، فوراً واپس یہاں سلامت نگر آ جاؤ، یہاں تمہاری ضرورت ہے۔" پیر سائیں نے کہا۔

"بابا سائیں۔! اگر آپ مجھے نادیہ کی وجہ سے بلا رہے ہیں تو میں قطعاً نہیں آؤں گا۔ میں ایسی کسی عورت کے ساتھ نہیں رہ سکتا جو انتہائی درجے کی بدتمیز ہو اور اسے نہ خونی رشتوں کا پاس ہو اور نہ جیسے ادب و آداب چھو کر گزرے ہوں۔"

"میں یہ مانتا ہوں کہ وہ ایسی ہے لیکن تم نے اس کے لیے نہیں آنا، ہمیں اس کی ذات سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ بلکہ اس سے متعلق جو ہمارے معاملات ہیں۔ ان کے لیے آنا ہے۔ تم آؤ اور اس کا دل جیتو، ہمارا مطلب نکل گیا تو پھر ہمیں اس کی کوئی ضرورت نہیں رہے گی۔"

"معاف کیجیے گا بابا سائیں۔ وہ جس نہج پر آ گئی ہے، اب اس کا بدل جانا یا ہمارے مطلب کے لیے تیار ہو جانے کا کوئی امکان نہیں ہے۔ بلکہ وہ ہمیں خراب کرے گی۔" اس نے صاف اور دو ٹوک الفاظ میں کہہ دیا۔

"تم تو مایوس ہو گئے۔ چلو تم ایسا کرو۔ میری بات مانو اور آ جاؤ۔ یہاں دیکھ لیں گے کہ کیا کرنا ہے۔" پیر سائیں نے اسے پیار سے سمجھایا۔

"بابا سائیں۔! سچی بات تو یہ ہے کہ میں خود اس کے منہ نہیں لگنا چاہتا۔ وہ عورت اسی دن میرے دل سے اتر گئی جب وہ حویلی سے بھاگ گئی تھی۔ ایسی مفرور عورت کو میں اپنی عزت بناؤں، میرا ضمیر گوارہ ہی نہیں کرتا۔ ہمارے پاس زمین جائیداد کی کون سی کمی ہے۔ آپ میری بات مانیں۔ اسے اس کی جائیداد سے حصہ دے کر حویلی سے چلتا کریں۔ میرا تھوڑا سا وقت رہتا ہے۔ میں یہاں سے اپنی تعلیم مکمل کر کے آ جاؤں گا۔ پھر میں سنبھال لوں گا سب کچھ۔"

"تم مجھے مایوس کر رہے ہو بیٹا۔" پیر سائیں نے حتمی انداز میں کہا۔

"نہیں بابا سائیں، میں مایوس نہیں کر رہا ہوں۔ آپ کو حقیقت بتا رہا ہوں۔ کیونکہ آپ ایک بہت بڑی غلطی کر چکے ہیں۔ شعیب کے ساتھ فرح کی شادی۔۔ وہ لوگ جو کبھی بھی جائیداد کے وارث نہیں بن سکتے تھے۔ وہ بھی زندہ ہو گئے ہیں۔ آپ کہاں کہاں کس کو قابو میں کریں گے۔ کیا اب آپ فرح کا حق اسے نہیں دیں گے۔ نہیں دیں گے تو وہ خود لے لے گی۔" ظہیر شاہ نے حقیقت بتاتے ہوئے کہا۔

"وہ تو بعد کی بات ہے۔۔۔ میں تو یہ کہتا ہوں کہ اگر وہ حویلی ہی میں آ کر رہنا شروع کر دیں تو زیادہ اچھی بات ہے۔ نادیہ والا کانٹا نکلے تو شعیب ہمارے لیے بہت کار آمد ثابت ہو سکتا ہے۔ فرح اپنی ازدواجی زندگی میں بہت خوش ہے اور مجھے پوری امید ہے کہ وہ بہت جلد میری راہ پر آ جائے گا۔ تم یہ سر دردی چھوڑو اور فوراً آ جاؤ۔ نادیہ کا زہر نکالنا بہت ضروری ہے۔" پیر سائیں نے اسے تحمل کے ساتھ پھر سمجھایا۔

"میں آپ کو کیسے سمجھاؤں بابا سائیں۔ ایسی اس عورت سے نفرت کرتا ہوں۔ خدا کے لیے مجھے مجبور نہ کیا جائے۔ میری طرف سے اسے آج قتل کروا دیں۔ جب تک وہ حویلی میں ہے، میں نہیں آؤں گا۔۔۔ اگر آپ مجھے

اپنی جائیداد سے عاق بھی کر دیں گے تو مجھے منظور ہے۔ اسے دفعان کریں تو میں آجاتا ہوں۔'' اس نے اپنا حتمی فیصلہ سنا دیا۔

''کیا یہ تمہارا آخری فیصلہ ہے۔'' پیر سائیں نے غصے میں پوچھا۔

''جی، یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔آپ مجھے اگر قبول نہیں کریں گے تو میں یہاں اپنی باقی زندگی گذار لوں گا۔یہ میری ضد سمجھ لیں یا میری انا۔۔۔ میں اسے حویلی میں برداشت نہیں کر سکتا۔اسی لیے میں نے اس رات حویلی کو چھوڑا تھا۔باقی جو آپ فیصلہ کریں۔۔''

''اب تو کوئی فیصلہ نہیں رہ گیا۔تم نے حکم عدولی کر کے اچھا نہیں کیا۔'' اس نے آزردگی سے کہا۔

''میں مجبور ہوں بابا سائیں۔!میں سب کچھ برداشت کر سکتا ہوں لیکن اپنی ہتک نہیں۔اسے معلوم تھا کہ میں حویلی میں ہوں اور اگلے دن میری اس سے شادی ہونے والی ہے۔صرف مجھے ذلیل کرنے کی خاطر وہ حویلی سے بھاگی۔۔۔ میں نے اگر بھاگی ہوئی عورت کے ساتھ شادی کی ہے تو صرف آپ کی ضد کی خاطر۔۔۔ورنہ۔۔۔ میں نے انکار کر دینا تھا۔۔۔لیکن میں نے سوچا، میں نے کون سا یہاں رہنا ہے۔آپ مجھے مجبور نہ کریں۔۔ورنہ میں اسے طلاق بھجوا دوں گا۔پھر میرا اور اس کا کوئی تعلق نہیں رہے گا۔''

''ٹھیک ہے تم جیسا چاہو۔۔آؤ یا نہ آؤ۔۔۔مجھے تم سے کوئی سروکار نہیں ہے۔'' پیر سائیں نے روہانسے انداز میں کہا اور فون بند کر دیا۔اس کے گمان میں بھی نہیں تھا کہ ظہیر شاہ اس طرح جواب دے گا۔مایوسی اس کے اردگرد طواف کرنے لگی تھی۔اسے ظہیر شاہ ہی سے امید تھی ۔وہ ہی نہیں رہی۔اب اسے کچھ اور ہی سوچنا تھا۔لیکن اب اس کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیت مفقود ہو چکی تھی۔

نادیہ کا وجود اس کے لیے چیلنج بن گیا تھا۔وہ جس قدر اس کے بارے میں سوچتا، اس قدر اسے اپنی راہیں مسدود دکھائی دیتی تھیں۔وہ اس کے بارے میں جو بھی فیصلہ کرتا، اسی میں ناکام ہو جاتا۔ایک کے بعد ایک فیصلہ اس کی نگاہوں میں گھومتا چلا گیا۔نادیہ کے معاملے میں اس کی ضد پوری نہیں ہو پائی تھی۔ورنہ اس نے جو بھی ارادہ کیا تھا، جو بھی فیصلہ اس نے کیا وہ پورا ہوتا چلا گیا تھا۔اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ ظہیر شاہ اسے جواب دے دے گا۔اور اس قدر نفرت انگیز انداز میں کہ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔آخر اسی کے معاملے میں ایسا کیوں ہو رہا ہے؟ اس کے اندر کے ضدی انسان پر ایسی کاری ضرب تھی جس سے وہ حواس باختہ ہو گیا۔وہ بجائے یہ سوچنے کے کہ ایسا کیوں ہو رہا ہے اور اسے اپنی ضد سے ہٹ جانا چاہئے۔وہ ان پہلوؤں پر غور کرنے لگا کہ اس سارے معاملے کو اپنے حق میں کیسے کیا جا سکتا ہے۔اس کے پاس آخری آپشن کے طور پر ظہیر شاہ ہی کا مہرہ تھا۔جسے چلتے ہوئے وہ نادیہ پر قابو پا سکتا تھا۔لیکن ایسا نہیں ہوا اور اس کی سوچوں کے برعکس وہ ہوا جس کے بارے میں وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔یہ شرط اسے بہت خوف زدہ کر دینے والی تھی کہ جب تک نادیہ حویلی میں رہے گی، تب تک وہ حویلی میں نہیں آئے گا۔اگر ایسا ہی ہو گیا تو پھر حالات اس کی دسترس میں نہیں رہیں گے۔اور نہ ہی کھیل اس کے قابو میں آئے گا۔سب کچھ بگڑ جائے گا۔وہ ہی تو ایک سونے کی چڑیا تھی جسے اس نے پنجرے میں قید کر رکھا تھا۔وہ تمام تر جائیداد میں سے آدھے کی اکیلی وارث تھی۔اس پر دباؤ کی صورت میں زبیدہ سامنے آ گئی، بلاشبہ اب وہ بھی وارث ہو گی۔وہ شعیب کا مقابلہ نہیں کر پائے گا۔مگر کیا تو بہت ٹوٹ پھوٹ ہو گی، تمام تر جائیداد کا اکیلا مالک ہونے کا جو خواب اس نے دیکھا تھا، وہ پورا نہیں ہو پا رہا تھا۔کیا وہ بچی کچھی جائیداد پر ہی اکتفا کرے۔۔۔یا پھر اس مسئلے سے نمٹنے کے لیے کچھ مزید سوچے، یہ وہ نکتہ تھا جس پر وہ کوئی فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا۔نادیہ کو حویلی سے اگر چلے جانے کا بھی کہہ دیا جائے تو وہ کہاں جائے گی۔یہ اچھا ہوتا کہ وہ شعیب کے ساتھ بیاہ دی جاتی اور وہ اپنی شرائط منوا لیتا۔مگر وہ موقعہ بھی تو ہاتھ سے نکل گیا تھا۔یہ فائدہ تو ہوا کہ وہ شعیب کے ساتھ فرح کو بیاہ کر اب وہ اسے اپنے ساتھ شامل کر سکتا تھا۔اب اسے یہی امید کی کرن دکھائی دے رہی تھی۔

☆......☆......☆

زندگی اس قدر خوبصورت بھی ہو سکتی ہے، اس کا احساس اسے پہلے کبھی نہ تھا۔وہ جو مایوسی کے حصار میں

بند ہو کر اپنی ہی ذات میں قید ہو گئی تھی، حویلی کی چار دیواری سے نکلی تو دنیا کے ہجوم میں آ گئی۔ فرح کے لیے ہر منظر ہی نیا تھا۔ اتنی تعداد میں انسان اس نے شاید زندگی میں پہلی بار دیکھے تھے۔ باہر کی دنیا اس قدر پر ہجوم اور پر شور، کبھی کبھی تو اسے یوں لگتا کہ جیسے وہ خود ان مناظر میں تحلیل ہو گئی ہے۔ پر شور، پر ہجوم اور رنگین دنیا کے ساتھ ایک محبت کرنے والا شوہر اس کے ساتھ تھا۔ اسے لگا جیسے حویلی کی چار دیواری کے باہر جنت ہے۔ شمالی علاقوں کی سیر کے بعد جب وہ لاہور پہنچے تو اس کے انگ انگ کی تھکن خوشی میں بدل چکی تھی۔ وہ ایک ایک منظر کو اپنے ساتھ سمیٹ کر لے آئی تھی۔ دن کے اجالے میں پہاڑوں کے درمیان سیر کرتے گزر جاتا۔ بھوک لگتی تو قریبی ہوٹل میں گھس جاتے، رات آتی تو اپنے ساتھ زندگی حسین لمحات لے کر آتی۔ جہاں دل چاہتا پڑاؤ کرتے اور پھر آگے نکل جاتے۔ اس طرح دس دن گھر سے باہر رہنے کے بعد وہ لوٹی تو اپنے ساتھ ڈھیروں یادیں لے کر آئی تھی۔ وہ زندگی کے لمحے لمحے سے خوشیاں کشید کر لینا چاہتی تھی جو اس نے کیں۔ ایک دن اور ایک رات تھکن اتارتے گزر گیا۔ اس صبح جب وہ نماز سے فارغ ہوئی تو کچن میں جا گھسی جہاں زبیدہ پہلے ہی چائے بنا رہی تھی۔

''پھوپھو۔ اگر آپ بھی ہمارے ساتھ ہوتیں نا۔ تو مزہ آ جاتا۔'' اس نے یادوں کا لطف لیتے ہوئے کہا۔

''نہیں۔! پھر تم دونوں کو ہر دم میرا خیال رہتا۔ اب اگر زندگی رہی تو اگلے سال میں تم لوگوں کے ساتھ چلوں گی۔۔۔ کیونکہ تب تم دونوں کو میری بہت ضرورت ہوگی۔'' زبیدہ نے پیار سے مسکراتے ہوئے پیار سے کہا۔

''میں سمجھی نہیں ،ضرورت۔۔۔'' فرح نے کہنا چاہا، پھر ایک دم اسے سمجھ میں آیا تو شرما گئی۔

''تم نے تو مجھے نہیں بتایا لیکن میں سمجھ گئی ہوں۔'' زبیدہ نے اس کے سرخ ہوتے ہوئے چہرے پر دیکھ کر کہا۔ تب وہ بولی۔

''میں نے چھپایا نہیں، بلکہ شعیب کہہ رہے تھے کہ ڈاکٹر کے پاس چلیں گے، تصدیق ہونے پر آپ کو بتائیں گے، تاکہ کسی قسم کی کوئی غلط فہمی نہ رہے۔'' وہ پر وقار انداز میں بولی۔

''اچھا تو یہ بات تھی۔۔ کب جانا ہے ڈاکٹر کے پاس۔۔۔؟'' زبیدہ نے سنجیدگی سے پوچھا۔

''آج کسی وقت۔۔۔'' وہ بولی تو زبیدہ نے جذبات بھرے لہجے میں کہا۔

''اس کا پتہ نہیں وہ کب جائے، میں تمہیں خود لے کر جاؤں گی۔ بس تم یہ ناشتہ وغیرہ بنا کر جلدی سے تیار ہو جانا۔۔''

''ٹھیک ہے۔ میں تیار ہو جاتی ہوں'' فرح نے سعادت مندی سے کہا اور کچن میں ہاتھ بٹانے لگی۔ زبیدہ تو چائے کا مگ لے کر باہر جا بیٹھی اور فرح انہونی سوچوں میں کھو گئی۔ اسے خود پر یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ ماں جیسے مقدس رتبے پر فائز ہونے جا رہی ہے۔

دوپہر ہونے سے کافی دیر پہلے وہ ایک مشہور لیڈی ڈاکٹر کے کلینک جا پہنچیں۔ اگرچہ وہاں انتظار نہیں تھا مگر پھر بھی ڈاکٹر تک رسائی ہوتے انہیں تقریباً دو گھنٹے لگ گئے۔ اچھی طرح تصدیق کے بعد جب وہ واپس لوٹیں تو ان کے ہمراہ یہ خوشخبری تھی کہ فرح ماں بننے والی ہے۔ زبیدہ نے تو وہیں کلینک ہی میں شعیب کو بتا دیا۔ اور پھر جب وہ گھر پہنچیں تو وہ مٹھائی لیے ان دونوں کا منتظر تھا۔ وہ اپنے رب کی شکر گزار تھی کہ اس نے اسے سب کچھ دے دیا تھا۔ وہ اب جلد از جلد سلامت نگر پہنچ جانا چاہتے تھے۔ ایک نئی زندگی کا احساس ان کے لیے بہت خوش آئند تھا۔ بکھرا بکھرا سا خاندان ایک لڑی میں پرونے کے لیے بہانہ انہیں مل گیا تھا۔ جذبات میں ایک خواہ مخواہ کی نرمی در آئی تھی۔ اس وقت گہری رات ہو چلی تھی۔ جب وہ سلامت نگر پہنچ گئے۔

اگلی صبح فرح کا دل بہت مچل رہا تھا کہ وہ حویلی جائے اور یہ خوشخبری انہیں بھی سنا دے۔ اس کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی کہ انہیں فون ہی کر دیتی۔ اسے یہ احساس اچھی طرح ہو گیا تھا کہ شعیب حویلی والوں سے رابطہ رکھنا اور تعلق بڑھانا پسند نہیں کرتا۔ اس کی شدت تبھی سامنے آئی تھی جب وہ یہاں سے نکلنے لگے تھے۔ راستے میں اس نے تہیہ کر لیا تھا کہ وہ خود حویلی والوں سے رابطہ نہیں کرے گی۔ اور اب جو بھی تعلق ہوگا وہ شعیب کے

ذریعے ہی سے ہوگا۔ اب اس کی ترجیح شعیب تھا۔ جس کے ساتھ اس نے اپنی زندگی بتانا تھی تب سے اگر اس نے رابطہ نہیں کیا تھا تو حویلی والوں نے بھی فون نہیں کیا تھا۔ ممکن ہے انہوں نے شعیب کے ساتھ رابطہ کیا ہو، اگر ایسا ہوا تھا تو اسے نہیں بتایا گیا تھا۔ اس لیے وہ بھی یہ بھول گئی تھی اس نے خود حویلی والوں سے رابطہ کرنا ہے۔ اب جبکہ وہ سلامت نگر آگئی تھی۔ تب نجانے ان فضاؤں میں کچھ ایسا تھا کہ حویلی جانے کو جی مچل گیا۔ مگر اس نے لب پر کوئی حرف نہیں آنے دیا۔ ناشتہ وغیرہ کروانے کے بعد جب شعیب کو تیار کروایا تو اس دوران اس نے اپنی خواہش کا اظہار جھجکتے ہوئے کیا۔

''کیا آپ نے حویلی والوں کو نئے مہمان کے آنے کے بارے میں بتادیا ہے۔۔''

''نہیں، میں نے تو نہیں بتایا، ممکن ہے امی نے بات کی ہو، ان سے پوچھ لو۔۔'' یہ کہہ کر اس نے غور سے فرح کے چہرے پر دیکھا اور بڑی نرمی سے کہا۔ ''اگر تم جانا چاہتی ہو تو چلی جاؤ۔''

''لیکن آپ کیوں نہیں جاتے؟'' نجانے کیوں اس کے منہ سے سرسراتے ہوئے لفظ پھسل گئے۔ تب پہلی بار شعیب نے اسے خشمگیں نگاہوں سے دیکھا۔ چند لمحے یونہی تکتا رہا، پھر دھیمے لہجے میں انتہائی نرمی سے بولا۔

''فرح یہ ایک ایسا مسئلہ ہے کہ جس کی کوئی وجہ نہ ہوتے ہوئے بھی میرا حویلی جانے کو دل نہیں کرتا۔ میں چاہنے کے باوجود بھی اپنے آپ کو مطمئن نہیں کر پاتا۔ ایسی جگہ، جہاں جا کر میں بے چینی محسوس کروں۔ تم مجھے وہاں جانے کے لیے کہہ رہی ہو۔''

''جب آپ جائیں گے تو یہ بے چینی بھی دور ہو جائے گی۔'' یہ کہتے ہوئے اچانک وہ چونک گئی اور تشویش زدہ لہجے میں گویا ہوئی۔ ''کہیں آپ نادیہ کی وجہ سے تو نہیں۔۔''

''ممکن ہے لاشعوری طور پر ایسی ہی کوئی وجہ ہو۔ مگر میرے ذہن میں تمہارے باپ کا رویہ ہے۔ وہ حاکمیت پسند ہے، اور ایسی کوئی وجہ نہیں کہ میں اس کی حاکمیت اپنے اوپر مسلط کرلوں۔ میں مانتا ہوں کہ میرا اس سے میری ماں کی وجہ سے رشتہ ہے، لیکن یہ رشتہ بھی نہیں رہا۔ میرے ہوش سنبھالنے سے لے کر اب تک میرا دوسرا تعلق اس سے یہ بنا کہ اس نے ناجائز کام کروانا چاہا۔ اس وجہ سے اس نے مجھے بلیک میل کیا۔ اور تیسرا تعلق تمہاری وجہ سے بنا، تم اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر کہو، کیا اس نے اس تعلق کو بھی دل سے قبول کیا؟ اگر کیا ہے تو کوئی ایک دلیل دو۔۔'' شعیب نے بڑے ٹھہرے ہوئے انداز میں اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''نہیں میرے پاس کوئی ایسی ایک دلیل نہیں ہے۔'' فرح نے صاف گوئی سے کہا۔

''پھر بھی میرا حویلی جانے کا جواز بنتا ہے؟'' اس نے اسی دھیمے لہجے میں پوچھا۔

''نہیں بنتا۔'' اس نے صاف لہجے میں کہا۔

''دیکھو۔ میں تمہارے باپ جتنا امیر نہیں ہوں۔ نہ ہی میرا وہ اسٹیٹس ہے جو اس کا ہے۔ میرے پاس مریدین کی قوت بھی نہیں، مگر اس کے پاس ہے، وہ کل میرے خلاف سلامت نگر میں جلوس نکلوا دے اور میرا تبادلہ ہو جائے۔ مجھے کرپٹ اور بے ایمان ثابت کر دے۔۔۔ میں۔۔۔''

''نہیں وہ ایسا نہیں کریں گے۔۔'' فرح تیزی سے بولی۔

''میں جانتا ہوں کہ وہ نہیں کرے گا۔۔ اس وقت تک نہیں جب تک میں کرپٹ نہیں ہو جاتا۔ خیر۔ میں کہنا تم سے یہ چاہ رہا تھا کہ اسٹیٹس کا فرق اس نے رکھا۔ وہ پیر سائیں ہے، جاگیردار ہے، سیاست دان ہے، لیکن ایک بیٹی کا باپ نہیں ہے۔ ورنہ وہ اب تک ایک بار ہی سہی یہاں ضرور آتا۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں۔''

''نہیں آپ غلط نہیں کہہ رہے ہیں۔'' فرح نے بات سمجھتے ہوئے کہا۔

''اب تم خود بتاؤ۔ جب اس نے وہ فرق رکھا ہوا ہے۔ جس میں تمہاری تضحیک ہو تو کیا مجھے حویلی جانا چاہئے۔ کیا اس تضحیک کو میں قبول کرلوں اور تمہارے باپ کے حضور جا کر گڑگڑاؤں کہ مجھے اپنا داماد دل سے تسلیم کرلیں۔'' اس بار اس کے لہجے میں تلخی آگئی۔ جس پر وہ خاموش رہی تب وہ بولا۔ ''دیکھو فرح۔! میں نے وہ وقت بھی دیکھا ہے کہ جب میرے پاس کچھ بھی نہیں تھا اور میں چھوٹی چھوٹی چیزوں کو بھی ترس جایا کرتا تھا اور

ایسا وقت بھی دیکھا ہے، جب میری ضروریات سے اتنا زیادہ مل جایا کرتا تھا کہ کوئی خواہش نہیں رہتی تھی۔ یاد رکھو۔!لالچ اور خواہش میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ لالچ بڑھتا ہی چلا جایا کرتا ہے اور خواہشیں پوری ہو جاتی ہیں۔ میرے خیال میں تم میری بات سمجھ گئی ہوگی۔'' آخری لفظ کہتے ہوئے شعیب کے لہجے میں پھر وہی نرمی اور تحمل در آیا تھا۔ فرح کچھ نہیں بولی اور خاموشی کے ساتھ کمرے سے نکل گئی۔ کچھ دیر بعد وہ بھی آفس چلا گیا۔

فرح سارا دن شعیب کی باتوں کو سوچتی رہی۔ اس دن وہ زبیدہ کے پاس بھی بہت کم بیٹھی۔ زیادہ تر اپنے کمرے میں بند رہی۔ زبیدہ نے بھی اسے نہیں پوچھا۔ اس کے ذہن میں تھا کہ ممکن ہے تھکن ہو۔ یا پھر طبیعت ٹھیک نہ ہو۔ اس نے خود ملازمین سے کہہ کر دوپہر کا کھانا بنوالیا۔ دوپہر سے تھوڑی دیر قبل وہ ہونقوں کی طرح اپنے کمرے سے نکلی اور سیدھی زبیدہ کے پاس آئی۔ وہ کافی شرمندہ سی لگ رہی تھی۔

''سوری پھوپھو۔! میری آنکھ لگ گئی تھی۔۔ کھانے کو دیر ہوگئی۔۔''

''تم جاؤ، نہاؤ دھوؤ اور تیار ہو جاؤ۔ کھانے کی فکر نہ کرو۔ وہ بن جائے گا۔'' زبیدہ نے پیار سے کہا تو اسے اطمینان ہوگیا۔ وہ پلٹ کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔

شام کب کی ڈھل گئی تھی۔ شعیب کچھ دیر قبل گھر آ کر دوبارہ نکل گیا تھا۔ پوچھنے پر یہی بتایا تھا کہ کوئی ضروری کام ہے۔ پھر انتظار بڑھتا گیا اور وہ اس وقت واپس پلٹا جب رات کافی گہری ہوگئی تھی۔ وہ اس کے انتظار میں جاگ رہی تھی۔ لیکن ڈھلتی شام سے رات گہری ہو جانے تک عجیب قسم کے وسوسوں کا شکار ہو گئی۔ اگرچہ شعیب نے اسے بڑے تحمل سے سمجھایا تھا لیکن آج ہی اس نے بات کی اور آج ہی اس کے معمولات میں فرق آ گیا۔ بلاشبہ اس نے جو گھر میں وقت نہیں گذارا، اسے میرا پوچھنا اچھا نہیں لگا ہوگا۔ وہ جس قدر ممکن ہے مجھ سے دور رہ کر اس بات کو بھلانے کی کوشش کر رہا ہوگا۔ کیا میں اپنے ہی ہاتھوں اپنے چمن کو آگ لگا رہی ہوں۔ کیا یہ میرا عمل درست نہیں تھا۔ ایسا تو تب ہوتا ہے کہ جب وہ کسی سے شدید قسم کی نفرت کر رہا ہو۔ کیا اسے حویلی والوں سے نفرت ہو چکی ہے۔، کیا وہ محض نادیہ کی وجہ سے نہیں جا رہا یا بابا سائیں کی وجہ ہے۔۔ اس نے جھوٹ بولا یا پھر سچ کہا۔ وہ ان سوچوں کا اظہار زبیدہ پھوپھو سے بھی نہیں کر پا رہی تھی۔ اس کے لیے نفرت ایک معمولی سی بات تھی لیکن کیا محبت میں بدگمانی کا زہر گھل گیا۔ کیا اب شعیب مجھ سے متنفر ہو گیا۔ کیا اب اس کا رویہ پہلے جیسا نہیں رہا۔ کیا میں اپنی بنتی سنورتی زندگی کو شک اور بدگمانی کی بھینٹ چڑھا دوں گی۔ میں نے اگر ضد کی تو کیا وہ مزید مجھ سے دور ہو جائے گا۔ ایسے ہی نجانے کتنے سوال اس کے ذہن میں گردش کرتے رہے اور وہ خوف کے مہیب سناٹوں میں یوں پھیلتی گئی کہ خود کو روکنا بھی چاہا تو نہ کر سکی۔ اور جس وقت وہ پلٹ کر گھر میں آیا تو وہ انتہائی خوف زدہ ہو رہی تھی۔ وہ ٹائی کی گرہ کھولتے ہوئے اس کی طرف غور سے دیکھ رہا تھا۔ پھر تشویش بھرے لہجے میں پوچھا۔

''کیا ہوا ہے تمہیں۔ تمہارا رنگ اتنا پیلا کیوں ہو رہا ہے؟''

چاہتے ہوئے بھی وہ جواب نہ دے سکی۔ لفظ اس کے منہ ہی سے نہیں نکل پائے تھے۔ وہ بہت کچھ کہنا چاہ رہی تھی لیکن پوری کوشش کر کے بھی نہ کہہ پائی۔ پھر اس سے مزید کچھ ہو نہ سکا تو وہ شعیب کے سینے سے جا لگی۔ آنسو تھے کہ ساون بھادوں کی مانند برسنے لگے۔ اس نے بڑے پیار سے اسے تھام لیا اور پھر اسے تھپکتے ہوئے پرسکون لہجے میں پوچھا۔

''فرح پلیز۔! بتاؤ کیا بات ہے۔ امی نے کچھ کہا۔''

''نہ۔۔ نن۔۔ نہیں۔۔ انہوں نے کچھ نہیں کہا۔''

''تو پھر کیا بات ہے۔۔'' اس نے اسے کاندھوں سے پکڑا اور بیڈ پر بٹھا لیا۔ وہ اس وقت تک خود پر قابو پا چکی تھی۔ اس نے دھیرے دھیرے اپنے ذہن میں چلنے والی شک کی آندھیوں کے بارے میں بتانا شروع کر دیا۔ وہ کہتی چلی جا رہی تھی اور وہ آہستہ آہستہ مسکراتا چلا جا رہا تھا۔ وہ جب کہہ چکی تو شعیب نے اس کے سر پر ہلکی سی دھپ مارتے ہوئے کہا۔

''اتنی سی بات پر خود کو ہلکان کر رہی ہو۔۔ صبح کی بات تو میں اسی وقت ختم کر کے چلا گیا تھا۔ وہ تو میرے

ذہن میں بھی نہیں۔ ہاں بس آج اتفاق ہی تھا جو میں اتنی دیر گھر سے باہر رہا، اب تو کئی دن تک ایسا چلے گا۔ اتنی چھٹیاں بھی تو گزار کر آئے ہیں۔ میں نوکر پیشہ بندہ ہوں۔ اس طرح کیا تم روزانہ ہلکان ہوتی رہو گی۔"

"مجھے بس آپ کا اعتماد چاہیے۔۔۔ میں۔۔۔ اور کچھ نہیں چاہتی۔۔۔" وہ لرزتے ہوئے لہجے میں بولی۔

"اب بتاؤ۔۔ تمہیں کیسا اعتماد چاہیے۔ اب اس سے زیادہ تمہیں اور اعتماد کیا دوں۔۔ کہ تم اب میرے بچے کی ماں بننے والی ہو۔۔" وہ مسکراتے ہوئے بولا تو فرح کو اس پر ڈھیروں پیار آ گیا۔ وہ اُس کے کاندھے سے لگ گئی۔ "اچھا۔! اب مجھے کپڑے بدلنے دو۔ تم جاؤ اور اچھی سی چائے بنا کر لاؤ۔ پھر دونوں مل کر پیتے ہیں اور باتیں کرتے ہیں۔"

"میں ابھی لے کر آتی ہوں۔" وہ جلدی سے اٹھ گئی۔

"نہیں یہاں نہیں۔ اوپر چھت پر۔ آج چاندنی بہت زیادہ ہے۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا اور اٹھ کر شرٹ بدلنے لگا۔ وہ بڑے اعتماد کے ساتھ کچن کی جانب چل دی۔

☆......☆......☆

حویلی میں بھونچال آ گیا تھا۔ اماں بی سکتے میں تھیں۔ زہرہ بی کی خاموشی طویل ہو گئی اور پیر سائیں کی تو جیسے دنیا ہی اندھیر ہو گئی تھی۔ نادیہ نے جب سنا تو ایک لمحے کے لیے اس کے من میں دکھ کی لہر اٹھی اور پھر وہ پہلے کی مانند وہی سکوت اس پر طاری ہو گیا۔ ظہیر شاہ نے نادیہ کے لیے طلاق بھجوا دی تھی۔

"یہ تم نے کیا کیا بے وقوف اپنے پاؤں پر خود ہی کلہاڑی ماری۔۔" پیر سائیں نے فون پر چیختے ہوئے کہا۔

"میں نے آپ سے کہا تھا کہ آپ اسے الگ کر دیں۔ حویلی سے نکال دیں۔۔ تب میں آؤں گا۔" وہ عام سے لہجے میں بولا۔

"وہ حویلی میں رہتی ہے یا نہیں رہتی۔ مگر اس کا طلاق سے کیا تعلق ہے۔" اس پر اسے شدید غصہ آ گیا تھا۔

"وہ میری دنیا میں آئی ہی نہیں تھی۔ میرا اس سے کوئی تعلق ہی نہیں ہے تو پھر میں اسے باندھ کر کیوں رکھوں۔۔ جب تک وہ میرے نام سے بندھی رہتی، آپ اسے حویلی سے نکال ہی نہیں سکتے تھے۔ اب یہ آپ کا امتحان ہے، آپ نے مجھے اپنے پاس بلانا ہے تو اسے حویلی سے نکالنا ہو گا۔ ورنہ میں نہیں آؤں گا حویلی میں۔" اس نے انتہائی سخت انداز میں کہا تو پیر سائیں کو ہوش آیا۔ ظہیر شاہ کی بات کو اس نے اہمیت ہی نہیں دی تھی، محض اپنی ضد منوانے کے لیے اسے حکم پر حکم دیتا چلا جا رہا تھا، جس کا نتیجہ اس کے سامنے آ گیا۔

"تو اتنا ہی کمزور ہے کہ ایک عورت کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اسے اپنے سامنے نہیں جھکا سکا۔" پیر سائیں دھاڑا۔

"میرا اُس سے مقابلہ بنتا ہی نہیں ہے تو کیا جیت اور کیا ہار۔۔۔ مجھے اس سے کوئی اعتراض ہی نہیں ہے۔ اور پھر جس کے ساتھ میں نفرت کرتا ہوں۔ میں اسے اپنی زندگی میں نہیں رکھ سکتا۔" اس نے واقعتاً نفرت انگیز انداز میں کہا۔

"یہ تو نے اچھا نہیں کیا ظہیر شاہ، تمہارے اس فیصلے کا نتیجہ بہت غلط بھی ہو سکتا ہے تمہارے حق میں۔" پیر سائیں نے اسے احساس دلایا۔

"میں نے بہت سوچ سمجھ کر یہ فیصلہ کیا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ آپ مجھے عاق بھی کر سکتے ہیں تو کر دیں۔ جب تک وہ حویلی میں ہے، میں وہاں قدم نہیں رکھوں گا۔ میں یہیں رہ جاؤں گا۔" اس نے تحمل سے کہا۔

"تم صرف اپنے اکلوتے ہونے کا فائدہ اٹھا رہے ہو۔ مت سمجھنا کہ میری حکم عدولی کر لو گے تو میں تمہیں معاف کر دوں گا۔ اب تم چاہو بھی تو حویلی میں نہیں آ پاؤ گے۔ یہ میری حتمی فیصلہ ہے۔۔" پیر سائیں نے کہا اور فون بند کر دیا۔ وہ بے جان سا ہو کر دیوار کے ساتھ لگ گیا۔ وہی خاص کمرہ جو اس کے لیے بہت پرسکون ہو اکرتا تھا، اس دن وہی اسے قید خانہ لگ رہا تھا۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ زندگی بھر کی کمائی وہ لٹا چکا تھا۔ زندگی میں پہلی بار اس نے بڑے مان اور اعتماد کے ساتھ جس کے لیے سب کچھ کرنے کی کوشش کی تھی، وہی سے یوں دھوکا دے جائے گا۔ یہ تو اس نے سوچا نہیں تھا۔ پہلی بار اسے شکست کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ اور یہ شکست اس لیے بھی زیادہ دکھ دے رہی تھی وہ اسے اپنے بیٹے ہی کے ہاتھوں ملی تھی۔ جس کا سب کچھ چھین لینا چاہتا تھا۔ وہ

اب بھی پورے وقار اور طمطراق کے ساتھ حویلی میں موجود تھی اور جس کے لیے چھین لینا چاہتا تھا، اس پر حویلی کے دروازے اس نے خود ہی بند کر دیے تھے۔ پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ صیاد اپنے دام میں خود ہی آ گیا تھا۔ اس نے جو چاہا تھا اس کے برعکس ہو گیا تھا۔ اپنوں کے ہاتھوں سے لگا ہوا زخم کاری ہوتا ہے۔ جو بندے کو سلب کر دیتا۔ پھر ایسا وار جس سے بندہ بھی داماں ہو جائے۔ ہار جانے کا دکھ، اکلوتا بیٹا کھو جانے کا دکھ اور پھر سب سے بڑی بات تہی داماں ہونے کا دکھ، اسے سانس نہیں لینے دے رہا تھا۔ یہ کیا ہو گیا تھا۔ اسے خود سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ اس سے اچھا تھا کہ نادیہ کو شعیب ہی کے ساتھ بیاہ دیتا، اس کی بیٹی تو بچ جاتی۔ اب وہ بھی اس نے زبیدہ کے ہاتھ میں دے دی تھی۔ وہ جو چاہے اس سے انتقام لے۔ اب چاہے تو وہ بھی اسے چھوڑ دے۔ کیا ہوگا؟ یہ سوال اس کے لیے سوہان روح بن گیا تھا۔ وہ انہی سوچوں میں غلطاں تھا کہ حویلی سے بلاوا آ گیا۔ دیوان نے انتہائی ادب سے کہا۔

''اماں بی حویلی میں یاد کر رہی ہیں۔''

اسے معلوم تھا کہ وہ کیا کہیں گی۔ اس سے یہی سوال ہوگا کہ ظہیر شاہ نے کیا کیا۔ بیٹے کے عمل کا جواب دہ وہ خود تھا۔ حالانکہ وہ یہ نہیں چاہتا تھا۔ وہ اٹھا اور حویلی کی طرف جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ واضح طور پر اس نے محسوس کیا کہ اس کے وجود میں جان نہیں رہی ہے۔ وہ جو ہر وقت خود کو زندگی سے بھرپور خیال کیا کرتا تھا، بیٹے کے ساتھ ایک فون کال کے بعد خود کو انتہائی ناتواں محسوس کرنے لگا تھا۔ وہ حویلی کی جانب چل پڑا۔ حویلی میں داخل ہوتے ہوئے وہ پہلی بار شرمندگی کے بوجھ تلے دبا ہوا تھا۔ کیا منہ دکھائے گا وہ جا کر۔ جس کے لیے اتنا کچھ کیا، اس کا نتیجہ کیا نکلا۔؟

اماں بی صوفے پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ پیر سائیں خاموشی سے ان کے برابر والے صوفے پر بیٹھ گیا۔ چند لمحے یونہی گزر گئے۔ ان کے درمیان کوئی بات نہیں ہوئی جیسے وہ ایک دوسرے سے بات کرنے کے لیے خود کو تیار کر رہے ہوں۔ آخر اس خاموشی کو اماں بی نے ہی توڑا۔

''یہ بہت ظلم ہوا نادیہ پر دلاور شاہ۔۔۔''

وہ اماں بی کا لہجہ سن کر چونک گیا۔ اس میں آگ ہی آگ تھی۔ پہلی بار ایسا لہجہ جس میں آگ کے ساتھ تذلیل کر دینے والی انتہا تھی۔ اس نے پوری قوت صرف کرتے ہوئے جواباً کہا۔

''ہاں واقعی، ظلم ہوا۔۔۔''

''یہ ظلم تم نے کیا ہے دلاور شاہ۔۔ اس یتیم بچی کے ساتھ جو تم نے کیا۔ اس کا بدلہ وہ کمزور تو نہیں لے سکتی اس کا بدلہ تو تم سے خدا ہی لے گا۔ لیکن میں تمہیں معاف نہیں کروں گی۔۔ بالکل بھی نہیں کروں گی۔۔''

''اماں۔! میں نے تو ان کی بھلائی ہی چاہی تھی۔ آپ بھی سمجھتی ہیں کہ میری نیت ٹھیک تھی۔'' اس نے صفائی پیش کرنا چاہی تو اماں بی نے دھاڑتے ہوئے کہا۔

''غلط۔! بالکل غلط کہہ رہے ہو دلاور شاہ۔ تمہاری نیت ہی تو ٹھیک نہیں تھی۔ اس بچی کی جائیداد ہتھیانے کی خاطر تم نے یہ سارا کھیل رچایا تھا۔ کیا انجام ہوا اس کا۔۔۔ تمہارے ہی بیٹے نے طلاق بھیج دی۔ میں پوچھتی ہوں کیا جرم تھا اس بن ماں باپ کی بچی نے۔ آج اگر اس کا باپ زندہ ہوتا۔۔۔ تو میں دیکھتی تیری اور تیرے بیٹے کی جرات کیا ہوتی کہ تم لوگ ایسا کر سکتے۔۔۔''

''میں نے اسے سزا دے دی ہے۔ میں نے اسے حویلی میں داخل ہونے سے روک دیا ہے۔'' پیر سائیں نے دھیمے لہجے میں بتایا۔

''تم نے نہیں، اس نے خود حویلی آنے سے انکار کر دیا ہے۔ ابھی اس نے اپنی ماں سے ساری بات کر لی ہے۔ یہ سب تیرے کیئے کا پھل ہے۔ تیری اکلوتی اولاد تجھے چھوڑ گئی۔ ابھی تو تیرے ساتھ پتہ نہیں کیا کچھ ہونا ہے۔ تو دیکھتا جا۔''

''اماں آپ مجھے ہی قصوروار ٹھہرا رہی ہیں۔ یہ ان دونوں کے درمیان ہونے والے جھگڑے کا نتیجہ ہے۔'' پیر سائیں چیخ پڑا۔

''اس جھگڑے کی بنیاد کون ہے۔ وہ بچی بے چاری چیختی رہی۔ چلاتی رہی۔ اس نے منع بھی کیا۔ لیکن۔۔۔ لیکن کیا تم اس سے انکار کر سکتے ہو کہ تم نے ضد نہیں کی۔۔ تم نے اس شادی کو انا کا مسئلہ نہیں بنایا۔ تم نے ہر وہ جائز و ناجائز کوشش نہیں کی جو تم کر سکتے تھے۔۔ اب کیا ہوا۔۔ تیرا ہی لالچ تیرے منہ پر آن

پڑا ہے۔'' اماں بی شعلہ جوالہ بن گئی تھیں۔

''اب کیا ہو سکتا ہے اماں۔۔۔ مجھے بتاؤ اس کا حل کیا ہے۔'' پیر سائیں نے زچ ہوتے ہوئے کہا۔

''حل۔ امیں کیا بتا سکتی ہوں حل۔۔۔ اب تو فیصلہ ہو چکا۔۔اب جو کچھ بھی کرے گی، نادیہ ہی کرے گی۔ میری طرف سے تو یہی سزا ہے تمہیں کہ تم فوراً سے پیشتر یہ حویلی خالی کر کے چلے جاؤ۔ میں تمہیں یہاں برداشت نہیں کر سکتی۔ یا پھر میں اپنی پوتی کو لے کر کہیں بھی چلی جاؤں گی۔'' اماں بی نے شعلہ برساتی ہوئی آواز میں جب حتمی لہجے میں کہا تو وہ چونک گیا۔ اس نے تو سوچا بھی نہیں تھا کہ یہ عتاب اس پر آ جائے گا۔ حویلی چھوڑنے کا مطلب کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ وہ کوئی بھی چھوڑتا، وہ خود اپنی بیوی کو لے کر جاتا تو سارے زمانے میں، مریدین میں، سیاست دانوں اور جاگیرداروں میں اس کی کیا وقعت رہ جاتی۔ اور اگر اس کی ماں، اماں بی اور بھتیجی جواب اس کی بہو بھی تھی۔ وہ اگر حویلی چھوڑ کر چلی جاتی ہیں تو پھر وہ کسی کو منہ دکھانے کے لائق نہیں رہتا تھا۔ وہ ایک ایسی صورت حال میں پھنس گیا تھا کہ نہ نگلنے بنتی تھی اور نہ اگلتے۔ لمحہ بھر میں جو اس نے چشم تصور میں آئندہ آنے والے دنوں کے بارے میں سوچا تو کانپ کر رہ گیا۔ اب تک کی بنی بنائی ساری عزت خاک میں مل جانے والی تھی۔ وہ جو ایک عقیدت مندی کا تصور اس کے ساتھ جڑ گیا تھا، اب کہاں رہتا۔ یہی وہ وقت تھا جسے سنبھالنا بہت ضروری تھا۔ اس نے اپنے لہجے میں حد درجہ درد بھرتے ہوئے کہا۔

''اماں بی۔ اظہیر شاہ کی غلطی کی سزا آپ مجھے کیوں دے رہی ہیں۔ میں نے تو کبھی ایسا نہیں چاہا تھا اور نہ ہی چاہ سکتا ہوں۔''

''تم نے اگر اتنی ضد کر کے، اپنی انا کا مسئلہ بنا کے ظہیر کی شادی نادیہ سے کی تھی تو اس کے

ذمہ دار تم ہو۔ وہ بے چاری ایک رات کی سہاگن نہیں اور اسے طلاق یافتہ بنا کر رکھ دیا۔ اس نے کیا جرم کیا تھا تیرا۔ کیا قصور ہے اس بچی کا، کیوں مسلسل اسے ظلم کا شکار کر رہے ہو۔'' اماں بی پھٹ پڑیں۔

''اماں۔۔! مجھے معاف کر دیں۔ میں آپ سے معافی مانگتا ہوں۔'' اس نے گڑگڑاتے ہوئے کہا۔

''مجھ سے کیا معافی مانگتا ہے تم نے۔۔ اس یتیم سے معافی مانگو جس پر تم نے ظلم کیا۔۔۔ وہ اگر معاف کر دیتی ہے تو کر دے۔۔۔ لیکن اگر اس نے تمہیں معاف نہیں کیا تو میں ہر حال میں اس کے ساتھ کھڑی ہوں۔۔ یہ یاد رکھنا۔۔ جو میں نے کہا ہے۔۔ اب وہی ہونا ہے۔۔''

''آپ نادیہ کو بلائیں۔ امیں آپ کے سامنے اس سے معافی مانگتا ہوں۔'' پیر سائیں نے انتہائی لجالت سے کہا۔

ایسا کہتے ہوئے اس نے کچھ فاصلے پر کھڑی نوکرانی کو اشارہ کر دیا کہ وہ نادیہ کو بلا لائے۔ وہ فوراً ہی وہاں سے چلی گئی۔ ان دونوں میں خاموشی چھا گئی۔ کسی نے ایک لفظ بھی کچھ نہ کہا جیسے کچھ کہنے کے لیے ان کے پاس لفظ نہ ہوں۔ کتنا ہی وقت یونہی گذر گیا۔ تبھی سفید لباس اور سفید آنچل میں ملبوس نادیہ وہاں آ گئی۔

اس نے کافی حد تک اپنا چہرہ چھپایا ہوا تھا۔ اس نے آتے ہی کہا۔

''جی پیر سائیں۔!''

''بیٹی۔! میں ظہیر شاہ کے رویے پر ہاتھ جوڑ کر تم سے معافی مانگتا ہوں۔۔۔ اس نے جو کیا، غلط کیا۔ میں نے اسے حویلی میں قدم رکھنے سے منع کر دیا ہے۔ میں اب اسے عاق بھی کر دوں گا۔۔'' پیر سائیں نے انتہائی دکھ بھرے لہجے میں کہا۔

''یہ تو آپ کا فیصلہ ہے نا۔۔ آپ جو چاہیں کریں۔۔'' نادیہ نے سنتے ہوئے چہرے سے کسی بھی جذبے سے عاری لہجے میں کہا۔

''کیا مطلب بیٹی۔! میں جو تم سے معافی مانگ رہا ہوں۔۔'' وہ تیزی سے بولا۔

''کیا اس طرح معافی مانگنے سے میرا طلاق یافتہ ہونے کا داغ مٹ جائے گا۔؟'' اس نے پرسکون لہجے میں کہا تو وہ ایک دم سے بھونچکا رہ گیا۔ اسے امید نہیں تھی کہ نادیہ اس سے ایسا سوال کرے گی۔ جس کا اس کے پاس کوئی جواب نہیں ہو گا۔ وہ حیرت اور اذیت سے اس کی طرف دیکھتا رہا پھر دھیمے سے شرمندگی بھرے لہجے میں بولا۔

''میں مانتا ہوں بیٹی کہ اس نے بڑا ظلم کیا۔۔ اسے

ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ اسے یہ۔۔۔''

''نہیں چاہیے تھا کہ حویلی کی روایات کو توڑتا۔۔۔ اس نے ان روایات کو توڑا۔ آپ کے بیٹے نے مجھے آزاد کر دیا۔۔۔ اور خود بھی آزاد ہو گیا۔ پیر سائیں۔! میں یہ جانتی ہوں کہ اسے آپ نے آنے سے منع کیا ہے یا نہیں کیا۔۔۔ لیکن وہ اس وقت تک یہاں نہیں آنا چاہتا تھا جب تک میں یہاں پر ہوں۔۔۔ کیا آپ اس سے انکار کرتے ہیں۔۔؟'' اس بار نادیہ کے لہجے میں کافی حد تک غصہ اتر آیا تھا۔ تب وہ بولا۔

''میں سمجھا شاید وہ صرف اپنی بات منوانے کے لیے ایسی بات کر رہا ہے۔۔''

''اس نے جو کر دیا۔ یہ اس کا فیصلہ تھا اب جو میں کروں گی۔ یہ میرا فیصلہ ہوگا۔ یہ ٹھیک ہے کہ آپ میرے چاچا ہیں۔ اس رشتے سے میں انکاری نہیں ہوں۔ لیکن جو سلوک آپ نے اور آپ کے بیٹے نے میرے ساتھ کیا۔ اب اس کے بعد آپ کو مجھ پر کوئی مان نہیں رہا۔ اب آپ مجھ پر کوئی پابندی نہیں لگا سکتے۔ اماں اگر جانا چاہتی ہے تو میرے ساتھ چلیں ورنہ میں نے تو یہاں سے جانا ہی ہے۔ ایک طلاق یافتہ عورت اپنے سسرال کیسے رہ سکتی ہے۔'' اس دفعہ نادیہ کے لہجے میں اعتماد تھا جیسے وہ انتہائی پختہ ارادہ کر چکی ہو۔

''یہ کیا کہہ رہی ہو بیٹی۔! تم اسی طرح حویلی کی بیٹی ہو۔ جیسے پہلے تھی، تم کیوں حویلی چھوڑ کر جاؤ گی۔'' پیر سائیں نے سارے جہاں کی شفقت اپنے لہجے میں بھرتے ہوئے کہا۔

''وہ اس لیے پیر سائیں کہ مجھے اب اپنے والدین کا سوال بھی کرنا ہے۔۔۔ مجھے یہ معلوم کرنا ہے کہ انہیں قتل کیوں کیا گیا۔۔۔؟'' نادیہ کے لہجے میں چٹانوں جیسی سختی تھی۔ اس کا اتنا کہنا ہی تھا کہ پیر سائیں یوں چونکا جیسے اس نے اپنے سامنے زہریلا ناگ دیکھ لیا ہو۔

''تمہارے ذہن میں یہ زہر کس نے بھر دیا نادیہ۔۔! وہ تو ایک حادثے میں اللہ کو پیارے ہو گئے تھے۔ اور یہ ایک ایسا المیہ تھا کہ۔۔۔''

''جھوٹ بولتے ہیں آپ۔۔۔ وہ حادثہ نہیں تھا، انہیں قتل کیا گیا ہے۔ اگرچہ اس وقت میرے پاس ثبوت نہیں ہے۔ لیکن بہت جلد میں اپنے ماں باپ کے قاتل کے گلے میں پھندا ڈال دوں گی۔۔۔ اور آپ مجھے ایسا کرنے سے نہیں روک سکتے۔۔۔'' نادیہ نے تیز لہجے میں کہا۔

''میں تمہیں کہہ رہا ہوں نا کہ ایسا کچھ نہیں ہوا۔'' پیر سائیں نے چیخ کر کہا۔

''آپ کس ناتے سے مجھے یہ بات کہہ رہے ہیں؟'' اس نے انتہائی طنزیہ انداز میں پوچھا۔ تو پیر سائیں کو چپ لگ گئی۔ اس سے ایک لفظ بھی نہیں کہا گیا۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ چند لمحے خاموشی کے بعد وہ بولی۔ ''سنو پیر سائیں۔! میں نے اپنی عدت کے دن گزارنے ہیں۔ وہ میں کہیں بھی گزار لوں گی۔ اس کے بعد میں نے اپنے والدین کے قاتلوں کی تلاش میں لگ جانا ہے۔ میں بڑی آسانی کے ساتھ شعیب سے شادی کر سکتی تھی۔ میں لاہور ہی سے نہ آتی۔ اور اگر میں لاہور زبیدہ پھوپھو کے پاس نہ پہنچ جاتی تو شاید مجھے معلوم ہی نہیں ہونا تھا کہ میرے والدین کو قتل کیا گیا ہے۔ میں بھی اسے حادثہ ہی تصور کرتی رہتی۔ میرا سوال یہ ہے کہ مجھے یتیم کیوں کیا گیا؟ کیا مجھے یہ سوال پوچھنے کا حق نہیں ہے؟ میں نے شعیب کو انکار ہی اس لیے کیا ہے کہ وہ مجھ سے شادی نہ کرے اور میں اپنے والدین کے قاتلوں کی تلاش کر سکوں۔ یہ میرا حق ہے اور میرے اس حق سے مجھے کوئی بھی دستبردار نہیں کر سکتا۔'' نادیہ جس طرح لفظ کہتی چلی گئی تھی۔ پیر سائیں کا رنگ فق ہوتا چلا گیا۔ اسے یہ بالکل بھی سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ جواب میں کیا کہے۔ ان کے درمیان خاموشی طاری ہو گئی تھی۔ وہ جس سے معافی کا طلب گار تھا۔ وہی اسے تعزیر سنا رہی تھی۔ بڑی مشکل سے اس نے روہانسا ہوتے ہوئے کہا۔

''نادیہ بیٹی۔! کیا تم یہ سب بھول نہیں سکتی۔ تم جو چاہو۔ میں ہی ماننے کو تیار ہوں۔ دیکھو۔ اب تک جو حویلی کی عزت و وقار بن چکا ہے۔ خدا کے لیے اسے داؤ پر مت لگاؤ۔ تمہیں اس میں کچھ حاصل ہو یا نہ ہو۔ قاتل مل سکیں گے یا نہیں، اس سے ہٹ کر دشمن اسی تاک میں ہیں کہ ذرا سی کمزوری ملے تو وہ اس کا فائدہ

اٹھائیں۔ بنا بنایا بھرم ختم ہو جائے گا۔۔۔ظہیر شاہ کی نادانی ہمارے گھر کا معاملہ ہے۔۔اسے ہم خود ہی حل کر لیں گے۔۔حویلی کا بھرم مت توڑو۔۔۔''

''آپ نے اس حویلی کی روایات کو نہیں توڑنے دیا۔ سانس تک سلب کر لیں۔ میں نے آپ کے ہر فیصلے کو تسلیم کیا۔ لیکن کیا میں اپنا حق نہیں مانگ سکتی۔۔کیا آپ میرا حق بھی اب سلب کر لیں گے۔ میں قانون کی مدد تو لوں گی۔۔اب مجھے انصاف ملتا ہے یا نہیں ملتا۔۔یہ اللہ جانے۔۔کیا آپ شرماں مائی کے قتل سے انکار کرتے ہیں؟'' نادیہ نے کہا تو پیر سائیں کی جیسے جان ہی نکل گئی۔ وہ کچھ نہ کہہ سکا اور اس قدر حیرت سے اپنی ماں کے چہرے پر دیکھا۔ جیسے ایک آگ میں جلتا ہوا بچہ اپنی ماں کی ممتا سے مدد کا طلب گار ہوتا ہے۔ اماں بی نے ایک بار بھی اس کی طرف دیکھا، اسی لمحے اس کی نگاہ حسرت ویاس کی تصویر بنی نادیہ پر پڑھی۔ تب اس نے نفرت سے منہ پھیر لیا۔ پیر سائیں اٹھا اور حویلی سے نکلتا چلا گیا۔ وہ بالکل مایوس ہو چکا تھا۔ اسے بالکل بھی امید نہیں تھی کہ حویلی میں بغاوت اس قدر ہو جائے گی کہ اس کا سب کچھ خس و خاشاک کی مانند بہہ جائے گا۔ زندگی میں بہت سارے معاملات، انتہائی کٹھن حالات اور نازک ترین، مسائل سے بھی اس کا واسطہ پڑا تھا۔ لیکن یہ وقت اس پر آن پڑا تھا۔ یہ اس کی اپنی زندگی اور موت کا مسئلہ تھا۔ اس کا دماغ ماؤف ہو گیا تھا۔ وہ بڑی مشکل سے اپنے کمرہ خاص میں آیا۔ اور اس معاملے کر سوچنے لگا۔ جو ہونا تھا وہ تو ہو چکا! لیکن اب آنے والے وقت کو وہ کیسے اپنی دسترس میں کرے گا۔ اس کا شعور اسے خوفناک ترین منظر دکھانے لگا تھا۔ نادیہ اور اماں بی اگر حویلی سے چلی جاتی ہیں تو کیا ہوگا؟ انہوں نے اگر قانون کی مدد لے لی تو پھر رسوائی کس حد تک جائے گی۔ قتل کی تفتیش یا اگر حویلی تک آ گئے تو کیا ہوگا؟ مریدین کا ایک حلقہ جو اس کی عقیدت میں جان دینے کو تیار رہتا ہے، اس کا کیا ہوگا؟ حویلی کی شان و شوکت مٹی میں مل جائے گی۔ جس حویلی کی خواتین نے کبھی باہر قدم نہیں نکالا تھا، وہ اگر تھانے اور عدالتوں میں کھڑی ہو کر اسے کٹہرے میں لا کھڑا کریں گی تو وہ منظر کیا ہوگا؟ وہ نادیہ کو ہی نہیں جواب دہ نہیں ہو سکا تھا تو شرماں مائی کے لواحقین کے سامنے کیا جواب دہ ہوگا۔ وہ چشم تصور سے خود کو عدالت کے کٹہرے میں دیکھ رہا تھا۔ اس کے ہاتھوں میں ہتھکڑی تھی اور نادیہ اس پر الزام لگا رہی تھی، اور اس کی ماں، وہ اس کے خلاف گواہ کے طور پر اسی عدالت میں بیٹھی تھی۔ ایک ایک کر کے وہ سارے چہرے اس کی نگاہ میں آ گئے جن کی آواز دبانے کے لیے اس نے ظلم کیے تھے۔ اس حویلی کی آن بان شان بڑھانے کے لیے جو کچھ اس نے کیا تھا۔ وہی اس کے گلے کا پھندا بن کر اس کے سامنے جھول رہا تھا۔ اچانک اس کے بائیں پہلو میں درد کی شدید لہر اٹھی۔ جس سے اس کا دماغ مفلوج ہو کر رہ گیا۔ ساری سوچیں بس ایک نقطے پر مرتکز ہو گئیں۔ زندگی کا رنگین پرندہ اس کے ہاتھوں سے چھوٹنے لگا۔ ہوس سے بندھے سارے دھاگے ایک ایک کر کے ٹوٹنے لگے۔ حیاتی کے منصوبہ پر موت کی لکیر پھرنے لگی۔ اس نے چاہا کہ دیوان کو آواز دے۔ پوری کوشش بھی کی۔ لیکن حسرت لفظ میں تبدیل نہ ہو سکی۔ لفظ منہ میں ہی سے نہ نکل سکا۔ بس سانس سرسرا کر رہ گئی۔ آنکھوں کے سامنے منظر دھندلانے لگے۔ پھر اسے یوں لگا کہ سارے منظر پگھل گئے ہیں۔ رنگوں کی شناخت ختم ہو گئی۔ سانس کی جو ڈوری تھی اس کو جھٹکے لگنے لگے۔ اس نے ہوا میں سہارا تلاش کرنے کی لاشعور کوشش کی مگر اس کا بے جان ہاتھ زمین پر آ رہا۔ اس کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔

☆☆☆

پیر سائیں کو درگاہ کے احاطہ ہی میں دفنا دیا گیا تھا۔ مریدین کے علاوہ شہر کے عمائدین، سیاست دان و جاگیرداروں کی ایک کثیر تعداد وہاں موجود تھی۔ ظہیر شاہ نہیں پہنچ سکا تھا۔ ہجوم میں چہ میگوئیاں تو ہوئیں۔ لیکن ہر کسی نے اپنی سوچ کے مطابق خود ہی وجہ اخذ کر لی۔ کیونکہ ظہیر شاہ کی جگہ شعیب موجود تھا۔ تجہیز و تکفین اگرچہ دیوان ہی کر رہا تھا۔ لیکن تمام تر معاملات اسی کی زیر نگرانی ہو رہے تھے۔ جس کسی نے دیوان سے پوچھا کہ ظہیر شاہ کیوں نہیں پہنچا تو اس کے پاس ایک ہی بہانہ تھا۔ اس نے لوگوں کو یہی کہا کہ والد صاحب کی اچانک

وفات کا سن کر صدمے سے انہیں دل کا دورہ پڑ گیا ہے۔ وہ لندن ہسپتال میں زیرِ علاج ہیں۔ ڈاکٹروں نے اتنا طویل سفر کرنے سے منع کیا ہے۔ دھیرے دھیرے یہ بات لوگوں میں پھیلتی چلی گئی۔ تاہم شعیب کو دیکھ کر کسی نے بھی اتنا محسوس نہیں کیا تھا۔ سب لوگ اسی سے افسوس کرتے ہوئے چلے گئے تھے۔ زہرہ بی جہاں عدت کے لیے بیٹھ گئی وہاں اسے بیٹے کے بچھڑنے کا بھی غم شدت سے تھا۔ اس نے اپنے بیٹے سے بہت کہا کہ تم آ جاؤں، لیکن وہ اپنی ضد پر قائم رہا۔

''بابا سائیں نے اپنی زندگی میں میری جگہ اس عورت کو ترجیح دی، جس سے میں شدت سے نفرت کرتا ہوں۔ وہ اب بھی حویلی میں ہے اور بقول آپ کے بابا سائیں نے اس سے معافی بھی مانگی۔ مگر اس بدذات عورت نے معافی نہیں دی۔ میں اب بھی اس کے ہوتے ہوئے حویلی میں آ جاؤ۔ یہ ناممکن ہے اماں جی۔۔ ناممکن۔۔۔''

''میں بیٹا یہاں اکیلی۔ !کس کے سہارے پر رہوں۔'' زہرہ بی نے کمزور سی دلیل کا سہارا لیا۔

''آپ کو اپنے عدت کے دن تو وہیں گذارنا پڑیں گے۔ پھر اس کے بعد میں دیکھ لوں گا کہ کیا کرنا ہے۔'' اس نے حتمی انداز میں جواب دیا تھا۔ اور زہرہ بی خاموش ہو گئی تھی۔ وہ اپنے کمرے تک سمٹ گئی تھی۔ باہر کیا ہو رہا تھا۔ اسے کچھ خبر نہیں تھی۔ حویلی میں آنے والی خواتین سے وہ نہیں ملی، وہ ان سے بات چیت کرنے کی ہمت ہی محسوس نہیں کر رہی تھی۔ اس نے سب کچھ اماں بی پر چھوڑ دیا اور وہ افسوس کے لیے آنے والی عورتوں سے ملتی رہیں۔

پیر سائیں کو فوت ہوئے دو دن گذر گئے۔ اگلی صبح سوئم کی رسم تھی۔ یہ وہ موقعہ ہوتا تھا جب نئے پیر سائیں کا اعلان کیا جاتا تھا۔ درمیان میں فقط ایک رات تھی۔ بڑے کمرے میں اماں بی اپنی ہی سوچوں میں گم بیٹھی ہوئی تھی کہ ملازمہ نے دیوان کے آنے کی بابت اطلاع دی۔ اماں نے اسے آنے کی اجازت دے دی۔ وہ بڑے مودب انداز میں ان کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔

''بولو دیوان۔ !کیا کہتے ہو؟'' اماں بی نے انتہائی سنجیدگی سے پوچھا۔

''کل صبح سوئم کی رسم کے لیے تمام انتظامات مکمل ہو گئے ہیں۔ امید ہے کہ مریدین کی ایک کثیر تعداد آئے گی۔ اس کے علاوہ بہت زیادہ لوگ ہوں گے۔''

''اگر انتظامات ہو گئے ہیں تو اچھی بات ہے۔ اب تم کیا چاہتے ہو۔'' انہوں نے پوچھا۔

''میں معلوم کرنے آیا تھا اماں بی کہ کل ظہیر شاہ تو ہیں نہیں، دستار بندی کے بارے میں کیا جواب دیں گے۔ پہلے تو جھوٹ سچ چل گیا تھا۔ اب کیا ہو گا؟۔'' دیوان نے خاصی تشویش سے پوچھا۔

''تم نے کیا سوچا ہے؟'' وہ بولیں۔

''یہ جھوٹ وقتی طور پر تو چل جائے گا کہ ابھی انہیں ہسپتال سے فارغ نہیں کیا گیا۔ یا ڈاکٹرز نے سفر کرنے کی اجازت نہیں دی۔ لیکن یہ بھی تو کوئی امید نہیں ہے کہ وہ کب تک یہاں پہنچ پائیں گے یا آئیں گے ہی نہیں۔ اگر ہم چہلم تک کا اعلان کر دیتے ہیں تو کیا اس وقت وہ آ پائیں گے۔ کوئی امید ہے؟'' دیوان نے کسی موہوم امید کا سہارا لینا چاہا۔ تو اماں سوچ میں پڑ گئیں۔ پھر سر اٹھا کر بولیں۔

''دیوان جو کچھ ظہیر شاہ نے کیا، کیا اب بھی وہ اس قابل ہے کہ اسے اس حویلی میں داخل بھی ہونے دیا جائے۔ اسے اگر اپنی بیوی سے کوئی مطلب نہیں تھا تو اپنے باپ کی وفات پر آ جاتا۔ آخر وہ کس برتے ضد کر رہا تھا۔ کم از کم میں اپنی زندگی میں اسے حویلی میں داخل نہیں ہونے دوں گی۔'' انہوں نے حتمی لہجے میں کہا تو دیوان ایک دم سے مایوس ہو گیا۔ پھر دھیمے لہجے میں بولا۔

''پھر تو سارا معاملہ ہی چوپٹ ہو جائے گا۔ کیا جواب دیں گے لوگوں کو۔ پیر سائیں کا جانشین ضروری ہے۔ میرا تو خیال ہے، اعلان کر دیتے ہیں۔ یہ بعد کی بات ہے کہ ظہیر شاہ کے ساتھ کیا معاملہ ہوتا ہے۔'' دیوان نے صلاح دی۔

''ظہیر شاہ گدی نشین نہیں ہو گا۔ یہ حتمی فیصلہ ہے۔'' اماں بی نے اس کی غلط فہمی دور کر دی۔

''تو پھر اماں بی، میرے لیے کیا حکم ہے؟'' دیوان

نے انتہائی احترام سے کہا۔

''میں صبح تمہیں بتا دوں گی کہ کیا کرنا ہے۔ ابھی تم جاؤ۔'' اماں بی نے کہا تو وہ چند لمحے وہاں کھڑا رہا۔ پھر واپس پلٹ گیا۔

اماں بی کے ذہن میں بھی کچھ نہیں تھا۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ اس مسئلہ سے آنکھیں چرائی جاسکتیں۔ دستار بندی تو ہونا تھی اور ظہیر شاہ کے بارے میں وہ فیصلہ کرچکی تھی۔ تبھی اس کے ذہن میں شعیب کا خیال آ گیا۔ وہ بھی تو اس خاندان کا فرد تھا۔ کیوں نا اسے گدی نشین بنا دیا جائے؟ یہ خیال آتے ہی اس نے ملازمہ سے کہا کہ زبیدہ شعیب اور زہرہ کو بڑے کمرے میں لے آؤ۔ کچھ ہی دیر بعد وہ سبھی ایک ایک کر کے بڑے کمرے میں جمع ہو گئے۔ صرف نادیہ اپنے کمرے میں تھی۔ اماں بی کو معلوم تھا کہ وہ شعیب کے سامنے نہیں آئے گی۔

''اماں کیا بات ہے، خیریت تو ہے نا۔'' زبیدہ نے پوچھا تو انہوں نے دیوان کے آنے اور اس کی گفتگو بارے سب کو بتا دیا۔

''ہاں۔ ایہ مسئلہ تو کل ہو گا؟'' زبیدہ نے تشویش سے کہا۔

''نہیں ہو گا، کیونکہ اب ظہیر شاہ کی تو کوئی گنجائش نہیں، اب اس خاندان میں شعیب ہی ہے جو اب اس ذمہ داری کو نبھائے۔'' یہ کہتے ہوئے اماں بی نے شعیب کی طرف دیکھا تو سبھی چونک گئے۔ تبھی وہ نہایت تحمل سے بولا۔

''اماں بی۔! آپ کا حکم سر آنکھوں پر لیکن میں اس ذمے داری کا اہل نہیں ہوں، میں گناہ گار بندہ اتنے زیادہ لوگوں کے جذبات و احساسات کے ساتھ نہیں کھیل سکتا۔''

''لیکن بیٹا۔! یہ دنیا داری بھی تو چلانا ہے۔ تم سمجھاؤ اپنے بیٹے کو۔'' اماں بی نے ایک ہی وقت میں شعیب اور زبیدہ سے کہا۔

''میں مانتا ہوں اماں کہ یہ دنیا داری ہے مگر میں اپنے ضمیر کے سامنے بھی جواب دہ ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ مال و دولت کی فراوانی ہو گی۔ مگر کیا کروں گا ایسی دولت کا جس سے میرا ضمیر مجھے ملامت کرتا رہے۔ میں بہر حال اس کا اہل نہیں ہوں۔''

''شعیب۔!'' کمرے کے باہر سے نادیہ کی آواز گونجی تو سبھی نے ادھر دیکھا۔ وہ اگرچہ کمرے میں نہیں تھی لیکن اس کے باہر ہونے کا انہیں یقین ہو گیا تھا۔ ''شعیب آپ اماں بی کی بات مان لیں۔''

''کیوں مان لوں میں۔! صرف اسی وجہ سے کہ میں اس خاندان کا فرد ہوں۔ تم بھی جانتی ہو کہ گدی نشین ہونے کا مطلب کیا ہوتا ہے۔ جیسے خود ہاتھ اٹھانا نہیں آتے۔ وہ کسی کے لیے کیا دعا کر سکے گا۔ صرف مال و دولت اکٹھا کرنا ہی تو مقصد نہیں ہے نا۔'' اس نے بڑے دھیمے مگر طنزیہ لہجے میں کہا۔

''آپ مال و دولت اکٹھا نہ کریں۔ مگر لوگوں کی پریشانیاں دور کرنے کی کوشش تو کر سکتے ہیں۔'' نادیہ نے دلیل دی۔

''وہ الحمدللہ میں کر رہا ہوں۔ مزید کی مجھے ضرورت نہیں۔''

''دیکھو شعیب، یہ مرد کی دنیا ہے۔ ہم حویلی کی عورتیں، وہ کچھ نہیں کر سکتیں جو آپ کر سکتے ہو۔ جب ہم آپ سے درخواست کر رہی ہیں تو آپ کو ہماری بات ماننا چاہئے۔ قدرت کی طرف سے جب یہ رتبہ آپ کو تفویض کیئے جانے کے حالات بن گئے ہیں تو آپ کیوں منع کر رہے ہیں۔ اور جہاں تک صلاحیت یا اہلیت کی بات ہے تو یہ اتنی بڑی بات نہیں، اللہ تعالیٰ خلوص نیت دیکھتا ہے، آپ دردِ دل کے ساتھ انسانیت کی خدمت کریں۔ رب تعالیٰ برکت دے گا۔'' نادیہ نے بہت ٹھہرے ہوئے لہجے میں سکون سے کہا تو وہ بولا۔

''دیکھو نادیہ ضد نہیں کرتے، یہ حق ظہیر شاہ کا ہے، اس کا انتظار کر لیا جائے تو میرے خیال میں زیادہ بہتر ہے۔ کل اعلان ہی کرنا ہے تو وہ میں کر دوں گا کہ جب تک وہ یہاں نہیں آ جاتے، اس وقت تک دستار بندی نہیں ہو سکتی۔ ویری سمپل۔'' شعیب نے ایک دوسری طرح سے اپنی جان چھڑانے کی کوشش کی۔

''پوچھ لیں زہرہ بی سے، کیا انہیں امید بھی ہے کہ ظہیر شاہ یہاں آئے گا؟'' نادیہ نے اسی ٹھہرے ہوئے

لہجے میں کہا تو شعیب نے زہرہ بی کی جانب دیکھا جو سر جھکائے حسب معمول خاموش بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ کافی دیر یونہی بیٹھی رہی تو اس نے پوچھا۔

''آپ جواب دیں نادیہ کی بات کا۔۔۔''

''نہیں، وہ یہاں نہیں آئے گا۔ اس نے کہا ہے کہ جب تک نادیہ اس حویلی میں ہے، وہ یہاں قدم نہیں رکھے گا۔'' زہرہ بی نے دکھتے ہوئے لہجے میں کہا۔ اس پر وہ چند لمحے خاموش رہا، پھر بولا۔

''چلیں۔! آپ اس سے پوچھ لیں، بلکہ اسے بتادیں کہ اماں بی اور نادیہ اس حویلی میں نہیں رہیں گی۔ وہ آجائے۔''

''یہ کیسے ہوسکتا ہے۔۔۔ میں خود اسے یہاں آنے کی اجازت نہیں دوں گی۔'' اماں بی نے سخت لہجے میں کہا۔

''اماں بی۔! اب کسی مسئلے کا حل تو نکالنا ہے نا۔ اس کی چیز ہے، اسے دے دی جائے، ایک ہی سال میں ایسی حویلی کھڑی ہوجائے گی، آپ فکرمند کیوں ہوتی ہیں۔'' شعیب نے اسے سمجھایا تو ایک دم سے نرم ہوتے ہوئے بولیں۔

''بیٹا۔! وقت اور حالات نے تمہیں ہمارے خاندان کا سربراہ بنادیا ہے۔ میں تمہاری ہر بات تسلیم کرنے کو تیار ہوں۔ مگر میں ظہیر شاہ کو معاف کردوں یہ ناممکن ہے۔''

''میں ساری بات سمجھتا ہوں اماں بی، آئندہ کیا ہو گا۔ میں نے وہ بھی سوچ لیا ہے، ایک بار آپ زہرہ بی کو فون تو کرلینے دیں۔'' اس نے انتہائی تحمل سے کہا تو اماں بی نے اجازت دے دی۔

''ٹھیک ہے کرلے فون۔''

فون منگوایا گیا اور زہرہ بی نے اپنے بیٹے سے رابطہ کیا۔ سبھی سن رہے تھے۔ کچھ دیر تمہیدی باتوں کے بعد جب زہرہ بی نے یہاں کی ساری صورت حال بارے بتا کر پوچھا تو وہ بولا۔

''ٹھیک ہے، اگر وہ حویلی سے چلے جاتے ہیں۔ تو میں آجاؤں گا۔''

''لیکن پھر تمہاری بہن حویلی میں آجائے گی۔ پوری زندگی کے لیے۔'' فرح نے ایک دم سے چیختے ہوئے کہا۔

''یہ کیا بات ہوئی، تم اپنے گھر میں خوش ہو۔'' وہ بولا۔

''نادیہ کی یہ شرط اس لیے تھی کہ تمہاری بہن کا گھر بس جائے، جس کو یہ امید نہیں تھی کہ اس کی بھی شادی بھی ہوگی۔ اس نے میری اتنی عزت کی، میرا مان رکھا اور میں اس کی تذلیل ہونے دوں۔ ظہیر شاہ، تم نہیں آتے تو نہ آؤ، اگر آنا ہے تو انہی کی موجودگی میں آنا ہوگا۔ ورنہ میں شعیب کا گھر چھوڑ کر حویلی میں آجاؤں گی۔ کیا صرف تم ہی ضد کرنا جانتے ہو۔۔۔ بابا سائیں کی موت تمہاری وجہ سے ہوئی اور اس کا الزام تم نادیہ پر ڈال رہے ہو۔ شرم آنی چاہیے تمہیں۔ اسے طلاق بھیجتے ہوئے تمہیں اپنی بہن کا ذرا بھی خیال نہیں آیا۔''

''ٹھیک ہے، میں بھی حویلی نہیں آؤں گا۔ تم لوگ یہ سمجھ لو، میں تم لوگوں کے لیے مرگیا ہوں۔'' وہ حتمی لہجے میں بولا۔

''تو پھر تمہیں مر ہی جانا چاہیے۔'' فرح نے انتہائی تلخی سے کہا تو دوسری طرف سے لائن کٹ گئی۔ فرح چند لمحے تیز تیز سانس لیتی رہی، پھر شعیب کی طرف دیکھ کر بولی۔ ''اس وقت یہ خاندان انتہائی نازک حالات سے گزر رہا ہے۔ اس وقت اس کی عزت و وقار آپ کے ہاتھ میں ہے۔ میں سمجھتی ہوں کہ اس طرح آپ کو اپنی نوکری چھوڑنا ہوگی۔ لیکن میں لکھ کر دیتی ہوں کہ میری تمام جائیداد آپ کے نام، امی بھی ابھی دے دیں گی۔''

''اور فرح میں بھی اپنی جائیداد شعیب کے نام کر دوں گی۔'' نادیہ نے کمرے کے باہر سے کہا۔ چند لمحے بعد بولی۔ ''فی الحال آپ چھٹیاں لے لیں۔ جب آپ کے نام یہ سب ہوجائے تو آپ نوکری چھوڑ دیں۔''

شعیب سر جھکائے چند لمحے سوچتا رہا، جیسے کسی فیصلے پر پہنچ جانا چاہتا ہو۔ پھر ایک دم سر اٹھا کر بولا۔

''نادیہ۔ کچھ وقت پہلے تم نے مجھ سے ایک سوال کیا تھا، وہ تمہیں یاد ہے؟''

''ہاں یاد ہے۔۔۔'' وہ دھیرے سے بولی۔

''تم نے مجھ سے کہا تھا کہ کیا مجھے تم سے محبت ہے؟ آج میں تم سے یہ سوال کرتا ہوں کہ کیا تمہیں مجھ

سے محبت ہے؟'' شعیب نے بڑے گھمبیر لہجے میں پوچھا۔ تو چند لمحے خاموشی کے بعد اس نے کہا۔

''ہاں۔! ہے۔ یہ ایک ایسا جذبہ ہے جو ختم تو نہیں ہو سکتا۔''

''تو پھر آج میں تمہیں اس ناتے ایک درخواست کرتا ہوں ۔۔۔ مجھے گدی نشین ہو جانے کا حکم مت دو۔ بلکہ یہ ذمہ داری تم سنبھالو۔''

ایک دم سے سناٹا چھا گیا۔ یوں جیسے وہاں موجود ہر ذی روح کی سانس رک گئی ہو۔ انہوں نے انتہائی حیرت سے شعیب کی دیکھا۔

''یہ کیسے ممکن ہے ۔۔۔؟'' نادیہ نے تیز لہجے میں کہا۔

''ممکن ہے، کیا تم انسان نہیں ہو۔ کیا تمہارے اندر جذبات واحساسات نہیں ہیں۔ کیا تم لوگوں کے کام نہیں آ سکتی۔ تم باپردہ رہ کر بھی انسانیت کی خدمت کر سکتی ہو۔ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ تمہارے جتنے بھی باہر کے معاملات ہوں گے، میں انہیں دیکھوں گا۔ تمہیں جہاں بھی مشکل پیش آئے گی، میں تمہارے ساتھ کھڑا ہوں گا۔ بولو، کیا تم میری بات مانتی ہو؟'' شعیب نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں سنجیدگی سے کہا۔ دوسری طرف خاصی دیر تک خاموشی رہی۔ پھر اس کی آواز ابھری۔

''جی، میں آپ کا حکم مانتی ہوں۔'' اس کی آواز آتے ہی سب چونک گئے۔

''تم نے میرا مان رکھ لیا۔'' شعیب نے خوشدلی سے کہا۔

''لیکن۔! یہ کیسے ہوگا۔ کیونکر ہوگا۔۔ یہ سب آپ نے دیکھنا ہے۔'' نادیہ نے کہا۔

''میں دیکھ لوں گا۔'' یہ کہہ کر اس نے سب کے چہروں پر دیکھا کسی نے بھی کچھ نہیں کہا۔ سو وہ بولا۔ ''کیا آپ اس فیصلے پر مطمئن ہیں۔''

''اب تو جو تم چاہو گے۔ وہی ہوگا بیٹا۔!'' اماں بی نے کہا اور اپنا سر جھکا لیا۔

اس صبح حویلی کے اندر اور باہر لوگوں کا جم غفیر تھا۔ دیوان کو ابھی تک معلوم نہیں تھا کہ اماں بی نے کیا فیصلہ کیا ہے۔ وہ منتظر تھا کہ حویلی سے اس کے لیے کیا پیغام آتا ہے۔ ایصال ثواب کی خصوصی دعا ہو چکی تو ایک بے چینی پھیل گئی۔ ظہیر شاہ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اب نیا پیر سائیں کون ہوگا؟ ایسے ہی لمحات میں شعیب نے آگے بڑھ کر اپنے اردگرد بیٹھے ہوئے لوگوں کو دیکھا، ان میں مریدین خاص بھی تھے۔ عمائدین شہر اور سیاست کی دنیا سے تعلق رکھنے والے لوگ بھی تھے۔ وہ سب شعیب کی بات سننے کے لیے متوجہ ہو گئے۔ اس نے چند تمہیدی باتوں کے بعد کہا۔

''رسم کے مطابق اس وقت پیر سائیں کی دستار بندی ہونا چاہیے تھی۔ لیکن کچھ ضروری وجوہات کی بناء پر دلاور شاہ صاحب کے بیٹے ظہیر شاہ تشریف نہیں لا سکے۔ کچھ عرصہ تک امکان بھی نہیں ہے کہ وہ تشریف لا سکیں۔ لندن میں ان کے ساتھ مسلسل رابطہ ہے اور انہی کی خواہش ہے اس فیصلے میں پوری طرح شامل ہے جو میں آپ کے علم میں لانا چاہ رہا ہوں۔'' اس نے اتنا کہا تو ایک دم ہر طرف سکوت چھا گیا۔ ہر ایک کو تجسس تھا۔ سب متوجہ تھے۔ تبھی اس نے کہا۔ ''فیصلہ یہ ہوا ہے کہ ظہیر شاہ صاحب کی دستار بندی نہیں ہوگی۔ بلکہ دلاور شاہ صاحب کے بڑے بھائی صاحب کی بیٹی کے سر آنچل دے دیا جائے گا۔ اب وہ گدی نشین ہوں گی۔''

اس فیصلے نے پورے ہجوم میں بے چینی بھر دی۔ لیکن سوال کرنے کی جرات کسی میں بھی نہیں ہوئی۔ ایسے ہی لمحات میں دیوان نے حق نمک ادا کیا اور شعیب کے بیٹھتے ہی آگے بڑھا اور ہجوم کی توجہ اپنی طرف کرتا ہوا بولا۔

''جس طرح پیر سائیں کی زندگی میں سلسلے چلتے تھے، اسی طرح اب بی بی سائیں کی زندگی میں بھی چلیں گے۔ کسی بھی نئی بیعت کی ضرورت نہیں۔ جو عقیدت رکھتا ہے، اس کی بیعت ہے، باقی چاہیں تو آزاد ہیں۔ دستار کی بجائے آنچل انہیں بھجوایا جا رہا ہے۔ کیا آپ سب کو قبول ہے۔'' ہجوم سے قبول ہے کی صدا بلند ہوئی۔ تو چند مریدین کے سامنے بڑے سے تھال میں سفید آنچل لایا گیا۔ انہوں نے وہ اٹھایا اور اندر موجود خواتین کی طرف بھجوا دیا گیا۔ تب ہجوم میں لنگر کھول دیا گیا۔ لوگ اس طرف متوجہ ہو گئے۔ لنگر کھانے کے دوران لوگ تبصرہ

آرائی کرتے رہے۔ جن لوگوں کو اس فیصلے پر اختلاف تھا بھی، وہ دب گیا۔ دوپہر ہونے سے پہلے تک ہجوم کم ہوتا ہوا ختم ہو گیا۔ وہاں فقط ملازمین رہ گئے۔ یا پھر وہ لوگ جنہوں نے کیے گئے انتظام کو سمیٹنا تھا۔ بہت پہلے شعیب مردان خانے میں بیٹھا۔ لوگوں سے میل ملاقات کر رہا تھا۔ اس نے محسوس کیا کہ اس فیصلے کا ردعمل فوری طور پر ظاہر نہیں ہوا تھا۔ آئندہ آنے والے حالات میں کیا ہوتا ہے یہ وقت پر منحصر تھا۔ مگر وہ مطمئن تھا۔ کہ لوگوں نے فیصلہ مان لیا ہے۔

☆......☆......☆

نادیہ کو پہلی بار کھڑکی میں کھڑا ہونا اچھا نہیں لگا۔ وہ ہجوم میں سے اٹھ کر اپنے کمرے کی تنہائی میں آئی تھی۔ وہ سارا وقت خاموش رہی تھی۔ حویلی میں آنے والی خواتین کے تبصرے وہ سنتی رہی تھی۔ لیکن کسی ایک پر بھی اپنی زبان نہیں کھولی۔ اس وقت جبکہ وہ کمرے کی تنہائی میں آئی تو سناٹے نے اس کا استقبال کیا۔ لیکن دماغ میں مختلف خیالات کا ہجوم تھا۔ بلاشبہ یہ اس کا ردعمل تھا جو وہ لوگوں کی باتیں سن کر آئی تھی۔ اس نے ایک نگاہ کھڑکی سے باہر ڈالی۔ سورج مغربی افق کی جانب جھک چکا تھا۔ وہ اپنے بیڈ پر آ کر بیٹھ گئی۔ یہ تو وہ کئی دنوں سے محسوس کر رہی تھی کہ اس میں جو الہڑ پن ہے، وہ تو کب کا ختم ہو چکا ہے اور سنجیدگی نے آ کر ڈیرے جما لیے ہیں۔ اس تبدیلی نے اس میں اعتماد بھر دیا تھا۔ وہ اعتماد جو اس کی اپنی ذات پر تھا۔ اگرچہ گذری رات شعیب نے بی بی سائیں ہو جانے کی ذمہ داری اس پر ڈال دی تھی۔ لیکن اسے کچھ دن پہلے ہی معلوم ہو گیا تھا کہ ایک بہت بڑی ذمہ داری اس پر پڑنے والی ہے۔ حیران کر دینے والا خواب۔ جیسے وہ الہام ہی کہتی تھی اس میں اپنے والدین کو دیکھا اور اپنے آباؤ اجداد کے اس بزرگ کو جو صاحب مزار تھا۔ اس وقت وہ اس خواب کو سمجھ نہ سکی تھی۔ لیکن آج اس خواب کو وہ پوری طرح جان گئی۔ اس خواب میں یہی دکھائی دیا تھا کہ وہ اسی سفید محل کے باہر کھڑی ہے۔ دور دور تک کوئی ذی روح نہیں ہے۔ رنگوں اور خوشبوؤں کے اس جزیرے میں وہ تنہا ہے۔ تبھی محل کے برجوں میں سے اڑتا ہوا ایک سفید آنچل اس کے سر پر آ پڑتا ہے۔ جب وہ اپنا آنچل ہٹاتی ہے تو خواب ٹوٹ گیا تھا۔ وہ جاگ گئی تھی۔ رات اسے وہ خواب یاد نہیں آتا تھا لیکن جب خواتین نے ایک بڑا سارا سفید آنچل جس کے کناروں پر سنہری گوٹا لگا ہوا تھا، اس پر اوڑھا دیا تو وہ خواب اپنی پوری جزئیات کے ساتھ اس کے ذہن میں تازہ ہو گیا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ ایک دن اس طرح وہ بی بی سائیں بن جائے گی۔ وہ جو اسے حویلی سے نکال رہے تھے۔ وہ خود اس حویلی میں آنے کے لیے اس کی اجازت کے مرہون منت تھے۔ یہ خیال آتے ہی وہ چونک گئی۔ اب اس کا رویہ دوسروں کے ساتھ کیسا ہونا چاہیے۔ اس سوال کے جواب میں اس کے اندر سے آواز ابھری۔

''ظاہر ہے اپنی محرومیوں کا ازالہ کرو، قدرت نے تمہیں موقعہ دیا ہے کہ اپنی گذشتہ زندگی میں جو تم سسکتی رہی ہو، وہ ساری خواہشیں پوری کرو جن کے لیے تم ترستی رہی ہو۔''

''وہ تو سب کچھ مجھے ویسے ہی مل گیا ہے۔ اب میرا حکم ہی یہاں سب سے مقدم ہو گا۔ بلکہ میری خواہش ہی میرا حکم ہے۔ اور وہ وقت گذر چکا۔ وہ اپنے ساتھ میری محرومیاں اور تشنگی بھی اپنے ساتھ لے گیا۔ اب تو میرے سامنے وہ آنے والا وقت ہے، جس کو میں جیسے چاہوں، ویسا ہو گا۔''

''کیا خود پر ہونے والے ظلم اور زیادتیوں کو بھول جاؤ گی۔ کیا تم ظہیر شاہ کو معاف کر پاؤ گی۔''

''کس سے بدلہ لو گی۔ وہ پیر سائیں جو حالات کا سامنا ہی نہ کر سکا اور خود اپنے ہی خوف سے موت کی وادی میں جا پہنچا۔ اس نے جس منصب کے لیے یہ ساری تگ و دو کی تھی۔ وہ قدرت نے میرے ہاتھوں میں دے دیا۔ اور اس کے ساتھ ہی میرا انتقام بھی دفن ہو گیا۔ رہی ظہیر شاہ کی بات، حقیقت یہ ہے کہ میں خود اس سے فرار چاہتی تھی، میں نے کون سا اس کے سامنے اپنا آپ جھکا دیا تھا۔ فطری طور پر مرد کی ایک انا ہوتی ہے۔ میرے ساتھ شادی بھی تو اس نے جبر سے کی تھی۔ یہ اچھا ہوا کہ اس نے وقت سے پہلے ہی مجھے آزاد کر دیا۔ ورنہ وہ کوئی ایسا زور رنج بندہ ہوتا تو مجھے سسک

سسک جانے پر مجبور کر دیتا۔ وہ اگر ضد نہ کرتا تو آج وہ پیر سائیں ہوتا۔ میں پھر کہاں ہوتی۔ اگر قدرت نے مجھے یہ موقعہ دے ہی دیا ہے تو مجھے سارے بغض، کینے انتقام اور بدلے بھول جانا چاہیئے اور وہ کچھ کرنا چاہیے جو اس منصب و مقام کا حق ہے۔"

"اس منصب و مقام کا ایک تقاضا یہ بھی ہے نادیہ کہ جب تک تم خود میں مضبوط اور سخت نہ رہو گی۔ یہ لوگ تمہیں، تمہاری ذات سمیت بہا کر لے جائیں گے۔ پھر نہ تم رہو گی اور نہ تمہارا یہ منصب و مقام، وہ لوگ جو پیر سائیں کے دور میں عیاشیوں میں اپنا وقت گذارتے تھے، وہ تمہیں کیسے قبول کر لیں گے۔"

"مجھے تو اپنی ڈگر پر چلنا ہے۔ اور مجھے یقین ہے کہ میں اس راہ پر کامیاب رہوں گی۔ اگر نہ بھی رہی تو میں نے کون سا اسی منصب و مقام کے لیے تگ و دو کی ہے، چھنتا ہے تو چھن جائے۔ مجھے کیا لینا دینا۔ اس منصب سے اور لوگوں سے، جب تک میرا رب چاہے گا، میں بی بی سائیں رہوں گی۔ جب نہیں چاہے گا تو نہیں رہوں گی۔"

"تو بس پھر اپنی خواہشوں، تمناؤں اور امیدوں کا گلا گھونٹ کر بی بی سائیں بنی رہو۔ ویسے بھی تمہارے لیے زندگی میں کچھ نہیں بچا۔ تمہیں اب تو گوشہ نشین ہو جانا چاہیئے۔"

"نہیں میں گوشہ نشین نہیں رہوں گی۔ میری زندگی کا ایک مقصد تھا، وہ پیر سائیں کے اس دنیا سے چلے جانے کے بعد ختم ہو گیا۔ لیکن اب میں ان روایات کو ختم کر دوں گی جس نے انسانوں کو باندھا ہوا ہے۔ بلکہ خود انسان اس سے بندھے ہوئے ہیں۔"

"کیسے کرو گی یہ سب۔ کیسے ممکن ہو پائے گا یہ سب۔ کہیں یہ مقصد بھی ادھورا نہ رہ جائے۔"

"زندگی ہے اور کچھ کرنے کی لگن ہو تو سب کچھ ہو جاتا ہے۔ میں نہ رہی اور میرے اندر امیدوں کے چراغ بجھ گئے تو پھر کیا، حالات اپنے اندر کیا کچھ رکھتے ہیں۔ میں ان کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔ لیکن اپنے من میں موجود امیدوں کو تو ٹٹول سکتی ہوں۔ ممکن ہے میں ان لوگوں میں ہوں جن کی اپنی زندگی ان کے کام نہیں آتی۔ وہ پیدا ہی دوسروں کے لیے ہوتے ہیں۔ زندگی تو بتانی ہے، جیسے بیت جائے۔"

"ہاں زندگی گذارنا تو مجبوری ہوتی ہے۔ یہ تو گذر ہی جاتی ہے۔ انسان کا ہونا تو تبھی ہوتا ہے نا کہ وہ زندگی کو اپنے مطابق گذارے۔ کیا اس کے اندر خواہشیں نہیں ہیں۔ جنہیں پورا ہونا چاہیے۔ کیا امیدیں نہیں ہیں جنہیں بر آنا چاہیے۔ کیا وہ خواب نہیں دیکھتا جو حقیقت کا روپ دھار سکیں۔ کیا حالات کے جبر تلے زندگی گذارنا ہی جیون ہے۔ اصل زندگی تو یہ ہے کہ اس کے لمحے لمحے سے خوشیاں کشید کر لی جائیں۔ حالات تو دکھ ہی دیتے ہیں۔ ہم دوسروں کی امیدوں پر پورا اترنا چاہیں تو بکھر کر رہ جائیں ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو جائیں۔ یہ زندگی تو نہیں ہے نادیہ۔۔ کیا ہم ہی نے دوسروں کے لیے جینا ہے۔ کیا ہمیں کوئی حق نہیں کہ ہم چاہے جائیں۔ کوئی ہمارے لیے جیئے۔ تم مان لو نادیہ کہ تم ہار گئی ہو۔ مایوس ہو اور اپنے آپ کو حالات کی دسترس میں دے دیا ہے۔ حالات تو وہ بہاؤ ہے، جس میں ہر شے خس و خاشاک کی مانند بہہ جاتی ہے۔"

"ہم انسان ہی ہیں جو خوشیوں کی چاہ میں غم کو گلے لگا بیٹھتے ہیں۔ کبھی سوچا کہ ایسا کیوں ہوتا ہے۔ جب ہم خود سے ناامید ہو جاتے ہیں ہماری یہی ناامیدی ہماری ذات کے اندر یقین کو دیمک کی طرح کھا جاتی ہے۔ اور ہم شکستگی کی اس انتہا پر جا پہنچتے ہیں جہاں زندگی سے آنکھیں ملانے کی جرأت نہیں ہوتی۔ کیا پتے گرنے سے شجر مرجھا جاتا ہے۔ نہیں، وہ یونہی منتظر ہوتا ہے۔ اسے امید ہوتی ہے۔ اور پھر یہی امید اسے پھل دیتی ہے۔"

"سوال تو یہ ہے کہ نا نادیہ! تمہیں اب کس کی امید ہے۔ تمہیں اگر شعیب کے کھو جانے کا ملال ہے تو کیا تم اب بھی اس کی امید رکھتی ہو۔ کیا تم فرح کو اپنے ہاتھوں سے اس کی دلہن بنا کر بھی امید رکھتی ہو کہ وہ تمہارا ہو جائے۔"

"نہیں۔ خدا کے لیے میں ایسا نہیں چاہتی۔ میں تو ایسا سوچوں گی بھی نہیں۔ ایسا سوچنا بھی بہت بڑا گناہ، یہ تو نری خود غرضی ہے۔" اس نے کانپتے ہوئے سوچا۔ اس سوچ نے اسے خود اپنے آپ سے ڈرا دیا تھا۔ سوال ہی

نہیں وہ الزام بھی تھی جس سے وہ ہر صورت بچنا چاہتی تھی۔ ایسے ہی نہیں، سب کو یہ معلوم تھا کہ وہ شعیب سے محبت کرتی ہے۔ سبھی کے ذہن میں سوال تھا کہ اس نے اپنی محبت کو فرح کی جھولی میں کیوں ڈال دیا؟ اس کا جواب وہ نہ کسی کو بتا سکتی تھی اور نہ ہی بتانا چاہتی تھی۔ تاہم لوگوں کا تجسس اس کے ایک ایک رویے پر ہوگا۔ خاص طور شعیب کے معاملے میں۔ اس کے کسی بھی طرز عمل سے اگر یہ شائبہ بھی ہو گیا کہ وہ اب بھی شعیب کی امید رکھتی ہے تو اس کی ساری ریاضت مٹی میں مل جائے گی۔ وہ جو اس نے قربانی دی تھی رائیگاں چلی جائے گی۔

''یہ سارا کچھ تم لوگوں کے خوف سے محسوس کر رہی ہو، تم اپنے من کی بات کہو، کیا تم اب بھی شعیب کو نہیں چاہتی ہو۔ کیا تم اب بھی اس کی امید نہیں رکھتی ہو؟''

''میں شعیب کو چاہتی ہوں اور پورے دل سے چاہتی ہوں۔ اس سے محبت کرتی ہوں۔ اختر رومانوی نے مجھے جس شخصیت سے پیار کرنے کا الہام بخشا، وہ شعیب ہی تو ہے۔ لیکن اب اس کی آس رکھوں یا اس کی امید کروں تو یہ مسلک محبت سے سراسر ناجائز ہے۔ محبت کا مطلب پانا تو نہیں ہے نا۔''

''تو پھر امید کے نام پر وہی سامنے کیوں آ جاتا ہے؟''

''حالات پر تو میری کوئی دسترس نہیں۔ اختر رومانوی میرے لیے ایک ان دیکھا ہیولا تھا۔ جسے میں نے چاہا اور اس کو اپنی دسترس میں کرنے کے لیے ایک طویل سفر کیا۔ اس کو پانے کی بہت ساری وجوہات میں میری بغاوت بھی شامل تھی۔ میں نے اسے پانے کی تمنا کی تو وہ میری زندگی سے یوں نکل گیا جیسے وہ کبھی میری زندگی میں آیا ہی نہیں تھا۔ اور پھر جب میں نے اسے پانے کی تمنا چھوڑ دی تو میرے سامنے آن کھڑا ہوا۔ میں چاہتی تو ہاتھ بڑھا کر اسے اپنی دسترس میں کر سکتی تھی، لیکن نہیں، وہ میری دسترس کے لیے میری چاہت کے لیے بنا ہے۔ بس میں چاہتی رہوں گی۔ اسے اپنانے کی خواہش نہیں کروں گی۔ مجھے معلوم ہے کہ جس دن میں نے اسے اپنا بنانے کی خواہش کی، اسی دن وہ میری زندگی سے چلا جائے گا۔''

''آنے والے حالات میں تم چاہو بھی تو اسے نظر انداز نہیں کر پاؤ گی۔ وہ اس حویلی کا حصہ نہیں، بلکہ وہ واحد مرد ہے جیسے تم نے بھی خود پر حاکم تصور کر لیا تھا۔ اس لیے تو اسے گدی نشین ہو جانے کی درخواست کی تھی۔ یہ اسی کا تحفہ ہے جو تمہیں دیا گیا ہے۔ وہ ہر پل تمہاری نگاہوں کے سامنے رہے گا۔ تم اس کے احساس سے کہاں تک بچ پاؤ گی۔ کیا کبھی بھی تمہارے اندر اس کے لیے ہوک نہیں اٹھے گی؟''

''میں انسان ہوں اور انسان تو ویسے ہی جذبات سے گندھا ہوا ہوتا ہے۔ اس کی محبت میں اب احترام شامل ہو گیا ہے۔ تو اس کی حیثیت ہی بدل گئی ہے۔ اب میری محبت کے رنگ گہرے ہیں۔ کیا یہ میری خواہش کے لیے اپنا آپ وار دیتا ہے۔ میں کچھ نہ بھی کہوں تو وہ مجھے اہمیت دیتا ہے۔ کیا صرف جسمانی تعلق ہی سب کچھ ہوتا ہے۔ اس نے تو مجھے دیکھا تک نہیں ہے۔ مجھے دیکھے بغیر میری چاہت رکھتا ہے۔ اور پھر یہ سارے سوال قبل از وقت ہیں۔ وہ فرح کا ہے اور میں کسی بھی بد دیانتی کے بغیر اس کی محبت کا دم بھرتی ہوئی۔ جس سے مجھے کوئی نہیں روک سکتا۔ اب تو میں خود آپ اپنے کو بھی نہیں روک سکتی۔ شاید میری محبت ایسے ہی ہے۔''

''صحرا بھی عبور کرنا چاہتی ہو اور نخلستان بھی تمہارے ساتھ محو سفر ہو، کیا یہ ممکن ہو پائے گا۔ محبت میں اپنے آپ کو وار کر زندگی کی خواہش مندی بھی ہو۔ قربانی دے کر اس کا صلہ بھی مانگ رہی ہو۔ رنگوں کو وار کر اپنی زندگی بھی رنگین کر لینا چاہتی ہو۔ یہ سب کیا ہے؟''

''یہ سب زندگی کا عطیہ ہے میں نے تحفے سمجھ کر قبول کر لیا ہے۔ پا لینے کے بعد پھر کھو جانے کا خوف بے حال رکھتا ہے۔ میں نے اسے پایا بھی نہیں مگر وہ میرا ہو گیا۔ یہی انہونی ہو گئی ہے۔ میں اگر چاہوں بھی تو خود کو نہیں آزما سکتی۔ وقت مجھے آزما رہا ہے۔ اور میں اس کی ہر آزمائش پر پورا اتروں گی، اس میں کوئی میری خواہش شامل نہیں ہے۔ میں نے تو اپنی خواہشوں کو گرہ دے کر ایک طرف رکھ دیا ہے۔ اور اسی کی چاہ کرنی ہے جو لازوال ہے۔ جیسے میں چاہوں تو وہ ستر قدم آگے بڑھ کر مجھے چاہتا ہے۔ وہ جو چاہے گا مجھے مقصد دے دے گا۔ وہ

جہاں چاہے گا میں اس کے سامنے سر جھکا دینے ہی میں اپنی فتح محسوس کرتی رہوں۔ اب یہی میری چاہ کی مسافت ہے۔ اب یہی میرا فیصلہ ہے۔ بندگی کے مقدس ریشمی کپڑے میں جب بندہ اپنا آپ باندھ لیتا ہے تو پھر زندگی خود بخود نرم ہو جاتی ہے۔''

''کیا تمہیں بندگی کا دعویٰ ہے؟''

''انسان بندگی نہ بھی کرے تو وہ بندہ ہی ہے۔ اس کی دی ہوئی نعمتوں کو قبول کرنا بندگی ہی تو ہے۔ اب یہ بندے پر منحصر ہے کہ وہ شکر ادا کرتا ہے یا ناشکروں کی صف میں جا کھڑا ہوتا ہے۔ ان حالات میں دعویٰ کیا وقعت رکھتا ہے۔''

اس جواب کے ساتھ ہی اس کے اندر سے اٹھنے والے سوال بند ہو گئے۔ کافی دیر تک یہ خلا جیسی کیفیت میں رہی۔ اسے لگا کہ یہ خود کلامی اسے بہت ساری ڈھارس دے گئی ہے۔ اک حوصلہ اس کے من میں جاگزیں ہو گیا ہے۔ وہ اعتماد مزید پختہ ہو گیا کہ وہ اب نادیہ نہیں بی بی سائیں ہے۔ یہ سوچ آتے ہی اس نے ایک نگاہ دوڑائی۔ مریدین کا دور و نزدیک حلقہ، جاگیرداری کے درپیش مسائل اور پھر معاملات دنیا، کیا وہ نبھا پائے گی؟ وہ دھیرے سے مسکرا دی۔ جس نے یہ سب دیا ہے، اس نے ان سے نبرد آزمائی کی طاقت و ہمت بھی دی ہے۔ وہ کر لے گی۔۔۔ یہ سوچ کر اس نے طویل سانس لی اور پھر بیڈ سے اٹھ گئی۔ کھڑکی کے باہر اندھیرا اتر آیا تھا۔ اب اس کی تنہائی، تنہائی نہیں رہی تھی۔ بہت کچھ ایسا تھا جیسے وہ اپنے ساتھ پالی تھی۔ وہ کمرہ جو کبھی سُونا ہوا کرتا تھا، اب وہی اتنا بھرپور لگتا تھا کہ وہ خود میں سمٹ جاتی، یہی اس کے من کی تبدیلی تھی۔

☆☆☆

شعیب ایک دم سے سلامت نگر میں اس طرح معروف ہوا کہ لوگ اس کا احترام کہیں زیادہ کرنے لگے۔ پہلے وہ فقط ایک انتظامی آفیسر تھا لیکن اب اس کا تعلق پیر سائیں کے گھرانے سے مشہور ہوا تو وہ عقیدت اس کے ساتھ بھی شامل ہو گئی۔ جہاں لوگوں کی کثیر تعداد اس کا احترام کرتی تھی، اسے عزت کی نگاہ سے دیکھتی تھی، وہیں ایسے حاسدین بھی پیدا ہو گئے، جن کے بہت سارے کام رک گئے۔ چوہدری ثناءاللہ اس کے قریبی مشیروں میں شامل ہو گیا۔ اور زندگی ایک خاموش ڈگر پر چل پڑی۔ حویلی وہ انہی دنوں میں گیا تھا جب پیر سائیں کا انتقال ہوا تھا۔ پھر وہ پلٹ کر وہاں نہیں گیا۔ ایک شام وہ لان میں بیٹھا ہوا تھا کہ ملازم چائے کی ٹرالی رکھ گیا۔ اس کے ساتھ ہی وہاں فرح آ گئی۔ اس نے آتے ہی چائے بنانا شروع کر دی تو شعیب نے پوچھا۔

''امی کہاں ہیں؟ وہ ٹھیک تو ہیں؟''

''وہ بالکل ٹھیک ہیں اور ڈرائنگ روم میں بیٹھی ہوئی ہیں۔ انہوں نے کہا مجھے وہیں چائے دے دو تو میں نے دے دی۔'' فرح نے دھیمے سے لہجے میں کہا اور پیالی اس کی جانب بڑھا دی۔ اس نے پیالی پکڑتے ہوئے فرح کی طرف دیکھا۔ وہ اب اپنی ہیئت میں تھوڑی سی تبدیلی ہو گئی تھی۔ وہ اس کی جانب دیکھ کر دھیرے سے مسکرا دیا۔ تبھی وہ بولی۔

''آج میں اور پھوپھو حویلی گئی تھیں۔ اماں نے بلایا تھا۔''

''اچھا، کیسے ہیں وہ سب ٹھیک ہیں۔ کس لیے بلایا تھا؟'' اس نے عام سے لہجے میں پوچھا۔

''ٹھیک ہیں۔ اماں نے ایک صلاح دی ہے۔'' وہ سپ لیتے ہوئے بولی۔

''کیا؟'' اس نے تجسس سے پوچھا تو وہ دبے ہوئے انداز میں بولی۔

''وہی پرانی بات۔۔۔ کہہ رہی تھیں کہ ہم تینوں وہیں حویلی ہی میں آ جائیں۔''

''تم کیا کہتی ہو؟'' اس نے پوچھا۔

''میرا تو خیال یہ ہے کہ ہمیں وہاں چلے جانا چاہیے۔ اس میں میری کوئی ذاتی خواہش نہیں ہے۔ میں یہاں آپ کے ساتھ بہت خوش ہوں۔ یہاں میں خود کو کھلی فضا میں محسوس کرتی ہوں۔ حویلی میں جانے کا مطلب، وہاں کی روایات کی پابند ہو جانا ہے۔ میں وہاں سے زیادہ یہاں خود کو پرسکون محسوس کرتی ہوں۔ لیکن اس وقت حویلی کو ایک مرد کی ضرورت ہے۔ جو وہاں کے تمام تر معاملات کو دیکھے، عورتیں جتنی مرضی ہوں۔ لیکن ان کے ساتھ ایک مرد بچے کا بھی سہارا ہونا تو

وہ تحفظ محسوس کرتی ہیں۔آپ کا وہاں ہونا ہی حویلی کو اعتماد بخش دے گا۔''

''ہوں۔!''شعیب نے ہنکارا بھرا اور پھر سپ لینے کے بعد چند لمحے خاموش رہا۔ پھر فوراً بولا۔''فرح۔امیری طرف سے اماں بی کو یہ کہہ دینا اور تم بھی سمجھ لو کہ حویلی مجھ سے اوجھل نہیں ہے۔میری اس پر پوری نگاہ ہے۔میں جس طرح چاہتا ہوں۔حویلی کا نظام اسی طرح چل رہا ہے۔اس طرف سے فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔''

''آپ وہاں کے معاملات کو دیکھ رہے ہیں۔لیکن وہاں جا کر رہنا پسند نہیں کرتے۔یہ کیوں، کیا رکاوٹ ہے۔''فرح نے الجھتے ہوئے پوچھا۔

''دیکھو۔!ایک ہی چھت تلے رہنے کے باوجود تم مجھے پوری طرح سمجھ نہیں پائی ہو۔میری یہ کوشش ہوتی ہے کہ کوئی میری وجہ سے تنگ نہ ہو۔پریشان نہ ہو۔نادیہ میرے سامنے نہیں آتی۔اور میں جب وہاں رہوں گا تو لازماً اس کے ذہن میں میرا خیال ہر دم رہے گا۔وہ اس سے ڈسٹرب ہوگی۔اس لیے میں اسے ذرا سی بھی تکلیف نہیں دینا چاہتا۔میری مخالفت پیر سائیں کے ساتھ تھی۔وہ اب نہیں رہا تو معاملہ ہی ختم ہو گیا۔''اس نے اعتماد سے کہا۔

''تو صرف نادیہ کے لیے آپ وہاں نہیں جا رہے ہیں۔''فرح نے سوچتے ہوئے کہا۔

''ہاں۔!بالکل، میں نہیں چاہتا کہ اسے ذرا سی بھی تنگی ہو۔وہ پوری آزادی سے اپنے معاملات میں مصروف رہے۔اور جس مقصد کے لیے اماں بی مجھے حویلی میں بلانا چاہتی ہیں۔وہ مقصد میرا حویلی میں جائے بغیر بھی پورا ہو رہا ہے۔حویلی کے کچن سے لے کر تمام تر جاگیر کے معاملات تک میری نگاہ میں ہیں۔ظہیر شاہ کا جو حق ہے، وہ اسی طرح پڑا ہے۔اور اس میں اسی طرح اضافہ ہوتا چلا جائے گا۔اماں بی سے کہنا مت گھبرائیں۔''اس نے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''اگر آپ کو نادیہ ہی وہاں رہنے۔۔۔۔''

''تو میں پھر بھی نہیں جاؤں گا۔اب اگر وہ میرے سامنے بھی آنا چاہے تو میں نہیں چاہوں گا۔''اس نے یوں کہا جیسے دور کہیں خواب میں کوئی بول رہا ہو۔اس پر فرح چند لمحے خاموش رہی، پھر گہرے لہجے میں پوچھا۔

''آپ نادیہ سے بہت محبت کرتے ہیں؟''

''فرح تم میری بیوی ہو، اور تم یہ جانتی ہو کہ میں نے تمہارے معاملے میں کبھی کوتاہی نہیں کی۔تمہیں بھرپور پیار دیا ہے۔اتنا کہ جتنا میں دے سکتا تھا۔اور جتنا میں دے سکتا ہوں۔لیکن اگر اس کے رویے پر غور کرو، حالات کو بڑی گہری نگاہ سے دیکھو تو وہ ہے ہی محبت کرنے کے لائق۔''وہ بڑی محبت سے بولا۔

''ہاں۔!میں نے بہت سوچا ہے، وہ ہے محبت کرنے کے لائق۔۔۔بلکہ وہ تو میری محسن ہے۔لیکن ہمیں بھی تو چاہیے نا کہ ہم اس کے کام آسکیں۔''وہ بولی۔

''وہ مجھے جو بھی حکم دے گی، میں بجا لاؤں گا۔لیکن ہمیں یہ بھی تو خیال رکھنا چاہئے کہ وہ پرسکون کیسے رہتی ہے۔میں سمجھتا ہوں کہ وہ کیسے پرسکون رہ سکتی ہے۔''

''مجھے کبھی کبھی تو اس پر بڑا ترس آتا ہے۔وہ زندگی۔۔۔۔''فرح نے کہنا چاہا تو اس کی بات ٹوک کر جلدی سے بولا۔

''نہ۔۔۔فرح نہ۔۔۔کبھی ایسا مت سوچنا۔۔۔اس پر ترس مت کھانا۔۔۔نہ اس سے کبھی ہمدردی جتانا۔۔۔وہ کچھ اور ہی چیز ہے۔۔۔اس نے اپنے مادی وجود کو اپنے قابو میں کر لیا ہے۔۔۔اس کی روح بہت توانا ہے۔وہ ایک مظلوم لڑکی نہیں، بلکہ معصوم پیکر ہے۔کیا تم نے یہ نہیں دیکھا کہ جو بھی اس سے دعا کرانے آتا ہے، وہ اپنی مراد پاتا ہے۔یہ اس کے وجود کا کوئی کمال نہیں ہے۔یہ رب تعالیٰ کی عنائتیں ہیں۔یاد رکھو۔!جو جتنا اپنے وجود کو منفی خیالات سے پاک کر لیتا ہے، وہ اتنی ہی تیزی سے رب تعالیٰ کی قربت حاصل کر لیتا ہے۔جو دل دنیا اور اس کی آلائشات سے پاک ہو جاتا ہے، رب تعالیٰ وہاں بسیرا کر لیتا ہے۔اور پھر جس دل میں رب تعالیٰ بس جاتا ہے، اس وجود کی لاج بھی اللہ سائیں خود رکھتا ہے۔اس میں بندے کا کوئی کمال نہیں ہوتا۔''

''ہاں۔!نادیہ کی کوئی ریاضت نہیں، لیکن پھر بھی مریدین کا اس پر اعتقاد بڑھتا ہی چلا جا رہا ہے۔''فرح

نے سوچتے ہوئے کہا۔

''عبادت و ریاضت سے پارسائی تو مل جاتی ہے ، نیکی نہیں ، بلکہ بندہ نیکی کے لیے تیار ہوتا ہے۔جس بندے کی سوچ ہی دوسروں کو فائدہ دینے کے لیے ہو اور وہ اپنی ذات کے بارے میں سوچے ہی نا، وہاں برکت ہی برکت ہوتی ہے۔یہ رب تعالیٰ کا انعام ہے بندے کے لیے۔'' شعیب نے عقیدت سے کہا تو فرح اس کی طرف دیکھتی چلی گئی۔پھر اٹھ کر اندر چلی گئی۔کچھ ہی دیر بعد ملازم برتن اٹھا کر لے گیا۔

☆......☆......☆

نادیہ نے سفید سوتی ڈھیلا ڈھالا لباس پہنا ہوا تھا۔اس پر سیاہ چادر لیے وہ وہیں بیٹھی ہوئی تھی، جہاں کبھی پیر سائیں بیٹھا کرتا تھا۔مگر اب کمرے کی حالت ویسی نہیں تھی۔اس میں بہت ساری تبدیلیاں آگئی ہوئیں تھیں۔وہ خواتین سے بالمشافہ مل لیا کرتی تھی۔ان کی روداد بہت دھیان سے سنتی اور پھر جو اس سے ہوسکتا وہ کرتی۔اسی طرح مرد حضرات بھی اپنی بپتا لے کر اس کے پاس آتے ، مگر وہ ان کے سامنے کبھی نہیں آئی تھی۔شیشے کی مضبوط دیوار حائل کر دیتی تھی۔وہ تو دیکھ سکتی تھی لیکن اندر کوئی نہیں جھانک سکتا تھا۔ان کے درمیان ایک مائیک ہوتا، جس سے وہ آواز سن لیتی۔پھر اس کی بات سن لینے کے جواب میں کوئی نہ کوئی شے باہر کھسکا دیتی ان میں کوئی بھی میٹھی چیز ہوسکتی تھی۔سائل سمجھ جاتا کہ اس کی بات سن لی گئی ہے۔وہ دن میں ایک خاص وقت کے لیے وہاں آتی اور پھر اس کا ٹھکانہ وہی اپنا کمرہ ہوتا۔عدت ختم ہونے کے بعد سے اس کا یہی معمول بن گیا ہوا تھا۔

اس دن جب وہ وہاں سے واپس آئی تو اس کے ذہن میں بہت کچھ آنے لگا تھا۔وہ اپنے کمرے میں آئی تو آتے ہی تاجاں مائی کو بلوایا۔وہ آگئی تو اس نے بڑے ہی نرم اور جذبات بھرے لہجے میں اس سے کہا۔

''تاجاں۔!تم آج ہی خود شعیب کے پاس جاؤ، اور اسے میری طرف سے عرض کرنا کہ وہ حویلی میں آئے، مجھے ان سے کچھ کام ہے۔اگر وہ آجائیں تو ٹھیک ہے، نہ آنا چاہیں تو خاموشی سے واپس آجانا۔''

''جی بی بی سائیں۔!کیا میں ابھی جاؤں۔؟'' اس نے پوچھا۔

''ہاں ابھی۔!اور مجھے آکر بتاؤ۔'' بی بی سائیں نے کہا تو تاجاں پلٹ گئی۔تبھی اماں بی اس کے پاس آگئی اور اس کے پاس بیڈ پر بیٹھ گئی۔کچھ دیر ادھر ادھر کی باتوں کے بعد وہ لرزتے ہوئے لہجے میں دھیرے سے بولیں۔

''ظہیر شاہ نے زہرہ کو اپنے پاس لندن بلوایا ہے۔۔۔وہ وہاں شادی کرنا چاہ رہا ہے۔''

''وہ اس کا حق ہے کرے۔۔۔اور جہاں تک زہرہ بی کے جانے یا نہ جانے کا تعلق ہے۔وہ ان کی مرضی، ہم اس میں کوئی دخل تو نہیں دے سکتے نا۔'' بی بی سائیں نے انتہائی تحمل سے کہا۔

''بیٹی۔!میں جب تمہیں دیکھتی ہوں نا۔۔۔تو خود ہی کو بڑا قصوروار سمجھتی ہوں۔تیری ویران زندگی۔۔''

''نہیں اماں بی۔۔آپ سے کس نے کہا میری زندگی ویران ہے۔۔۔میں تو اس قدر مصروف ہوں کہ میرے پاس خود اپنے لیے وقت نہیں ہوتا۔۔آپ قطعاً خود کو قصوروار مت سمجھیں۔میرے لیے زندگی ایسے ہی تھی اور میں اس زندگی پر بہت خوش ہوں۔''

''تم لاکھ دلیلیں دو میری بیٹی۔!جو فطری تقاضے ہوتے ہیں نا۔۔۔انہیں پورا کرنا ہی پڑتا ہے۔اللہ نے اگر تمہیں یہ عزت و مقام دے دیا ہے تو یہ اس کی نعمت ہے۔لیکن بہت ساری نعمتوں سے خود کو الگ رکھنا یہ بھی تو کفران نعمت ہے نا۔۔۔'' اماں بی نے آہستگی سے کہا تو اس نے چونک کر اماں بی کی طرف دیکھا۔پھر دھیمے سے لہجے میں بولی۔

''اماں بی۔!آپ کیا کہنا چاہتی ہیں۔صاف لفظوں میں کہیں، تاکہ مجھے آپ کی بات سمجھ میں آسکے۔''

''دیکھ بیٹی۔!انسان اپنے آپ سے جتنا فرار حاصل کرنا چاہے، کر تو سکتا ہے۔لیکن تب تک وقت بیت جاتا ہے۔پھر پچھتاوے انسان کو توڑ کر رکھ دیتے ہیں۔عقل مندی کا تقاضا یہ ہے کہ وقت کو سنبھال لے اور پھر اس کے مطابق چلے۔۔''

''اماں بی۔میں اب بھی نہیں سمجھ سکی ہوں کہ آخر آپ کہنا کیا چاہتی ہیں۔آپ کھل کر کہیں۔آپ کیا کہنا

چاہتی ہیں۔" نادیہ نے یہ بھانپ لیا تھا کہ جو بات اماں بی اس سے کہنا چاہ رہی ہے، ضرور ایسی ہے کہ جو اہم ہونے کے ساتھ ساتھ ایسی ہے کہ جس سے کسی کے دل کو ٹھیس پہنچنے کا احتمال بھی ہو سکتا ہے۔ ورنہ وہ اس قدر محتاط انداز میں بات نہ کرتیں۔ وہ اماں بی کے چہرے پر دیکھتی رہی۔ جبکہ وہ اپنی سوچوں میں گم تھی۔ اس کی بات سن کر اپنا سر اٹھایا اور نہایت آزردہ لہجے میں بولیں۔

"نادیہ۔! میرے ذہن میں چند دن سے ایک خیال آ رہا ہے۔ اگر تم اس خیال بارے اپنی رائے فوراً نہیں کچھ دن سوچ سمجھ کر دو تو میں تم سے کہوں۔۔۔"

"آپ کہیں۔۔۔ میں سوچ سمجھ کر ہی آپ کو اس پر اپنی رائے بتاؤں گی۔" نادیہ نے بڑے تحمل سے کہا۔ تب اماں بی نے قدرے گہری سانس لی اور بڑے مان سے کہا۔

"میں مانتی ہوں کہ انسان اپنے بدن پر جیسا چاہے کنٹرول کر سکتا ہے۔ اسے پھولوں کی سیج پر رکھے یا کانٹوں میں گھسیٹتا رہے۔ اس کی اپنی مرضی ہے کہ وہ خود پر ظلم کرے یا اسے بنا سنوار لے۔ مگر بعض اوقات حالات اس طرح کے بن جاتے ہیں کہ اپنی خواہش کے مطابق وہ کچھ نہیں کر سکتا۔ اسے وہ کرنا پڑتا ہے، جو حالات اس سے چاہتے ہیں۔ میرے کہنے کا مطلب یہ ہے میری بیٹی کہ تم چاہتی تو اپنے حصے کی خوشیاں بڑی آسانی سے حاصل کر سکتی تھی۔ پھر اپنی خوشیوں کی راہ میں خود ہی رکاوٹ بن بیٹھی ہو۔ خیر۔! وہ جو بھی حالات تھے، جیسا بھی وقت تھا، وہ گذر گیا۔ لیکن اب میں چاہتی ہوں کہ تم شادی کرلو۔"

اماں بی نے اپنی بات کہی تھی جو اس کے من میں اس وقت کھٹکنے لگی تھی جب انہوں نے تمہید ہی باندھی تھی۔ اس لیے نادیہ نے بڑے تحمل سے کہا۔

"اماں۔! اب اگر میں بی بی سائیں بن گئی ہوں تو اب میرا حق بنتا ہی نہیں کہ میں شادی کروں اور ایک ازدواجی زندگی بسر کروں۔۔۔ میرا اب سارا وقت اپنے مریدین کے لیے ہے۔ اور دوسری بات اب اگر میں شادی کرنا بھی چاہوں تو کس سے کروں، کیا ایسا کوئی لڑکا ہے خاندان میں جس سے میں شادی کروں گی۔؟ بالفرض محال اگر لڑکا مل بھی جاتا ہے تو میں پھر بھی شادی نہیں کر سکتی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بی بی سائیں بن جانے کے بعد کیا اب میں اپنی حویلی کی روایات کی امین نہیں ہوں؟"

"تمہاری بات بالکل ٹھیک ہے، میں مانتی ہوں اس کو۔۔۔ لیکن کیا ضروری ہے کہ اب ان روایات کو زندہ رکھا جائے جو اس حویلی میں موجود عورتوں کا سانس تک بند کر دے، اب اختیار تمہارے ہاتھ میں ہے۔ تم چاہو تو ان روایات کو بدل سکتی ہو۔ اگر تم ان روایات کو نہ بھی بدلنا چاہو تو میرے پاس ایک راستہ ہے۔" اماں بی نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں انتہائی سنجیدگی سے کہا۔

"کیسا راستہ۔؟" اس نے تحمل ہی سے پوچھا۔

"یہی کہ تم شعیب سے شادی کرلو۔۔۔" اماں بی نے ایک مختصر سا فقرہ کیا کہا کہ دھماکا کر دیا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ اماں بی اس نہج پر سوچ رہی ہے۔ تب اس نے لرزتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"یہ کیسے ممکن ہے اماں۔۔۔ وہ فرح سے۔۔۔"

"وہ چار شادیاں کر سکتا ہے۔ تم فرح کی سگی بہن تو نہیں ہو کہ اس نکاح میں کوئی رکاوٹ ہو۔ اگر ایسا ہو جاتا ہے تو پھر شعیب اس حویلی میں آ کر رہے گا۔ چاہے تو سب کچھ اس کے سپرد کر دینا اور چاہے تو اس سلسلے کو بڑھائے رکھنا۔ اس وقت حویلی کو ایک مرد کی ضرورت ہے۔ اگر زہرہ لندن چلی جاتی ہے اپنے بیٹے کے پاس تو پھر حویلی میں تم اور میں۔۔۔ اور پھر میرے دن بھی کتنے ہیں۔۔۔ کسی وقت بھی بلاوا آ سکتا ہے۔" اماں نے اسے سوچ کیا دی کہ وہ لاجواب ہوگئی۔ اس کے پاس کوئی بھی ایسی دلیل نہیں تھی جیسے وہ جھٹلا سکتی۔ انہوں نے جو کہا تھا وہ بالکل سچ تھا۔ اس وقت حویلی کو ایک مرد کی بلاشبہ ضرورت تھی، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ وہ شعیب سے شادی کر لے۔ اگر اس نے شعیب سے شادی کرنا ہی ہوتی تو وہ اس وقت کر لیتی، جب وہ اسے لینے کے لیے حویلی آن پہنچا تھا۔ وہ انہی سوچوں میں ڈوبی ہوئی تھی کہ اماں بی نے کہا۔ "میری باتوں پر خوب سوچ لینا، اور پھر جواب دینا، اس کے علاوہ اگر تجھے کوئی راستہ سوجھے تو مجھے بتانا، میں وہی مان لوں گی۔"

''اماں بی۔! آپ نے مجھے ایک ایسے دوراہے پر لا کھڑا کیا ہے کہ میں آپ کی کسی بات کو جھٹلا نہیں سکتی اور نہ ہی انکار کر سکتی ہوں۔ لیکن۔ یہ غلط ہے کہ میں شعیب سے شادی کر لوں، میں فرح کی زندگی میں کوئی ایسا بھونچال نہیں لا سکتی کہ جس سے وہ اپنی ہی ذات میں ڈوب کر رہ جائے۔ آپ لوگوں کی زبان نہیں پکڑ سکتیں۔ لیکن یہ سوچ لیں کہ میرا یہ عمل صرف اور صرف انتقام ہی سمجھا جائے گا۔ اب شعیب فقط ایک نہیں جسے منانا پڑے گا۔ بلکہ اس کی زندگی میں فرح کے ساتھ ساتھ ایک تیسرے فرد کا بھی اضافہ ہونے والا ہے۔ ایسے وقت میں اماں بی۔۔ کچھ نہیں ہو سکتا۔ ہاں، حویلی کی روایات کو توڑتے ہوئے، خاندانی روایات کو توڑتے ہوئے۔۔ آپ جس سے چاہیں میری شادی کر دیں۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔۔ لیکن جب میں شادی کر لوں گی، تو یہ بی بی سائیں والا معاملہ مجھ سے نہیں ہو پائے گا۔ میں پھر اپنی خواہشوں کے مطابق مزید آزادیاں چاہوں گی جو میرا حق بنتا ہے۔''

''دیکھو بیٹی۔! میں نے ساری صورت حال تمہارے سامنے رکھ دی ہے۔ اس پر اب فیصلہ تو تمہارا ہی بنتا ہے نا۔ تم ہی کہو گی۔۔'' اماں بی نے مرجھائے ہوئے انداز میں کہا۔

''اماں بی، آپ کا مسئلہ یہ ہے کہ حویلی کو کسی مرد کی ضرورت ہے، اگر وہ مسئلہ حل ہو جاتا ہے تو پھر میری شادی کوئی معنی نہیں رکھتی۔۔۔ شعیب آج آ رہا ہے۔ اگر آ گیا تو میں خود اس سے درخواست کروں گی کہ وہ یہاں رہے۔''

''اور تم۔! تم کیا پھر ادھر ہی رہو گی۔؟'' اماں بی نے کہا تو وہ خاموش رہی۔ تبھی وہ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ ''جہاں تک میرا خیال ہے، وہ ایسا انا پرست ہے کہ کبھی حویلی میں نہیں آئے گا۔ اگر آنا ہوتا نا تو وہ پہلے دن ہی آ جاتا۔ پیر سائیں بن جانے کا موقعہ اس کے لیے بہت بڑا تھا۔ وہ اس نے قبول نہیں کیا۔''

''اماں بی۔! میرے خیال میں آپ کے ذہن میں جو سوچ ہے نا، وہ کبھی بھی حقیقت نہیں بن پائے گی، جیسے میں نے خود فرح کی جھولی میں ڈالا، اب اس میں حصے دار کیسے بن جاؤں؟ آپ کو حویلی کے لیے مرد چاہیے نا تو وہ میں کہہ رہی ہوں، شعیب سے میں درخواست کروں گی۔''

''میں نے تجھے پہلے ہی کہا تھا کہ میری بات کا فوراً جواب نہیں دینا۔ سے سوچنا، اچھی طرح سوچ کر جواب دینا، تاکہ ہاتھ آئے وقت کو ہم پھر نہ گنوا دیں۔'' اماں بی نے اسے سمجھایا۔ جس پر نادیہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ سمجھ گئیں کہ نادیہ۔ اب اس موضوع پر مزید بات نہیں کرے گی۔ اس لیے وہ کچھ دیر ادھر ادھر کی باتیں کر کے اٹھ گئی۔ جبکہ نادیہ کے لیے سوچنے کا ایک نیا بہانہ چھوڑ گئی۔ مگر اس نے زیادہ نہیں سوچا، بس اتنا ہی کہ یہ ناممکن ہے۔ اب ایسا نہیں ہو سکتا۔ اور اس خیال کو ذہن سے جھٹک دیا۔

اس وقت شام کے سائے ڈھل چکے تھے، جب اسے اطلاع ملی کہ مردان خانے میں شعیب آیا ہوا ہے اور اس کا انتظار کر رہا ہے۔ ایک لمحے کے لیے اس کا دل کٹ کر رہ گیا۔ کیا اس نے خود کو عام مریدین کی سطح پر رکھا ہوا ہے یا دوسرے ملاقاتی لوگوں کی طرح، جس طرح بھی تھا۔ اس نے خود کو حویلی کا حصہ ظاہر نہیں کیا۔ اجنبیوں کی مانند ہی یہاں آیا ہے۔ دکھ کی ایک شدید لہر اس کے سینے میں اتر گئی۔ اسے اماں بی کے خیال پر بھی تاسف ہوا۔ وہ جو سوچ رہی ہیں، اس پر اگر وہ چاہیے بھی تو اب ناممکن ہے، اس کا جو رویہ ہے وہ خود ہی واضح کر رہا ہے۔ اس سے پہلے کہ اماں بی کوئی بات کریں، اظہار کریں تو فرح کا دل دکھے۔ انہیں منہ سے بات نکالنے ہی سے روک دیا جائے۔ انہی سوچوں میں غلطاں و پیچاں، وہ اپنے لیے مخصوص کمرے میں چلی گئی۔

ان دونوں کے درمیان شیشے کی دیوار تھی۔ نادیہ جو اس وقت بی بی سائیں کے مقام پر فائز تھیں۔ وہ اسے ایک ٹک دیکھے چلے جا رہی تھی۔ جبکہ دوسری طرف شعیب پر اشتیاق انداز میں منتظر تھا کہ بی بی سائیں اس سے بات کرے۔ نادیہ کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی کہ وہ اس سے بات کرے۔ کیا نادیہ کو اس سے شکوہ یا شکایت کرنی چاہیے کہ اس نے خود کو عام لوگوں کی سطح پر کیوں رکھا، یہاں کیوں آئے، بلکہ براہ راست حویلی کیوں نہیں

آیا۔ممکن ہے وہ اس کے سامنے آ کر اپنا آپ کھول دیتی۔خاندان کا فرد سمجھ کر اور حویلی کا ایک حصہ جان کر یا پھر لب بستہ خاموش رہے۔جس طرح کا رویہ شعیب اپنائے ہوئے ہے۔اسی کی رضا میں خوش رہ کر اپنا ردعمل دے، کیا کرے۔؟ یہی سوچ کر لرز رہی تھی اور وہ اس کا منتظر بیٹھا ہوا تھا۔پھر اس نے زیادہ دیر تک انتظار کروانا مناسب خیال نہیں کیا۔انٹر کام کے بزر پر اس نے ریسور اٹھالیا۔

''جی بی بی سائیں فرمائیں۔''شعیب کی آواز اس کے کانوں میں رس گھول گئی۔دور کہیں اختر رومانوی انگڑائی لے کر بیدار ہو گیا۔لمحہ بھر وہ ماضی کی پھسلن میں پھسل چلی تھی کہ ڈگمگاتے ہوئے اس نے فوراً ہی خود کو سنبھال لیا۔اور بڑے نرم لہجے میں بولی۔

''کیسے ہیں آپ؟''

''میں بالکل ٹھیک ہوں۔فرمائیں؟''اس نے جواب دیتے ہوئے، بلانے کے مقصد میں اپنی بے تابی دکھائی۔تب اس نے بھی تمہید وغیرہ میں اپنا وقت ضائع کرنا مناسب خیال نہیں کیا۔اس لیے براہ راست بولی۔

''شعیب۔!آپ یہاں سلامت نگر میں آفیسر ہیں۔اور آپ کو یہاں کے اداروں کے بارے میں پوری معلومات ہوگی۔خاص طور پر تعلیم اور صحت کے معاملے میں۔''

''جی، جانتا ہوں۔ان کی حالت کچھ اتنی اچھی نہیں رہی۔''وہ اختصار سے بولا۔

''اس کی وجہ جو بھی رہی ہو۔میں چاہتی ہوں کہ ان کی حالت بہتر ہو جائے۔اور اس کے ساتھ ساتھ خصوصی طور پر بچیوں کے لیے کوئی تعلیمی ادارہ بنالیا جائے۔جہاں وہ دینی اور دنیاوی دونوں طرح کی تعلیم حاصل کر سکیں۔اس کے فنڈز یہاں حویلی سے جائیں گے۔کیا ایسا ادارہ بنانے میں آپ میری مدد کریں گے۔''

''آپ یہ حکم دیں کہ مجھے کرنا کیا ہے۔''وہ پھر اسی اختصار سے بولا

''سارا کچھ کرنا ہی آپ نے ہے۔پیپر ورک سے لے کر ادارہ بنانے تک۔۔میرا خیال ہے کہ اس کے بعد ایک ہسپتال بھی بناؤں۔۔دونوں پراجیکٹ اگر اکٹھے چلا سکتے ہیں تو۔۔یہ کیسے ہوگا۔۔کس طرح ہوگا۔یہ سب آپ نے کرنا ہے۔۔''

''میری صرف ایک شرط۔۔نہیں۔بلکہ استدعا ہے۔۔۔''وہ بولا۔

''جی، وہ کیا ہے؟''اس نے تیزی سے پوچھا۔

''میں سارا کام کروں گا۔ایک ہی وقت میں ایک پراجیکٹ زیادہ اچھے انداز میں ممکن ہوگا۔استدعا میری یہ ہے کہ مجھے مالی معاملات میں نہ لایا جائے۔وہ کسی اور کے ذمے ہو۔باقی میں سب دیکھ لوں گا۔''اس نے کہا تو نادیہ کے دل پر یوں چوٹ لگی جیسے کسی نے تیر مار دیا ہو۔تبھی اس نے دل گرفتہ سے انداز میں کہا۔

''شعیب یہ آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔میں نے اگر آپ سے یہ استدعا کی ہے تو نہ صرف اپنا سمجھ کر بلکہ مجھے سب سے زیادہ اعتماد آپ پر ہی ہے۔آپ ایسا اجنبیوں والا رویہ کیوں رکھے ہوئے ہیں۔؟''شاید لفظوں سے زیادہ لہجہ اثر کر گیا تھا۔شعیب کے چہرے پر ایک رنگ آ کر گزر گیا۔چند لمحے خاموش رہنے کے بعد بولا۔

''بی بی سائیں۔!آپ یہ مت سمجھیں کہ میں نے یہ اجنبیوں والا رویہ رکھا ہے۔دراصل یہ جو دولت ہوتی ہے نا۔یہ خونی رشتوں میں بھی شک کا زہر گھول دیتی ہے۔پھر مالیات کا یہ معاملہ میرے ذہن کو بانٹ دے گا۔۔۔اور۔۔۔''

''تو پھر بتائیں۔کس پر اعتماد کروں، کون سنبھالے گا یہ پیسوں کا معاملہ۔۔میں اس کے سپرد کر دیتی ہوں؟''نادیہ نے خود پر قابو پاتے ہوئے اعتماد بھرے لہجے میں کہا۔

''دیوان ہیں، بہت بھروسے کے آدمی ہیں۔''اس نے کہا تو نادیہ تیزی سے بولی۔

''تو یہ کام ہی اس کے ذمے ہی لگا دیتی ہوں۔آپ بہر حال مصروف ہیں۔یہ میری غلطی تھی کہ میں نے آپ سے یہ مشورہ کیا۔مجھے تو آپ سے مشورہ بھی نہیں کرنا چاہیے۔میں یہ سارا معاملہ دیکھ لوں گی۔''

''آپ تو ناراض ہو گئیں۔میرا مقصد یہ نہیں تھا، میں تو چاہتا ہوں کہ۔۔۔۔''اس نے کہنا چاہا تو نادیہ

نے اس کی بات قطع کرتے ہوئے کہا۔

"شاید آپ مجھے یہ باور کرانا چاہتے ہیں کہ میں اس دنیا میں اکیلی ہوں، میرا اس دنیا میں کوئی نہیں ہے۔ کوئی ایسا شخص نہیں جو میرے اعتبار کے قابل ہو۔ میں یہ نہیں کہتی کہ آپ اپنی اہمیت جتانا چاہتے ہیں۔ کیونکہ آپ ہمارے لیے اہم ہیں۔ مگر شاید آپ اپنے ذہن میں کچھ اور لیے بیٹھے ہیں۔ آپ شاید سمجھتے ہیں کہ میں عورت ذات ہوں، حویلی کی روایات کی پاسداری کرنے والی ایک مجبور عورت تو میں یہ مجبوری بھری روایات والی زنجیر بھی ختم کردوں گی۔ آپ کا مشورہ صائب ہے کہ ایک ہی وقت میں ایک پراجیکٹ پر کام کرنا چاہیے۔ میں تو آپ کی بات مانوں گی۔ آپ کا بہت شکریہ کہ آپ نے وقت دیا۔ اللہ آپ کا حامی و ناصر ہو۔۔۔" نادیہ نے یہ ساری بات بڑے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہی اور انٹر کام کا ریسور رکھ دیا۔ شیشے کے پار شعیب کا چہرہ اس کی نگاہ کے سامنے تھا۔ جبکہ اس کے اپنے گلے میں کڑواہٹ بھرنے لگی تھی۔ اگر وہ فقط نادیہ ہوتی تو شاید اب تک آہ بھرتے ہوئے چیخ پڑتی۔ لیکن اب وہ بی بی سائیں تھی، اس لیے اپنے دکھ کو اندر ہی اندر رکھنے پر مجبور تھی۔ شکوہ شکایت تو دور کی بات وہ اپنا ردعمل بھی نہیں کہہ سکتی تھی۔ وہ خاموشی سے شعیب کے چہرے پر دیکھ رہی تھی۔ جہاں ندامت یا شرمندگی کا کوئی تاثر نہیں تھا۔ وہی سپاٹ، جذبات سے عاری چہرہ، جس سے کسی بھی تاثر کا اندازہ تک نہیں لگایا جا سکتا تھا۔ وہ چند لمحے دیکھتی رہی، پھر اٹھ کر چل دی۔ اس نے پلٹ کر بھی نہیں دیکھا کہ وہ اس پر کچھ کہنا بھی چاہتا ہے یا نہیں۔ وہ صرف اور فقط اماں بی کو باور کرانے جا رہی تھی کہ آپ کا خیال غلط ہو گیا ہے۔

☆☆☆

بعض اوقات زندگی میں انا پرستی بھی دکھ دے جاتی ہے۔ ایسی کیفیات سے اس وقت شعیب گذر رہا تھا۔ وہ دل سے نادیہ کی مدد کرنا چاہتا تھا لیکن اس کی انا آڑے آئی تھی۔ اس انا کی رکاوٹ بن جانا بھی ایک طرح سے اس کے لیے بہتر ہی تھا۔ اس کی نگاہ حویلی اور حویلی کے معاملات پر پوری طرح تھی۔ وہ جانتا تھا کہ وہاں پر کیا ہو رہا ہے۔ وہ انہی سوچوں میں گھرا ہوا بیٹھا تھا۔ اسے اپنی حالت کا اس وقت اندازہ ہوا جب اس کی امی اور فرح دونوں ڈرائننگ روم میں آئیں اور اسے حیرت زدہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے صوفے پر بیٹھ گئیں۔ تبھی اس کی امی نے حیرت اور تجسس سے پوچھا۔

"خیریت تو ہے پتر۔! حویلی سے ہو کر آئے ہو تو یوں بیٹھے ہو، جیسے اردگرد کا ہوش ہی نہیں۔ ایسی کیا بات ہوئی وہاں پر؟"

"میں۔۔ میں ہوش و حواس میں نہیں؟ میں ٹھیک ہوں۔" اس نے زبردستی مسکراتے ہوئے کہا۔

"خاک ٹھیک ہو، ابھی فرح تمہیں دیکھ کر گئی ہے، اس نے تو مجھے جا کر تیرے بارے میں بتایا۔۔۔ اب سیدھے سیدھے بات کرو، کیا ہوا ہے وہاں پر؟" امی نے ذرا سخت لہجے میں تشویش سے پوچھا تو اس نے من و عن ساری بات بتا دی۔ جیسے سن کر زبیدہ بولی۔

"اب مجھے تیری بھی تو سمجھ نہیں آتی۔ اب اگر اس نے تم سے کہہ دیا تھا تو کسی مان ہی سے کہا تھا۔ اس پر تمہارا انکار بنتا ہی نہیں تھا۔"

"میں نے انکار تھوڑی کیا تھا، بس میں اس کے مالی معاملات نہیں۔۔۔"

"ارے وہی تو اصل معاملات ہوتے ہیں۔" زبیدہ نے حیرت سے کہا۔

"نہیں امی، آپ نہیں جانتیں، اس وقت وہی لوگ اس کے اردگرد ہیں جو کبھی پیر سائیں کے اردگرد تھے۔ ان کے دور میں وہ جو کرتے رہے ہیں وہ سب میرے علم میں ہے۔ عنقریب نادیہ ان کے جال میں پھنس جانے والی ہے۔ یا پھر وہ انہی کی مرضی کے مطابق چلے گی۔ ایسی اگر کوئی صورت حال بنی، تب وہ کون ہو گا جو اسے ایسی صورت حال سے نکالے گا۔ وہی نا۔۔۔ جس پر اسے اعتماد ہو گا۔ میں نہیں چاہتا اماں کہ میں کسی سازش کا شکار ہو کر اپنا اعتماد بھی کھو بیٹھوں۔"

"اگر ایسی صورت حال ہے تو پھر تمہیں وہاں کا سارا نظام اپنے ہاتھ میں لے لینا چاہیے۔ ایک تو وہ ابھی ناسمجھ ہے، ناتجربہ کار ہے۔ دوسرا وہ لاکھ سمجھدار بھی ہو۔ عورت تو ہے نا۔ ایسی عورت جو حویلی سے باہر قدم نکالتے ہوئے سو بار سوچتی ہے۔" اماں نے کہا تو فرح نے منمناتے

ہوئے کہا۔
''کیا آپ کے خیال میں دیوان یہ سب کر رہا ہے؟ یا کر سکتا ہے؟''
''ہاں۔! کیونکہ اس کے میرے پاس اب تک کئی ثبوت آ چکے ہیں۔ میں نے اگر مالی معاملات اپنے ہاتھ میں لیے نہیں، ان کا وار چل جانا ہے۔ اور میں اس پوزیشن میں نہیں کہ دیوان کو الگ کر دوں۔۔۔ اس وقت وہ مریدین میں اپنے ہم خیال لوگوں کا حلقہ بنا چکا ہے۔ اور کوئی شک نہیں کہ وہ اپنی ہی پیری مریدی شروع کر دے۔'' اس نے سمجھایا تو فرح نے تیزی سے کہا۔
''اس طرح تو وہ دن بدن مضبوط ہوتا چلا جائے گا۔ یہی وہ حالات ہیں، جب ہمیں حویلی میں ہونا چاہیے۔ یہی وہ وقت ہے، جیسے ہمیں نادیہ کا ساتھ دینا ہے۔ کل وہ تجربہ کار ہو گئی یا لٹ گئی، پھر ہم اس کے کس کام آئے۔''
''فرح۔! میں سب سمجھتا ہوں اور واقف بھی ہوں کہ آئندہ کیا ہونے والا ہے۔ ظہیر شاہ نے بہت بڑی بے وقوفی کر کے سب کچھ تلپٹ کر دیا ہے۔ اب تو وہ اپنی والدہ کو بھی اپنے پاس بلا رہا ہے کہ وہاں پر شادی کر لے۔ مطلب تمہاری والدہ، تمہارے بھائی کے پاس جا رہی ہے۔ کیا انہوں نے تمہیں مشورے میں لیا؟ فرح مان جاؤ، چاہے نادیہ ہے یا پھر تمہاری والدہ۔۔۔ وہ لوگ ہمیں اس قابل ہی نہیں سمجھتے کہ ہمیں کوئی بات ہی بتا دیں اور تم مالی معاملات کی بات کرتی ہو۔'' شعیب نے کافی حد تک تلخ لہجے میں کہا۔
''آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں، میں نادیہ کی بات کر۔۔۔'' فرح نے کہنا چاہا تو وہ بات کاٹتے ہوئے بولا۔
''نہیں کرو نا بات اس کی۔ کم از کم میرے لیے نہیں۔ ہاں، تمہیں ہمدردی ہے، تو تم حویلی میں جا سکتی ہو۔ اماں بھی جا سکتی ہے۔۔۔''
اس کے لہجے میں تلخی بتا رہی تھی کہ وہ اس موضوع پر بات کرنا بھی پسند نہیں کرتا۔ زبیدہ نے آنکھوں کے اشارے سے فرح کو منع کر دیا کہ وہ مزید بات نہ کرے۔ چند لمحوں بعد وہ اٹھ گئی تو زبیدہ بھی چلی گئی۔ شعیب یوں تنہا رہ گیا۔ وہ پھر سے اپنی کیفیات کا تجزیہ کرنے لگا کہ وہ دل سے اس کی مدد تو کرنا چاہتا ہے لیکن اس نے انکار کیوں کر دیا۔ کیا وہ کوئی ایسا انتقامی جذبہ لیے ہوئے ہے یا کچھ اور۔۔۔ اس نے سو طرح سے سوچا، مگر کہیں بھی کچھ ایسا نہیں تھا۔ مگر اس کا سکون غارت ہو گیا تھا۔
نادیہ کی پہلی کال سے لے کر آخری بار انٹرکام پر بات ہونے تک نجانے کتنی یادیں لمحوں میں آ کر گزر گئیں۔ ایک عام سے لڑکی سے بی بی سائیں کے مقام تک آ جانے میں اس کا سارا سفر وہ جانتا تھا۔ کہیں بھی اس کی اپنی جدوجہد شامل نہیں تھی۔ حالات و واقعات ایسے ہی بنتے چلے گئے اور وہ بی بی سائیں بن گئی۔ لیکن۔! جو چیز اس کے ذہن کو بار بار متوجہ کر رہی تھی، وہ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ بی بی سائیں کے مقام پر فائز ہوئے اسے تقریباً چار ماہ ہو چلے تھے اس دوران وہ بہت بااعتماد ہو گئی تھی۔ اس کے اس مقام تک پہنچ جانے میں وہ حالات و واقعات ہی کا اتفاق قرار دے دیتا۔ لیکن حیرت بھری الجھن یہ تھی کہ اس کے بارے میں یہ مشہور ہو گیا تھا کہ وہ جس کے لیے دعا کرتی ہے، وہ پوری ہو جاتی ہے۔ اگر یہ سچ ہے تو پھر یہ حالات و واقعات کا اتفاق نہیں ہے، بلکہ یہ قدرت کی طرف سے کوئی عطیہ ہے، جس نے نہ صرف اسے بی بی سائیں کے مقام پر لا کھڑا کیا ہے بلکہ اس کی دعائیں بھی قبول ہو رہی ہیں۔ ایسا کیوں ہو گیا؟ یہ بات اس کی سمجھ میں آئے یا نہ آئے۔ یہ گتھی وہ کھول سکے گا یا نہیں لیکن اس کے لیے مقام حیرت ہے۔ اسے سوچنا ہو گا کہ ان کا ایک نہ ہونا قدرت ہی کی منشاء تھی۔ اور اس نے جو مدد چاہی تھی وہ یونہی نہیں تھی۔ یہ تو ہو سکتا تھا کہ ایک عام سی لڑکی کے دل میں اس کی محبت ہو اور اب جبکہ اسے موقعہ ملا تو وہ اس کی قربت کی خواہاں ہو۔ تبھی اسے کسی نہ کسی طرح قریب رکھنے کے بہانے یہ پراجیکٹ بنایا ہو۔ یہ بات نہ اس کا دل قبول کر رہا تھا اور نہ ہی ذہن۔ اب جو نادیہ کا مقام ہے، اس کے ہوتے ہوئے، اسے خود نادیہ سے دور ہو جانا چاہیے۔ وہ جو محبت ان کے دلوں میں موجود ہے کہیں کوئی ہلکی سے چلنے والی ہوا پھر سے سلگ جانے پر

مجبور کر دے۔ شاید وہ اسی لیے خوف کھا گیا تھا۔ تبھی اچانک اس کے من میں یہ خیال آیا کہ کچھ بھی ہے تم دلیلیں مت گھڑو، یہ مان جاؤ کہ تم سے غلطی ہوئی۔ تم نے اسے انکار کر کے اچھا نہیں کیا۔ تمہارے اندر کا کوئی خوف ہے جو تمہیں ایسا کرنے سے روک رہا ہے۔ ممکن ہے نادیہ کے دل میں محبت کی وہ آگ سرد پڑ چکی ہو۔ جس کی چنگاری تم اب بھی اپنے دل میں لیے پھرتے ہو۔

''مجھے کیا کرنا چاہیے؟'' اس نے خود سے سوال کیا۔

''یہی کہ اب جبکہ تم نے اسے انکار کر دیا ہے تو بس کر دیا۔ جب تک وہ تمہیں دوبارہ نہیں کہے گی۔ تم اپنی بات پر قائم رہو۔ غلطی ہوگئی تو بس ہوگئی۔''

''تو گویا میں اپنی غلطی تسلیم کر لوں''

''تو یہ ہٹ دھرمی ہوگی، نہ کرو تسلیم، غلطی تو پھر بھی غلطی رہے گی۔''

''ٹھیک، مجھے اب انتظار کرنا ہوگا۔ وقت اور حالات مجھے یہ موقع دیں گے تو میں کر لوں گا۔''

''اب ہوئی نا بات۔۔۔''

اس کے اندر سے آواز آئی تو وہ پرسکون ہوگیا۔

اصل میں ہوتا یہی ہے کہ جب ہمارے ذہن یا دل میں کوئی منفی جذبہ، یا سوچ پروان چڑھنے لگے تو وہ بدبو کی مانند ہوتا ہے۔ اور بدبو بھی سکون نہیں لینے دیتی۔ وہ بے چین رکھتی ہے۔ جیسے ہی اس جذبے یا سوچ کو ہم نکال باہر پھینکتے ہیں تو پرسکون ہو جاتے ہیں۔ شعیب بھی اسی حالت میں تھا۔

☆......☆......☆

دن ایک کے بعد ایک کر کے گذرتے چلے گئے۔ ایک موسم گذر گیا تو دوسرا آ گیا۔ اس کے ساتھ ہی حویلی کا سناٹا مزید بڑھتا چلا گیا۔ بہت پہلے زہرہ بی لندن چلی گئی تھی۔ کچھ دنوں بعد یہ خبر آ گئی کہ ظہیر شاہ نے ایک پاکستانی نژاد برطانوی لڑکی سے شادی کر لی ہے۔ جو اس کے ساتھ تعلیم حاصل کر رہی تھی۔ پھر پلٹ کر کوئی خبر نہیں آئی۔ یہاں تک کہ اس نے اپنی جائیداد کے حصول کے لیے بھی کبھی کوئی بات نہیں کی۔ نہ ہی اس نے اپنی جاگیر سے ہونے والی آمدنی میں سے کبھی کوئی مطالبہ کیا تھا۔ بی بی سائیں کے کہنے پر دیوان نے ظہیر شاہ سے رابطہ کیا تھا۔ تب اس نے دیوان سے یہی کہا تھا کہ جب تک وہ عورت اس حویلی میں ہے۔ میں پلٹ کر نہیں آؤں گا۔ رہی جائیداد اور آمدنی کی بات تو وہ کسی بھی وقت آ کر لے لے گا۔ تب سے ہی دیوان کو کہہ دیا تھا کہ اس کی آمدنی کا حساب کتاب درست طریقے سے رکھا جائے اور وہ جب بھی مطالبہ کرے اسے فوراً ادا کر دیا جائے۔ دیوان پوری پابندی کے ساتھ اس حکم کو نبھا رہا تھا۔

اب حویلی میں اماں بی ہوتی یا پھر بی بی سائیں۔ چند ملازم عورتوں کے ساتھ حویلی میں رونقیں تو کیا ہوتی تھیں۔ سناٹے مزید بڑھ گئے۔ دن رات کے کچھ حصے میں وہ دونوں مل پاتیں۔ چند عام سی باتوں کے بعد وہ اپنی تنہا دنیا میں لوٹ جاتیں۔ اماں بی اب اپنے آپ میں سمٹ گئی تھیں۔ جبکہ بی بی سائیں کا وقت مریدین کے ساتھ گذر جاتا۔ جب سے شعیب نے انکار کیا تھا اس نے پلٹ کر دوبارہ اسے نہیں کہا۔ بلکہ اپنے چند مریدین کے ذمے لگایا کہ وہ ایک شاندار ادارہ بنائیں۔ اس کی بنیاد ڈال دی گئی تھی۔ اور وہ زور شور سے تعمیر ہو رہا تھا۔ وہ دن میں ایک بار اس ادارہ میں ہونے والے کام کے متعلق بات کرتی، کبھی کبھی زبیدہ پھوپھو آ جاتی تو حویلی میں ذرا سی ہلچل ہوتی، پہلے پہلے فرح بھی آ جاتی تھی۔ لیکن اب وہ اس حال میں تھی کہ ایک دو دن ہی میں اس کے ہاں مہمان کی آمد تھی۔ اماں بی کو اس کی بڑی فکر تھی۔ اس دن بھی جب وہ مل بیٹھیں تو اماں بی نے ذکر چھیڑ دیا۔

''آج کل میں کوئی خبر آنے والی ہے۔ پتہ نہیں فرح بے چاری کس حال میں ہوگی۔ بس اتنی ڈھارس ہے کہ زبیدہ اس کے پاس ہے۔ سنبھال لے گی۔ مگر دل تو پھر بھی مطمئن نہیں ہوتا نا۔۔۔''

''اماں بی۔! آپ ایسا کیوں نہیں کرتیں، اسے یہاں لے آئیں۔ یا پھر آپ چلی جائیں اس کے پاس۔'' نادیہ نے اس قدر خلوص سے کہا کہ اماں بی نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ چند لمحوں تک وہ اس کے لہجے میں کسی دوسرے جذبے کو تلاش کرتی رہی لیکن نہ کر سکیں۔ بلکہ اس کے لہجے میں دردمندی کے ساتھ اپنوں

کے لیے تڑپ بھی چھلک پڑی تھی۔
''میں تمہیں اکیلی چھوڑ کر کہاں جاؤں۔ بس ایک شعیب ہی تو ہے جو نہیں مانتا۔ ورنہ اس حویلی میں بھی زندگی سانس لینے لگے۔'' ذرا سی ٹیس لگی تو اماں بی کا پرانا زخم پھر سے تازہ ہو گیا۔
''اماں بی۔! اب میں اس پر تو کچھ نہیں کہہ پاؤں گی۔ آپ کم از کم فون کر کے ہی اس کے بارے میں معلومات لیتی رہیں۔ انہیں احساس تو ہو کہ ہم ان کے لیے فکر مند ہیں۔''
''چند دن پہلے فون کیا تھا، آج پھر کرتی ہوں۔ بلکہ میں کوشش کرتی ہوں کہ زبیدہ کو منا لوں کہ وہ فرح کو لے کر یہاں آ جائے۔ شعیب نہ بھی مانا تو میں خود اسے لینے چلی جاؤں گی۔'' اماں نے شدت جذبات سے کہا۔ ان کا لہجہ بھیگا ہوا تھا۔ جیسے دردمندی میں ابھی رو دیں گی۔
''اماں بی۔! آپ ان کا بہت خیال رکھیں۔۔'' بی بی سائیں نے کہا تو اماں بی نے اس کی طرف چونک کر دیکھا۔ اس کے لہجے میں ہمدردی کے چراغ روشن تھے۔ اماں بی نے فون منگوایا اور فرح کے نمبر پش کر دیے۔ کافی دیر تک بیل بجتی رہی لیکن فون کسی نے نہیں اٹھایا۔ وہ پریشان ہو گئی کہ وہ فون کیوں نہیں اٹھا رہی۔ اس نے چند لمحوں بعد کرنے کا سوچ کر بی بی سائیں سے اپنی تشویش کا اظہار کیا۔
''وہ فون ہی نہیں اٹھا رہی۔۔ اللہ خیر کرے۔۔'' لفظ ابھی اس کے منہ ہی میں تھے فون آ گیا۔ اماں بی نے فون ریسو کرتے ہوئے پوچھا۔
''فرح بیٹی، کیسی ہو۔۔۔؟''
''میں فرح نہیں۔ زبیدہ بات کر رہی ہوں۔ آپ دعا کریں۔ ابھی کچھ دیر پہلے ہم اسے لے کر یہاں ہسپتال میں آئے ہیں۔'' وہ گہرے غم زدہ لہجے میں بولی۔
''کیا ہوا اسے۔۔۔؟'' اماں بی نے حیرت سے پوچھا۔
''طبیعت خاصی بگڑ گئی ہے۔ ڈاکٹروں نے یہی تجویز کیا ہے کہ اسے آپریشن کے مرحلے سے گذرنا پڑے گا۔ اب آپ دعا کریں۔۔۔''
''کیا اسے آپریشن کے لیے لے کر چلے گئے ہیں۔۔۔'' اماں بی نے پوچھا۔
''نہیں۔۔۔ ڈاکٹر کہہ رہے ہیں کہ آپریشن ضروری ہے لیکن فرح کی حالت ایسی نہیں ہے۔ بہت عجیب صورت حال کا سامنا ہے۔۔ اسے بہت زیادہ بلڈ پریشر ہو رہا ہے۔''
''اللہ خیر کرے۔۔'' اماں بی کے منہ سے نکلا! پھر پوچھا۔ ''فرح سے بات تو کراؤ۔۔''
''اماں، اس کی حالت ایسی نہیں کہ بات کر سکے۔ اگر ٹھیک ہو گئی تو کر لے گی۔'' آخری لفظ کہتے ہوئے زبیدہ کا لہجہ بھرا گیا اور پھر وہ کچھ نہ کہہ سکی اور فون بند کر دیا۔
بی بی سائیں کے چہرے پر تشویش ابھر آئی۔ صورت حال تو خاصی مخدوش تھی۔ اسے خود پر افسوس ہونے لگا کہ وہ رابطہ کیوں نہ رکھ سکی۔ یہ رابطہ ہی کی کوتاہی تھی کہ اسے فرح کی طبیعت بارے معلوم ہی نہ ہو سکا۔ اسے خود پر افسوس ہونے لگا۔ پھر کچھ دیر سوچ کر بولی۔
''اماں بی۔! آپ جائیں ہسپتال۔۔ اسے دیکھیں اور حوصلہ دیں۔۔ تاجاں مائی آپ کے ساتھ جاتی ہے۔ وہ مجھے صورت حال سے آگاہ کرتی رہے گی۔'' بی بی سائیں نے کہا اور اٹھ گئی۔ اماں بی تو جیسے اسی انتظار میں تھی۔ فوراً ہی تیار ہو گئی۔ کچھ دیر بعد پتہ چلا کہ وہ ہسپتال پہنچ گئی ہے۔
وہ جائے نماز پر بیٹھی فرح کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ کچھ دیر پہلے جو اس کے بارے میں معلوم ہوا تو کتنا دکھ ہوا تھا اسے۔ ایک طرح سے وہ بھی اب اس جیسی ہو گئی تھی، نہ باپ تھا اور نہ ماں۔۔۔
''لیکن اس کا ایک شوہر ہے اور محبت کرنے والی ماں کے جیسی ساس بھی۔۔۔ لیکن۔ تیرے پاس نہیں ہے۔ تم اسے اپنے ساتھ مت جوڑو۔۔ بلکہ رشک کرو اس کی قسمت پر اس کے چاہنے والے اس کے سر پر ہیں۔۔۔''
''ہاں۔! یہ اس کی قسمت ہے اور جو میری قسمت ہے۔۔ وہ مجھے مل گئی ہے۔۔۔ اس میں ہم کیا کر سکتے ہیں۔''

''اگر اسے کچھ ہو گیا تو۔۔۔!''
''یہ بھی تو اللہ کی مرضی ہے نا۔۔''
''اس کا بچہ کیا کرے گا۔۔کون سنبھالے گا۔۔''
اس سوچ کے آتے ہی ایک ایسی سوچ اس کے دماغ میں سرسرائی کہ وہ بے چین ہو گئی۔
''کیا یہ قدرت کی طرف سے ایسے حالات بن رہے ہیں کہ فرح درمیان میں نہ رہے اور۔۔میں۔۔'' یہ سوچتے ہی وہ لرز گئی۔
''نہیں۔!کتنی گھٹی زندگی۔۔اور میری خوشی کے شادیانے۔۔نہیں میرے مولا میں ایسا نہیں چاہتی۔۔مجھے کس امتحان میں نہ ڈال میرے مولا۔۔'' یہ سوچتے ہوئے وہ زاروقطار رونے لگی۔پتہ نہیں کتنی دیر یونہی گذر گئی۔تبھی تاجاں مائی کا فون آ گیا۔
''ہاں تاجاں۔۔بتاؤ۔۔کیسی ہے فرح۔۔''
''اس کا تو پتہ نہیں۔۔لیکن آپریشن کے بعد اللہ نے اسے بہت پیارا سا بیٹا دیا ہے۔۔''
''اچھا اور کیسا ہے۔۔''اس نے اشتیاق سے پوچھا۔
''بہت پیارا۔۔''
''اور فرح۔۔؟''
''ڈاکٹر اس کی زندگی سے اتنی اُمید نہیں رکھتے۔۔اسے اب تک ہوش آ جانا چاہیے تھا۔لیکن نہیں آیا۔۔ڈاکٹر بھی پریشان ہیں۔۔۔''
''جو کچھ بھی ہونا ہے۔۔میرے اللہ سائیں نے کرنا ہے۔۔تم پریشان نہ ہو۔تم وہیں رہنا۔جب تک اسے ہوش نہ آ جائے۔۔۔اماں بی کو چاہے واپس بھیج دینا۔''
''جی۔۔!بی بی سائیں۔جیسا آپ کا حکم۔''
بی بی سائیں نے فون بند کر دیا۔ایک عجیب ہلچل سی اس کے من میں پھیل گئی تھی۔وہ اپنے کمرے کی کھڑکی سے جا لگی۔باہر کے منظر اندھیروں میں ڈوبے ہوئے تھے۔وہاں اس کا دل نہیں لگا۔وہ پھر سے جائے نماز پر آن بیٹھی۔اور صدق دل سے دعا مانگنے لگی۔
ساری رات اسی طرح گذر گئی۔اماں بی واپس نہیں لوٹی تھی۔فرح کی حالت واقعتاً کچھ زیادہ ہی تشویش ناک ہو گئی تھی۔تاجاں مائی گاہے بگاہے اسے آگاہ کرتی رہی۔اس وقت صبح نور ہونے والی تھی کہ تاجاں مائی کا فون ملا،فرح کی حالت خاصی بگڑ گئی تھی۔
''بی بی سائیں۔!فرح کا کوئی پتہ نہیں۔میرے خیال میں آپ ایک دفعہ ہسپتال کا چکر ضرور لگا جائیں۔ورنہ ساری زندگی۔۔۔''
''میں آتی ہوں۔۔''اس نے کہا اور فون رکھ دیا۔وہ سمجھ چکی تھی کہ تاجاں کیا کہنا چاہتی ہے۔کچھ ہی دیر بعد وہ اپنے لیے مخصوص گاڑی میں اپنی ملازمہ کے ساتھ بیٹھی ہوئی ہسپتال کی طرف جا رہی تھی۔ڈرائیور اور ان کے درمیان پردہ حائل تھا۔نجانے کن کن راستوں سے ہوتے ہوئے وہ کب ہسپتال جا پہنچے۔جس وقت وہ فرح کے کمرے میں گئی تو وہ نیم وا آنکھوں سے اس کی راہ تک رہی تھی۔۔ایک طرف بیڈ پر اماں بی اور دوسری طرف زبیدہ پھوپھو تھیں۔قریب ہی کارٹ میں وہ ننھا مہمان تھا۔جس کے پاس تاجاں بیٹھی ہوئی تھی۔شعیب کہیں دکھائی نہیں دیا۔وہ فرح کے قریب بیٹھ گئی اور اس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیے۔
''حوصلہ کرو فرح۔۔تم ٹھیک ہو جاؤ گی۔۔۔''
''نہیں۔۔ایسا نہیں ہے۔اچھا کیا تم آ گئیں۔۔۔میری بعد میرے بیٹے کی پرورش کرنا۔یہ تمہاری ذمے داری ہے۔۔۔اور شعیب۔۔۔''
''مایوسی کی باتیں مت کرو۔۔اچھا اچھا سوچو۔۔۔''
''ڈاکٹر نا امید ہو چکے ہیں۔۔چند سانسیں۔۔ہیں۔۔۔''
''اللہ کی رحمت سے انسان کو کبھی بھی نا امید نہیں ہونا چاہیے۔۔۔''بی بی سائیں نے جیسے ہی یہ لفظ کہے،انہی لمحات میں اس کا سیل فون بج اٹھا۔اجنبی نمبر تھے۔چند لوگوں کے علاوہ تو کسی کے پاس اس کا نمبر نہیں تھا۔اس نے اسکرین پر دیکھا اور پھر فون ریسو کر لیا۔
''میں شعیب بات کر رہا ہوں۔''شعیب کی آواز تو وہ لاکھوں آوازوں میں سے پہچان سکتی تھی۔
''جی۔!''اس نے انتہائی اختصار سے کہا۔
''میں اس وقت ہسپتال ہی میں ہوں۔۔اور کاریڈور میں اس لیے کھڑا ہوں کہ تم نے آنا ہے۔۔اب

دیکھ لو اس کی حالت۔۔۔میں نے سنا ہے کہ تم جو بھی دعا کرتی ہو۔۔وہ پوری ہوتی ہے۔۔میں اپنے بیٹے کو کسی امتحان میں نہیں ڈالنا چاہتا۔دعا کرو۔۔۔میری بیوی بچ جائے۔۔۔'' شعیب نے کہا تو نادیہ نے اگلے ہی لمحے کہا۔

''ایک شرط پر۔۔!''

''بولو۔!میں تمہاری ہر شرط ماننے کو تیار ہوں۔''
اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں سنجیدگی سے کہا۔

''تمہارا بیٹا حویلی میں رہے گا۔اپنی ماں کے ساتھ۔۔''

''یہ۔۔۔یہ۔۔۔کیا کہہ رہی ہو تم۔۔۔'' شعیب نے تڑپ کر کہا۔

''ابھی آپ نے کہا کہ آپ ہر شرط ماننے کو تیار ہیں اور اتنی سی بات پر تڑپ اٹھے۔۔۔دیکھو۔!زندگی اور موت تو اللہ سائیں نے اپنے ہاتھ میں رکھی ہوئی ہے نا۔کیا کوئی ایسا دعویٰ کر سکتا ہے۔آپ نے اپنی انا پر ذرا سی ٹھیس نہیں آنے دی۔تو کیا رب تعالیٰ اپنے نظام میں مداخلت برداشت کر سکتا ہے۔میں پورے خلوص سے دعا گو ہوں۔۔کہ اللہ تعالیٰ فرح کو صحت دے۔۔''

''ٹھیک ہے۔۔۔میرا بیٹا حویلی میں پرورش پائے گا۔میں مان لیتا ہوں۔۔لیکن فرح کے ساتھ۔۔یہی تم نے شرط عائد کی ہے نا۔۔۔میں اپنے گھر جا رہا ہوں تم ان سب کو حویلی لے جانا۔۔چاہے جیسی بھی حالت ہو۔۔'' شعیب نے کہا۔

ایک بہت بڑا امتحان بی بی سائیں کے سر آ گیا تھا۔رات کے پہلے پہر جو خیال اس کے ذہن میں آیا تھا کہ اگر فرح نہ رہے تو شعیب اس کا ہو سکتا ہے۔کس قدر خودغرضی تھی۔اسے اپنے آپ سے گھن آنے لگی تھی کہ اب وہ یہ سوچ سکتی ہے۔لیکن انسان اپنی سوچ پر دسترس تو نہیں رکھ سکتا۔کوئی بھی خیال آ سکتا ہے۔اگرچہ اس نے اس خیال کو فوراً ہی جھٹک دیا تھا۔لیکن یقین کے آئینے پر ایک خراش ضرور ڈال گیا تھا۔اگر فرح اس دنیا میں نہ رہی تو وہ کبھی اپنے آپ کو معاف نہیں کر پائے گی کہ وہ تو چاہتی ہی فرح کی موت تھی کہ وہ ہی ان کے درمیان رکاوٹ تھی۔اس نے ایک نگاہ فرح کی طرف دیکھا جو نیم وا آنکھوں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔فون کی سائیں سائیں اس کے کانوں میں گونج رہی تھی۔

''نہیں۔!آپ مت جائے۔۔بلکہ اللہ نے چاہا تو شام سے پہلے فرح تندرست ہو جائے گی اگرچہ آپریشن کا زخم تو رہے گا۔وہ تو جاتے جاتے جائے گا۔لیکن فرح ابھی خطرے سے باہر آ جائے گی۔تب آپ خود ہی انہیں لے کر حویلی آ جانا۔۔میں جا رہی ہوں۔۔۔'' یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔پھر چند لمحے بیٹھ کر جس طرح آئی تھی اسی طرح واپس پلٹ گئی۔اس وقت سورج طلوع ہو رہا تھا۔جب وہ حویلی میں داخل ہوئی۔

☆......☆......☆

شعیب کو یہ احساس تو تھا کہ جیسا وہ کہے گی، ویسا ہو جائے گا۔بی بی سائیں کی بات پر اسی رات اسے یقین ہو گیا۔شام ہونے سے پہلے ہی فرح کی طبیعت سنبھلنے لگی تھی اور پھر رات جب لیڈی ڈاکٹر نے خصوصی طور پر آ کر اسے دیکھا تو اسے کسی بھی خطرے سے باہر قرار دیا۔اماں بی نے اسی وقت ڈاکٹر سے فرح کو ڈسچارج کر دینے کے لیے کہا۔

''اچھا ہے اگر ایک دو دن مزید یہاں رہیں، لیکن آپ کہتے ہیں تو لے جائیں۔ڈاکٹر نے اپنی رائے دی۔

''آپ کو دو وقت گاڑی لے آیا کرے گی، آپ ہی نے اسے دیکھنا ہے۔'' زبیدہ نے کہا تو ڈاکٹر فوراً ہی مان گئی۔اسے معلوم تھا کہ یہ کس فیملی سے تعلق رکھنے والے لوگ ہیں۔کچھ ہی دیر بعد وہ سب حویلی کی طرف چل دیئے تھے۔شعیب انہیں خود لے کر گیا تھا۔

فرح کے لیے جو کمرہ مختص کیا گیا تھا۔اس میں جہاں فرح کے لیے ہر طرح کی سہولیات کا خیال تھا، وہاں ننھے مہمان کے لیے بھی پورا اہتمام کیا گیا تھا۔ایک دن کے بچے نے کھلونوں سے کیا کھیلنا تھا لیکن وہاں پر ایک کونا پوری طرح سجا ہوا تھا۔اس کمرے پر ایک نگاہ ڈالتے ہی شعیب کو یوں لگا جیسے نادیہ کو پورا یقین ہو کہ وہ یہیں آئیں گے۔وہ کچھ دیر وہاں رہا۔پھر واپس پلٹنے کے لیے تیار ہو گیا۔

''اب تم کہاں جاؤ گے۔یہیں رہو۔'' اماں بی نے حیرت سے کہا۔

"نہیں، میرا بی بی سائیں سے وعدہ تھا کہ انہیں خود لے کر آؤں گا، وہ میں لے آیا۔ اب میں اپنے گھر جاتا ہوں۔ روزانہ انہیں دیکھنے کے لیے آجایا کروں گا۔"

"یہاں رہنے میں آخر تمہیں رکاوٹ کیا ہے۔۔۔ کیوں نہیں ٹھہرتے تم یہاں۔۔" اماں بی نے پھر پوچھا۔ ان کے لہجے میں غصہ ملی حیرت جھلک رہی تھی۔ تبھی اس نے بڑے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

"رکاوٹ۔۔۔ بی بی سائیں ہیں۔۔۔ ایک ہی چھت تلے دو نامحرم نہیں رہ سکتے۔۔" شعیب نے کہا اور جانے کے لیے اٹھ گیا۔ اس نے ایک نگاہ فرح پر ڈالی جو اس کی طرف بڑے پیار سے دیکھ رہی تھی۔ پھر اپنے بیٹے کو پیار کیا اور کمرے سے نکلتا چلا گیا۔ ایک بہت بڑا بوجھ اس کے ذہن سے اتر گیا تھا۔ وہ ایک پرسکون نیند لینا چاہتا تھا۔ وہ اپنی سرکاری رہائش گاہ پہنچا، فریش ہوا اور کھانا کھا کر سو گیا۔ بہت دنوں بعد وہ ایسی پرسکون نیند سویا تھا۔

☆......☆......☆

بی بی سائیں کے لیے وہ رات کسی امتحان سے کم نہیں تھی۔ اسے جب معلوم ہوا کہ شعیب چلا گیا ہے تو وہ فرح کے کمرے میں آ گئی۔ جہاں اماں بی اور زبیدہ پھوپھو موجود تھیں۔ وہ کچھ دیر فرح کے ساتھ باتیں کرتی رہی۔ تبھی تاجاں مائی نے بچے کو اچھی طرح لپیٹ کر اس کی گود میں دے دیا۔ جیسے ہی وہ اس کی گود میں آیا تو بی بی سائیں نے اندر سے کہیں ایک لہر اٹھتی ہوئی محسوس کی۔ وہ لہر نجانے کیا تھی۔ اس کی اسے بھی سمجھ نہیں آئی۔ لیکن بے چین کر دینے والی اس لہر نے اس کے عورت پن کو یوں چھوا کہ پوری جان سے لرزا کر رکھ دیا۔ اسے بچے پر ٹوٹ کر پیار آیا۔ اس کے پھول جیسے گالوں کو جب اس نے اپنی انگلیوں کی پوروں سے چھوا تو اسے یوں لگا جیسے وہ زندگی کو چھو رہی ہے۔ ایک انجانی حرارت اس کے رگ و پے میں سرائیت کر گئی۔ جس نے اسے بے حال کر کے رکھ دیا۔ انہی لمحات میں اماں بی نے کہا۔

"شعیب نے اپنی بات پوری کی اور یہاں تک انہیں چھوڑ گیا۔ کہہ گیا ہے کہ وہ روزانہ آجایا کرے گا۔"

"اگر یہیں رہ لیتے تو زیادہ اچھا تھا۔" بی بی سائیں نے ہولے سے کہا۔

"جاتے جاتے وہ ایک بات کہہ گیا ہے۔۔۔ کہ وہ کیوں یہاں نہیں رہنا چاہتا۔" اماں بی نے یوں کہا جیسے وہ اس سے کوئی حتمی بات کہنے جا رہی ہو۔

"کیا بات کہہ گئے ہیں وہ۔۔۔ کس وجہ سے وہ یہاں نہیں رہنا چاہتے۔" اس نے یوں پوچھا جیسے وہ دوسرے لفظوں میں یہ کہہ رہی ہو کہ چلو برف تو پگھلی، دھیرے دھیرے ٹھیک ہو جائے گا۔

"وہ وجہ تم ہو بی بی سائیں۔۔۔ اس نے کہا ہے کہ شریعت ایک ہی چھت تلے رہنے کی اجازت نہیں دیتی۔"

یہ ایک دھماکہ تھا جو اس کے اندر ہوا۔ مگر اس کا احساس نہیں ہونے دیا۔ وہ کچھ نہ بولی، سمجھ گئی کہ اگر وہ اس سے پردہ کرتی ہے، اس کے سامنے نہیں آتی تو اسے بھی ایسی بات کہنے کا پورا پورا حق ہے اور وہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔

"میرے خیال میں اس نے غلط نہیں کہا۔" زبیدہ پھوپھو نے تیزی سے شعیب کی وکالت کرتے ہوئے کہا۔

"ہاں۔! اس نے غلط نہیں کہا۔ وہ درست ہے۔۔۔ ہمیں یہ بات پہلے ہی سمجھ جانی چاہیے تھی۔" بی بی سائیں نے اپنی انگلیوں کی پوروں سے بچے کے گالوں کو محبت سے چھوتے ہوئے کہا۔ تبھی اماں بی نے کہا۔

"اگر تم چاہو۔! تو شعیب آزادی سے یہاں رہ سکتا ہے۔۔"

اماں کے یوں کہنے پر بی بی سائیں نے تیزی سے فرح کے چہرے پر دیکھا۔ اس کے خیال میں یہی تھا کہ وہاں ملال اور دکھ کی پرچھائیاں ہوں گی۔ لیکن وہ مسکرا کر بڑے اشتیاق سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ فرح نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا۔

"انکار مت کرنا۔۔۔ تمہاری ہاں مجھے حوصلہ دے گی اور میں اپنے شوہر کو منانے میں پورے اعتماد سے بات کر سکوں گی۔۔۔ حویلی کی ضرورت اپنی جگہ، لیکن نکاح سنت بھی تو ہے نا۔۔۔ اسے اپنا لو۔۔"

"کیا مجھے سوچنے کے لیے کچھ وقت دیا جائے گا۔۔۔" بی بی سائیں نے آہستگی سے کہا۔

''صرف آج کی رات۔۔۔'' اماں بی نے یوں کہا جیسے حکم دے رہی ہوں۔

''ٹھیک ہے۔۔'' اس نے بچے کو تاجاں کی طرف بڑھایا اور خود اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی آئی۔۔رات بھر وہ سوچتی رہی۔زندگی ایک بار پھر اس کے لیے خوشیاں لے کر آئی تھی۔اس یہ اس کے ہاتھ میں تھا کہ بڑھا کر خوشیاں سمیٹ لے یا پھر ان سے منہ موڑ لے۔۔اور شاید یہ آخری موقع تھا۔اور شاید زندگی پھر اسے کبھی ایسا موقعہ نہ دے۔۔ایسا کڑا امتحان جب بھی اس پر آیا۔وہ سوچتی تو تھی لیکن اپنا فیصلہ رب کے سپرد بھی کیا کرتی تھی۔رات کے پچھلے پہر جب وہ تہجد کے لیے اٹھی تو اسے فیصلے کا جواب مل چکا تھا۔یہ اس کا اپنا فیصلہ نہیں تھا ،بلکہ اس پر انہوں نے بھی صاد کر دیا تھا، جہاں سے اسے ہر طرح کی روحانی قوت میسر تھی۔صبح جب سورج طلوع ہوا تو اس نے اپنے فیصلے سے اماں بی کو آگاہ کر دیا۔

☆☆......☆☆

حویلی میں شعیب کے لیے ایک شاندار کمرہ مختص کر دیا گیا تھا۔جس کا دروازہ کھولتے ہوئے اس کا انگ انگ خوشی سے بھرا ہوا تھا۔ایک طرف جہاں بہت سارے معاملات سلجھ جانے کی خوشی تھی تو دوسری جانب اس دلکش آواز کو مجسم دیکھنے کا تجسس اپنے پورے عروج پر تھا۔جس نے اس کے اندر محبت کی جوت جگائی تھی۔دوپہر کے بعد اس کا نکاح نادیہ سے ہو گیا تھا۔اور یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح مریدین میں پھیل گئی تھی۔دوپہر سے لے کر اب سے تھوڑی دیر قبل تک وہ بہت مصروف رہا تھا۔کچھ دیر پہلے اسے تنہائی میسر آئی تھی۔اس تھوڑے سے وقت میں پہلی کال سے لے کر اب تک کے سارے واقعات اس کی نگاہوں میں گھوم گئے تھے۔زندگی نے اسے سب کچھ دے دیا تھا۔لیکن ایک طویل صبر کے بعد۔اس نے دروازہ کھولا تو سامنے ہی بیڈ پر نادیہ سرخ عروسی جوڑے میں گٹھڑی بنی بیٹھی تھی۔اسے خیال آیا، فرح بی کچھ ایسے ہی بیٹھی تھی۔اسے بھی پہلے نہیں دیکھا تھا۔لیکن تب اس کے جذبات کچھ اور تھے اور یہاں کچھ اور۔۔ایک اشتیاق تھا جو اسے دھیرے دھیرے لرزائے ہوئے تھا۔وہ اس کے پاس جا بیٹھا تو نادیہ کچھ مزید سمٹ گئی۔اس نے چند لمحے اسے دیکھا اور پھر جیب میں سے کنگن نکال کر اپنے گورے ہاتھ میں پکڑ لیا۔کنگن پہناتے ہوئے اس نے واضح طور پر محسوس کیا کہ نادیہ بھی لرز رہی ہے۔پھر وہ لمحہ بھی آ گیا اس نے دھیرے سے اس کا گھونگھٹ اٹھایا تو چند لمحے کے لیے مبہوت ہو کر رہ گیا۔اس قدر خوبصورت ہے نادیہ۔۔۔؟ وہ تو اس کی سوچوں سے بھی زیادہ حسین نکلی۔۔۔وہ آنکھیں بند کیئے ہوئے تھی۔اور اس کے پپوٹے ہلکے ہلکے لرز رہے تھے۔تبھی اس نے آہستگی سے کہا

''آج دلکش آواز میرے سامنے مجسم ہو گئی۔۔بلاشبہ تم آواز سے بھی زیادہ خوبصورت ہو۔۔'' اس کے یوں کہنے پر نادیہ نے آنکھیں کھول دیں۔اسے بس ایک لمحہ کو دیکھا اور پھر نگاہیں جھکا لیں۔

''آواز سے مجسم ہو جانے کا سفر بہت صبر آزما رہا۔۔تم کیسا محسوس کر رہی ہو۔۔؟''

''وہی جو ایک عورت محسوس کرتی ہے۔۔۔'' اس نے ہولے سے کہا۔

''نادیہ!زندگی نے جس طرح طویل راستے طے کرنے کے بعد ہمیں آپس میں ملایا ہے۔بلاشبہ اس مسافت نے ہمیں بہت کچھ دیا۔ہم نے کھویا کچھ نہیں۔تمہارا بی بی سائیں کا اسٹیٹس ویسا ہی رہے گا۔۔میں اس میں قطعاً مداخلت نہیں کروں گا۔''

''آپ کا بہت شکریہ۔۔آپ نے میرا اعتماد بڑھا دیا۔میری تمام تر سپردگی آپ کے لیے ہے۔میرا بی بی سائیں ہونا اپنی جگہ۔۔۔میں آپ کی بیوی بھی ہوں۔۔آپ کا ہر حکم ماننا میرا فرض ہے۔''

''آؤ۔!دو رکعت نماز شکرانہ ادا کریں۔باقی زندگی تو اب ہماری دسترس میں آ ہی چکی ہے۔۔'' شعیب نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اٹھایا تو نادیہ کو یوں لگا جیسے واقعتاً زندگی اب اس کی دسترس میں آ چکی ہے۔اس کی چاہ میں جو مسافتیں تھی۔اب نجانے کہاں تھیں۔منزل مل جانے کا سکون وہ محسوس کر رہی تھی۔یہ محبت ہی تو تھی جس نے آخر انہیں جیت لیا۔

(ختم شد)

☆☆......☆☆